الکوثر

فی تفسیر القرآن

محسن علی نجفی

مصباح القرآن

ٹرسٹ لاہور

الكوثر

في تفسير القرآن

خالی

الکوثر

فی تفسیر القرآن

جلد پنجم

محسن علی نجفی

مِصْبَاحُ الْقُرآن ٹرسٹ۔ لاہور

تفسیر

الکہف۔ مریم۔ طٰہ۔ الانبیاء۔ الحج۔
المؤمنون۔ النور

نام کتاب: الکوثر فی تفسیر القرآن (جلد پنجم)

مفسر: محسن علی نجفی

کمپوزنگ و فارمٹنگ: خادم حسین

انتظامی امور: علی حیدری

تعداد: ایک ہزار

باراول: ذی القعدہ ۱۴۳۴ھ / ستمبر ۲۰۱۳

مطبع: شوکت پریس۔ لاہور

پیشکش: جامعۃ الکوثر۔ اسلام آباد

ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور

فون: 0321 448 1214

ای میل: info@misbahulqurantrust.com

ویب: www.misbahulaqurantrust.com

اس کتاب میں نقل شدہ اکثر روایات کے متن اور حوالوں کی اصلاح و تطبیق، کتب احادیث پر مبنی سافٹ ویئر ''جامع الاحادیث'' تیار کردہ کمپیوٹر ریسرچ سینٹر آف اسلامک سائنسز اور المحدث سے کی گئی ہے۔

نہج البلاغۃ کے اکثر اقتباسات کا ترجمہ نہج البلاغۃ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ مطبوعہ امامیہ کتب خانہ لاہور سے نقل کیا گیا ہے۔

تشریح کلمات مفردات القرآن راغب اصفہانی، ترجمہ مولانا محمد عبدہ فیروز پوری سے ماخوذ ہے۔

ملنے کا پتہ: محمد علی بک ایجنسی۔ کراچی کمپنی۔ اسلام آباد

معراج کمپنی۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

قارئین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! مصباح القرآن ٹرسٹ عہد حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ایک عظیم اور پُر وقار مرکز کی حیثیت سے امت مسلمہ کے لیے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ ادارہ ہذا کی یہ شہرت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

خالقِ کائنات نے ''انسان'' کو روح و بدن سے مرکب، عقلِ سلیم اور قوتِ گویائی کی نعمات سے مالا مال فرما کر موجوداتِ عالم میں منفرد و ممتاز مقام عطا فرمایا ہے۔ جس طرح بدن کو اپنے ہی اعضا کی تقویت و ارتقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی بلندی اور تازگی کے لیے زہد و تقویٰ سے ملبوس ہو کر علمی تفکر کے میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ روحانی تسکین اور معرفت کی بلندیوں سے فیض یاب ہونے کے لیے آیاتِ قرآن پر غور و فکر کرنا، اس کے رموز و حقائق کو سمجھنا اور فرمودات الٰہی پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی گزارنا آخرت کی کامیابی کا باعث ہے۔

بلاشبہ قرآنِ مجید دین اسلام کا حقیقی آئین و دستور ہے۔ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے اسی قدر اس میں مزید تازگی آ جاتی ہے؟ جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔''

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے دنیا کے ہر شخص کے لیے قرآنی آیات کے مفہوم اور تفاسیر کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر علمائے اسلام نے عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں قرآن مجید کی بہت سی تفاسیر اور تراجم مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے اہل تشیع و اہل

سنت علماء نے بھی اردو زبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم وتفاسیر پیش کیے ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان میں طبع شدہ اکثر تراجم وتفاسیر انڈیا (لکھنؤ) کے مترجمین ومفسرین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔لکھنؤ کی اُردو پاکستان کی موجودہ اردو سے ذرا مختلف ہے۔

چونکہ دنیا کا ہر شخص دوسری زبانوں کے علاوہ اپنی قومی زبان بلکہ اپنے خطے کی زبان سے زیادہ مانوس ہوتا ہے لہٰذا خطے کی موجودہ اردو زبان کے پیش نظر اور قرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات اور جدید معاندانہ تحریروں اورالزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا موقف بیان کرنے کے لیے ۱۰ جلدوں پر مشتمل زیرنظر تفسیر قرآن ''الکوثر فی تفسیر القرآن'' کی جلد پنجم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ محسن علی نجفی مدظلہ العالی کی غیر معمولی مساعی اور شبانہ روز محنت کا ثمر ہے۔ خداوندعالم اُن کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اورانہیں طاقت وصحت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ قبلہ موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ادارہ ہذا کو یہ تفسیری مجموعہ پرنٹ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ:

www.misbahulqurantrust.com

کے ذریعے گھر بیٹھے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق مصباح القرآن ٹرسٹ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے اور ادارے کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور۔

پاکستان

سُوْرَۃُ الْکَھْفِ

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھف غار کو کہتے ہیں۔ اس سورۃ مبارکہ میں اصحاب کھف کا ذکر ہے۔ اس لیے اس کا نام سورۃ الکھف ہو گیا۔

سبب نزول

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

کفار قریش نے تین افراد نضر بن حارث، عقبہ بن ابی معیط اور عاص بن وائل کو نجران کے نصاریٰ کے پاس بھیجا تا کہ ان سے کچھ مسائل سیکھ لیں اور رسول اکرم ﷺ کا امتحان کریں۔ ان لوگوں نے یہود کے علماء سے ملاقات کی اور اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ یہودیوں نے کہا: تین مسائل ان سے پوچھ لیں اگر جیسے ہم نے بتایا جواب دیں تو یہ سچے رسول ہیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال کریں اگر جواب میں کہہ دیں کہ اس مسئلے کو میں جانتا ہوں تو سمجھ لینا یہ جھوٹے ہیں....

اس روایت کی تفصیل آیت نمبر۹ کے ذیل میں آنے والی ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں تین اہم واقعات کا ذکر ہے:

i۔ اصحاب کے طویل خواب کا واقعہ

ii۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رموزِ نظام الٰہی سے آگاہی کا واقعہ

iii۔ ذوالقرنین کی عالم گیری کا واقعہ

ان واقعات سے ناخواندہ عرب بے خبر تھے۔ اس لیے ان کے درمیان میں زندگی کرنے والی ایک ہستی کی طرف سے ان واقعات کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرنے میں رسول اکرم ﷺ کی نبوت کا ثبوت موجود ہے اور قرآن کا وحی ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ یعنی جو سوالات انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے جھوٹا ہونے کے ثبوت کے لیے اٹھائے تھے انہی سوالات سے آپ ﷺ کی رسالت کی صداقت ثابت ہو جاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنام خدائے رحمن رحیم

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ۜ﴿۱﴾

۱۔ ثنائے کامل اس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کسی قسم کی کجی نہیں رکھی۔

قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾

۲۔ نہایت مستحکم ہے تاکہ اس کی طرف سے آنے والے شدید عذاب سے خبردار کرے اور ان مومنین کو بشارت دے جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لیے بہتر اجر ہے۔

مَّاکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا ۙ﴿۳﴾

۳۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ: حمد و ستائش ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندوں پر کتاب نازل فرمائی اللہ تعالیٰ کو عالمین کا پروردگار ہونے کی بنیاد پر لائق حمد وثنا قرار دیتے ہیں:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ[1] — ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

اور کبھی خالق ارض و سماء ہونے کے اعتبار سے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ[2] — ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔

---

[1] ۱فاتحہ: ۲ [2] ۶انعام: ۱

نیز فرمایا:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ... ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا ایجاد کرنے والا ہے....

اس جگہ قرآن نازل کرنے کے اعتبار سے حمد وثنا کا لائق قرار دیا جا رہا ہے۔ گویا نزول قرآن ایک نئی کائنات کی تخلیق اور جدید عالمین کی ایجاد ہے۔

۲۔ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا: اس میں کسی قسم کی کجی نہیں ہے۔ قیامت تک کے انسانوں کے لیے ایک قابل عمل ابدی دستور حیات ہے۔ یہ کسی زمانے کے لوگوں کے لیے ناقابل عمل ہونا تو دور کی بات ہے اس میں کسی قسم کی نامناسب شق بھی نہیں ہے۔

اس دستور حیات کی ہر شق قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے ابدی سعادت پر مشتمل، ناقابل تنسیخ اور پائیدار ہے جو کسی زمان و مکان کے وقتی تقاضوں سے متزلزل نہ ہو گی۔

ا۔ لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا: یہ کتاب تنبیہ اور بشارت جیسے اہم مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب ہدایت کو مسترد کرنے والوں کے لیے شدید عذاب کی تنبیہ ہے اور اس ہدایت کو قبول کرنے والوں کے لیے اجر حسن ہے جو دائمی ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن ایک دستور قیم ہے۔ زمان و مکان اسے متاثر نہیں کر سکتے۔

۲۔ قرآن کا نزول ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس کی بنا پر اللہ کی حمد و ستائش ضروری ہے۔

وَّ یُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ﴿۴﴾

۴۔ اور انہیں تنبیہ کرے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنا لیا ہے۔

مَا لَہُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِہِمۡ ؕ کَبُرَتۡ کَلِمَۃً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاہِہِمۡ ؕ اِنۡ یَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا کَذِبًا ﴿۵﴾

۵۔ اس بات کا علم نہ انہیں ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو، یہ بڑی (جسارت کی) بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، یہ تو محض جھوٹ بولتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ تعالیٰ کو جسم و جسمانی قرار دینا اور اللہ کے لیے وہی چیزیں ثابت کرنا جو جسم و جسمانی ہونے

کی صورت میں حاصل ہو سکتی ہیں، شان الٰہی میں گستاخی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی گرفت بھی سخت ہوتی ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے جب یہ مطالبہ کیا کہ ہمیں اللہ علانیہ طور پر دکھا دو تو ان پر بجلی گری۔

۲۔ اس آیت میں خاص طور پر ذکر کیا کہ جو لوگ اللہ کی اولاد ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی خصوصی طور پر تنبیہ ہوگی کیونکہ یہ کہنا کہ اللہ کے لیے اولاد ہے، اسے اللہ نے ''بڑی جسارت'' سے تعبیر فرمایا ہے: كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ....

دوسری جگہ فرمایا:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۞ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ۞ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۞ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۞ ¹

اور وہ کہتے ہیں: رحمٰن نے کسی کو فرزند بنا لیا ہے۔ بتحقیق تم بہت سخت بیہودہ بات (زبان پر) لائے ہو۔ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں۔ اس بات پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے فرزند (کی موجودگی) کا الزام لگایا ہے۔

اہم نکات

۱۔ خالق کو اپنی مخلوق کی سطح پر لانا شان الٰہی میں سب سے بڑی گستاخی اور جرم ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۞

۶۔ پس اگر یہ لوگ اس (قرآنی) مضمون پر ایمان نہ لائے تو ان کی وجہ سے شاید آپ اس رنج میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

تشریح کلمات

بَاخِعٌ: (ب خ ع) البخع کے معنی غم سے اپنی تئیں ہلاک کر دینے کے ہیں۔ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ: بعد ولیھم واعراضھم۔ ان کے منہ پھیرنے اور انکار کرنے کے بعد۔ علی اثرہ کے معنی ہیں: من بعدہ۔

تفسیر آیات

لوگوں کے عدم ایمان اور اللہ کے پیغام حق کو پزیرائی نہ ملنے پر جو رنج و غم رسول اللہ ﷺ کو درپیش ہوتا تھا اس رنج و غم کی سنگینی کا اندازہ اس آیت سے ہوتا ہے کہ رب العالمین کو یہ کہنا پڑا کہ آپؐ اس حد تک

---

¹ ۱۹ مریم۔ ۸۸ تا ۹۱

ان کے عدم ایمان کی وجہ سے غم و اندوہ میں اپنے آپ کو مبتلا نہ کریں کہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَيۡهِمۡ حَسَرٰتٍ ... [1] ان لوگوں پر افسوس میں آپ کی جان نہ چلی جائے...

اہم نکات

۱۔ پیغام الٰہی کو عام کرنے کے لیے قلب رسول بے تاب رہتا تھا۔

۲۔ اللہ نے اپنے حبیب کی بے تابی کو دیکھ کر مہر و محبت کا اظہار فرمایا۔

اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ۝۷ وَ اِنَّا لَجٰعِلُوۡنَ مَا عَلَيۡهَا صَعِيۡدًا جُرُزًا ۝۸

۷۔ روئے زمین پر جو کچھ موجود ہے اسے ہم نے زمین کے لیے زینت بنایا تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سب سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے۔

۸۔ اور اس پر جو کچھ ہے اسے ہم (کبھی) بنجر زمین بنانے والے ہیں۔

تشریح کلمات

جُرُزًا: (ج ر ز) وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہوتا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ جو کچھ روئے زمین پر موجود ہے وہ سب اس زندگی کو پر رونق بنانے کے لیے ہے اور اس زندگی کی دل فریبیاں صرف تمہاری آزمائش کے لیے ہیں کہ کیا تم ان پر فریفتہ ہو کر مقصد کو بھول جاتے ہو یا نہیں؟

۲۔ سطح زمین پر موجود عارضی زیب و زینت ایک وقت ختم ہونے سے یہ زمین ایک چٹیل میدان میں بدل جائے گی اور اس وقت پتہ چلے گا کہ زمین کی زندگی میں عیش و عشرت محض ایک آزمائش تھی۔

عبد اللہ بن مسعود کی اس آیت کے ذیل میں روایت ہے:

زینة الارض الرجال و زینة الرجال علی بن ابی طالب (ع) [2] زمین کی زینت مردوں سے ہے اور مردوں کی زینت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔

حضرت عمار یاسر راوی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو علی علیہ السلام کے بارے میں یہ فرماتے سنا:

---

[1] ۳۵ فاطر: ۸ [2] شواھد التنزیل ذیل آیت

يا علی ان اللّٰہ زينك بزينة لم يزين العباد باحسن منها، بغض اليك الدنيا وزهدك فيها وحبب اليك الفقراء فرضيت بهم اتباعا و رضوا بك اماما۔[1]	اے علی! اللہ نے آپ کو ایسی زینت سے مزین کیا جس سے بہتر بندوں میں سے کسی کو مزین نہیں کیا، دنیا کو آپ کے لیے ناپسند کر دیا اور دنیا میں آپ کو بے رغبت بنا دیا غریبوں کو پسندیدہ کر دیا تو آپ نے بھی غریبوں کو اپنے پیروکار کے لیے پسند کیا اور غریبوں نے آپ کو امام پسند کیا۔

اہم نکات

۱۔ روئے زمین پر نعمت کی فراوانی بندوں کے لیے آزمائش ہے۔

۲۔ جس کی نظر میں کل کی ویرانی ہو تو آج کی فراوانی اسے دھوکہ نہیں دے سکتی۔

اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡکَہۡفِ وَ الرَّقِیۡمِ ۙ کَانُوۡا مِنۡ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ﴿۹﴾	۹۔ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار اور کتبے والے ہماری قابل تعجب نشانیوں میں سے تھے؟

تشریح کلمات

الۡکَہۡفِ : (ك ه ف) بڑے غار کو کہتے ہیں جو پہاڑ میں ہوتے ہیں۔ اس کی جمع کھوف آتی ہے۔ اگر یہ چھوٹا ہو تو اسے غار کہتے ہیں۔

الرَّقِیۡمِ : (ر ق م) بمعنی مرقوم۔ مکتوب، الرقم کے معنی گاڑھے خط کے ہیں۔ بعض کے نزدیک رقیم ایک مقام کا نام ہے۔ بعض دیگر کے نزدیک اس لوح کا نام ہے جس پر اصحاب کہف کے نام ونسب اور مختصر واقعہ درج تھا۔

تفسیر آیات

استفہام انکاری ہے: کیا اصحاب کہف کا صدیوں تک سلانا اور بیدار کرنا اللہ کی نشانیوں میں قابل تعجب نشانی ہے؟ اصحاب کہف اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ضرور ہیں مگر آفاق و انفس میں موجود اللہ تعالیٰ کی بڑی اور نہایت حیرت انگیز عظیم نشانیوں میں اس نشانی کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے کہ تعجب و حیرت ہو اور قدرت خدا سے بعید ہو۔ اس قادر مطلق کے لیے چند افراد کو چند صدیوں تک سلا دینا اور پھر تندرست، صحت مند حالت میں انہیں بیدار کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اپنے خاص بندوں کو ایک مقصد کے تحت لمبی زندگی دینا اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے۔

---

[1] شواھد التنزیل ۱: ۴۵۴

۲۔ اللہ کی کائنات میں اصحاب کہف کے واقعات سے زیادہ تعجب خیز واقعات موجود ہیں۔

اِذۡ اَوَی الۡفِتۡیَۃُ اِلَی الۡکَہۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً وَّ ہَیِّیٔۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ﴿۱۰﴾

۱۰۔ جب ان جوانوں نے غار میں پناہ لی تو کہنے لگے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی بارگاہ سے رحمت عنایت فرما اور ہمیں ہمارے اقدام میں کامیابی عطا فرما۔

تشریح کلمات

اَوَی: (ا و ی) اس کا مصدر الماوی ہے۔ کسی جگہ پر نزول کرنا یا پناہ حاصل کرنا۔

الۡفِتۡیَۃُ: (ف ت ی) الفتی کی جمع ہے جس کے معنی جوان کے ہیں۔ بطور کنایہ غلام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

اصحاب کہف کا واقعہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابو بصیر اس طرح روایت کرتے ہیں:

سورہ کہف کا شان نزول یہ ہے کہ قریش نے تین افراد نضر بن حارث بن کلدۃ اور عقبہ بن ابی معط اور عاص بن وائل کو نجران روانہ کیا تاکہ یہودیوں سے چند مسائل سیکھ آئیں اور ان مسائل کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا جائے۔ وہ نجران کے علماء و یہود سے ملے انہوں نے کہا:

محمد سے تین مسائل پوچھو اگر اس نے جو ہمارے علم میں ہے اس کے مطابق جواب دیا تو وہ سچا ہے اس کے بعد ایک اور مسئلہ پوچھو اگر اس کے علم کا دعویٰ کیا تو وہ جھوٹا ہے۔

کہا: وہ مسائل کیا ہیں؟

کہا: ان سے پوچھو قدیم زمانے میں چند جوان افراد بھاگے اور غائب ہو گئے اور سو گئے۔ وہ کتنی دیر سوئے؟ ان کی تعداد کیا تھی؟ ان کے ساتھ ان کے علاوہ کیا تھا؟ اور ان کا قصہ کیا تھا؟ اور موسیٰ کے بارے میں پوچھو کہ جس عالم کی پیروی اور ان سے علم حاصل کرنے کا اللہ نے حکم دیا تھا وہ عالم کون تھا؟ اس کی کیسے پیروی کی اور اس کا قصہ کیا تھا؟ پھر ان واقعات کو لکھوایا اور کہا جیسے ہم نے لکھوایا ہے اسی طرح جواب دیا تو وہ سچا ہے ورنہ جھوٹا ہے۔

کہا: تیسرا مسئلہ کیا ہے؟

کہا: اس سے قیامت کے بارے میں سوال کرو اگر اس نے اس بارے میں علم کا دعویٰ

کیا تو وہ کاذب ہے چونکہ قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔

وہ مکہ لوٹے حضرت ابو طالب کے پاس آئے اور کہا:

آپ کا بھتیجا یہ گمان کرتا ہے کہ میرے پاس آسمان کی خبریں آتی ہیں۔ ہم چند مسائل پوچھنے والے ہیں۔ اگر صحیح جواب دیا تو پتہ چلے گا وہ سچا ہے ورنہ وہ کاذب ہے۔

حضرت ابو طالب نے فرمایا: جو جی میں آئے پوچھ لو۔ چنانچہ ان لوگوں نے ان تین مسائل کے بارے میں پوچھا تو حضورؐ نے فرمایا: میں کل اس کا جواب دوں گا اور انشاء اللہ نہیں کہا۔ چالیس دن تک وحی نازل نہ ہوئی جس پر حضور غمگین ہوئے کچھ اہل ایمان شک کا شکار ہوئے۔ قریش والوں نے تمسخر کرنا شروع کیا اور حضرت ابو طالب غمگین ہوئے۔ چالیس روز کے بعد سورہ کہف نازل ہوا....

مروی ہے کہ پھر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اصحاب کہف و رقیم ایک جابر بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ وہ اپنے عوام کو بت پرستی کی دعوت دیتا، انکار کرنے والے کو قتل کرتا تھا۔ یہ لوگ مؤمن تھے۔ صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے شہر کے دروازے پر پہرہ بٹھایا تھا کہ وہاں سے بتوں کو سجدہ کیے بغیر نکلنے نہیں دیتے تھے مگر یہ لوگ شکار کے بہانے نکلے، راستے میں ایک چرواہے سے ملے۔ اس نے ساتھ نہ دیا مگر اس کے کتے نے ان کا ساتھ دیا۔ وہ بھاگتے ہوئے غار تک پہنچ گئے اور کتا ان کے ساتھ تھا۔ غار میں ان پر طویل خواب مسلط کیا گیا۔ بادشاہ اور شہر والے سب ختم ہوگئے۔ زمانہ اور لوگ بدل گئے تو وہ بیدار ہوئے۔ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے ہم کتنی مدت سوئے ہوں گے؟ دیکھا سورج چڑھ گیا ہے لہٰذا دن کا ایک حصہ یا ایک دن سوئے ہوں گے۔ اپنے میں سے ایک فرد کو ایک سکہ دے کر شہر کی طرف کھانے کے لیے بھیجا اور کہا: خبردار کوئی تجھے پہچاننے نہ پائے۔ اگر ان لوگوں نے پہچان لیا تو یا تو ہمیں قتل کریں گے یا ان کا دین اختیار کرنے پر مجبور کریں گے۔ وہ شہر پہنچا تو دیکھا ہر چیز بدلی ہوئی ہے۔ حتیٰ زبان کے سمجھنے میں دقت پیش آئی۔ لوگوں نے کہا: تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟ اس نے اپنے سارے حالات بتا دیے تو بادشاہ اپنے اعوان کے ساتھ نکلا اور غار کے دہانے تک پہنچ گیا....[1]

فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً: اپنے دین کو بچانے کے لیے ہجرت اختیار کرنے کے بعد اس

---

[1] المیزان ذیل آیہ۔ پھر روایت کے الفاظ قرآنی تعبیرات سے متصادم ہیں کہ بادشاہ اور اس کے اعوان نے اصحاب کہف کی تعداد میں اختلاف کیا الی آخر روایت۔ اس وجہ سے ہم نے پوری روایت نقل نہیں کی ممکن ہے یہ اشتباہ راوی کی طرف سے سرزد ہوا ہو۔

دعا کے لیے محل ہے کہ وہ اس ہجرت کے بعد دو باتوں کے اہل بن گئے: ایک اللہ کی رحمت، دوسری بات اس اقدام کی کامیابی کے: وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا۔

اہم نکات

۱۔ بلاد شرک سے ہجرت کرنا موحدین کی سیرت ہے۔

۲۔ راہ خدا میں عملی اقدام کے بعد دعا کی جاتی ہے: وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا۔

فَضَرَبۡنَا عَلٰۤی اٰذَانِهِمۡ فِی الۡکَهۡفِ سِنِیۡنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾

۱۱۔ پھر کئی سالوں تک غار میں ہم نے ان کے کانوں پر (نیند کا) پردہ ڈال دیا۔

تفسیر آیات

آواز کی بنیاد پر نیند کا وجود معلوم کیا جاتا ہے۔ فقہ جعفری میں وضو کے ٹوٹنے کے اسباب میں سے ایک سبب نیند ہے اور نیند کا وجود اس وقت ثابت ہوتا ہے جب دماغ آوازوں کے ارتعاش کا ادراک نہ کرے۔

لہٰذا قرآن کی یہ تعبیر بہت شیرین ہے کہ ہم نے انہیں سلا دیا کہنے کی جگہ فرمایا: ہم نے ان کے کانوں پر پردے ڈال دیے۔

اہم نکات

۱۔ جو دنیا کی آلائشوں سے فرار ہوتا ہے وہ گہری اور پرسکون نیند سوتا ہے۔

ثُمَّ بَعَثۡنٰهُمۡ لِنَعۡلَمَ اَیُّ الۡحِزۡبَیۡنِ اَحۡصٰی لِمَا لَبِثُوۡۤا اَمَدًا ﴿۱۲﴾

۱۲۔ پھر ہم نے انہیں اٹھایا تا کہ ہم دیکھ لیں کہ ان دو جماعتوں میں سے کون ان کی مدت قیام کا بہتر شمار کرتی ہے۔

تشریح کلمات

الامد: (ا م د) اور الابد کے قریب المعنی ہیں لیکن الابد غیر محدود زمانے کے لیے ہے اور الامد محدود زمانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

البعث: (ب ع ث) کسی کے ابھارنے اور کسی طرف بھیجنے کے معنوں میں ہے یہ لفظ مردوں، زندہ کرنے اور سونے والوں کی طرف منسوب ہو تو بیدار کرنے کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ طویل مدت کے بعد بیدار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کو اپنے طویل خواب کا علم ہو جائے۔ چنانچہ بیداری کے بعد ان میں اختلاف ہوا کہ ہم کتنی مدت سوئے ہیں۔ بعض نے کہا:

لَبِثۡنَا یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ ...[۱]　ایک روز یا روز کا ایک حصہ (ہم وہاں) ٹھہرے ہیں،

دوسرے بعض نے کہا:

رَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثۡتُمۡ ...[۲]　تمہارا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی مدت رہے ہو۔

اس تعبیر سے معلوم ہوا کہ مدت خواب ان کے لیے ایک معمہ ضرور تھا۔ جو بعد میں حل ہو گیا کہ ہم ایک دن نہیں کئی سو سال سوئے ہیں۔

۲۔ اَیُّ الۡحِزۡبَیۡنِ: دو جماعتوں سے مراد ممکن ہے خود اصحاب کہف میں خواب کی مدت کے بارے میں دو موقف بن گئے ہوں۔ چنانچہ آنے والی آیت میں فرمایا:

بَعَثۡنٰہُمۡ لِیَتَسَآءَلُوۡا بَیۡنَہُمۡ ...[۳]　اسی انداز سے ہم نے انہیں بیدار کیا تاکہ یہ آپس میں پوچھ گچھ کر لیں....

آپس کے اس سوال و جواب سے وہ راز منکشف ہو جائے جو اللہ چاہتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنے خاص بندوں کو دنیا سے اٹھنے سے پہلے ان کا مقام بتلا دیتا ہے۔

۱۹

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ نَبَاَہُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّہُمۡ فِتۡیَۃٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّہِمۡ وَ زِدۡنٰہُمۡ ہُدًی ﴿۱۳﴾

۱۳۔ ہم آپ کو ان کا حقیقی واقعہ سناتے ہیں، وہ کئی جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے انہیں مزید ہدایت دی۔

وَّ رَبَطۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اِذۡ قَامُوۡا فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَنۡ نَّدۡعُوَا۠ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلٰـہًا لَّقَدۡ قُلۡنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور جب وہ اٹھ کھڑے ہوئے تو ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا پس انہوں نے کہا: ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو ہرگز نہیں پکاریں گے، (اگر ہم ایسا کریں) تو ہماری یہ بالکل نامعقول بات ہوگی۔

---

[۱] ۲۳ مومنون: ۱۱۳　[۲] ۱۸ کہف: ۱۹　[۳] ۱۸ کہف: ۱۹

تشریح کلمات

شطط: حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اصحاب کہف کا قصہ بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّهُمۡ فِتۡیَةٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّهِمۡ .... یہ چند جواں سال افراد تھے جو ایمان باللہ سے سرشار تھے۔

۲۔ زِدۡنٰهُمۡ هُدًی: ان کا ایمان بتاتا ہے کہ وہ ہدایت کی ایک منزل پر پہلے سے فائز تھے۔ اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جب وہ ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ فرمایا۔ یعنی پہلی ہدایت دوسری ہدایت کے لیے زینہ بن گئی۔ اس طرح کار خیر، خیر کے لیے زینہ بن جاتا ہے۔

۳۔ وَّ رَبَطۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ اِذۡ قَامُوۡا: یہاں بھی ان کے قیام کے نتیجے میں اللہ نے ان کے دلوں کو مضبوط بنایا۔ یہ بات الٰہی سنت ہے کہ وہ خود پہل نہیں کرتا۔ پہل بندے کو کرنا ہوتی ہے۔ جب بندہ پہل کرتا ہے تو اللہ توفیقات اور عنایتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اصحاب کہف نے قیام کیا تو اللہ نے ان کو دلیر بنا دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے ان کو دلیر بنایا تو انہوں نے قیام کیا۔

روایات کے مطابق یہ شاہی درباری تھے۔ عیش و آرام کی زندگی میں تھے۔ اس پر تعیش زندگی کو اور گھر والوں کو چھوڑتے ہوئے انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہمارے مستقبل کا کیا بنے گا۔ ایسے فیصلوں کے لیے بڑی شجاعت اور دلیری درکار ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ عمل خیر، خیر کے لیے زینہ بن جاتا ہے۔

۲۔ خیر و سعادت کے لیے بندے کو پہل کرنا ہوتی ہے۔

هٰۤؤُلَآءِ قَوۡمُنَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوۡلَا یَاۡتُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ بِسُلۡطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا ﴿۱۵﴾

۱۵۔ ہماری اس قوم نے تو اللہ کے سوا اوروں کو معبود بنایا ہے، یہ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ پس اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے والوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے؟

تشریح کلمات

بِسُلۡطٰنٍ: (س ل ط) عام طور پر صاحب سلطنت کو سلطان کہا جاتا ہے اور حجت و دلیل کو بھی سلطان

کہا گیا ہے کیونکہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے اور جس کے پاس دلیل ہوتی ہے اسے بالادستی حاصل ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

اصحاب کہف کا ایمان، دلیل و برہان کی مضبوط بنیادوں پر استوار تھا۔ وہ اس کلیہ کو درک کر چکے تھے کہ بلا دلیل ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ وہ اپنی قوم کے مذہب سے اس لیے بیزار تھے کہ ان کا مذہب کسی دلیل پر استوار نہیں تھا۔ وہ بے دلیل مذہب کو ایک بے بنیاد بہتان سے زیادہ حیثیت دینے کے لیے حاضر نہ تھے۔

اہم نکات

۱۔ مذہب کے بنیادی عقائد محکم دلیل پر قائم ہونے چاہئیں۔

۲۔ جس مذہب کی بنیاد دلیل پر استوار نہیں وہ بے بنیاد بہتان ہے۔

وَاِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَمَا یَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاۡوٗۤا اِلَی الۡکَهۡفِ یَنۡشُرۡ لَکُمۡ رَبُّکُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَ یُهَیِّئۡ لَکُمۡ مِّنۡ اَمۡرِکُمۡ مِّرۡفَقًا ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور جب تم نے مشرکین اور اللہ کے سوا ان کے معبودوں سے کنارہ کشی اختیار کی ہے تو غار میں چل کر پناہ لو، تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے معاملات میں تمہارے لیے آسانی فراہم کرے گا۔

تشریح کلمات

الاعتزال: (ع ز ل) کے معنی ہیں کسی چیز سے کنارہ کش ہو جانا۔

مِّرۡفَقًا: (ر ف ق) نرمی و آسائش۔

تفسیر آیات

ان لوگوں نے صرف شرک کو نہیں مشرکین کو بھی چھوڑ دیا۔ مشرک معاشرے میں رہنے کو پسند نہیں کیا۔ اس راہ میں چونکہ انہوں نے اپنی عیش و آرام کی زندگی چھوڑ دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے آرام و راحت سلب نہیں فرمایا۔ اپنی رحمتوں کے سائے میں جگہ دی اور صدیوں کی مدت تک آرام و راحت کی نیند سلا دیا۔ نیند سے زیادہ آرام و سکون کسی چیز میں نہیں ہے کیونکہ نیند میں انسان تمام افکار سے بے نیاز ہو کر امن و سکون کی بہترین حالت میں چلا جاتا ہے۔

فَأْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ: عزم و ارادہ اور امید و یقین دونوں مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں۔ غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ کی پناہ میں جانے کا عزم اور اللہ کی طرف سے رحمتوں کے نزول اور آسانی کی فراہمی کی امید اور یقین۔

اہم نکات

۱۔ دنیا کی آلائشوں سے کنارہ کش انسان کو امن و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔

۲۔ صرف شرک نہیں، شرک کے معاشرے سے بھی کنارہ کش ہونا چاہیے۔

۳۔ عزم و یقین یعنی مضبوط ارادہ اور نتیجہ پر یقین، کامیابی کے دو عناصر ہیں۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے داہنی طرف سمٹ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بائیں طرف کترا جاتا ہے اور وہ غار کی کشادہ جگہ میں ہیں، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے، جسے اللہ ہدایت کرے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لیے آپ سرپرست و رہنما نہ پائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ: چونکہ خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ بیرون غار سے دھوپ کی تابش کا منظر فرض کیا جا رہا ہے۔ اور غار اور دھوپ کی موقعیت بیان ہو رہی ہے لہٰذا ہم غار کے اندر سے غار کی دائیں اور بائیں جانب کا تعین کریں گے۔ اس طرح غار کا دہانہ شمال کی طرف بنتا ہے۔ اس صورت میں جب سورج طلوع ہوتا ہے تو دھوپ غار کی دائیں جانب پڑتی ہے اور غروب کے وقت غار کی بائیں جانب۔ اصحاب کہف غار میں وسیع جگہ پر دھوپ سے محفوظ تھے یا یہ مراد ہو کہ اصحاب کہف غار کے اندر کی طرف کشادہ جگہ پر تھے اور سورج کی دھوپ ان تک نہیں پہنچ پاتی تھی اگرچہ غار کا رخ جنوب کی طرف تھا۔

آیت میں ان دونوں باتوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ اگر غار میں داخل ہونے کے اعتبار سے دائیں اور بائیں کہا جا رہا ہے تو غار کا رخ شمال کی طرف ہوگا اور اگر غار سے خارج ہونے کے اعتبار سے ہے تو غار کا رخ جنوب کی طرف ہوگا۔

۲۔ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡ: اس واقعے اور دیگر اللہ کی نشانیوں سے، ہدایت کی اہلیت رکھنے والے ہدایت حاصل کرتے ہیں جب کہ ہدایت کی اہلیت نہ رکھنے والے ہدایت حاصل نہیں کرتے، خداوند عالم ہدایت کا سامان فراہم کرنے کے بعد ہدایت کی راہ میں نہ آنے والوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور جسے اللہ اپنے حال پر چھوڑ دے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ اٹھائے اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

۲۔ جسے اللہ ہدایت نہ دے اس کا کوئی رہنما نہ ہوگا۔

وَتَحۡسَبُہُمۡ اَیۡقَاظًا وَّہُمۡ رُقُوۡدٌ ٭ۖ وَّ نُقَلِّبُہُمۡ ذَاتَ الۡیَمِیۡنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ٭ۖ وَکَلۡبُہُمۡ بَاسِطٌ ذِرَاعَیۡہِ بِالۡوَصِیۡدِ ؕ لَوِ اطَّلَعۡتَ عَلَیۡہِمۡ لَوَلَّیۡتَ مِنۡہُمۡ فِرَارًا وَّلَمُلِئۡتَ مِنۡہُمۡ رُعۡبًا ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور آپ خیال کریں گے کہ یہ بیدار ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں اور ہم انہیں دائیں اور بائیں کروٹ بدلاتے رہتے ہیں اور ان کا کتا غار کے دھانے پر دونوں ٹانگیں پھیلائے ہوئے ہے اگر آپ انہیں جھانک کر دیکھیں تو ان سے ضرور الٹے پاؤں بھاگ نکلیں اور ان کی دہشت آپ کو گھیر لے۔

تشریح کلمات

الرقاد: (ر ق د) خوشگوار اور ہلکی نیند کو کہتے ہیں۔

الوصید: (و ص د) کے معنی آیت میں غار کا صحن یا دروازے کی چوکھٹ کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَتَحۡسَبُہُمۡ اَیۡقَاظًا: ممکن ہے کہ بار بار کروٹ بدلنے سے یہ گمان ہو جائے کہ وہ بیدار ہیں لیکن سونے والا بھی کروٹیں بدلتا ہے۔ اس سے بیداری ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے بعض مفسرین نے کہا ہے: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں کھلی تھیں، اس لیے دیکھنے والا انہیں بیدار خیال کرتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والے ان کی آنکھیں کھلی دیکھیں اور خیال کریں یہ لوگ بیدار ہیں۔ ساتھ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ وہ بیدار والوں کی حرکتیں نہیں کر رہے ہیں، اس صورت حال کو دیکھ کر ایک خوفناک تصور ذہن میں آئے گا اور وہاں سے بھاگنے میں انسان اپنی سلامتی تصور کرے گا۔

۲۔ نُقَلِّبُہُمۡ: ان کے جسموں کی حفاظت کے لیے کروٹ بدلانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے

کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہونے کے باوجود ذرائع و اسباب استعمال فرماتا ہے ورنہ کروٹ بدلائے بغیر وہ ان کے جسموں کی حفاظت فرما سکتا تھا۔

۳۔ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ: سے معلوم ہوا کہ اصحاب کہف کے ساتھ ان کا کتا بھی صدیوں کی نیند میں شامل رہا ہے۔ ان کے تحفظ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتے کو مامور فرمایا اور صدیوں تک کتے کو تحفظ مل گیا۔

۴۔ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ: ان کو دیکھ کر دہشت طاری ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ باہر سے دیکھنے والا جب چند آدمیوں کو غار میں کروٹ بدلتے ہوئے بیدار حالت میں دیکھے اور غار کے دہانے پر ایک کتے کو پنجہ پھیلائے ہوئے دیکھے تو یہ ایک غیر معمولی حالت معلوم ہوتی ہے اور دل پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ لَوِ اطَّلَعْتَ میں اگرچہ خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن مراد خود رسول اللہ کا فرار مقصود نہیں ہے بلکہ ہر دیکھنے والا مقصود ہے۔ بہت سے مقامات پر قرآن کا یہ طرز خطاب رہا ہے کہ ایک مطلب کو عام لوگوں کے لیے بیان کیا جاتا ہے لیکن خطاب اپنے رسول سے کیا جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اطاعت سے کتا بھی اللہ کے خاص بندوں کی معیت میں رہ سکتا ہے۔

۲۔ مردان حق کو تحفظ دینے سے خود کو تحفظ ملتا ہے خواہ وہ کتا ہی کیوں نہ ہو۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾

۱۹۔ اسی انداز سے ہم نے انہیں بیدار کیا تاکہ یہ آپس میں پوچھ گچھ کر لیں، چنانچہ ان میں سے ایک نے پوچھا: تم لوگ یہاں کتنی دیر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ایک دن یا اس سے بھی کم، انہوں نے کہا: تمہارا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی مدت رہے ہو پس تم اپنے میں سے ایک کو اپنے اس سکے کے ساتھ شہر بھیجو اور وہ دیکھے کہ کون سا کھانا سب سے ستھرا ہے پھر وہاں سے کچھ کھانا لے آئے اور اسے چاہیے کہ وہ ہوشیاری سے جائے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔

تشریح کلمات

وَرِقِكُمْ: (و ر ق) الورق بکسر راء درہم کو کہتے ہیں اور الورق بفتح راء درخت کے پتے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

بَعَثۡنٰهُمۡ: ان کو بیدار کیا تا کہ ان کے لیے یہ سوال پیدا ہو جائے لِیَتَسَآءَلُوۡا کہ وہ کتنی دیر سوئے ہیں۔ اس سوال کے پیدا ہونے کی وجہ سے وہ اللہ کی ان عنایتوں سے واقف ہو جائیں گے جو صدیوں کے آرام و راحت کے خواب کی صورت میں ان کے شامل حال رہی ہیں۔

وہ کفر کی طاقت سے مایوس ہو کر بھاگ گئے تھے اور دل میں یہ حسرت لیے گھر بار چھوڑ دیا تھا کہ وہ دن کب آئے گا کہ باطل مٹ جائے، بت پرستی ختم ہو جائے اور توحید پرستی عام ہو جائے۔ اللہ نے ان کو اتنی مدت سلا دیا کہ وہ دن دیکھ پائیں کہ باطل مٹ چکا ہے اور حق کا بول بالا ہے۔

بادی الرای میں ان کو خواب کی مدت مختصر اور معمول کے مطابق معلوم ہو رہی تھی چونکہ کہا جاتا ہے کہ وہ صبح وقت نماز سوئے تھے اور دن ڈھلے بیدار ہو گئے۔ اس لیے ان کو تردد ہو گیا کہ ہم کل صبح سوئے تھے تو آج۔ قَالُوۡا لَبِثۡنَا یَوۡمًا: اگر آج صبح سوئے تھے تو دن کا ایک حصہ ہو جاتا ہے اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ۔ یہ تو تھی بحث کی ابتدا اور بحث کا اختتام اس بات پر ہوا کہ رَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثۡتُمۡ رب بہتر جانتا ہے کہ ہم کتنی مدت سوئے ہیں۔ آیت کے اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدت خواب ان کے لیے معمہ بن گئی تھی جو بعد میں حل ہو گیا۔

فَابۡعَثُوۡۤا اَحَدَکُمۡ بِوَرِقِکُمۡ: جب ان میں سے ایک شخص کھانا خریدنے کے لیے شہر گیا تو دیکھا دنیا بدل چکی ہے۔ اب روم میں بت پرستی کا کوئی نشان نہیں ہے۔ سب عیسائی مذہب اختیار کر چکے ہیں۔ رہن سہن کے تمام طریقوں میں نمایاں تبدیلی آ گئی ہے۔ جب اس نے کھانا خریدنے کے لیے قیصر دقیانوس کے زمانے کا سکہ پیش کیا۔ روایت کے مطابق نان فروش کو شبہ ہوا کہ پرانے زمانے کا دفینہ اس کے ہاتھ لگا ہے۔ اس نے اسے حکام کے سامنے پیش کیا جس کے بعد راز کھلا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دقیانوس کے زمانے میں اپنے مذہب کو بچانے کے لیے بھاگے تھے۔[1]

فَلۡیَنۡظُرۡ اَیُّهَاۤ اَزۡکٰی طَعَامًا: ان کے خیال میں مشرک قوم بتوں کے نام اپنے جانور ذبح کرتی ہے۔ ان ناپاک چیزوں سے بچ کر پاکیزہ طعام ہی بازار سے خرید لائیں۔

احادیث

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

ان اصحاب الکہف اسرّوا الایمان و اظہروا الکفر فآجرھم اللہ مرتین.[2]	اصحاب کہف نے ایمان کو چھپایا اور کفر کا اظہار کیا تو اللہ نے انہیں دوبار اجر مرحمت فرمایا۔

---

[1] بحار الانوار ۱۴: ۴۲۳، باب قصہ اصحاب الکہف [2] تفسیر عیاشی ۲: ۳۲۱

اہم نکات

۱۔ تقیہ کے ذریعے تنگ نظر دشمن سے بچاؤ کرنا عین فراست مؤمن ہے۔

۲۔ اللہ اپنے خاص بندوں پر عنایت فرماتا ہے تو انہیں اس پر آگاہ فرماتا ہے: لِیَتَسَآءَلُوۡا ....

۳۔ کھانے کی چیزوں میں پاکیزگی کا لحاظ رکھنا اہل حق کا وطیرہ ہے: اَیُّہَاۤ اَزۡکٰی طَعَامًا ....

۴۔ حق پر قائم رہنے کے لیے جابروں سے بچنے کا سامان کرنا چاہیے: وَ لۡیَتَلَطَّفۡ ....

اِنَّہُمۡ اِنۡ یَّظۡہَرُوۡا عَلَیۡکُمۡ یَرۡجُمُوۡکُمۡ اَوۡ یُعِیۡدُوۡکُمۡ فِیۡ مِلَّتِہِمۡ وَ لَنۡ تُفۡلِحُوۡۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

۲۰۔ کیونکہ اگر وہ تم پر غالب آ گئے تو وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے یا اپنے مذہب میں پلٹائیں گے اور اگر ایسا ہوا تو تم ہرگز فلاح نہیں پاؤ گے۔

وَ کَذٰلِکَ اَعۡثَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ لِیَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَۃَ لَا رَیۡبَ فِیۡہَا ۚۛ اِذۡ یَتَنَازَعُوۡنَ بَیۡنَہُمۡ اَمۡرَہُمۡ فَقَالُوا ابۡنُوۡا عَلَیۡہِمۡ بُنۡیَانًا ؕ رَبُّہُمۡ اَعۡلَمُ بِہِمۡ ؕ قَالَ الَّذِیۡنَ غَلَبُوۡا عَلٰۤی اَمۡرِہِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیۡہِمۡ مَّسۡجِدًا ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور اس طرح ہم نے (لوگوں کو) ان سے باخبر کر دیا تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت (کے آنے) میں کوئی شبہ نہیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب لوگ ان کے بارے میں جھگڑ رہے تھے تو کچھ نے کہا: ان (کے غار) پر عمارت بنا دو، ان کا رب ہی ان کا حال بہتر جانتا ہے، جنہوں نے ان کے بارے میں غلبہ حاصل کیا وہ کہنے لگے: ہم ان کے غار پر ضرور ایک مسجد بناتے ہیں۔

تشریح کلمات

اَعۡثَرۡنَا: (ع ث ر) اعثر باخبر کر دیا۔ عثر کے معنی پھسل جانے اور گر پڑنے کے ہیں۔ مجازاً کسی بات پر مطلع ہو جانے کے بھی ہیں۔ اعثرہ علی کذا اس چیز سے باخبر کر دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ اسلامی و سریانی روایت کے مطابق اس زمانے میں قیامت کے موضوع پر گرما گرم بحث چل رہی تھی۔ مسیحی آخرت پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے مقابلے میں بت پرستی کی باقیات جو ابھی تک خاصی مؤثر تھیں، قیامت کی منکر تھیں۔ عین ان دنوں میں اصحاب کہف کی بیداری کا واقعہ پیش آیا جس سے حیات بعد الموت کے اثبات کے لیے ایک ناقابل تردید ثبوت مل گیا۔ جیسا کہ آیت کی ابتدا میں فرمایا: وَ کَذٰلِکَ اَعۡثَرۡنَا

عَلَيۡهِمۡ لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا ...۔

۲۔ اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ : یہ اس وقت کی بات ہے جب لوگ ان کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ اصحاب کہف کے بارے میں دو موقف وجود میں آئے تھے۔ ان میں نزاع تھا۔ ابن عباس کی روایت کے مطابق یہ نزاع اصحاب کہف کی موت کے بعد واقع ہوا تھا۔ نزاع کی نوعیت آیت کے اگلے جملے سے معلوم ہوتی ہے :

۳۔ فَقَالُوا ابۡنُوۡا عَلَيۡهِمۡ بُنۡيَانًا : ایک موقف یہ تھا کہ ان پر ایک دیوار بنا دو۔ بظاہر ان کا مطلب یہ تھا کہ غار کے دہانے پر ایک دیوار بنا دو اور غار کو بند کر دو۔ یہ لوگ خدا کے خاص بندے ہیں۔ انہیں ان کی خواب و بیداری سے کیا سروکار۔ کچھ ثابت ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے، وہ کس دین و مذہب کے پیروکار تھے؟ ان سب کے بارے میں ان کا رب ہی ان کا حال بہتر جانتا ہے: رَبُّهُمۡ اَعۡلَمُ بِهِمۡ ۔ ہم انہیں کسی امر پر دلیل قرار نہیں دیتے۔

۴۔ رَبُّهُمۡ اَعۡلَمُ بِهِمۡ کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ ہم ان کے بارے میں کوئی موقف نہیں بناتے۔ یہ بات ان لوگوں کے موقف کے ساتھ سازگار ہے جو حیات اخروی کے منکر تھے۔ اصحاب کے خواب و بیداری سے ان کے موقف میں کمزوری آ گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اصحاب کا واقعہ ایک زندہ حقیقت اور حیات بعد الموت پر ایک دلیل کے طور پر باقی نہ رہے۔ اس لیے وہ غار کو بند کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کے آثار باقی نہ رہیں۔

صالحین نصاریٰ یہ نہیں کہہ سکتے: ان کا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کس مرتبے کے ہیں۔ صالحین تو انہیں اور ان کے مرتبے کو جان چکے تھے۔ اسی لیے ان سے صالحین کے موقف کو تقویت ملی تھی۔

قَالَ الَّذِيۡنَ غَلَبُوۡا عَلٰۤى اَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِمۡ مَّسۡجِدًا : یہ ان لوگوں کا موقف ہو سکتا ہے جو حیات اخروی کے قائل تھے اور اصحاب کہف کے واقعے کو اللہ کی نشانی اور اپنے موقف کے حق میں دلیل سمجھتے تھے۔

نیز یہ تعبیر کہ ہم مسجد بنائیں گے شاہد ہے کہ یہ نصاریٰ کے صالحین کا موقف ہے کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں مسجد مسلمانوں کی عبادت گاہ کے لیے مختص ہے اور لفظ کو زیادہ تقدس حاصل ہے۔ قرآن دیگر ادیان کی عبادت گاہوں کو مسجد کے ساتھ تعبیر نہیں فرماتا۔ چنانچہ سورۃ الحج کی آیت ۴۰ میں فرمایا:

وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا..	اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے روکے نہ رکھتا تو راہبوں کی کوٹھریوں اور گرجوں اور عبادت گاہوں اور مساجد کو جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے منہدم کر دیا جاتا۔

اس آیت میں راہبوں کی عبادت گاہ کو صومعة، مسیحیوں کی عبادت گاہ بیع، یہود کی عبادت گاہ کو

صلوات اور مسلمانوں کی عبادت گاہ کو مساجد کہا ہے۔

تفہیم قرآن کا یہ موقف نہایت غیر منصفانہ ہے:

> یہاں قرآن مسجد بنانے والوں کی گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکان آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی، اسے انہوں نے ارتکاب شرک کے لیے خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا: چلو کچھ اور دلی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔

حالانکہ قرآنی تعبیر میں مسجد بنانے والوں کی گمراہی کی طرف نہ صرف کوئی اشارہ نہیں ہے بلکہ لہجہ کلام مویدانہ ہے۔ جو لوگ نزاع آخرت یا اصحاب کہف کے بارے میں نزاع میں غالب آ گئے وہ مسجد بنانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے اس وقت ان دونوں مسائل میں غالب آنے والے لوگ اہل ایمان تھے چونکہ اصحاب کہف کے واقعہ سے اہل ایمان کے موقف کو غلبہ حاصل ہوا تھا۔ اس زمانے میں بت پرستوں کے غلبہ کا کوئی امکان نہیں تھا۔

یہ کہنا غالب آنے والے سلطنت روم کے ارباب اقتدار تھے۔ صحیح ہے لیکن یہ تاویل کہ وہ لوگ پھر سے بت پرست ہو گئے تھے، صحیح نہیں ہے۔

چنانچہ اکثر مفسرین نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جو لوگ اصحاب کہف کے مذہب پر تھے وہ مسجد بنانا چاہتے تھے اور اس کی ایک روایت بھی تائید کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی و روح المعانی۔

رہا یہ سوال کہ احادیث رسول ﷺ میں نہایت شدت سے منع کیا گیا ہے کہ قبور انبیاء کو مساجد قرار نہ دو۔

مسلم کی روایت ہے:

الا وان من کان قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیاء ھم مساجد فانی انھاکم عن ذلک۔	آگاہ رہو تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے میں تمہیں اس عمل سے روکتا ہوں۔

پیغمبر اکرم ﷺ سے روایت ہے:

لَا تَتَّخِذُوا قَبْرِی قِبْلَۃً وَلَا مَسْجِداً فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ لَعَنَ الْیَھُودَ حِیْنَ اتَّخَذُوا قُبُورَ اَنْبِیَاءِ ھِمْ مَسَاجِدَ۔ [1]	میری قبر کو قبلہ اور مسجد نہ بنانا۔ اللہ تعالیٰ نے یہود پر اس لیے لعنت بھیجی کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنایا تھا۔

ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ خود قبر کو ہی مسجد یا قبلہ نہ بنایا جائے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی

----

[1] الفقیہ ۱: ۱۷۸

نے بیان کیا: و اتخاذ القبر مسجداً معناه الصلوة علیه او الیه. آیت سے جس مسجد کا ذکر ملتا ہے، وہ یہ نہیں کہ اصحاب کہف کے غار کو مسجد بنایا ہے بلکہ اس غار کے پاس مسجد بنائی یا کسی نبی کی قبر کے پاس مسجد بنائی جائے تو یہ ممنوع کے مصداق میں نہیں آتا۔

اہم نکات

۱۔ اصحاب کہف کے واقعے کی روح، حیات اخروی کی سچائی ہے۔

۲۔ صالح بندوں کی قبروں کے جوار میں مسجد بنائی جا سکتی ہے۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ ۟ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

۲۲۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین ہیں، چوتھا ان کا کتا ہے اور کچھ کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے، یہ سب دیکھے بغیر اندازے لگا رہے ہیں اور کچھ کہیں گے: وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے، کہد یجیے: میرا رب ان کی تعداد کو بہتر جانتا ہے ان کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہیں لہٰذا آپ ان کے بارے میں سطحی گفتگو کے علاوہ کوئی بحث نہ کریں اور نہ ہی ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے کچھ دریافت کریں۔

تشریح کلمات

مِرَآءً: (م ر ی) المریة کسی معاملہ میں تردد کرنے کے معنوں میں ہے۔ یہ لفظ اصل میں مریت الناقة سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اونٹنی کے تھنوں کو سہلانا تا کہ دودھ دے۔

تَسْتَفْتِ: (ف ت ی) استفتاء کے معنی فتوی طلب کرنے کے ہیں۔ افتونی مشورہ دو۔ فاستفتهم ان سے پوچھو۔

تفسیر آیات

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں مسیحیوں میں اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں اختلاف تھا اور تین اقوال گردش میں تھے۔ پہلا قول یہ کہ اصحاب کہف کی تعداد تین ہے، چوتھا ان کا کتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی تعداد پانچ ہے، چھٹا ان کا کتا ہے۔ ان دونوں اقوال کو قرآن نے یہ کہہ کر مسترد کیا

کہ یہ رَجۡمًۢا بِالۡغَیۡبِ ہے۔ غیب کی باتوں میں بے تکی ہانکتے ہیں۔ تیسرا قول یہ کہ ان کی تعداد سات اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تیسرے قول کے درست ہونے پر اس آیت میں متعدد اشارے موجود ہیں۔ پہلا اشارہ یہ کہ اس قول کے بعد رَجۡمًۢا بِالۡغَیۡبِ کی طرح تردید نہیں آئی دوسرا اشارہ یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے قول میں رَّابِعُہُمۡ اور سَادِسُہُمۡ سے پہلے واؤ نہیں ہے جب کہ تیسرے قول میں ثَامِنُہُمۡ سے پہلے واو ہے جس سے بقول ابن عباس گنتی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

تیسرا اشارہ قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِعِدَّتِہِمۡ ہے۔ یعنی میرا رب بہتر جانتا ہے کہ ان کی تعداد کیا ہے اور ان کی تعداد وہی ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا۔

لیکن ان تینوں اشاروں میں بالعموم اور تیسرے اشارے میں بالخصوص تامل ہے کیونکہ سب سے اہم اشارہ رَجۡمًۢا بِالۡغَیۡبِ کا جملہ ہے جس کا تعلق ممکن ہے تینوں اقوال سے ہو۔ اس پر جملہ قُلۡ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِعِدَّتِہِمۡ قرینہ ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ سارے اقوال اَعۡلَمُ بِعِدَّتِہِمۡ نہیں ہیں۔ ان کی تعداد کو میرا رب ہی بہتر جانتا ہے۔

فَلَا تُمَارِ فِیۡہِمۡ: ان سے بحث لا حاصل ہے کیونکہ علم رکھنے والا، علم نہ رکھنے والے سے کیا بحث کرے اور عالم جاہل سے سوال بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا ان سے بحث و سوال کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ سرسری اور سطحی باتیں کر کے ان کو ان کی لاعلمی کا احساس دلا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں اہمیت کا حامل وہ سبق ہے جو اس واقعہ سے ملتا ہے۔ تعداد میں اتنی اہمیت نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ عالم کو جاہل سے بحث نہیں، سرسری گفتگو کرنی چاہیے۔

۲۔ جن باتوں کو ہماری دینی و دنیاوی زندگی میں دخل نہیں ہے ان میں نہیں الجھنا چاہیے۔

وَ لَا تَقُوۡلَنَّ لِشَایۡءٍ اِنِّیۡ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور آپ کسی کام کے بارے میں ہرگز یہ نہ کہیں کہ میں اسے کل کروں گا،

اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ۫ وَ اذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ وَ قُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّہۡدِیَنِ رَبِّیۡ لِاَقۡرَبَ مِنۡ ہٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

۲۴۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے اور اگر آپ بھول جائیں تو اپنے پروردگار کو یاد کریں اور کہدیجیے: امید ہے میرا رب اس سے قریب تر حقیقت کی طرف میری رہنمائی فرمائے گا۔

شان نزول: رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کچھ یہودیوں نے چند سوالات کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: میں تم سے کل بات کروں گا۔ اس میں اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ نہ فرمایا تو چالیس دن تک وحی نازل نہ ہوئی۔ چالیس

دن کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

واضح رہے سیاق آیت اور شان نزول کے مطابق اگرچہ خطاب اپنے رسولؐ سے ہے لیکن دوسروں کو سمجھانا مقصود ہے۔

تفسیر آیات

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے تاکیداً خطاب ہے: کسی عمل کی انجام دہی کا اظہار اس طرح نہ ہو کہ اس میں اللہ سے بے نیازی کا شائبہ اور استقلال کا اظہار ہو۔ خطاب اگرچہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ہے لیکن اس میں دوسروں کے لیے آداب بندگی کی تعلیم ہے کہ کسی عمل کی انجام دہی کے سلسلے میں مصمم ارادے کا اظہار ہو تو مشیت الٰہی کے حوالے سے ہو۔

اس کائنات میں تکویناً جو بھی عمل انجام پاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ، اس کی مشیت شامل ہوتی ہے ورنہ ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ انسان جو بھی عمل انجام دیتا ہے وہ اللہ کی دی ہوئی قدرت اور اس کی طرف سے عنایت شدہ تاثیر سے ہے۔

درست ہے اللہ کی طرف سے عنایت شدہ تاثیر کو بروئے کار لانا بندے کے ہاتھ میں ہے۔ بندے کے بازو میں اگر طاقت اللہ نے دی ہے تو اس کا استعمال بندے کے ہاتھ میں ہے کہ اس طاقت سے ضعیفوں کی دستگیری کرے یا ان پر ظلم کرے۔ تاہم دونوں صورتوں میں بندے نے اللہ کی دی ہوئی طاقت استعمال کی ہے۔ اس میں اسے استقلال حاصل نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ اللہ نے اس طاقت کو ضعیفوں کی دستگیری کے لیے استعمال کرنے کو تشریعاً چاہا ہے اور ظلم کرنے کو تشریعاً نہیں چاہا۔ تکوینی و تشریعی اعمال، دونوں کے لیے انشاء اللہ کہنا چاہیے۔ اس طرح ایک مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ اس آداب بندگی کا خیال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مشیت پر تکیہ کا اظہار کیے بغیر کسی کام کی انجام دہی کا اظہار نہ کرے۔

وَ اذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ: اگر آپ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کریں۔ اولاً تو اس سے بھولنے کا وقوع ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ ....[2] اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضرور حبط ہو جائے گا۔

یہاں شرک کا وقوع نہیں ہے، صرف ایک فرض ہے جس کا مقصد موضوع کی اہمیت کو واضح کرنا ہے۔ اسی طرح یہاں بھول کا وقوع نہیں ہے صرف ایک فرض ہے۔ ثانیاً اگرچہ یہاں خطاب اپنے حبیب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ہے لیکن ان لوگوں کو سمجھانا مقصود ہے جن کے لیے یہ قرآن دستور حیات ہے۔

---

[1] الفقیہ ۳: ۳۶۲۔ باب الایمان والنذور [2] ۳۹ زمر: ۶۵

اہم نکات

۱۔ مومن کے ہر عمل سے اللہ پر تکیہ کا اظہار ہونا چاہیے۔

مزید تحقیق کے لیے رجوع کیجیے: الوسائل۔۲۳: ۳۵۳ باب استحباب استثناء۔ مستدرک الوسائل: ۱۶: ۶۰ باب استحباب استثناء۔ الصراط المستقیم ۱: ۲۷ الباب الثانی

وَلَبِثُوۡا فِیۡ کَہۡفِہِمۡ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیۡنَ وَ ازۡدَادُوۡا تِسۡعًا ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اور وہ اپنے غار میں تین سو سال تک رہے اور نو کا اضافہ کیا۔

قُلِ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ۚ لَہٗ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اَبۡصِرۡ بِہٖ وَ اَسۡمِعۡ ؕ مَا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّلِیٍّ ۫ وَّ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

۲۶۔ آپ کہدیجیے: ان کے قیام کی مدت اللہ بہتر جانتا ہے، آسمانوں اور زمین کی غیبی باتیں صرف وہی جانتا ہے، وہ کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے، اس کے سوا ان کا کوئی سرپرست نہیں اور نہ ہی وہ کسی کو اپنی حکومت میں شریک کرتا ہے۔

تفسیر آیات

جملہ ہائے معترضہ کو حذف کیا جائے تو سلسلہ کلام کچھ اس طرح بنتا ہے:

کچھ لوگ کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا ہے۔ کچھ کہیں گے وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے اور کچھ کہیں گے وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے۔ وہ اپنے غار میں تین سو سال تک رہے اور ان لوگوں نے نو کا اضافہ کیا۔ آپ کہدیجیے ان کے قیام کی مدت اللہ بہتر جانتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی غیبی باتیں صرف وہی جانتا ہے۔ وہ کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے۔

آیات کے سیاق سے ابن عباس کا یہ قول قرین حق معلوم ہوتا ہے کہ آیت ۲۵ میں تین سو اور تین سو نو کی جو مدت بیان کی گئی ہے وہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا قول نہیں ہے۔ اس تفسیر پر اللہ تعالیٰ کا یہ فقرہ قرینہ بنتا ہے: آپ کہدیجیے ان کے قیام کی مدت اللہ بہتر جانتا ہے۔

اگر تین سو نو سال کی مدت اللہ کا قول ہوتا تو یہ فقرہ پہلے ہوتا اور ربط کلام کچھ اس طرح بنتا: آپ کہدیجیے ان کے قیام کی مدت اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال تک رہے اور نو کا اضافہ کیا یا

اس فقرے کی ضرورت نہ رہتی۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابو بصیر کی روایت میں مروی ہے:

وَلَبِثُوۡا فِیۡ کَہۡفِہِمۡ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیۡنَ وَازۡدَادُوۡا تِسۡعًا وھو حکایۃ عنھم ولفظہ خبر و الدلیل علی انہ حکایۃ عنھم قولہ: قُلِ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ۔[1]	اور وہ اپنے غار میں تین سو سال تک رہے اور انہوں نے نو کا اضافہ کیا یہ فرمان لوگوں کے قول کی حکایت ہے تعبیر خبر کے انداز میں ہے۔ اس قول کے حکایت ہونے پر دلیل اگلا فقرہ ہے قُلِ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ۔ اللہ بہتر جانتا ہے ان کے قیام کی مدت کیا تھی۔

دوسرا قرینہ لَہٗ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی غیب کی باتیں اللہ کے علم میں ہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ ان کی تعداد کتنی ہے۔ تیسرا قرینہ اَبۡصِرۡ بِہٖ وَ اَسۡمِعۡ ہے کہ اللہ خوب دیکھنے اور سننے والا ہے اس کے مقابلے میں تمہاری کیا حیثیت ہے۔

ایک شامی شخص کی روایت کی بنا پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ قرآن پر وارد نہیں ہوتا۔ واضح رہے اصحاب کہف کے قصے کا قدیم ترین راوی ایک مسیحی پادری ہے جو شام کا باشندہ اور سیریا (موجودہ شام) کے چرچ کا سربراہ تھا۔ اس نے یہ قصہ پانچویں صدی عیسوی ۴۷۴ء کے لگ بھگ سالوں میں لکھا۔ اس روایت میں آیا ہے کہ اصحاب کہف نے قیصر دقیانوس (Decus) کے عہد سلطنت میں غار میں پناہ لی تھی۔ جس کی سلطنت ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک قائم رہی اور قیصر تھیوڈوسیس (Theodosius) کے عہد میں بیدار ہوئے جس کی سلطنت ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک قائم رہی۔ اس طرح اصحاب کہف کے خواب کی مدت ۱۹۷ سال بنتی ہے جب کہ قرآن تین سو نو سال بتاتا ہے۔

اس کے متعدد جوابات ہیں۔ پہلا جواب گزر گیا کہ قرآن نے لوگوں کے قول کی حکایت کی ہے خود کسی مدت کو بیان نہیں کیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ سریانی روایت کا راوی سیریا (موجودہ شام) کا باشندہ تھا جب کہ یہ واقعہ شہر افیس (موجودہ ترکی کے شہر ازمیر) سے دور پیش آیا لہٰذا اصحاب کہف کی بیداری کی روایت اگر قابل اعتبار ہو سکتی ہے تو ان کی ہجرت کی تاریخ کے تعین کے بارے میں یہ روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔

> اصل تحقیق کے مطابق اصحاب کہف کا واقعہ قیصر روم طراجان کے عہد سلطنت ۹۸۔ ۱۱۷ء میں پیش آیا، نہ کہ قیصر دقیانوس ۲۵۱ء کے عہد میں جیسا کہ بعض مسیحی روایات میں آیا ہے، نہ دقیانوس ۳۰۵ء کے عہد میں جیسا کہ بعض دیگر مسلم و غیر مسلم روایات میں آیا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ اصحاب کہف قیصر تھیوڈوسیس کے عہد میں بیدار ہوئے جس کی سلطنت ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک رہی ہے۔ لہٰذا اگر ہم ۴۲۱ء سے ۳۰۹ء منفی کریں تو طراجان کا عہد سلطنت ۱۱۲ء نکل آتا ہے۔[2]

---

[1] بحار الانوار ۱۴: ۴۲۳ باب قصۃ اصحاب الکھف عن تفسیر القمی ۲: ۳۳ [2] ملاحظہ ہو المیزان بحوالہ کتاب اکتشاف کھف اہل کھف۔

وَ اتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ کِتَابِ رَبِّکَ ۚؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ۟ وَ لَنۡ تَجِدَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا ﴿۲۷﴾

۲۷۔(اے رسول) آپ کے پروردگار کی کتاب کے ذریعے جو کچھ آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اسے پڑھ کر سنا دیں کوئی اس کے کلمات کو بدلنے والا نہیں ہے اور نہ ہی آپ اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ پائیں گے۔

تشریح کلمات

مُلۡتَحَدًا: (ل ح د) لحد۔ اس کے معنی پناہ گاہ کے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ ایک طرف مائل ہونے کو کہتے ہیں۔ اسی لیے قبر کی ایک طرف (لحد) کو کھودنے اور حق سے دوسری طرف مائل ہونے والے کو ملحد کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

درمیان میں قصہ اصحاب کہف کے بیان کے بعد اس آیت سے مربوط کلام کا سلسلہ جاری ہو رہا ہے جو اس قصے سے پہلے بیان ہو رہا تھا۔ آیت نمبر ۶، ۲۷ اور ۲۸ کو ملایا جائے تو ربط کلام اس طرح بنتا ہے:

اگر یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہ لائے تو ان کی وجہ سے شاید آپ اس رنج میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ ۲۷: آپ اپنے پروردگار کی کتاب کے ذریعے جو کچھ آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اسے پڑھ کر سنا دیں کوئی اس کے کلمات کو بدلنے والا نہیں ہے اور نہ ہی آپ اللہ کے سوا کوئی پناہ کی جگہ پائیں گے۔ ۲۸: اور اپنے آپ کو ان لوگوں کی معیت میں محدود رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ الی آخر الآیۃ

لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ: کلمات سے مراد اللہ کے اٹل فیصلے ہیں۔ اس کے کلمات کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کا ہر حکم اٹل ہے۔ کتاب کے ذکر کے بعد کلمات کا ذکر ہے لہٰذا ان کلمات سے مراد قرآنی کلمات ہی ہو سکتے ہیں جن میں اللہ نے اپنے حبیب کو متعدد مقامات پر بتا دیا کہ فتح و کامیابی آپؐ کی ہے۔ آپؐ کے دشمن کو ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ حکم اللہ کا اٹل فیصلہ ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا۔

وَ لَنۡ تَجِدَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا: اس بات پر قرینہ ہے کہ کامیابی آپؐ کی ہے چونکہ آپؐ اللہ کی پناہ میں ہیں۔ آپؐ کا دشمن کوئی پناہ اور سہارا نہیں رکھتا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کا حتمی فیصلہ ناقابل تنسیخ ہوتا ہے۔

۲۔ بے سہارا ہے وہ شخص جو غیر اللہ کی پناہ پر بھروسہ کرتا ہے۔

وَ اصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ وَ لَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ ۚ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ وَ کَانَ اَمۡرُہٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور (اے رسول) اپنے آپ کو ان لوگوں کی معیت میں محدود رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اپنی نگاہیں ان سے نہ پھیریں، کیا آپ دنیاوی زندگی کی آرائش کے خواہشمند ہیں؟ اور آپ اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔

تشریح کلمات

فُرُطًا: (ف ر ط) فرط آگے بڑھ جانے کے معنوں میں ہے۔ حدیث میں فرمایا: انا فرطکم علی الحوض میں حوض (کوثر) پر تمہارا پیشرو ہوں۔[۱] یہاں سے حد سے آگے بڑھنے والے کو مفرط اور فرطا کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

شان نزول کے سلسلے میں روایت ہے:

قریش کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک سے گزری اور دیکھا کہ آنحضرتؐ کے پاس صہیب، خباب، بلال، عمار و دیگر کچھ غریب مسلمان بیٹھے ہیں تو انہوں نے کہا: محمدؐ! آپ اس قسم کے لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔ انہیں اپنے پاس سے ہٹائیں تو ہم آپؐ کے پاس بیٹھ سکتے ہیں۔[۲]

دوسری روایت میں آیا ہے:

یہ آیت سلمان فارسیؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب عینیہ بن حصین کو سلمانؓ کے کپڑوں سے بدبو آئی تو اس نے کہا: یا رسول اللہؐ جب ہم آپؐ کے پاس آئیں تو اس (سلمان فارسی) کو یہاں سے نکال دیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا ....[۳]

---

[۱] مستدرک الوسائل ۲: ۳۹۸ [۲] تفسیر ثعلبی [۳] تفسیر قمی ۲: ۳۴

آنحضرت صلى الله عليه وآله وسلم کو یہ حکم مل رہا ہے کہ آپؐ اپنے ان ساتھیوں تک محدود رہیں جن میں دو اوصاف موجود ہیں: پہلا وصف یہ ہے کہ وہ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے اس سے مراد نماز ہے۔[1] دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں: يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ.... وہ وجہ خدا کے طالب ہیں۔ ہر چیز کا وجہ وہ ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں قرآن کی مختلف تفاسیر میں آیا ہے کہ ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ، يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَ اللّٰهِ، لِوَجۡهِ اللّٰهِ ان سب تعبیروں میں یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اللہ کو چاہتے ہیں۔ ذات کو چاہنے کا یہ مطلب تو نہیں ہوسکتا کہ وہ ذات کا حصول چاہتے ہیں لہٰذا لازماً اس کا مطلب یہ بنتا ہے اللہ کی رضا کا حصول چاہتے ہیں۔

واضح رہے کہ اسلام کا بوجھ ہمیشہ ناداروں نے اٹھایا ہے اور اسلام کے لیے غریبوں نے ہی قربانی دی ہے کیونکہ قربانی ہمیشہ وہ لوگ دیتے ہیں جو خواہشات کے اسیر نہیں ہیں۔ انسان کے پاس جب مال و دولت آ جاتی ہے تو اس کی خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں۔ جب خواہشات سر اٹھاتی ہیں تو پھر انہیں کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور اس اسیری سے رہائی نہیں مل سکتی۔ عیش و عشرت کی زندگی سے واپس پھر تنگی کی طرف نہیں آتے بلکہ وہ تمام مراعات کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام عہد نامہ مالک اشتر میں ان لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَلَيۡسَ اَحَدٌ مِنَ الرَّعِيَّةِ اَثۡقَلَ عَلَى الۡوَالِي مَؤُونَةً فِي الرَّخَاءِ وَ اَقَلَّ مَعُونَةً لَهُ فِي الۡبَلَاءِ وَ اَكۡرَهَ لِلۡاِنۡصَافِ وَ اَسۡاَلَ بِالۡاِلۡحَافِ وَ اَقَلَّ شُكۡراً عِنۡدَ الۡاِعۡطَاءِ وَ اَبۡطَاءَ عُذۡراً عِنۡدَ الۡمَنۡعِ وَ اَضۡعَفَ صَبۡرًا عَنۡدَ مُلِمَّاتِ الدَّهۡرِ مِنۡ اَهۡلِ الۡخَاصَّةِ....

یاد رکھو! کہ رعیت میں خواص (مراعات یافتہ طبقہ) سے زیادہ کوئی ایسا نہیں جو کہ خوشحالی کے وقت حاکم پر بوجھ بننے والا، مصیبت کے وقت امداد سے کترانے والا، انصاف پر ناک بھوں چڑھانے والا، طلب و سوال کے موقعہ پر پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جانے والا، بخشش پر کم شکر گزار ہونے والا، محروم کر دیے جانے پر بہ مشکل عذر سننے والا زمانے کی ابتلاؤں پر بے صبری دکھانے والا ہو۔

پھر آپؑ نے عوام الناس کے بارے میں فرمایا:

وَ اِنَّمَا عِمَادُ الدِّيۡنِ وَ جِمَاعُ الۡمُسۡلِمِينَ وَالۡعُدَّةُ لِلۡاَعۡدَاءِ الۡعَامَّةُ مِنَ الۡاُمَّةِ ....

اور دین کا مضبوط سہارا اور مسلمانوں کی قوت اور دشمن کے مقابلے میں سامان دفاع یہی امت کے عوام ہوتے ہیں....

انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت خاتم الانبیاء صلى الله عليه وآله وسلم تک اس دین خدا کی امانت کے حامل یہی غریب لوگ رہے ہیں۔ اس لیے حضورؐ کو حکم مل رہا ہے کہ ساری

---

[1] تفسیر عیاشی۔ مستدرک الوسائل ۳: ۴۱، باب استحباب اختیار الصلوۃ علی غیرھا

توجہ اور نگاہ ان غریبوں پر مرکوز رکھیں۔ چنانچہ فرمایا: وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ ۚ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا...۔ آپ اپنے نگاہیں ان سے نہ پھیریں۔

آپؐ کی توجہ ان سے تجاوز کر کے مراعات یافتہ طبقے کی طرف نہ جائے اور کہیں دنیا کی زیب و زینت سبب نہ بن جائے کہ اسلام کے جانثاروں اور اس دین کے اصل محافظوں سے آپؐ کی توجہ ہٹ جائے۔

واضح رہے کہ ان الفاظ اور تعبیر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسا عمل سرزد ہونے کا امکان تھا بلکہ ان آیات کا مقصد ان دو طبقوں (مراعات یافتہ اور غریب) کے بارے میں جو موقف اختیار کرنا چاہیے اس کا بیان ہے اور اس حقیقت کا بیان ہے کہ اس امانت کے امین کون لوگ ہیں۔

وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا: غریبوں سے نفرت کرنے والے وہ ہوتے ہیں جن کا قلب یاد خدا سے غافل ہوتا ہے۔ جن کے دل یاد خدا سے معمور ہوتے ہیں وہ صرف غربت کی بنیاد پر خلق خدا سے نفرت نہیں کرتے بلکہ ان سے ہمدردی کرتے ہیں۔

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ: ذکر خدا سے غافل انسان وہ ہوتا ہے جو اپنی خواہشات کا اسیر ہے۔ خواہشات کا بندہ انسانی قدروں سے دور ہوا کرتا ہے۔ اس کی اقدار اور پہچان صرف خواہشات پر مبنی ہوتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کی اصل طاقت وہ لوگ ہیں جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں: يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ...۔

۲۔ مراعات یافتہ طبقے پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے: وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ...۔

۳۔ خواہش پرستوں کی بات نہیں سنی چاہیے: وَلَا تُطِعۡ مَنۡ... وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ...۔

مزید تحقیق کے لیے رجوع فرمائیے: بحار الانوار ۲۳ باب ماجری بینه و بین اهل الکتاب، تفسیر قمی ۲: ۳۴۔ سعد السعود: ۷۳

وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۟ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ ۙ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِيۡنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمۡ سُرَادِقُهَا ؕ وَاِنۡ يَّسۡتَغِيۡثُوۡا يُغَاثُوۡا بِمَآءٍ كَالۡمُهۡلِ يَشۡوِى الۡوُجُوۡهَ ؕ بِئۡسَ الشَّرَابُ ؕ وَسَآءَتۡ

۲۹۔ اور کہد یجیے: حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، پس جو چاہے ایمان لائے او جو چاہے کفر کرے، ہم نے ظالموں کے لیے یقیناً ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں انہیں گھیرے میں لے رہی ہوں گی اور اگر وہ فریاد کریں تو ایسے پانی سے ان کی دادرسی ہوگی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو گا ان کے چہروں کو بھون ڈالے گا

مُرۡتَفَقًا ﴿۲۹﴾　　بدترین مشروب اور بدترین ٹھکانا ہے۔

تشریح کلمات

سرادق: (س ر د ق) فارسی سے معرب ہے۔ اس کے معنی قنات کے ہیں۔

المھل: (م ہ ل) تلچھٹ۔ پگھلا ہوا تانبا۔

المرتفق: تکیہ۔ جب اپنی کہنی پر تکیہ لگایا گیا تو کہتے ہیں: اِرۡتَفَقَ۔

یَشۡوِی: (ش و ی) شوی گوشت کا بھوننا۔ الطیر المشوی بھنا ہوا پرندہ۔

تفسیر آیات

حق کا منبع و مصدر صرف اللہ ہے: اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۔ کوئی بھی بات واقع کے مطابق ہو تو اس بات کو صدق کہتے ہیں اور واقع کو حق کہتے ہیں۔ صدق کے مقابلے میں کذب اور حق کے مقابلے میں باطل آتا ہے۔ حق، ہستی اور باطل، نیستی ہے۔

فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ: جو چاہے ایمان لائے، جو چاہے کفر اختیار کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے تمہارے پاس حق آ گیا ہے۔ اس کے بعد ایمان لانے یا کفر اختیار کرنے میں تم خود مختار ہو۔ فَمَنۡ شَآءَ جو چاہے اختیار کرے۔ قرآن نے اس مطلب کو مختلف الفاظ اور متعدد تعبیرات میں نہایت صریح اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے: مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ [1] ، قُلۡ فَلِلّٰہِ الۡحُجَّۃُ الۡبَالِغَۃُ ۚ فَلَوۡ شَآءَ لَہَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ [2] ، فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ [3] ، فَہَلۡ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ [4] ، فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ؕ اِنۡ عَلَیۡکَ اِلَّا الۡبَلٰغُ [5] ، لَسۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ [6] و دیگر آیات میں غیر مبہم الفاظ میں بیان فرمایا: رسول کے ذمے حق کی تبلیغ اور حق و ہدایت کا بیان ہے۔ اس کے بعد اس حق کے قبول کرنے اور اس ہدایت پر چلنے کے لیے اللہ تعالیٰ طاقت استعمال نہیں فرماتا اور نہ ہی اپنے رسول کو طاقت استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ آیت کی یہ صراحت ” جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے“ انسان کی خودمختاری پر واضح ترین دلیل ہے کہ ایمان لانا اور کفر اختیار کرنا انسان کے چاہنے اور اختیار کرنے کے سے مربوط ہے۔ یہ خودمختاری کی صورت میں ممکن ہے ورنہ مجبور ہونے کی صورت میں انسان کے چاہنے اور نہ چاہنے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

ہم نے پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ دشمنوں کے الزام کے برخلاف اسلامی جنگیں جبر اور طاقت کا استعمال نہیں تھیں بلکہ یہ جنگیں جبر کے خلاف تھیں۔ جن طاقتوں نے اسلام کے خلاف جبر اور طاقت کا استعمال کیا ان کے خلاف جنگیں لڑی گئیں ورنہ چشم جہان نے دیکھ لیا ہے کہ جن عناصر نے اسلام کے

---

[1] ۵ مائدہ۔ ۹۹　[2] ۶ انعام۔ ۱۴۹　[3] ۱۳ رعد۔ ۴۰　[4] ۱۶ نحل۔ ۳۵　[5] ۴۲ شوریٰ۔ ۴۸　[6] ۸۸ غاشیہ۔ ۲۲

خلاف طاقت استعمال نہیں کی انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔ اسلامی قوانین اس آزادی کی شقوں سے پر ہیں۔[1] چنانچہ ارشاد ہے:

لَا یَنۡہٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ لَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡہُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ۝ [2]

جن لوگوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اللہ تمہیں ان کے ساتھ احسان کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق کا پیغام ملنے کے بعد کفر و ایمان کا اختیار بندے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ﴿ۚ۳۰﴾ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ وَّ یَلۡبَسُوۡنَ ثِیَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَّکِئِیۡنَ فِیۡہَا عَلَی الۡاَرَآئِکِ ؕ نِعۡمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿۳۱﴾

۳۰۔ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال بجا لاتے ہیں تو ہم نیک اعمال بجا لانے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

۳۱۔ ان کے لیے دائمی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ سونے کے کنگنوں سے مزین ہوں گے اور باریک ریشم اور اطلس کے سبز کپڑوں میں ملبوس مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، بہترین ثواب ہے اور خوبصورت منزل۔

تشریح کلمات

اَسَاوِرَ: (س و ر) سوار کی جمع ہے۔ اس کے معنی کنگن کے ہیں۔ راغب کے بقول یہ فارسی دستوار سے

---

[1] کیا آپ کو ان لوگوں کے امت قرآن سے خارج ہونے میں تامل ہے جو اپنے سے ذرا اختلاف رکھنے والوں کو مسجدوں میں حالت نماز میں قتل کرتے ہیں۔ چنانچہ مسجد شاہ نجف راولپنڈی میں اور ۲۰۰۳ء میں کوئٹہ میں حالت نماز میں نمازیوں کا قتل عام ان درندوں اور ان کے حامیوں کے ماتھے پر ایک داغ اور عار و ننگ ہے، جسے وہ کبھی نہیں دھو سکیں گے۔

[2] ۶۰ ممتحنہ۔ ۸

معرب ہے۔

سُنۡدُسٍ: باریک ریشم استبرق۔ اطلس۔

الۡاَرَآئِکِ: اریکۃ کی جمع جو حجلہ تخت کے اوپر رکھا ہوا ہو اسے اریکہ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

سونے کے کنگن اور حجلہ ابریشم اور اطلس کے لباس، یہ سب جنت کی شاہانہ زندگی کی طرف اشارہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عالم آخرت، عالم دنیا سے مختلف ہے۔ وہاں کا طرز زندگی، اللہ تعالیٰ ہمارے محسوسات کی روشنی میں سمجھاتا ہے ورنہ عالم آخرت کے حقائق اس عالم ناسوت والوں کے لیے ناقابل فہم و ادراک ہیں۔

واضح رہے ان دو آیات سے یہ بات واضح ہے کہ یہ ثواب ان کے لیے ہے جن کے پاس ایمان کے ساتھ عمل صالح ہے۔ وہ حسن عمل سے اپنے ایمان کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس لیے فرمایا: ہم نیک عمل بجا لانے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ اس سے واضح ہوا کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح بجا نہ لایا جائے تو اس کا کوئی اجر ہی نہیں ہوتا کہ ضائع ہونے کا سوال پیدا ہو بلکہ اس پر ایمان ہی صادق نہیں آتا۔

اہم نکات

۱۔ ایمان اگر عمل کے لیے محرک نہ بنے تو وہ ایمان نہیں ہے۔

۲۔ ایمان کا اگر کردار پر اثر نمایاں ہے تو اس کا اجر ضائع نہیں جاتا۔

وَ اضۡرِبۡ لَہُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَیۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِہِمَا جَنَّتَیۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّ حَفَفۡنٰہُمَا بِنَخۡلٍ وَّ جَعَلۡنَا بَیۡنَہُمَا زَرۡعًا ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور (اے رسول) ان سے دو آدمیوں کی ایک مثال بیان کریں جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ عطا کیے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگا دی اور دونوں کے درمیان کھیتی بنائی تھی۔

تشریح کلمات

ضرب المثل: ضرب کے مختلف معانی میں سے ایک معنی چلنے کے ہیں۔ ضرب المثل، ایک مثال کا لوگوں میں رواں ہونا۔

تفسیر آیات

یہ ایک تمثیلی باغ کا تصور ہے یا ایک واقعی باغ کا قصہ ہے۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾

۳۳۔ دونوں باغوں نے خوب پھل دیا اور ذرا بھی کمی نہ کی اور ان کے درمیان ہم نے نہر جاری کی۔

تشریح کلمات

اُكُلُ: (ا ک ل) جو چیز بھی کھائی جائے اسے اکل کہتے ہیں۔

تَظْلِمْ: (ظ ل م) ظلم کے معانی میں سے ایک معنی نقص اور کمی کے ہیں۔

تفسیر آیات

ان دونوں باغات میں پھل لدے ہوئے ہیں اور کسی قسم کا نقص نہیں ہے بلکہ ان دونوں باغات کے درمیان موجود نہر نے اسے اور پرکشش و زرخیز بنا دیا ہے۔

وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾

۳۴۔ اور اسے پھل ملتا رہتا تھا، پس باتیں کرتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی سے کہا: میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور افرادی قوت میں بھی زیادہ معزز ہوں۔

تفسیر آیات

اس جاگیر دار کی اچھی خاصی آمدنی ہے جیسا کہ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ سے ظاہر ہے۔

ان آیات میں ایک جاگیر دار دولتمند شخص کا ایک نادار کے ساتھ مکالمے کی مثال یا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ جاگیر دار کا زبان حال یا زبان قال یہ ہے: مجھے دو اعتبار سے تم پر برتری حاصل ہے۔ ایک یہ کہ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ میرے پاس تم سے زیادہ دولت کی فراوانی ہے۔ دوسرا یہ اَعَزُّ نَفَرًا افرادی قوت کے اعتبار سے تم سے زیادہ برتر اور طاقتور ہوں۔ یہ جاگیردار صرف مادی اقدار کو جانتا ہے جیسا کہ اکثر سرمایہ داروں کا یہی حال ہے۔

وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ

۳۵۔ اور وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا، کہنے لگا: میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی فنا

هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ ہو جائے گا۔

تشریح کلمات

تَبِیۡدَ: (ب ی د) اصل میں یہ بیداء سے ہے جو میدان میں کسی چیز کے پراگندہ ہونے کے معنوں میں ہے۔ اسی سے کامل تباہی و بربادی کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

دولت میں مدہوش انسان عاقبت کی فکر نہیں کرتا۔ وہ اپنی خوشحالی کو دائمی تصور کرتا ہے۔ وہ کسی ناگہانی حالت کے لیے آمادہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ کسی مافوق قوت پر ایمان نہیں رکھتا اور اسے اپنے مال و دولت کے زوال کے فی الحال کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ: اس فقرے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ وہ صرف مشاہدات ومحسوسات کے دائرے میں سوچتا ہے، عقل وخرد سے کام نہیں لیتا۔ دوسری یہ کہ اس کا اعتماد خدائے واحد پر نہیں ہے۔ وہ ظالم بہ نفس یعنی مشرک ہے۔ اگر عقیدے سے مشرک نہ ہو تو عملاً خدا پر اعتماد نہیں ہے۔

وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰی رَبِّیۡ لَاَجِدَنَّ خَیۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور میں خیال نہیں کرتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر مجھے میرے رب کے حضور پلٹا دیا گیا تو میں ضرور اس سے بھی اچھی جگہ پاؤں گا۔

تفسیر آیات

مشرک ہونے کے اعتبار سے یہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اور مراعات کا عادی ہونے کے اعتبار سے وہ آخرت کے موجود ہونے کی صورت میں اپنے آپ کو آخرت کی تمام مراعات کا بھی حقدار سمجھتا ہے۔ لہٰذا اس بات پر تعجب نہیں ہے کہ مراعات یافتہ طبقہ دنیا میں تمام مراعات کا صرف خود کو حقدار سمجھتا ہے، دوسرے طبقوں کو مراعات ملتے نہیں دیکھ سکتا۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ یُحَاوِرُهٗۤ اَکَفَرۡتَ بِالَّذِیۡ خَلَقَکَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىکَ

۳۷۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے ساتھی نے کہا: کیا تو اس اللہ کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا پھر تجھے ایک

رَجُلًا ﴿۳۷﴾ معتدل مرد بنایا؟

تفسیر آیات

کیا تو اس مالک حقیقی کا انکار کرتا ہے جس نے نہ صرف یہ کہ تجھے اس نعمت سے مالا مال کیا بلکہ تمہیں تمہارا وجود بھی اسی نے دیا ورنہ تو ایک خاک سے بیشتر کچھ نہ تھا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جاگیردار عقیدۃً مشرک اور منکر قیامت و خدا تھا؟ یا وہ عقیدۃً ایسا نہ تھا بلکہ وہ دولت میں بدمست ہونے کی وجہ سے اس قسم کے کردار کا مالک تھا جو ایک منکر خدا و قیامت اختیار کرتا ہے۔

دوسری صورت کے لیے دو قرینے موجود ہیں: اول یہ کہ یہ شخص قیامت کے امکان کا اظہار کرتا ہے۔ دوم یہ کہ یہ شخص وَّلَىٕنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰى رَبِّىۡ میں رَبِّىۡ کا فقرہ استعمال کرتا ہے۔ اس سے عندیہ ملتا ہے کہ وہ عقیدۃً منکر خدا نہیں تھا بلکہ وہ عملاً اس مالک حقیقی کو نہیں، اپنے آپ کو مالک اور اس دولت کو عنایت الٰہی نہیں، اپنے ہنر اور مہارت کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىۡ وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

۳۸۔ لیکن میرا رب تو اللہ ہی ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔

تفسیر آیات

اس سرمایہ دار کے مقابلے میں مؤمن اپنا موقف بیان کرتا ہے کہ وہ عقیدۃً و عملاً اللہ کو ہی مالک سمجھتا ہے۔

وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا: مؤمن صرف اللہ کو مالک حقیقی مانتا ہے اور مال و دولت کو اپنی مہارت کا مرہون نہیں مانتا۔ وَلَاۤ اُشۡرِكُ سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ سرمایہ دار مشرک تھا۔

وَلَوۡلَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ جَنَّتَكَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنۡ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنۡكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿ۚ۳۹﴾
فَعَسٰى رَبِّىۡۤ اَنۡ يُّؤۡتِيَنِ خَيۡرًا مِّنۡ جَنَّتِكَ وَيُرۡسِلَ عَلَيۡهَا حُسۡبَانًا

۳۹۔ اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو کیوں نہیں کہا: ماشآء اللّٰہ لا قوۃ الا باللّٰہ؟ (ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہے طاقت کا سرچشمہ صرف اللہ ہے) اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر سمجھتا ہے،

۴۰۔ تو بعید نہیں کہ میرا پروردگار مجھے تیرے باغ سے بہتر عنایت فرمائے اور تیرے باغ پر آسمان سے

مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصۡبِحَ صَعِیۡدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ آفت بھیج دے اور وہ صاف میدان بن جائے۔

اَوۡ یُصۡبِحَ مَآؤُہَا غَوۡرًا فَلَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ لَہٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ ۴۱۔ یا اس کا پانی نیچے اتر جائے پھر تو اسے طلب بھی نہ کر سکے۔

تشریح کلمات

حُسۡبَانًا: (ح س ب) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس پر محاسبہ کیا جائے پھر اس کے مطابق بدلہ دیا جائے۔

زَلَقًا: (ز ل ق) صاف۔ بے سبزہ۔

غَوۡرًا: (غ و ر) نشیبی زمین کے معنوں میں ہے۔ کہتے ہیں غارت عینہ اس کی آنکھ اندر پھنس گئی۔

تفسیر آیات

مال دولت کے بارے میں مؤمن اپنا موقف بیان کرتا ہے۔ مال و دولت کے حصول میں انسان کو استقلال حاصل نہیں ہے۔ اس میں مشیت الٰہی کا بھی دخل ہے۔ مال و دولت کا جب مشاہدہ ہو: دَخَلۡتَ جَنَّتَکَ تو یہ موقف اختیار کرنا چاہیے: مَا شَآءَ اللّٰہُ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے اور طاقت و قوت کا سرچشمہ صرف اللہ ہے: لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

جاگیر دار کی سرمایہ دارانہ مادی سوچ کے مقابلے میں مؤمن اپنا موقف نہایت مہذب اور منطقی انداز میں پیش کرتا ہے۔ جاگیر دار نے فخریہ اور غیر مہذب انداز میں کہا تھا: میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور افرادی طاقت میں تم سے برتر ہوں۔ مؤمن نے جواب میں کہا: تجھے ایک ناپائیدار جاگیر پر ناز ہے جب کہ مجھے اس جاگیر پر ناز ہے جو میرے رب کے پاس محفوظ ہے۔ گو کہ تمہاری قدروں کے مطابق میں مال و اولاد میں تم سے کمتر ضرور ہوں لیکن الٰہی قدروں کے مطابق جس جاگیر کا میں مالک بننے والا ہوں وہ تیری ناپائدار جاگیر سے بہتر ہے: فَعَسٰی رَبِّیۡۤ اَنۡ یُّؤۡتِیَنِ خَیۡرًا مِّنۡ جَنَّتِکَ ....

تیری جاگیر آسمانی اور زمینی آفت کی زد میں ہے۔ ہوسکتا ہے آسمان سے تیری جاگیر پر آفت گرے اور زمین خشک ہو جائے۔

وَ اُحِیۡطَ بِثَمَرِہٖ فَاَصۡبَحَ یُقَلِّبُ کَفَّیۡہِ عَلٰی مَاۤ اَنۡفَقَ فِیۡہَا وَ ہِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوۡشِہَا وَ یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ لَمۡ اُشۡرِکۡ بِرَبِّیۡۤ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

۴۲۔ چنانچہ اس کے پھلوں کو (آفت نے) گھیر لیا پس وہ اپنے باغ کو اپنی چھتوں پر گرا پڑا دیکھ کر اس سرمائے پر کف افسوس ملتا رہ گیا جو اس نے اس باغ پر لگایا تھا اور کہنے لگا: اے کاش! میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا۔

وَلَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ فِئَۃٌ یَّنۡصُرُوۡنَہٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ مَا کَانَ مُنۡتَصِرًا ﴿۴۳﴾

۴۳۔اور (ہوا بھی یہی ہے کہ) اللہ کے سوا کوئی جماعت اس کے لیے مددگار ثابت نہ ہوئی اور نہ ہی وہ بدلہ لے سکا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اُحِیۡطَ بِثَمَرِہٖ: چنانچہ اس کے باغ کی ناپائیداری کا وقت آگیا اور اس کا باغ تباہ ہوگیا۔ اس کے دماغ سے دولت و جاگیر کا غرور اتر گیا تو حقائق کا فہم شروع ہوگیا اور کہنے لگا:

۲۔ وَ یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ: کاش میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا اور اس دولت پر تکیہ کرنے کی جگہ اپنے رب پر تکیہ کرتا۔ اب تو کوئی اس کی مدد کرنے کے لیے آنے والا ہے نہ ہی خود گرفتوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

ہُنَالِکَ الۡوَلَایَۃُ لِلّٰہِ الۡحَقِّ ؕ ہُوَ خَیۡرٌ ثَوَابًا وَّ خَیۡرٌ عُقۡبًا ﴿۴۴﴾ؑ

۴۴۔ یہاں سے عیاں ہوا کہ اقتدار تو خدائے برحق کے لیے مختص ہے، اس کا انعام بہتر ہے اور اسی کا دیا ہوا انجام اچھا ہے۔

تشریح کلمات

الۡوَلَایَۃُ: ابوعبیدہ کے مطابق الوِلایۃ (بکسر واو) نصرت کے معنوں میں، الۡوَلَایَۃُ (بفتح واو) کسی کام کے متولی ہونے کے معنوں میں ہے لیکن تحقیق یہ ہے کہ الۡوَلَایَۃُ بفتح واو ہو یا بکسر واو دونوں کا ایک معنی ہے۔ یعنی کسی کام کے متولی ہونے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اس واقعہ یا مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کل کائنات میں اقتدار اعلیٰ اللہ کے پاس ہے۔

لِلّٰہِ الۡحَقِّ: سے یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ ایک امر واقع اور حق و حقیقت پر مبنی ہے اور اس کے مقابلے میں آنے والی ہر چیز ایک سراب اور دھوکہ ہے۔ اگر کسی کو مال و دولت مل گئی ہے تو اس دولت کے حصول میں آنے والے علل و اسباب سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ ان علل و اسباب میں اللہ نے خاصیت ودیعت فرمائی ہے۔ اس طرح ہر ذرے پر اللہ کی ولایت اور حاکمیت قائم ہے۔ اگر ان علل و اسباب سے ان کی خاصیتیں سلب ہو جائیں تو کوئی طاقت نہیں جو ان کو یہ سلب شدہ خاصیت واپس دلا دے۔

اہم نکات

۱۔ سرمایہ دار صرف مادی اقدار کو جانتا ہے: اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ...۔
۲۔ مادی انسان اپنی خوش حالی کو دائمی تصور کرتا ہے: مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ...۔
۳۔ مراعات کا عادی شخص آخرت کی مراعات کا اپنے آپ کو حقدار سمجھتا ہے: وَّلَىِٕنْ رُّدِدْتُّ... خَيْرًا...۔
۴۔ دولت میں بدمست انسان عملاً مالک حقیقی کا منکر ہوتا ہے: اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ...۔
۵۔ مؤمن مال کو اللہ کی عطا کردہ نعمت سمجھتا ہے: وَلَوْلَاۤ ... قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ...۔
۶۔ مؤمن مال پر رحمت خدا کی امید کو ترجیح دیتا ہے: خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ...۔
۷۔ مؤمن عاقبت اندیش ہوتا ہے۔ مال کی ناپائیداری پر نظر رکھتا ہے: وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا...۔
۸۔ مؤمن کو سرمایہ دار کی ندامت کا مشاہدہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے: فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ...۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا۝۴۵

۴۵۔ اور ان کے لیے دنیاوی زندگی کی یہ مثال پیش کریں: یہ زندگی اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے آسمان سے برسایا جس سے زمین کی روئیدگی گھنی ہو گئی پھر وہ ریزہ ریزہ ہو گئی، ہوائیں اسے اڑاتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ زندگی کو کبھی رعنائیاں مل جاتی ہیں۔ بارش کے پانی سے زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ کھیت لہلہانے لگتے ہیں۔ ہر طرف بہار ہی بہار ہوتی ہے۔ پھر یکایک وہی زندگی بے رونق ہو جاتی اور ہر طرف خزاں ہی خزاں ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ دنیا کی ہر چیز ناپائیدار ہے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ

۴۶۔ مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہیں اور ہمیشہ باقی رہنے والی نیکیاں آپ کے پروردگار

عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیۡرٌ اَمَلًا ۝۴۶	کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے اور امید کے اعتبار سے بھی بہترین ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں مال و اولاد اور باقیات صالحات میں موازنہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مال و اولاد جو باقیات صالحات کا مصداق نہیں بنتے وہ صرف چند دنوں کی زیب و زینت ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن بعض مقامات پر مال کی مذمت کرتا ہے۔ مثلاً فرمایا:

وَ الَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَ الۡفِضَّةَ وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَهَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۝[1]	اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔

اور مال کی فضیلت میں فرمایا:

مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ...[2]	جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس کی سات بالیاں اگ آئیں جن میں سے ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں اور اللہ جس (کے عمل) کو چاہتا ہے دگنا کر دیتا ہے۔

اس آیت کی رو سے مال سے وہ نیکی مل سکتی ہے جس کا سات سو گنا ثواب ہے۔ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ کے مطابق اس کو دگنا کریں تو چودہ سو ہو جاتے ہیں۔

اولاد کے بارے میں فرمایا:

وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۝[3]	اور جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں اور بے شک اللہ ہی کے ہاں اجر عظیم ہے۔

دوسری طرف انبیاء علیہم السلام اللہ سے اولاد مانگتے ہیں:

رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ...[4]	پروردگارا! مجھے اپنی عنایت سے صالح اولاد عطا کر۔
وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ اتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّیَّتُهُمۡ بِاِیۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ ...[5]	اور جو لوگ ایمان لے آئے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی ان کی اولاد کو (جنت میں) ہم ان سے ملا دیں گے۔

---

[1] ۹ توبہ: ۳۴　[2] ۲ بقرۃ: ۲۶۱　[3] ۸ انفال: ۲۸　[4] ۳ آل عمران: ۳۸　[5] ۵۲ طور: ۲۱

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ اَزۡوَاجِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ...[1]

دائمی جنتیں ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادا ان کی ازواج اور اولاد میں سے جو نیک ہوں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے:

اَلْوَلَدُ الصَّالِحُ رَیْحَانَۃٌ مِنَ اللّٰہِ...[2]

نیک اولاد اللہ کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

مِنْ سَعَادَۃِ الرَّجُلِ الْوَلَدُ الصَّالِحُ۔[3]

نیک اولاد انسان کے لیے باعث سعادت ہے۔

مذمت مال و اولاد: مال اور اولاد کے بارے میں حتی حکومت و اقتدار کے بارے میں اسلام کا موقف یہ ہے کہ یہ چیزیں اگر بذات خود مقصد بن جائیں تو مذمت ہے دوسرے لفظوں میں یہ چیزیں اگر رضائے خدا کے مقابلے میں آجائیں تو مذمت ہے اور اگر یہ چیزیں خود مقصد نہ ہوں بلکہ خدائی مقاصد کے لیے ذریعہ ہوں تو اس صورت میں ان کے لیے فضیلت ہے۔

خود دنیا کی زندگی اگر راہ خدا میں گزاری جائے فضیلت ہے۔ ورنہ دنیا برائے دنیا مذمت ہے۔ اسی لیے حضرت علی علیہ السلام نے اس شخص کی سرزنش فرمائی جو دنیا کی مذمت کر رہا تھا فرمایا:

اِنَّ الدُّنْیَا دَارُ صِدْقٍ لِمَنْ صَدَقَھَا وَ دَارُ عَافِیَۃٍ لِمَنْ فَھِمَ عَنْھَا وَ دَارُ غِنًی لِمَنْ تَزَوَّدَ مِنْھَا وَ دَارُ مَوْعِظَۃٍ لِمَنِ اتَّعَظَ بِھَا مَسْجِدُ اَحِبَّاءِ اللّٰہِ وَ مُصَلّٰی مَلَائِکَۃِ اللّٰہِ وَ مَھْبِطُ وَحْیِ اللّٰہِ وَ مَتْجَرُ اَوْلِیَاءِ اللّٰہِ...[4]

بلاشبہ دنیا اس شخص کے لیے جو باور کرے سچائی کا گھر ہے اور جو اس کی ان باتوں کو سمجھے اس کے لیے امن و عافیت کی منزل ہے اور جو اس سے زاد راہ حاصل کرے اس کے لیے دولتمندی کی منزل ہے اور جو اس سے نصیحت حاصل کرے اس کے لیے وعظ نصیحت کا محل ہے۔ وہ دوستان خدا کے لیے عبادت کی جگہ، اللہ کے فرشتوں کے لیے نماز پڑھنے کا مقام، وحی الٰہی کی منزل اور اولیاء اللہ کی تجارت گاہ ہے۔

مال رضائے الٰہی کا ذریعہ بن جائے تو مال کی نہ صرف مذمت نہیں ہے بلکہ یہ باقیات صالحات کا مصداق بن جاتا ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں زکوۃ دینے کا حکم ہے، یہ مال کسب کرنے کا حکم ہے کیونکہ مال کسب کیے بغیر زکوۃ نہیں دی جا سکتی۔ حدیث میں آیا ہے:

اَلْکَادُّ عَلَی عِیَالِہِ کَالْمُجَاھِدِ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ.[5]

اپنے اہل و عیال کے لیے محنت کرنے والا راہ خدا میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔

---

[1] رعد: ۲۳ [2] الکافی ۶: ۳، باب فضل الولد [3] الکافی ۶: ۳

[4] نہج البلاغۃ ح ۱۳۱ [5] الکافی ۵: ۸۸ باب من کد علی عیالہ

لٰہذا مال کے رضائے الٰہی کا ذریعہ ہونے کا سلسلہ انسان کا اپنا پیٹ پالنے اور اپنے بال بچوں کو پالنے کے لیے روزی کمانے سے شروع ہوتا ہے۔ ایک شخص اپنا پیٹ پالنے اور اپنی عزت و وقار کو بحال رکھنے کے لیے روزی کماتا ہے:

خَیْرُ الْمَالِ مَا وَقَی الْعِرْضَ۔[1] بہترین مال وہ ہے جس سے آبرو محفوظ رہے۔

اس کے بعد غریبوں کی مدد اور راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے کماتا ہے۔ ان سب جگہوں پر مال مقدس مقصد کا ذریعہ ہے۔

مال خود مقصد اور قابل مذمت کب ہوتا ہے؟: وہ بھی پیٹ سے شروع ہوتا ہے. ایک شخص اپنے ذاتی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے مال کماتا ہے مگر حرام ذرائع سے کماتا ہے۔ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کماتا ہے جو واجب ہے اور واجب، عبادت ہے لیکن اس نے اس واجب عمل کو حرام کے ذریعے انجام دیا تو حرام سے واجب ادا نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ مال جب رضائے الٰہی سے متصادم ہو جائے اور باقیات صالحات کے مصداق میں نہ آئے تو ایسے مال کی مذمت ہے۔

باقیات الصالحات: شیعہ سنی مصادر میں یہ روایت کثرت سے ملتی ہے کہ باقیات صالحات سے مراد تسبیحات اربعہ سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر ہیں، بعض دیگر روایات کے مطابق اس سے مراد نماز ہے۔ درحقیقت ان روایات میں باقیات صالحات کے اہم مصادیق کا ذکر ہے۔

حدیث میں آیا ہے:

اِنَّ کَانَ اللّٰہُ عزَّ وَ جَلَّ قال اَلۡمَالُ وَالۡبَنُوۡنَ زِیۡنَۃُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا اِنَّ الثَّمَانِیَۃَ رَکَعَاتٍ یَصلّیھَا الۡعَبۡدُ آخِرَ اللَّیۡلِ زِینۃُ الآخِرَۃِ۔[2]

اللہ نے تو فرمایا کہ مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہیں مگر رات کے آخری حصے میں پڑھی جانے والی آٹھ رکعت نماز آخرت کی زینت ہے۔

اہم نکات

۱۔ وہ مال جو خود مقصد ہو، قابل مذمت ہے۔

۲۔ مقدس مقصد کا ذریعہ بننے والا مال، بہترین چیز ہے۔

وَ یَوۡمَ نُسَیِّرُ الۡجِبَالَ وَ تَرَی الۡاَرۡضَ بَارِزَۃً ۙ وَّ حَشَرۡنٰہُمۡ فَلَمۡ

۴۷۔ اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور زمین کو آپ صاف میدان دیکھیں گے اور سب کو ہم جمع کریں گے اور ان میں سے کسی ایک

---

[1] الوسائل۔ ۹/۴۵۶، باب الاستغناء عن الناس [2] التہذیب۔ ۲: ۱۲۰، باب کیفیۃ الصلوۃ

نُغَادِرۡ مِنۡهُمۡ اَحَدًا ﴿۴۷﴾　　کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔

تشریح کلمات

نُغَادِرۡ :　(غ د ر) غادر کے معنی چھوڑنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

وقوع قیامت کا ذکر ہے کہ اس دن زمین سے سارے پہاڑ غائب ہو جائیں گے اور زمین ہموار میدان بن جائے گی۔ پہاڑوں کے بارے میں مختلف آیات میں اسی مطلب کو بیان فرمایا ہے۔ مثلاً:

وَّ سُیِّرَتِ الۡجِبَالُ فَکَانَتۡ سَرَابًا ؕ[1]　　اور پہاڑ چلادیے جائیں گے تو وہ سراب ہو جائیں گے۔

وَّ بُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ۙ فَکَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۙ[2]　　اور پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے، تو یہ منتشر غبار بن کر رہ جائیں گے۔

ان سب آیتوں سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ قیامت کے دن کائناتی نظام میں ایک انقلاب آئے گا اور جس نظام سے ہم دنیا میں مانوس ہیں وہاں اس کی کوئی علامت نظر نہیں آئے گی۔ جیسا کہ فرمایا:

یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوۡا لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ....[3]　　یہ (انتقام) اس دن ہو گا جب یہ زمین کسی اور زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور سب خدائے واحد و قہار کے سامنے پیش ہوں گے....

اہم نکات

۱۔　قیامت کائناتی نظام طبیعت میں ایک انقلاب کا نام ہے۔

وَ عُرِضُوۡا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ ۫ بَلۡ زَعَمۡتُمۡ اَلَّنۡ نَّجۡعَلَ لَکُمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور وہ صف در صف تیرے رب کے حضور پیش کیے جائیں گے (تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا) تم اسی طرح ہمارے پاس آ گئے ہو جیسا کہ ہم نے پہلی بار تمہیں خلق کیا تھا بلکہ تمہیں تو گمان تھا کہ ہم نے تمہارے لیے وعدے کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا ہے۔

---

[1] ۷۸ نباء: ۲۰　[2] ۵۶ واقعہ: ۵۔۶　[3] ۱۴ ابراهیم: ۴۸

تفسیر آیات

اس آیت کا اشارہ مشرکین کی طرف ہے کہ وہ مشرکین ایک صف میں کھڑے ہوں گے۔

عَلٰی رَبِّکَ: آپ کے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ آپ کا رب اس لیے فرمایا کہ مشرکین اکیلا اللہ کو اپنا رب نہیں مانتے تھے۔ ان کے اپنے مختلف ارباب تھے جن کی یہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ صرف اللہ کو اپنا رب نہیں بلکہ اپنے ارباب کا رب مانتے تھے۔ اس لیے صحیح معنوں میں وہ اللہ کو رب نہیں مانتے تھے۔

لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا: آج وہ آپ کے رَبّ کے سامنے اسی طرح کھڑے ہیں جیسے وہ پہلی بار خلق ہو کر دنیا میں آئے تھے۔ اس وقت ان کے تن پر کپڑا تھا نہ دنیا کی کسی چیز کے وہ مالک تھے نہ بن سکتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بے بس تھے اور آج بھی وہ عریاں ہیں۔ کسی چیز کے مالک ہیں نہ بن سکتے ہیں اور بے بس ہیں۔ جیسا کہ وہ اس وقت سو فیصد دوسروں کے رحم وکرم پر منحصر تھے، آج بھی وہ دوسروں کے رحم و کرم پر منحصر ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ آج ان پر رحم و کرم کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں اور اللہ کا ان پر کوئی رحم و کرم نہ ہو گا چونکہ وہ صرف اللہ کو اپنا رب نہیں مانتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت میں نشاۃ ثانیہ کی بہت سی مثالیں نشاۃ اولیٰ میں موجود ہیں۔

وَ وُضِعَ الۡکِتٰبُ فَتَرَی الۡمُجۡرِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا فِیۡہِ وَ یَقُوۡلُوۡنَ یٰوَیۡلَتَنَا مَالِ ہٰذَا الۡکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیۡرَۃً وَّ لَا کَبِیۡرَۃً اِلَّاۤ اَحۡصٰہَا ۚ وَ وَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ وَ لَا یَظۡلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور نامۂ اعمال (سامنے) رکھ دیا جائے گا، اس وقت آپ دیکھیں گے کہ مجرمین اس کے مندرجات کو دیکھ کر ڈر رہے ہیں اور یہ کہ رہے ہیں: ہائے ہماری رسوائی! یہ کیسا نامہ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کر لیا ہے اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ ان سب کو حاضر پائیں گے اور آپ کا رب تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

تشریح کلمات

مُشۡفِقِیۡنَ: (ش ف ق) الاشفاق کسی کی خیر خواہی کے ساتھ اس پر تکلیف آنے سے ڈرنا۔

تفسیر آیات

وَوُضِعَ الۡکِتٰبُ: میں الۡکِتٰبُ سے مراد نامہ اعمال ہے چونکہ عرف میں الۡکِتٰبُ اس صحیفہ کو کہتے ہیں جس میں کچھ لکھا ہوا ہو۔ خواہ کسی کاغذ پر لکھا ہوا جیسے قرآن آیا ہے:

وَلَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ کِتٰبًا فِیۡ قِرۡطَاسٍ ...[1] اور (اے رسول) اگر ہم کاغذ پر لکھی ہوئی کوئی کتاب (بھی) آپ پر نازل کرتے....

خواہ دستور اور قانون میں درج ہو:

وَکَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ فِیۡہَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ...[2] اور ہم نے توریت میں ان پر (یہ قانون) لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان....

خواہ تقدیر و تکوین میں درج ہو جیسے

قُلۡ لَّنۡ یُّصِیۡبَنَاۤ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ۚ ...[3] کہد یجیے: اللہ نے جو ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے۔

یہاں الۡکِتٰبُ سے مراد وہ مندرجات بھی ہو سکتے ہیں جس میں انسان کے تمام اعمال و گفتار ثبت ہیں۔ جیسے فرمایا:

بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیۡہِمۡ یَکۡتُبُوۡنَ ○[4] ہاں! اور ہمارے فرستادہ (فرشتے) ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔

ہاں! ہمارے فرشتے ان کے پاس لکھ رہے ہیں۔ ثبت کرنے کا طریقہ کیا ہوگا؟ اس میں رائے زنی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ جب لوح کائنات میں کسی عمل یا گفتار کو ثبت فرماتا ہے تو اس کا ہمارے طریقہ ثبت کے ساتھ موازنہ کرنا درست نہیں ہے۔ ہم کائنات کو اس طرح مسخر نہیں کر سکتے جس طرح اللہ مسخر کر سکتا ہے۔ ہم نے جب شروع میں خطوط کے ذریعے ثبت کرنا سیکھا تو اسے بہت بڑا کارنامہ قرار دے دیا اور یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس طرح ثبت فرماتا ہے۔ بعد میں جب سائنس نے ثبت کرنے کے لیے جدید اسباب کو مسخر کیا تو ہم نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ بھی اس طرح اعمال و گفتار کو ثبت فرماتا ہے۔

بہر حال یہ تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمال کو ثبت فرماتا ہے اور کل قیامت کے دن انسان کو ان ثبت شدہ اعمال کا سامنا پڑے گا۔

وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا: اس کی دو تفسیریں ہیں: قدیم تفسیر یہ ہے کہ وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا عمل تو دنیا میں ہو چکا۔ اس دن اس عمل کی جزا حاضر پائیں گے اور تجسم اعمال کا نظریہ اسی سلسلے میں قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جب رسول خدا ﷺ معراج پر گئے تو دیکھا بعض قصور بن

---

[1] ۶ انعام: ۷ [2] ۵ مائدہ: ۴۵ [3] ۹ توبہ: ۵۱ [4] ۴۳ زخرف۔ ۸۰

رہے ہیں اور دیگر بعض ادھورے ہیں۔ پوچھنے پر جواب ملا: یہ قصر جس شخص کے لیے زیر تعمیر ہے وہ عمل خیر انجام دیتا ہے تو فرشتوں کو تعمیری مواد فراہم ہوتے ہیں۔ جب وہ نیک عمل کرتا ہے تو اس کا عمل انرجی ہے اور یہ مادے میں بدل جاتی ہے۔

یہ بات بھی اپنی جگہ واضح ہے کہ مادہ انرجی میں اور انرجی مادے میں بدل جاتی ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ کل قیامت کے دن خود عمل کو حاضر پائیں گے اور عمل جب ایک مرتبہ وجود میں آ جائے تو وہ نہیں مٹتا اور

وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ۙ﴿۱۱﴾[1] جب کہ تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز لکھنے والے۔

میں کتابت سے مراد خود عمل کا بنفسہ حفظ اور ثبت کرنا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو اپنے تمام اعمال کا سامنا کرنا پڑے گا: مَالِ ھٰذَا الۡکِتٰبِ....

۲۔ دنیا میں پردہ رہ جاتا ہے آخرت میں عمل فاش ہو جائے گا۔ عَمِلُوۡا حَاضِرًا....

مزید تحقیق کے لیے رجوع فرمائیے: تفسیر عیاشی ۔۲: ۲۸۴

وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ کَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوۡنَہٗ وَ ذُرِّیَّتَہٗۤ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِیۡ وَ ہُمۡ لَکُمۡ عَدُوٌّ ؕ بِئۡسَ لِلظّٰلِمِیۡنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اور (یہ بات بھی) یاد کریں جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنات میں سے تھا، پس وہ اپنے رب کی اطاعت سے خارج ہو گیا، تو کیا تم لوگ میرے سوا اسے اور اس کی نسل کو اپنا سرپرست بناؤ گے حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ یہ ظالموں کے لیے برا بدل ہے۔

تفسیر آیات

کَانَ مِنَ الۡجِنِّ: سوال یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ اگر ابلیس جنات میں سے تھا تو آدم کے لیے سجدے کے حکم میں ابلیس کیسے شامل ہوا کیونکہ سجدہ کرنے کا حکم تو فرشتوں کو ہوا تھا؟

جواب دیا گیا ہے کہ ابلیس فرشتوں کے ساتھ ''مقام قدس'' پر فائز تھا اور یہ حکم ''مقام قدس'' میں

---

[1] ۸۲ انفطار: ۱۰: ۱۱

اقامت پذیروں کے لیے تھا۔ اس میں ابلیس بھی شامل تھا۔ چنانچہ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ [1] سے ظاہر ہے۔ اللہ کا اس فرمان: فَاهۡبِطۡ مِنۡهَا فَمَا یَکُوۡنُ لَکَ اَنۡ تَتَکَبَّرَ فِیۡهَا ... میں بھی اس مقام کی طرف اشارہ ہے جس میں مِنۡهَا اور فِیۡهَا کی ضمیر اسی مقام کی طرف جاتی ہے۔[2]

چنانچہ اس آیت میں فرمایا: کَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهٖ یعنی ابلیس جنات میں سے تھا جس کی وجہ سے وہ اطاعت رب سے خارج ہوا۔ فَفَسَقَ میں فاء تفریعی ہے۔ اس کا مطلب یہ بنتا ہے وہ جنات میں سے ہونے کی وجہ سے فاسق ہو گیا۔ کیونکہ انس اور جن فرشتوں کی طرح معصوم نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں قابل آزمائش اور خود مختار مخلوق ہیں۔ یہ خود مختار مخلوق کبھی فرشتوں سے بھی بالاتر ہو جاتی ہے اور کبھی شیطان سے بھی پست تر۔

دوسرے جملے میں فرمایا: کیا تم مجھے چھوڑ کر ابلیس اور اس کی نسل کو اولیاء بناتے ہو جب کہ یہ تمہارے دشمن ہیں۔ آیت میں ولایت سے مراد ولایت مالک و ربوبیت ہو سکتی ہے کیونکہ یہاں ابلیس کی ولایت اللہ کی ولایت کے مقابلے میں ہے۔ ظاہر ہے اللہ رب اور مالک ہے۔

مَاۤ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَا خَلۡقَ اَنۡفُسِهِمۡ ۪ وَمَا کُنۡتُ مُتَّخِذَ الۡمُضِلِّیۡنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

۵۱۔ میں نے انہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا مشاہدہ نہیں کرایا اور نہ خود ان کی اپنی تخلیق کا اور میں کسی گمراہ کرنے والے کو اپنا مددگار بنانے والا نہیں ہوں۔

تفسیر آیات

مَاۤ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ: میں ھُم کی ضمیر مشرکین کی جانے کی صورت میں آیات کا مطلب یہ بنتا ہے: مشرکین کو کہاں سے علم ہوا کہ اللہ کا کوئی شریک ہے۔ خود مشرکین کے نزدیک بھی خالق اللہ ہے اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو ان کے سامنے نہیں بنایا۔ ان کو کہاں سے علم ہوا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں یا یہ بت اللہ کے مقرب ہیں۔ اس صورت میں جملہ وَمَا کُنۡتُ مُتَّخِذَ الۡمُضِلِّیۡنَ عَضُدًا کے ساتھ ربط نہیں بنتا۔

اگر ضمیر ابلیس اور اس کی اولاد کی طرف جاتا ہے تو آیت کا مطلب یہ بنتا ہے: ہم نے ابلیس اور اس کی اولاد کو کائنات کی خلقت کے وقت حاضر نہیں کیا تھا کہ ابلیس کا بھی تدبیر کائنات میں کوئی حصہ ہو۔ کیونکہ جب جب تخلیق کا مشاہدہ نہیں ہے تو ابلیس اور اس کی اولاد کو اس بارے میں علم نہیں ہے اور جب علم نہیں ہے تو علم کے بغیر تدبیر کیسے کر سکتے ہیں۔ علم کے بغیر شفاعت بھی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] بقرۃ: ۳۰ [2] المیزان ذیل آیہ ۱۱ سورہ اعراف

جہاں شفاعت کا ذکر کیا ہے غالباً وہاں علم کا بھی ذکر آیا ہے:

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ....[1] زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے، کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے؟ جو کچھ لوگوں کے روبرو اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے وہ ان سب سے واقف ہے.

آیت کی اس تفسیر کو ہم درست تصور کرتے ہیں کیونکہ اس صورت میں جملہ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ''میں کسی گمراہ کرنے والے کو اپنا مددگار بنانے والا نہیں ہوں'' کے ساتھ ربط بنتا ہے کہ اللہ تدبیر کائنات میں ایسے گمراہ کرنے والوں کو اپنا بازو نہیں بناتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے: کیا اللہ کو کسی کو اپنا بازو بنانے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے؟

جواب یہ ہے کہ کائنات کے نظام کے لیے اللہ ذرائع استعمال فرماتا ہے، احتیاج کی بنیاد پر نہیں، حکمت کی بنیاد پر۔ مثلاً: اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ....[2] اس آیت میں فرمایا: اللہ تعالیٰ کسی گمراہ کن کو اپنا بازو نہیں بناتا۔

حضرت علی علیہ السلام سے جب کہا گیا کہ آپ کی حکومت کی مصلحت اس میں ہے کہ فی الحال معاویہ کو معزول نہ کیا جائے تو آپؑ نے فرمایا:

میں ظلم و جور کو ذریعہ بنا کر عدل قائم نہیں کروں گا۔ پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

ایک نہایت توجہ طلب مسئلہ یہ ہے جو اکثر ہماری دینی زندگی میں پیش آتا ہے۔ ہم ایک کار خیر کے لیے دانستہ یا نادانستہ طور پر گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ثواب کے حصول کے لیے گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ ایک مسجد، مدرسہ، امام بارگاہ یا مجلس قائم کرنے کے سلسلے میں کسی مومن کی غیبت یا اہانت کرتے ہیں یا کسی کا حق مارتے ہیں۔ اس سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہم اس کار خیر کو اللہ کی رضا جوئی کے لیے نہیں کر رہے تھے ورنہ اس کار خیر کے ذریعے اللہ کو ناراض نہ کرتے۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۔[3]

اہم نکات

۱۔ جنہیں اللہ نے کائنات کی خلقت کا مشاہدہ نہیں کرایا وہ وسیلہ نہیں بن سکتے۔

۲۔ باطل حق کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۵۵　[2] ۴۷ محمد: ۷ (ترجمہ) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔

[3] ۵۹ حشر: ۲ (ترجمہ) پس اے بصیرت رکھنے والو! عبرت حاصل کرو۔

وَ یَوۡمَ یَقُوۡلُ نَادُوۡا شُرَکَآءِیَ الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ فَدَعَوۡہُمۡ فَلَمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَہُمۡ وَ جَعَلۡنَا بَیۡنَہُمۡ مَّوۡبِقًا ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اور جس دن اللہ فرمائے گا: انہیں بلاؤ جنہیں تم نے میرا شریک ٹھہرایا تھا تو وہ انہیں بلائیں گے لیکن وہ انہیں جواب نہیں دیں گے اور ہم ان کے درمیان ہلاکت کی ایک جگہ بنا دیں گے۔

وَ رَاَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ النَّارَ فَظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ مُّوَاقِعُوۡہَا وَ لَمۡ یَجِدُوۡا عَنۡہَا مَصۡرِفًا ﴿۵۳﴾

۵۳۔ اور مجرمین اس دن آتش جہنم کا مشاہدہ کریں گے اور سمجھ جائیں گے کہ انہیں اس میں گرنا ہے اور وہ اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے۔

تشریح کلمات

موبق: (و ب ق) ہلاکت کی جگہ۔

تفسیر آیات

وَجَعَلۡنَا بَیۡنَہُمۡ مَّوۡبِقًا: بَیۡنَہُمۡ ان کے درمیان، یعنی مشرکین اور شریکوں کے درمیان ہلاکت کی جگہ بنائیں گے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ اس ہلاکت کی جگہ مشرکین اور شریک دونوں کو ڈال دیا جائے گا۔ عین ممکن ہے کہ اس ہلاکت گاہ میں مشرکین کو ڈال دیا جائے کیونکہ یہاں گفتگو مشرکین کے بارے میں ہے شریکوں کے بارے میں نہیں ہے۔

لہٰذا یہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ شریکوں کو ہلاکت میں کیسے ڈالا جائے گا جب کہ لوگوں نے بعض انبیاء، ائمہ علیہم السلام اور فرشتوں کو بھی شریک بنایا ہے؟

اہم نکات

۱۔ وہ مشرکین جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں، ان کا کوئی سننے والا نہیں ہے۔

وَ لَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِلنَّاسِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ اَکۡثَرَ شَیۡءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اور بتحقیق ہم نے اس قرآن میں انسانوں کے لیے ہر مضمون کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو (ثابت ہوا) ہے۔

تشریح کلمات

جَدَلًا: (ج د ل) الجدال۔ مفاعلہ ایسی گفتگو کرنا جس میں طرفین ایک دوسرے پر غلبہ حاصل

کرنے کی کوشش کریں۔

تفسیر آیات

یعنی ہم نے اس قرآن میں طرز استدلال کے کئی اسلوب اپنائے اور گفتگو کے تمام محاورے استعمال کیے اور دلیل و حجت کے تمام انداز اختیار کیے مگر یہ ناشکرا انسان قبول حق کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۹۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَهُمُ الۡهُدٰی وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِیَهُمۡ سُنَّةُ الۡاَوَّلِیۡنَ اَوۡ یَاۡتِیَهُمُ الۡعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اور جب ان کے پاس ہدایت آ گئی تھی تو ایمان لانے اور اپنے پروردگار سے معافی طلب کرنے سے لوگوں کو کسی چیز نے نہیں روکا سوائے اس کے کہ ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جائے جو ان سے پہلوں کے ساتھ ہوا یا ان کے سامنے عذاب آ جائے۔

تفسیر آیات

یہ لوگ سابقہ امتوں کی روش پر چلتے ہیں۔ عذاب آنے تک ایمان نہیں لاتے، جب کہ عذاب آنے کے بعد کا ایمان ان کے لیے فائدہ مند نہیں ہے۔

فَلَمۡ یَکُ یَنۡفَعُهُمۡ اِیۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا۔۔۔۔[1]　لیکن ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے فائدہ مند نہیں رہے گا۔۔۔۔

اس قسم کا ایمان فرعون بھی غرق ہوتے وقت لایا تھا۔ دوسرے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے مشاہدے کے بعد ایمان و توجہ سود مند نہیں ہے کیونکہ اللہ کو وہ ایمان قبول ہے جو قلب و شعور سے عاشقانہ اور خود مختارانہ طور پر لا جائے۔ عذاب کا سامنا کرنے کے بعد کا ایمان قلب و شعور کا ایمان نہیں ہے۔

ثانیاً وہ ایمان سود مند ہے جس کے کردار پر اثرات ہوں۔ عذاب سامنے آنے کے بعد کا ایمان کسی کردار کے لیے محرک نہیں بن سکتا کیونکہ عذاب کے سامنے آنے کے بعد تو کسی عمل و کردار کی مہلت ختم ہو چکی ہو گی۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کا وہ دعویٰ درست نہیں ہے جس سے اس کے کردار پر کوئی اثر نہ ہو۔ بغیر کسی کردار کے صرف ایمان کوئی معنی نہیں رکھتا۔

---

[1] ۴۰ مومن: ۸۵

اہم نکات

۱۔ مہلت ختم ہونے کے بعد کا ایمان مفید نہیں ہے۔
۲۔ وہ ایمان، ایمان نہیں ہے جس کا کسی کردار پر کوئی اثر نہ ہو۔

وَ مَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ ۚ وَ یُجَادِلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِیُدۡحِضُوۡا بِہِ الۡحَقَّ وَ اتَّخَذُوۡۤا اٰیٰتِیۡ وَ مَاۤ اُنۡذِرُوۡا ہُزُوًا﴿۵۶﴾

۵۶۔اور ہم پیغمبروں کو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ وہ بشارت دیں اور تنبیہ کریں اور کفار باطل باتوں کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں تاکہ وہ اس طرح حق بات کو مسترد کر دیں، انہوں نے میری آیات کو اور ان باتوں کو جن کے ذریعے انہیں تنبیہ کی گئی تھی مذاق بنا لیا۔

تشریح کلمات

دحض: (د ح ض) باطل ثابت کرنا، اصل میں دَحضُ الرِّجل سے مشتق ہے جس کے معنی پاؤں کے پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی سیرت، تکلیف شرعی اور اس کے مقابلے میں کفار کا رویہ مذکور ہے۔ وہ یہ کہ رسولوں کا طریقہ عمل یہ ہے کہ مؤمنین کو بشارت دیں، منکرین کو تنبیہ کریں اور بس۔ نہ طاقت استعمال کریں، نہ ان کو کسی عقیدے پر مجبور کریں، نہ ہی کسی عقیدے کی بنیاد پر کسی پر زیادتی کریں۔ اس کے مقابلے میں کفار حق کو مسترد کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت استعمال کرتے ہیں اور اس دستور حیات کو تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام لے کر آتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء صرف حجت پوری کرتے ہیں اور کافر پوری طاقت استعمال کرتے ہیں: لِیُدۡحِضُوۡا بِہِ الۡحَقَّ ....
۲۔ کفار اس دستور حیات کو تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں جسے اللہ کے رسولوں نے پیش کیا: اٰیٰتِیۡ وَ مَاۤ اُنۡذِرُوۡا ہُزُوًا۔

وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ ذُکِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ

۵۷۔اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جسے اس کے

فَاَعۡرَضَ عَنۡهَا وَنَسِیَ مَا قَدَّمَتۡ یَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ یَّفۡقَهُوۡهُ وَفِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا ؕ وَاِنۡ تَدۡعُهُمۡ اِلَی الۡهُدٰی فَلَنۡ یَّهۡتَدُوۡۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

رب کی آیات کے ذریعے نصیحت کی گئی تو اس نے ان سے منہ پھیر لیا اور جو ان گناہوں کو بھول گیا جنہیں وہ اپنے ہاتھوں آگے بھیج چکا تھا؟ ہم نے ان لوگوں کے دلوں پر یقیناً پردے ڈال دیے ہیں تا کہ وہ سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں کو سنگین کر دیا ہے (تا کہ وہ سن نہ سکیں) اور اب اگر آپ انہیں ہدایت کی طرف بلائیں بھی تو یہ کبھی راہ راست پر نہیں آئیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ ذُکِّرَ: جو شخص مشفقانہ نصیحتوں سے منہ پھیر لیتا ہے اور اپنے جرائم کا احساس بھی نہیں کرتا وہ مردہ ضمیر ہے۔ اس کا دل کسی بات کے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا، نہ اس کا ضمیر کسی گناہ کا احساس کرتا ہے۔

۲۔ اِنَّا جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً: ہم نے اس سے پہلے کئی بار اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ اللہ کی طرف سے دلوں پر مہر لگانے اور گمراہی میں ڈالنے کا کیا مطلب ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ کی طرف سے ہدایت کے اسباب فراہم کرنے کے بعد ایک شخص گمراہی پر قائم رہتا ہے تو اللہ اس سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ کے بعد کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔ نتیجتاً وہ گمراہی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا ہے۔

۳۔ وَاِنۡ تَدۡعُهُمۡ اِلَی الۡهُدٰی: اگر اے رسول! آپ ان کو ایمان کی دعوت دیں گے تو وہ کسی صورت بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس وقت دو صورتیں سامنے آتی ہیں: یا تو انہیں ایمان لانے پر مجبور کریں یا اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ ایمان لانے پر جبر کرنا صحیح نہیں ہے تو دوسری صورت باقی رہتی ہے کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

اہم نکات

۱۔ ضمیر زندہ رکھنے کے لیے اللہ کی نصیحتوں پر توجہ دینی اور اپنے گناہوں پر نادم رہنا چاہیے۔

۲۔ نصیحت مسترد کرنے اور گناہ کا احساس نہ کرنے سے انسان ناقابل ہدایت ہو جاتا ہے: فَلَنۡ یَّهۡتَدُوۡۤا اِذًا اَبَدًا...

وَرَبُّكَ الۡغَفُوۡرُ ذُو الرَّحۡمَةِ ؕ لَوۡ　　۵۸۔ اور آپ کا پروردگار بڑا بخشنے والا، رحمت کا مالک

يُؤَاخِذُهُمۡ بِمَا كَسَبُوۡا لَعَجَّلَ لَهُمُ الۡعَذَابَ ؕ بَلۡ لَّهُمۡ مَّوۡعِدٌ لَّنۡ يَّجِدُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖ مَوۡئِلًا ﴿۵۸﴾

ہے، اگر وہ ان کی حرکات پر انہیں گرفت میں لینا چاہتا تو انہیں جلد ہی عذاب دے دیتا لیکن ان کے لیے وعدے کا وقت مقرر ہے، وہ (اس سے بچنے کے لیے) اس کے سوا کوئی پناہ گاہ ہرگز نہیں پائیں گے۔

وَ تِلۡكَ الۡقُرٰۤى اَهۡلَكۡنٰهُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا وَ جَعَلۡنَا لِمَهۡلِكِهِمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۵۹﴾

۵۹۔ اوران بستیوں کو ہم نے اس وقت ہلاکت میں ڈال دیا جب انہوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے بھی ایک وقت مقرر کر رکھا تھا۔

تشریح کلمات

موئل: (و ء ل) پناہ گاہ۔

تفسیر آیات

وَ رَبُّكَ الۡغَفُوۡرُ ذُو الرَّحۡمَةِ: آیت کے اس حصے کی دو تفسیریں ممکن ہیں: پہلی تفسیر یہ ہے کہ اللہ مؤمنوں کے لیے خوب بخشنے والا اور رحمت کا مالک ہے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ اللہ مشرکوں کو نہیں بخشے گا۔ جیسا کہ فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ ....[1] یا اس بنیاد پر ہے کہ کافروں کے لیے ڈھیل دینا رحمت نہیں ہے بلکہ یہ ڈھیل کافروں کے خلاف ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ لَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِيۡ لَهُمۡ خَيۡرٌ لِّاَنۡفُسِهِمۡ ؕ اِنَّمَا نُمۡلِيۡ لَهُمۡ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ ....[2]

اور کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہم انہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو انہیں صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنے گناہوں میں اور اضافہ کر لیں....

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ بخشنے والا اور رحمت کا مالک ہے بشرطیکہ یہ لوگ اللہ کی رحمت اور مغفرت کے اہل بن جائیں اور شرک و کفر سے توبہ کریں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ ....[3] حالت شرک میں مرنے والوں کے لیے ہے کہ ان کو مغفرت نہیں ملے گی لیکن اگر توبہ کریں تو سابقہ شرک کا گناہ دھل جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کافروں کے لیے ڈھیل دینا ان کے حق میں نہیں ان کے خلاف ہے۔ یہ اس صورت میں درست ہے اگر وہ توبہ نہیں کرتے لیکن اگر کسی مرحلے میں کافر اور مشرک نے توبہ کر لی تو یہ ڈھیل اس کے لیے رحمت و مغفرت کا سبب ہے۔ البتہ اگر وہ اپنے شرک و کفر پر قائم رہتا ہے تو یہ ڈھیل اسی کے خلاف ہے۔

---

[1] و [3] نساء: ۱۱۶ (ترجمہ) اللہ صرف شرک سے درگزر نہیں کرتا....   [2] آل عمران: ۱۷۸

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف سے ڈھیل مؤمن کے لیے رحمت اور کافر کے لیے عذاب کا موجب ہے۔

۲۔ سزا کا مقررہ وقت آنے پر سزا نہیں ٹل سکتی: لَّنۡ یَّجِدُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖ مَوۡئِلًا ۔

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِفَتٰىہُ لَاۤ اَبۡرَحُ حَتّٰۤی اَبۡلُغَ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ اَوۡ اَمۡضِیَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾

۶۰۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا: جب تک میں دونوں سمندروں کے سنگم پر نہ پہنچوں اپنا سفر جاری رکھوں گا خواہ برسوں چلتا رہوں۔

تشریح کلمات

حُقُبًا: (ح ق ب) اس کے معنی زمانہ کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے ایک حقب اسّی (۸۰) سال ہے۔

لِفَتٰىہُ: (ف ت ی) جواں سال کو کہتے ہیں اور خادم کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ روایت کے مطابق یہ جوان یوشع بن نون ہیں جو بعد میں خود بھی نبوت کے مقام پر فائز ہوئے۔

شان نزول: مجمع البیان میں آیا ہے کہ جب رسول ﷺ نے اصحاب کہف کا واقعہ از روئے قرآن قریش سے بیان کیا تو انہوں نے آپؐ سے کہا: اس عالم کا بھی ہمیں بتائیں جس کی پیروی کرنے کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا تھا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر آیات

مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ: دو دریاؤں کا سنگم۔ ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسے شواہد نہیں ہیں کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کس دور میں پیش آیا تھا۔ مصر یا وادی سینا میں۔ اگر مصر میں پیش آیا ہے تو یہ سنگم دریائے نیل کی دونوں شاخوں کے ملنے کی جگہ ہو سکتی ہے۔ اگر یہ واقعہ وادی سینا میں پیش آیا ہے تو ممکن ہے یہ جگہ خلیج عقبہ اور خلیج سویز یا بحر ابیض اور بحر ارزق کے اتصال کی جگہ ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سنگم تک جانے کا اشارہ ملا ہوا ہے اور جملہ اَوۡ اَمۡضِیَ حُقُبًا خواہ برسوں چلتا رہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہر قیمت پر اس جگہ پہنچنا تھا۔ اس کی وجہ ہم آیندہ بتائیں گے۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجۡمَعَ بَیۡنِہِمَا نَسِیَا

۶۱۔ جب وہ ان دونوں کے سنگم پر پہنچ گئے تو وہ

حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾

دونوں اپنی مچھلی بھول گئے تو اس مچھلی نے چیر کر سمندر میں اپنا راستہ بنا لیا۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾

۶۲۔ جب وہ دونوں آگے نکل گئے تو موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا: ہمارا کھانا لاؤ ہم اس سفر سے تھک گئے۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَاۤ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾

۶۳۔ جوان نے کہا: بھلا آپ نے دیکھا کہ جب ہم چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی وہیں بھول گیا؟ اور مجھے شیطان کے سوا کوئی نہیں بھلا سکتا کہ میں اسے یاد کروں اور اس مچھلی نے تو عجیب طریقے سے سمندر میں اپنی راہ بنائی۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾

۶۴۔ موسیٰ نے کہا: یہی تو ہے جس کی ہمیں تلاش تھی، چنانچہ وہ اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس ہوئے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

۶۵۔ وہاں ان دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) کو پایا جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت عطا کی تھی اور اپنی طرف سے علم سکھایا تھا۔

تشریح کلمات

سَرَبًا: (س ر ب) السَّرْبُ کے اصل معنی نشیب کی طرف جانے کے ہیں۔

نَصَبًا: (ن ص ب) اَلنَّصَبُ کے معنی مشقت کے ہیں۔

غَدَآءَ: (غ د و) کھانا جو دن کے ابتدائی حصے میں کھایا جائے۔

اَرَءَيْتَ: یہ ترکیب بمعنی اخبرنی نہیں ہے۔ ابو حیان نے دو شرائط کا ذکر کیا ہے: پہلی شرط یہ ہے کہ جس چیز کی خبر دینا ہے وہ اسم اس کے ساتھ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس کے بعد آنے والا جملہ استفہامیہ ہو۔ یہاں دونوں شرائط نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

نَسِيَا حُوْتَهُمَا: دونوں اپنی مچھلی بھول گئے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خادم دونوں بھول گئے۔ خادم کا بھولنا واضح ہے کہ وہ بھول گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ اسلام کو مچھلی کے پانی میں جانے کا حال بتا دے۔ جیسا کہ خادم خود کہتا ہے مجھے شیطان نے بھلا دیا کہ اَنْ اَذْكُرَهٗ میں اسے یاد کروں لیکن یہ بات واضح نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ اسلام اس بھول میں کیسے شریک ہیں؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: اگرچہ بھولا صرف خادم ہے لیکن محاورۃً نسبت دونوں کی طرف دی گئی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ...[1]	اے گروہ جن و انس! کیا تمہارے پاس خودتم میں سے رسول نہیں آئے۔

ظاہر ہے کہ رسول تو صرف انس میں آئے لیکن خطاب جن و انس دونوں سے ہے کہ تم میں سے رسول آئے۔

چنانچہ سیاق آیت میں اس بات کا قرینہ موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بھول میں شریک نہیں تھے۔ پہلا قرینہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے فرمایا: اٰتِنَا غَدَآءَنَا کھانا حاضر کرو تو خادم نے کہا: فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ میں مچھلی بھول گیا۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ بھولنے والا صرف خادم تھا۔ دوسرا قرینہ یہ ہے جب خادم نے کہا: مچھلی عجیب طریقہ سے پانی میں چلی گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ یہی تو ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خادم کے کہنے پر پتہ چلا مچھلی پانی میں چلی گئی ہے۔ اگر بھول گئے ہوتے تو یہ تعبیر اختیار نہ کرتے۔ چونکہ بھولنا علم کے بعد ہوتا ہے جب کہ سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خادم کے کہنے پر علم ہوا کہ مچھلی ہمراہ نہیں ہے۔ بہت سے دیگر مفتیان کرام کی طرح تھانوی نے بھی فرمایا: شیطان کے اثر سے وسوسہ و نسیان کا پیش آنا ولایت بلکہ نبوت کے منافی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر دریابادی صفحہ ۶۱۵۔

فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا: سرب کے لغوی معنی نشیب کی طرف جانے کے ہیں۔ کہتے ہیں سرب الدمع آنسو رواں ہوگیا۔ سانپ کے اپنے بل میں اتر جانے کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ: اپنا راستہ بنا لیا سے بظاہر ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ مچھلی زندہ ہوگئی اور ارادۃً پانی میں چلی گئی۔ اس کے باوجود بزرگ مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ آیت سے مچھلی کے زندہ ہونے پر دلیل نہیں ملتی۔ ممکن ہے کہ مچھلی لب دریا کسی چٹان پر رکھ دی ہو اور وہ دریا میں گر گئی ہو یا سمندر کی لہروں کی زد

---

[1] ۶ انعام: ۱۳۰

میں آگئی ہو۔ یہ احتمال اس لیے بعید ہے کہ اگلی آیت میں بتایا: مچھلی نے عجیب طریقے سے دریا میں اپنا راستہ بنا لیا۔ ظاہر ہے کہ مچھلی کا چٹان سے پانی میں گر جانا یا لہروں کی زد میں آنا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

اٰتِنَا غَدَآءَنَا: ہمارا ناشتہ لاؤ۔ غَدَآءَ صبح کے کھانے اور عشاء شام کے کھانے کو کہتے ہیں۔

سیاق کلام سے واضح ہے کہ غَدَآءَ (کھانے) سے مراد مچھلی ہے۔ کیونکہ خادم نے جواب میں کہا: مچھلی (کھانا) تو میں چٹان پر بھول آیا اور اس نے عجیب طریقے سے دریا میں اپنی راہ بنائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مچھلی کھانے کے لیے تیار بھنی ہوئی تھی۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ مچھلی نے دریا میں اپنا راستہ بنا لیا اور میں آپ کو بتانا بھول گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ یہی تو ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ مچھلی کا واقعہ ایک ایسی علامت تھی جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے معلم کا پتہ معلوم ہونا تھا۔ اس میں ممکن ہے کہ یہ علامت مچھلی کا زندہ ہونا ہو۔ چنانچہ خادم کی بات سننے کے بعد اسی جگہ واپس ہو گئے اور فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ چنانچہ جس معلم کی تلاش تھی وہ اسی جگہ پر مل گئے۔

اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا: جسے اللہ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ رحمت سے مراد قرآنی اصطلاح میں نبوت ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی نبوت کے بارے میں فرمایا:

وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ ...[1] اور اس نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ معلم ایک نبی تھے۔

روایات کے مطابق یہ معلم حضرت خضرؑ تھے اور یہ بات رد کر دی گئی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے تھے۔

وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا: اسے ہم نے اپنی طرف سے علم سکھایا تھا۔ اس پورے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علم سے مراد علم تاویل ہے۔ اس دنیا میں وقوع پزیر ہونے والے ہر حادثہ اور واقعہ کے پیچھے جو حکمت کارفرما ہے اس کا علم ہے۔

اہم نکات

۱۔ استاد کی تلاش میں نکلنا انبیاء کی سیرت ہے۔

۲۔ زاد راہ ہمراہ رکھنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

۳۔ خادم ساتھ رکھنا تقویٰ اور ورع کے منافی نہیں ہے۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰی هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤی

۶۶۔ موسیٰ نے اس سے کہا: کیا میں آپ کے پیچھے چل سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے وہ مفید علم سکھائیں

اَنۡ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمۡتَ رُشۡدًا ﴿۶۶﴾　جو آپ کو سکھایا گیا ہے؟

تشریح کلمات

رُشۡدًا: (ر ش د) الرشد، غی کی ضد ہے اور ہدایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس حقیقت تک رسائی رشد ہے جو پردہ خفا میں ہے۔

تفسیر آیات

تعلیم کے ذکر سے پہلے اتباع کا ذکر بتلاتا ہے کہ شاگرد کے لیے استاد کی اتباع اور پیروی کرنا بنیادی بات اور ساتھ شاگردی کے آداب میں اتباع کو اولیت حاصل ہے۔ شاید اسی لیے اتباع کا ذکر پہلے اور تعلیم کا ذکر بعد میں آیا ہے۔

قَالَ اِنَّکَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ مَعِیَ صَبۡرًا ﴿۶۷﴾　۶۷۔ اس نے جواب دیا، آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔

تفسیر آیات

کہا: آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکیں گے۔

تعبیر میں تاکید ہے انّ اور لَنۡ کے ساتھ اور پیش بینی ہے کہ صبر نہیں ہو سکے گا۔ ساتھ اس کا سبب بھی مذکور ہے: اس بات پر کیسے صبر کر سکیں گے جو آپ کے احاطہ علم میں نہیں ہے۔

آگے ایسے تصرفات دکھائی دینے والے ہیں جو بظاہر منطق اور عدل و انصاف کے ساتھ متصادم ہیں۔ اس قسم کے تصرفات کسی ضمیر کے لیے قابل تحمل نہیں۔ چنانچہ بہت سے ایسے حالات ہر وقت وجود میں آتے رہتے ہیں جن کے ظاہری چہرے مکروہ، ناقابل قبول اور تلخ ہوتے ہیں۔ جب کہ ان حالات کے پیچھے جو حقائق پوشیدہ ہیں ان میں حسن اور مصلحت ہوتی ہے اور نہایت شیرین ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک انسان کو قتل کرنا کس قدر مکروہ اور قابل مذمت جرم ہے۔ چشم ظاہر بین اس سے نفرت کرتی ہے لیکن اگر یہ قتل قصاص کے سلسلے میں ہو تو نہ صرف قبیح نہیں ہے بلکہ قرآنی تعبیر کے مطابق یہ قتل، حیات ہے۔

وَ کَیۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰی مَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ خُبۡرًا ﴿۶۸﴾　۶۸۔ اور اس بات پر بھلا آپ کیسے صبر کر سکتے ہیں جو آپ کے احاطہ علم میں نہیں ہے؟

تفسیر آیات

ظاہر ہے علم کے بغیر صبر ممکن نہیں ہوتا۔ اگر شفا کے حصول کا علم نہ ہو تو معالجہ کی تلخی قابل تحمل نہیں ہوتی۔ حدیث میں آیا ہے:

وَمَنْ عَرَفَ قَدْرَ الصَّبْرِ لَا یَصْبِرُ عَمَّا مِنْهُ الصَّبْرُ۔۔۔۔[1]

اگر صبر کی قدر و قیمت کا علم ہو جائے تو جس پر صبر کرنا ہوتا ہے اس پر صبر نہ کرنے پر صبر نہ آتا۔

قَالَ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعۡصِیۡ لَکَ اَمۡرًا ﴿۶۹﴾

۶۹۔ موسیٰ نے کہا: انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔

تفسیر آیات

یہ ایک عزم و ارادے کا اظہار ہے اور حالات کا سامنا کرنے سے پہلے یہ اظہار اپنی جگہ سچا ہے۔

یہ عہد و پیمان حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس اعتبار سے دیا ہے کہ اللہ کے حکم سے جس استاد سے علم حاصل کرنا ہے وہ یقیناً خلاف شرع کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ بعد میں جو خلاف ورزی سرزد ہوئی ہے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام خلاف ورزی تصور نہیں کرتے تھے بلکہ وہ معلّم کی خلاف ورزی پر برہم تھے۔ بادی الرای میں اس برہمی کو خلاف ورزی تصور نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ معلّم کی طرف سے توجہ دلانے پر انہوں نے معذرت کی۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعۡتَنِیۡ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِیۡ عَنۡ شَیۡءٍ حَتّٰۤی اُحۡدِثَ لَکَ مِنۡہُ ذِکۡرًا ﴿۷۰﴾

۷۰۔ اس نے کہا: اگر آپ میرے پیچھے چلنا چاہتے ہیں تو آپ اس وقت تک کوئی بات مجھ سے نہیں پوچھیں گے جب تک میں خود اس کے بارے میں آپ سے ذکر نہ کروں۔

تفسیر آیات

کوئی بھی حادثہ یا مسئلہ پیش آتا ہے تو اس کے انجام کار کا انتظار کرنا ہو گا۔ اگر اس حادثے اور مسئلے کی کوئی توجیہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو لب اعتراض نہ کھولنا۔

اس واقعہ میں ان تمام سوالات کے جواب موجود ہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں ابھرتے ہیں کہ اللہ کے دیس میں یہ کیا ماجرا ہے کہ ایک شخص کا اکلوتا بیٹا حادثے کا شکار ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔ دوسرا شخص کثرت

---

[1] مستدرک الوسائل ۲: ۴۲۷ باب استحباب الصبر

کثرت اولاد کی وجہ سے غربت سے کراہتا ہے۔ ایک شخص کو اپنے پیارے بچے کے معالجے کے لیے ہزار روپیہ میسر نہیں اور دوسرا شخص اپنی بلی اور کتے پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

آگے آپ اسی واقعہ میں دیکھیں گے کہ ایک شخص کا واحد ذریعہ معاش کشتی ٹوٹ جاتی ہے اور دوسرے شخص کے سرمائے کو تحفظ دیا جاتا ہے اور ایک شخص کا اکلوتا بیٹا مارا جاتا ہے۔ اسی قسم کے مسائل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہی سوالات اٹھائے جو ہر کسی کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔

فَانۡطَلَقَا ٝ حَتّٰۤی اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیۡنَۃِ خَرَقَہَا ؕ قَالَ اَخَرَقۡتَہَا لِتُغۡرِقَ اَہۡلَہَا ۚ لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡئًا اِمۡرًا ﴿۷۱﴾

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّکَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ مَعِیَ صَبۡرًا ﴿۷۲﴾

۷۱۔ چنانچہ دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ ایک کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے کشتی میں شگاف ڈال دیا، موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے اس میں شگاف اس لیے ڈالا ہے کہ سب کشتی والوں کو غرق کر دیں؟ یہ آپ نے بڑا ہی نامناسب اقدام کیا ہے۔

۷۲۔ اس نے کہا: کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے؟

تشریح کلمات

اِمۡرًا: (ا م ر) کے معنی منکر (برائی) کے ہیں۔

تفسیر آیات

اس سلسلہ تعلیم کا پہلا سبق شروع ہوتا ہے اور درس چونکہ نظری و فکری درس تو تھا نہیں کہ کلاس روم میں دیا جائے بلکہ یہ عملی درس تھا۔ اس لیے اس درس کو واقعیت کا میدان درکار اور زمینی حقائق سے سروکار تھا۔ اس لیے وہ تحقیقاتی و تدریسی دورے پر نکلتے ہیں۔ حضرت معلّم سے ایسا عمل سرزد ہوتا ہے جو عقل و ضمیر کے لیے قابل تحمل نہیں ہے۔ ایک طرف تو کسی کے ذریعہ معاش کو نقصان پہنچایا، دوسری طرف کشتی پر سوار لوگوں کی جانوں کو خطرے میں ڈال دیا اور اس ارتکاب کے لیے کوئی جواز بھی پیش نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رہا نہیں گیا اور اسے نامناسب امر قرار دیا۔ چنانچہ حضرت معلّم کا عمل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توقع کے خلاف تھا۔ جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ردعمل حضرت معلّم کی توقع کے مطابق تھا۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذۡنِیۡ بِمَا نَسِیۡتُ وَ لَا

۷۳۔ موسیٰ نے کہا: مجھ سے جو بھول ہوئی ہے اس پر

تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿٧٣﴾	آپ میرا مؤاخذہ نہ کریں اور میرے اس معاملے میں مجھے سختی میں نہ ڈالیں۔

تشریح کلمات

لَا تُرْهِقْنِيْ: (ر ہ ق) کسی معاملے میں بزور جبر دبایا۔ رھق، ارھق مجرد مزید فیہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔

تفسیر آیات

یہاں بھول، بقول بعض مفسرین ترک کے معنوں میں ہے۔ میں نے جو عہد آپ کے ساتھ کیا تھا اس پر عمل کرنا ترک ہوا۔ اس پر معذرت چاہتا ہوں۔

حضرت معلّم سے نامناسب، غیر ضروری اور نامعقول عمل سرزد ہوتے دیکھ کر بادی النظر میں ردعمل کا ظاہر ہونا فطری ہے اور اس پر برہم ہونا قدرتی بات تھی۔ ایک طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور معلّم میں معاہدہ ہے دوسری طرف اس خلاف ورزی پر ردعمل قدرتی وفطری ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے عہد پر غالب آیا۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ﴿٧٤﴾	٧۴۔ پھر روانہ ہوئے یہاں تک کہ وہ دونوں ایک لڑکے سے ملے تو اس نے لڑکے کو قتل کر دیا، موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے ایک بے گناہ کو بغیر قصاص کے مار ڈالا؟ یہ تو آپ نے واقعی برا کام کیا۔

تفسیر آیات

اس سلسلہ تعلیم کا دوسرا درس شروع ہوا۔ اس مرتبہ پہلے سے زیادہ قابل سرزنش اور ناقابل تحمل جرم سرزد ہوتے دیکھا۔ ایک بے گناہ نَفْسًا زَكِيَّةً پاکیزہ جان کا قتل۔ اس مرتبہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکے۔ ان کا وجدان، ضمیر اور جذبہ اس عہد پر غالب آ گیا جو اپنے معلّم سے کر رکھا تھا کیونکہ ایک نوعمر لڑکے کا قتل شریعت، وجدان اور سب لوگوں میں قابل نفرت جرم ہے۔ اس بار بھی معلّم نے یاد دلایا:

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٥﴾	٧۵۔ اس نے کہا: کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے؟
قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا	٧٦۔ موسیٰ نے کہا: اگر اس کے بعد میں نے آپ

فَلَا تُصٰحِبۡنِیۡ ۚ قَدۡ بَلَغۡتَ مِنۡ لَّدُنِّیۡ عُذۡرًا ﴿۷۶﴾

سے کسی بات پر سوال کیا تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں میری طرف سے آپ یقیناً عذر کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔

فَانۡطَلَقَا ٝ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَیَاۤ اَہۡلَ قَرۡیَۃِۣ اسۡتَطۡعَمَاۤ اَہۡلَہَا فَاَبَوۡا اَنۡ یُّضَیِّفُوۡہُمَا فَوَجَدَا فِیۡہَا جِدَارًا یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّنۡقَضَّ فَاَقَامَہٗ ؕ قَالَ لَوۡ شِئۡتَ لَتَّخَذۡتَ عَلَیۡہِ اَجۡرًا ﴿۷۷﴾

۷۷۔ پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب وہ دونوں ایک بستی والوں کے ہاں پہنچ گئے تو ان سے کھانا طلب کیا مگر انہوں نے ان کی پذیرائی سے انکار کر دیا، پھر ان دونوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی جو گرنے والی تھی پس اس نے اسے سیدھا کر دیا، موسیٰ نے کہا: اگر آپ چاہتے تو اس کی اجرت لے سکتے تھے۔

تفسیر آیات

سلسلہ تعلیم کا تیسرا سبق شروع ہوتا ہے۔ اس مرتبہ درس کی نوعیت اور مضمون میں تبدیلی آ گئی ہے۔ پہلے اسباق میں وہ مضامین پڑھائے گئے جو بظاہر ناانصافی اور زیادتی دکھائی دیتے ہیں جب کہ اس مرتبہ وہ مضمون پڑھایا جا رہا ہے جس میں ایک ایسا عمل ہے جس میں کوئی حکمت اور فلسفہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا ہے۔

دونوں کو بھوک کا سامنا ہے۔ گاؤں والے کنجوس ہیں۔ بجائے اس کے کہ کوئی ایسا عمل انجام دیا جائے جس سے بھوک کا علاج ہو جائے ایک ایسا عمل شروع ہو گیا جس کا بظاہر کوئی فائدہ نہیں۔

اس مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے اعتراض کا محرک جذبات نہیں، خواہش نفسی اور حکمت عملی کے فقدان کا احساس ہے۔

قَالَ ہٰذَا فِرَاقُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنِکَ ۚ سَاُنَبِّئُکَ بِتَاۡوِیۡلِ مَا لَمۡ تَسۡتَطِعۡ عَّلَیۡہِ صَبۡرًا ﴿۷۸﴾

۷۸۔ انہوں نے کہا: (بس) یہی میری اور آپ کی جدائی کا لمحہ ہے، اب میں آپ کو ان باتوں کی تاویل بتا دیتا ہوں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

تفسیر آیات

اس تحقیقی و تدریسی سفر کا جاری رکھنا اب ممکن نہیں ہے جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوسرے سبق کے دوران ہی سمجھ لیا تھا اور کہا تھا: قَالَ اِنۡ سَاَلۡتُکَ عَنۡ شَیۡءٍۭ بَعۡدَہَا فَلَا تُصٰحِبۡنِیۡ ۔ اس کے بعد بھی میں نے

آپ سے کسی بات پر سوال کیا تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں لیکن جدائی سے پہلے ان واقعات سے پردہ اٹھاؤں جن پر تجھے اور ہر چشم ظاہر بین کو اعتراض تھا اور ان میں مضمر ان رازوں کا انکشاف کروں جو نظام حیات کی بہتری کے لیے ضروری ہیں:

اَمَّا السَّفِیۡنَۃُ فَکَانَتۡ لِمَسٰکِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ فِی الۡبَحۡرِ فَاَرَدۡتُّ اَنۡ اَعِیۡبَہَا وَ کَانَ وَرَآءَہُمۡ مَّلِکٌ یَّاۡخُذُ کُلَّ سَفِیۡنَۃٍ غَصۡبًا ﴿۷۹﴾

۷۹۔ وہ کشتی چند غریب لوگوں کی تھی جو سمندر میں محنت کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اسے عیب دار بنا دوں کیونکہ ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا جو ہر (سالم) کشتی کو جبراً چھین لیتا تھا۔

تفسیر آیات

اس واقعہ کی ظاہری صورت نہایت نامناسب اور زیادتی تھی کہ ان مسکینوں کا واحد ذریعہ معاش کشتی کو توڑ دیا جائے اور اس پر سوار لوگوں کو غرق آب ہونے کے خطرے سے دوچار کر دیا جائے۔ جب کہ اس حادثے کے پیچھے جو حکمت کارفرما ہے اس کے تحت ان مسکینوں کے ذریعہ معاش کو اس عمل کے ذریعہ تحفظ مل گیا۔

وَ اَمَّا الۡغُلٰمُ فَکَانَ اَبَوٰہُ مُؤۡمِنَیۡنِ فَخَشِیۡنَاۤ اَنۡ یُّرۡہِقَہُمَا طُغۡیَانًا وَّ کُفۡرًا ﴿ۚ۸۰﴾

۸۰۔ اور لڑکے (کا مسئلہ یہ تھا کہ اس) کے والدین مؤمن تھے اور ہمیں اندیشہ ہوا کہ لڑکا انہیں سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا۔

فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ یُّبۡدِلَہُمَا رَبُّہُمَا خَیۡرًا مِّنۡہُ زَکٰوۃً وَّ اَقۡرَبَ رُحۡمًا ﴿۸۱﴾

۸۱۔ پس ہم نے چاہا کہ ان کا رب انہیں اس کے بدلے ایسا فرزند دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر اور محبت میں اس سے بڑھ کر ہو۔

تفسیر آیات

اس واقعہ کی ظاہری صورت ایک انسان کا بلا جرم و گناہ قتل ہے جو بہت بڑا جرم ہے لیکن اس قتل کے پیچھے جو حکمت کارفرما ہے وہ قصاص کی طرح حیات آفرین ہے۔

فَکَانَ اَبَوٰہُ مُؤۡمِنَیۡنِ: ہم نے اس بچے سے اس کی زندگی سلب کر کے ان کے والدین پر احسان کیا ہے کیونکہ اس کے والدین مؤمن تھے اور انہیں اپنے بچے کے شر بچایا۔ جیسا کہ فرمایا:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَاَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ...[1] اے ایمان والو! تمہاری ازواج اور تمہاری اولاد میں سے بعض یقیناً تمہارے دشمن ہیں لہٰذا ان سے بچتے رہو۔

اس کا یہ مفہوم ہوسکتا ہے کہ والدین کے مؤمن ہونے کی وجہ سے اس سرکش بچے کی جان لے لی ہے۔ اگر والدین مؤمن نہ ہوتے تو اس کی جان نہ لیتا۔

فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَهُمَا: روایات میں آیا ہے کہ اس کے والدین کو اس بیٹے کی جگہ اللہ نے ایک بیٹی عنایت فرمائی جس سے جو بچہ پیدا ہوا وہ نبوت پر فائز ہوا ہے۔ اکثر روایات میں آیا ہے کہ اس بچی کی نسل سے ستر انبیاء پیدا ہوئے۔[2]

وَاَمَّا الۡجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيۡنِ يَتِيۡمَيۡنِ فِى الۡمَدِيۡنَةِ وَكَانَ تَحۡتَهٗ كَنۡزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوۡهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنۡ يَّبۡلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَيَسۡتَخۡرِجَا كَنۡزَهُمَا ۖ رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلۡتُهٗ عَنۡ اَمۡرِىۡ ؕ ذٰلِكَ تَاۡوِيۡلُ مَا لَمۡ تَسۡطِعْ عَّلَيۡهِ صَبۡرًا ؕ﴿۸۲﴾

۸۲۔ اور (رہی) دیوار تو وہ اسی شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ موجود تھا اور ان کا باپ نیک شخص تھا، لہٰذا آپ کے رب نے چاہا کہ یہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور آپ کے رب کی رحمت سے اپنا خزانہ نکالیں اور یہ میں نے اپنی جانب سے نہیں کیا، یہ ہے ان باتوں کی تاویل جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

تفسیر آیات

اس دیوار کا بنانا اگرچہ بظاہر بے سود اور بے فائدہ کام ہے لیکن درحقیقت ایک نیک اور صالح انسان کے سرمائے کا تحفظ ہے۔ ان بچوں نے بڑے ہوکر صالح اور نیک انسان بننا تھا۔ چنانچہ ان کے والد بھی نیک اور صالح تھے اس لیے ان کا مال بہترین ذریعہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

نعم المال الصالح للعبد الصالح۔[3] صالح عبد کے لیے صالح مال بہترین چیز ہے۔

ذٰلِكَ تَاۡوِيۡلُ مَا لَمۡ تَسۡطِعْ عَّلَيۡهِ صَبۡرًا: تاویل کے بارے میں مقدمہ میں بحث ہوگئی ہے کہ ہر واقعہ اور فعل کی تاویل وہ مرکزی نکتہ ہے جس پر اس فعل کی مصلحت اور اس کی افادیت کا انحصار ہے۔ وہی اس کا محرک اور جواز بنتا ہے۔

---

[1] ۶۴ تغابن: ۱۴　[2] الفقیه ۳: ۳۹۱ باب حال من یموت من اطفال المؤمنین　[3] بحار الانوار ۷۰: ۶۲

ایک سوال: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معلّم نے کسی کے مال پر تصرف کیسے کر لیا کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی کشتی کو نقصان پہنچایا۔ کسی شریعت میں بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ کسی کی ملکیت کو خراب کیا جائے۔

اسی طرح ایک بے گناہ لڑکے کا قتل کسی شریعت میں جائز نہیں ہے۔ خواہ یہ معلوم ہو کہ بڑا ہو کر اس نے کفر کا ارتکاب کرنا ہے چونکہ جرم سرزد ہونے سے پہلے سزا نہیں دی جاتی۔

اس کے جواب میں یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معلّم نے یہ کام اللہ کے حکم سے کیا تھا چونکہ اس میں تو شک نہیں ہے کہ یہ سب اللہ کے حکم سے ہوا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ نے ایک مکلّف کو یہ حکم کیسے دیا جب کہ اپنی کسی شریعت میں اس حکم کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے؟

اس کے جواب کی ایک یہ کوشش کی گئی ہے کہ کوئی شرعی جواز نکالا جائے۔ مثلاً کشتی کے بارے میں کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معلّم نے اذن فحوی کی بنا پر کشتی کو نقصان پہنچایا۔ اذن فحوی کا مطلب یہ ہے کہ جب مالک کو معلوم ہو گا کہ اس نقصان کی وجہ سے اس کی کشتی ظالم بادشاہ کے ہاتھ سے بچ گی تو وہ یقیناً اس نقصان پر راضی ہو جائے گا۔

کہتے ہیں یہ بچہ نابالغ اور کافر تھا اور مستقبل میں بڑے جرائم کا ارتکاب کرنے والا تھا۔ اس لیے جائز القتل تھا۔

رہی دیوار کی اصلاح۔ سو یہ ایک ایثار ہے اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اس جواب میں فقہی اعتبار سے سقم موجود ہے اور تاریخی اعتبار سے بچے کا بلوغ ثابت نہیں ہے۔

اس مسئلے میں زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ کسی مکلّف انسان کا عمل نہیں ہے کہ گزشتہ اعتراضات وارد ہو جائیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے نظام تکوینی میں رونما ہونے والے واقعات کو تمثیلی طور پر پیش کیا گیا ہے اور ان واقعات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معلّم کے عمل کی صورت میں دکھایا گیا ہے، درحقیقت یہ اللہ کی طرف سے تھے۔

چنانچہ دیوار کے بارے میں فرمایا: فَاَرَادَ رَبُّكَ تیرے رب نے ارادہ کیا اور آخر میں فرمایا: وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ۔ یہ کام میں نے اپنی جانب سے نہیں کیا۔

چنانچہ روزمرہ مشاہدہ ہے کہ ایک شخص کا اکلوتا بچہ مر جاتا ہے۔ دوسرے غریب مسکین کی جمع پونجی ضائع ہو جاتی ہے۔ تیسرے شخص کی دولت میں بے تحاشا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک ظالم کے پاس طاقت ہے اور ایک مظلوم کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کی توجیہ اور مصلحت عام لوگوں کے فہم سے خارج ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام تکوینی میں رونما ہونے والے اس قسم کے حالات اور حادثات کے پیچھے جو اسرار و رموز پوشیدہ ہیں ان سے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو آگاہ فرماتا ہے۔

سیر ملکوتی: اللہ تعالیٰ کے نظام تکوینی میں رونما ہونے والے اس قسم کے حالات و حادثات کے

پیچھے جو اسرار و رموز پوشیدہ ہیں اللہ تعالیٰ اپنے اولوالعزم رسولوں کو ان سے آگاہ فرماتا ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی ملکوتی نشانیوں سے آگاہ فرماتے ہوئے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ [1]

اور اس طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کا (نظام) حکومت دکھاتے تھے تا کہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائیں۔

آسمانوں اور زمین میں اللہ کی سلطنت کا مشاہدہ کرایا تا کہ ان کا ایمان بالشہود کے درجے پر فائز ہو جائے اور یقین کی اس منزل پر فائز ہو جائیں کہ آتش نمرود میں جاتے ہوئے جبرئیل امین جیسے مقتدر فرشتے کی مدد کو بھی نا قابل اعتنا سمجھیں۔

اسی طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی افق اعلیٰ کی سیر کرائی۔ چنانچہ فرمایا:

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝ [2]

تحقیق انہوں نے اپنے رب کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایمان بالغیب اور ایمان بالشہود، دونوں سے بالاتر مقام کی طرف اشارہ فرمایا:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ [3]

جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا۔

قلب و بصر دونوں سے بالاتر، مقام یقین پر فائز ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۲۶۰۔ سورہ الانعام آیت ۷۵۔

اسی طرح نظام کائنات کے پوشیدہ رازوں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مطالعہ کرانا مقصود ہے۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جس مرتبہ کا ملکوتی کا مطالعہ کرایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سے کمتر درجے کا مطالعہ کرایا ہے۔

چنانچہ اس درس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سیکھا کہ اس کائنات میں رونما ہونے والے ان واقعات جن کی ہم کوئی مثبت توجیہ نہیں کر سکتے، کے پیچھے ایک حکمت پوشیدہ ہے جو اس کائنات کے نظام اصلح کے لیے ضروری ہے۔

اہم نکات

۱۔ نظام کائنات میں اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو صبر سے کام لینا چاہیے اور تحقیق کا سفر جاری رکھنا چاہیے۔

۲۔ استاد شاگرد میں فکری ہم آہنگی نہ ہو تو زیادہ دیر ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔

۳۔ شاگردی کے لیے اتباع سب سے پہلی شرط ہے۔

۴۔ بے علم، بے صبر ہوتا ہے۔

---

[1] ۶ انعام۔ ۷۵　[2] ۵۳ نجم۔ ۱۸　[3] ۵۳ نجم: ۱۱

۵۔ حصول علم کے لیے طویل سفر کرنا پڑے تو کرنا چاہیے۔
۶۔ والدین کی نیکی کی ایک جزا یہ ہے کہ ان کی اولاد نیک ہوتی ہے اور ان کو تحفظ مل جاتا ہے۔
۷۔ اولاد کا مرنا کبھی والدین پر اللہ کا احسان ہوتا ہے۔

وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنۡ ذِی الۡقَرۡنَیۡنِ ؕ قُلۡ سَاَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ مِّنۡہُ ذِکۡرًا ﴿۸۳﴾

۸۳۔ اور لوگ آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہدیجیے: جلد ہی اس کا کچھ ذکر تمہیں سناؤں گا۔

تشریح کلمات

ذِی الۡقَرۡنَیۡنِ: دو سینگوں والا۔ یہ شخصیت کون ہے اور ان کو دو سینگوں والا کیوں کہا گیا؟ اس بارے میں مورخین اور مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ذوالقرنین دو سینگوں والا کی وجہ تسمیہ میں یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ خسرو نے سیڈیا اور فارس دونوں بادشاہتوں کو فتح کر لیا تھا۔ اس لیے دو سینگوں کا لقب دیا گیا اور سینگ اس زمانے میں طاقت کی نشانی ہو سکتی ہے۔ المیزان کے مطابق خسرو کا ایک مجسمہ ماضی قریب میں مرغاب جنوب ایران میں دریافت ہوا۔ اس میں اس کے تاج میں دو سینگ بھی ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ کو ذوالقرنین کہا گیا ہے۔

تفسیر آیات

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ: پوچھنے والے کون لوگ تھے؟ محمد بن اسحاق کی روایت[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالات کے اٹھانے والے یہود تھے۔ لہٰذا یہ سمجھنے کے لیے کہ ذوالقرنین سے مراد کون ہے؟ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہودیوں کے ہاں کس شخصیت کو ذوالقرنین کے عنوان سے شہرت حاصل تھی۔

جواب: یہودیوں کے ہاں جس عالمی فرماں روا کو ذوالقرنین کے نام سے شہرت حاصل تھی وہ ایران کے فرمان روا خسرو یا سائرس ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ جب ۵۳۹ ق م میں خسرو نے بابل کو فتح کیا تو اس نے بابل میں اسیر یہودیوں کو اپنے ملک واپس جانے کی اجازت دے دی جس کی وجہ سے یہودی دوبارہ اپنے وطن میں آباد ہوئے اور اسی خسرو نے یہودیوں کو ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی، جو یہودیوں کی تاریخ میں ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ لہٰذا زیادہ امکان یہی ہے کہ ذوالقرنین سے مراد خسرو ہی ہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل کے بعض انبیاء کی طرف سے یہ پیشگوئی ملتی ہے:

خداوند اپنے ممسوح (کورش) خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا

داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے سامنے زیر کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں۔[۲]

رہا یہ سوال کہ پھر مسلمانوں میں اس بات کو کیسے شہرت مل گئی کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی ہے؟ جواب یہ ہے کہ اسکندر اعظم کا تعلق تاریخ کی تدوین کے زمانے سے تھا۔ اس لیے سکندر مقدونی کا ذکر مدون تاریخ میں میسر تھا۔ ممکن ہے کہ ان مفسرین کو تاریخ میں سکندر مقدونی کے علاوہ کوئی عالمی حکمران نہ ملا ہو لہٰذا ناچار اسی کو ذوالقرنین قرار دیا ہو۔ چنانچہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

والملك الذی اشتهر فی کتب التواریخ ان ملکه بلغ هذا المبلغ لیس الا الاسکندر۔	اسکندر کے علاوہ کوئی ایسا بادشاہ نہیں گزرا جسے تاریخ کی کتابوں میں شہرت ملی ہو اور اس کی بادشاہت اس قدر وسیع ہو گئی ہو۔

جب کہ خسرو کا تعلق اس زمانے سے تھا جس کی تاریخ مدوّن نہ تھی۔ جدید دور میں چونکہ اس غیر مدون تاریخ کا بھی کھوج لگا لیا گیا ہے اس لیے جدید محققین کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ قرآن و احادیث میں مذکور شخص کا تعین کیا جائے۔ ذوالقرنین سے مراد سکندر اس لیے بھی نہیں ہو سکتا کہ قرآن نے جس ذوالقرنین کے اوصاف کا ذکر کیا ہے وہ سکندر پر صادق نہیں آتے۔ مثلاً قرآن نے ذوالقرنین کو موحد اور آخرت پر ایمان لانے والا بتایا ہے جب کہ اسکندر بت پرست مشرک تھا۔ دوسری بات یہ کہ قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نیک اور منصف انسان تھا جب کہ سکندر ایک ظالم حکمران تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ تاریخ میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ سکندر نے کوئی بند تعمیر کیا ہو جب کہ قرآن کہتا ہے ذوالقرنین نے ایک بند تعمیر کیا تھا۔

جب کہ کورش موحد، عادل تھا۔ چنانچہ قدیم مسماری خطوط سے بھی یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ موحد تھا، مشرک نہیں تھا۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾	۸۴۔ بے شک ہم نے اسے زمین میں اقتدار عطا کیا اور ہم نے ہر شے کے (مطلوبہ) وسائل بھی اسے فراہم کیے۔

تشریح کلمات

سَبَبًا: (س ب ب) السبب اصل میں اس رسی کو کہتے ہیں جس سے درخت خرما وغیرہ پر چڑھا جاتا ہے پھر اسی مناسبت سے ہر اس شیٔ کو سبب کہا جانے لگا جو دوسری شیٔ تک رسائی کا سبب

---

[۱] اس روایت کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مجمع البیان ذیل آیہ اصحاب کہف [۲] ملاحظہ ہو یسعیاہ ۴۵:۱

بنتی ہو۔

تفسیر آیات

خسرو یا خورس یا سائرس کی حکومت کا دائرہ مغرب میں ایشیائے کوچک اور مقدونیہ تک اور مشرق میں بلخ تک اور شمال میں قفقاز تک وسیع ہو گیا تھا۔

فَاَتۡبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾	۸۵۔ چنانچہ پھر وہ راہ پر ہو لیا۔
حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغۡرِبَ الشَّمۡسِ وَجَدَہَا تَغۡرُبُ فِیۡ عَیۡنٍ حَمِئَۃٍ وَّ وَجَدَ عِنۡدَہَا قَوۡمًا ۬ؕ قُلۡنَا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِمَّاۤ اَنۡ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ تَتَّخِذَ فِیۡہِمۡ حُسۡنًا ﴿۸۶﴾	۸۶۔ یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا تو اس نے سورج کو سیاہ رنگ کے پانی میں غروب ہوتے دیکھا اور اس کے پاس اس نے ایک قوم کو پایا، ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! انہیں سزا دو یا ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو (تمہیں اختیار ہے)۔
قَالَ اَمَّا مَنۡ ظَلَمَ فَسَوۡفَ نُعَذِّبُہٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّہٖ فَیُعَذِّبُہٗ عَذَابًا نُّکۡرًا ﴿۸۷﴾	۸۷۔ ذوالقرنین نے کہا: جو ظلم کا ارتکاب کرے گا عنقریب ہم اسے سزا دیں گے پھر جب وہ اپنے پروردگار کی طرف پلٹایا جائے گا تو وہ اسے برا عذاب دے گا۔
وَ اَمَّا مَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَہٗ جَزَآءَ ۨ الۡحُسۡنٰی ۚ وَ سَنَقُوۡلُ لَہٗ مِنۡ اَمۡرِنَا یُسۡرًا ﴿ؕ۸۸﴾	۸۸۔ لیکن جو ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا تو اسے بہت اچھا اجر ملے گا اور ہم بھی اپنے معاملات میں اس سے نرمی کے ساتھ بات کریں گے۔

تشریح کلمات

حَمِئَۃٍ : سیاہ، حمأ سیاہ مٹی، من حمأ مسنون۔ سڑی ہوئی سیاہ مٹی۔

تفسیر آیات

ذوالقرنین کے کورش ہونے کی صورت میں اس پانی سے مراد ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل ہو سکتا ہے اور چونکہ قرآنی تعبیر میں اس پانی کو چشمہ کہا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کوئی خلیج یا نہر ہو سکتی ہے جو سمندر میں گر رہی ہو۔ کبھی سورج پہاڑ کے پیچھے غروب کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور کبھی سمندر کے پانی میں غروب کر رہا ہوتا ہے

اور کبھی کسی کو صحرا میں زمین کے اوٹ میں جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے ذوالقرنین نے خشکی کی آخری حدود میں پہنچ کر دیکھا ہو کہ سورج پانی میں غروب ہو رہا ہے لیکن اس جگہ کی سو فیصد ہمارے پاس کوئی یقینی دلیل موجود نہیں ہے۔

یہ ممکن ہے وحی کے ذریعے ہو اور ممکن ہے الہام ہو یا زبان حال ہو اس لیے قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ کے جملے سے نبوت ثابت نہیں ہوتی۔

اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا: اس قوم کے ساتھ جو بھی سلوک اختیار کرنا ہو اسے ذوالقرنین کی صوابدید پر چھوڑ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین اللہ کا بہت مقرب بندہ تھا۔ البتہ اس کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ کوئی حکم تشریعی نہ ہو بلکہ فاتح حکمران جب کسی قوم پر فتح حاصل کرتا ہے تو فاتح قوم کے اختیار میں ہوتا ہے وہ مفتوح قوم کو سزا دے یا اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے لیکن یہ توجیہ درست نہیں ہے کیونکہ اس سے فاتح قوم کے ہر سلوک کو جائز قرار دینا لازم آتا ہے۔ لہٰذا یہ قبول کرنا پڑے گا کہ ذوالقرنین کے لیے یہ بھی روا تھا کہ وہ ان کے کفر اور ظلم کو قابل سرزنش قرار دے یا ان سے بہتر سلوک کرے۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ: ذوالقرنین کا جواب بھی پیغمبرانہ ہے اور ظلم سے مراد شرک بھی ہو سکتا ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝[1]	یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

اور کفر بھی ہو سکتا ہے چونکہ کفر بھی ظلم ہے۔ ظلم کے مقابلے میں ایمان کا ذکر ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظلم سے مراد عدم ایمان ہے۔

ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ: سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوالقرنین آخرت پر ایمان رکھنے والا موحد تھا۔

77 وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا: سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوالقرنین مؤمنین میں شریعت کے نفاذ کے لیے عدم تشدد کی حکمت عملی پر عمل پیرا تھے جو الٰہی شریعتوں کا امتیاز ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ...[2]	اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾	۸۹۔ پھر وہ راہ پر ہو لیا۔
حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ	۹۰۔ یہاں تک کہ جب وہ طلوع آفتاب کی جگہ پہنچا تو دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے

---

[1] ۳۱ لقمان: ۱۳ [2] ۲ بقرہ: ۱۸۵

نَجۡعَلۡ لَّہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہَا سِتۡرًا ۙ﴿۹۰﴾ جن کے لیے ہم نے آفتاب سے بچنے کی کوئی آڑ نہیں رکھی۔

تفسیر آیات

مشرق میں ایسی قوم آباد تھی جو ہنوز تمدن سے نا آشنا تھی۔ اسی وجہ سے اسے مکان و لباس بنانا بھی نہیں آتا تھا اور اپنے آپ کو دھوپ سے نہیں بچا پاتی تھی۔

یہ مشرقی سرزمین کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟ ایک گمان یہ ہے کہ یہ علاقہ بلخ کا ہو سکتا ہے جو کہ کورش کے دائرہ حکومت کے مشرق کی طرف آخری حدود ہے۔

كَذٰلِكَ ؕ وَ قَدۡ اَحَطۡنَا بِمَا لَدَیۡہِ خُبۡرًا ﴿۹۱﴾ ۹۱۔ اسی طرح (کا حال تھا) اور جو کچھ اس کے پاس تھا ہمیں اس کی مکمل خبر تھی۔

تفسیر آیات

جو کچھ سامان اور وسائل ذوالقرنین کے پاس تھے وہ ہمارے علم و دانست میں تھا۔ ذوالقرنین نے وسائل کی حدود میں جو کچھ کیا وہ اللہ کی طرف سے ہدایت پر مبنی تھا۔

ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ ۹۲۔ پھر وہ راہ پر ہولیا۔

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِہِمَا قَوۡمًا ۙ لَّا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ قَوۡلًا ﴿۹۳﴾ ۹۳۔ یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اسے ان دونوں پہاڑوں کے اس طرف ایک ایسی قوم ملی جو کوئی بات سمجھنے کے قابل نہ تھی۔

تفسیر آیات

مشرق اور مغرب کی طرف فوج کشی کے بعد یہ تیسری فوج کشی ہے لیکن یہ تیسری فوج کشی کیا تیسری سمت تھی یا مشرق کی طرف کا ذکر ہنوز چل رہا ہے؟ دو نظریے ہیں:

ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ مشرق کی طرف کی فوج کشی کا تسلسل ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ تیسری فوج کشی، تیسری طرف تھی۔ یہ تیسری طرف شمال ہے۔ چنانچہ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فوج کشی شمال کی طرف تھی جہاں ایک وحشی قوم بستی تھی جو کسی زبان کے ذریعے بھی افہام و تفہیم کے قابل نہ تھی۔

بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ: دو پہاڑوں کے درمیان۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ دو پہاڑ بحر خزر اور بحر اسود کے

درمیان واقع ہیں جو کیشیا کے پہاڑی سلسلوں پر قابل تطبیق ہیں اور الدرالمنثور میں ابن عباس سے روایت ہے کہ سدین دو پہاڑوں سے مراد ارمینیا اور آذربائجان ہیں۔

ممکن ہے روایت کا اشارہ ان دو پہاڑوں کے محل وقوع کی طرف ہو کہ یہ سدین ان علاقوں میں ہیں۔

قَالُوۡا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِنَّ یَاۡجُوۡجَ وَ مَاۡجُوۡجَ مُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَہَلۡ نَجۡعَلُ لَکَ خَرۡجًا عَلٰۤی اَنۡ تَجۡعَلَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَہُمۡ سَدًّا ﴿۹۴﴾

۹۴۔ لوگوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج یقیناً اس سرزمین کے فسادی ہیں کیا ہم آپ کے لیے کچھ سامان کا انتظام کریں تا کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند باندھ دیں؟

تشریح کلمات

خَرۡجًا: (خ ر ج) خرج کا لفظ دخل (آمدنی) کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے مگر "خراج" عموماً زمین کے لگان اور اس لگان کو بھی کہتے ہیں جو رعیت حاکم کو ادا کرتی ہے۔

تفسیر آیات

ابن مسعود کے مصحف میں آیا ہے: قال الذین من دونھم فھل نجعل لك خرجاً یعنی یاجوج و ماجوج کے اس طرف آباد لوگوں نے کہا۔

یَاۡجُوۡجَ وَ مَاۡجُوۡجَ: کون ہیں؟ ایک رائے یہ ہے کہ یہ وہی قوم ہے جسے تاتاری، منگولی وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جو قدیم زمانے سے یورپ اور ایشیاء کی متمدن قوموں پر حملے کرتے رہے ہیں۔

بائبل میں ان کو حضرت نوح علیہ السلام کے فرزند یافث کی نسل سے قرار دیا گیا ہے۔[1] چنانچہ بحار الانوار ۶: ۲۹۸ اور علل الشرائع میں بھی ایک روایت میں یاجوج وماجوج کو یافث کی نسل قرار دیا گیا ہے اور حزقی ایل صحیفے باب ۳۸ میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔

فَہَلۡ نَجۡعَلُ لَکَ خَرۡجًا عَلٰۤی اَنۡ تَجۡعَلَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَہُمۡ سَدًّا: اس قوم کی طرف سے ذوالقرنین سے اپنے تحفظ کا مطالبہ بتاتا ہے کہ ذوالقرنین اپنے مفتوحہ علاقوں کو دیگر فاتحین کی طرح صرف زیرنگین کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ انہیں تحفظ اور عدل و انصاف فراہم کرتے تھے۔

قَالَ مَا مَکَّنِّیۡ فِیۡہِ رَبِّیۡ خَیۡرٌ

۹۵۔ ذوالقرنین نے کہا: جو طاقت میرے رب نے

---

[1] پیدائش باب ۱۰

فَاَعِیۡنُوۡنِیۡ بِقُوَّۃٍ اَجۡعَلۡ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ رَدۡمًا ﴿۹۵﴾

مجھے عنایت فرمائی ہے وہ بہتر ہے، لہٰذا تم محنت کے ذریعے میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان بند باندھ دوں گا۔

تشریح کلمات

رَدۡمًا: (ر د م) الردم پتھروں سے کسی شگاف کو بند کرنا۔ بقول بعض ردم عظیم سد کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

ذوالقرنین نے اس عظیم منصوبے کے لیے عوام پر ٹیکس کی صورت میں مالی بوجھ ڈالنے کی پیشکش کے باوجود اسے قبول نہ کیا جو اچھی حکمرانی کا مثالی کردار ہے۔ البتہ عوامی شرکت کو افرادی قوت کی شکل میں قبول کیا اور یہ ذوالقرنین کی مثالی حکمرانی ہے کہ وہ علاقے کی ستم زدہ قوموں کو تحفظ دیتے اور ظالم کا لوگوں پر ظلم کا راستہ روکتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ اچھے حکمران عوام پر پیشکش کے باوجود بلا ضرورت ٹیکس نہیں لگاتے۔

۲۔ خدا کی عطا کردہ طاقت موجود ہونے کی صورت میں عوام پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے: مَا مَکَّنِّیۡ فِیۡہِ ...

۳۔ عوام کی جو شرکت آسانی سے ہو سکتی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے: فَاَعِیۡنُوۡنِیۡ بِقُوَّۃٍ ...

اٰتُوۡنِیۡ زُبَرَ الۡحَدِیۡدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ قَالَ انۡفُخُوۡا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَہٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوۡنِیۡۤ اُفۡرِغۡ عَلَیۡہِ قِطۡرًا ﴿ؕ۹۶﴾ فَمَا اسۡطَاعُوۡۤا اَنۡ یَّظۡہَرُوۡہُ وَ مَا اسۡتَطَاعُوۡا لَہٗ نَقۡبًا ﴿۹۷﴾

۹۶۔ تم مجھے لوہے کی چادریں لا کر دو، یہاں تک کہ جب اس نے دونوں پہاڑوں کی درمیانی فضا کو برابر کر دیا تو اس نے لوگوں سے کہا: آگ پھونکو یہاں تک کہ جب اسے بالکل آگ بنا دیا تو اس نے کہا: اب میرے پاس تانبا لے آؤ تاکہ میں اس (دیوار) پر انڈیلوں۔

۹۷۔ اس کے بعد وہ نہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ ہی اس میں نقب لگا سکیں۔

تشریح کلمات

زُبَرَ: زبرۃ کی جمع لوہے کے بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ: دونوں پہاڑوں کے سروں کے درمیانی حصے کو لوہے کی اینٹوں سے پر کر کے پہاڑوں کے برابر کر دیا پھر اس دیوار پر پگھلا ہوا تانبا اُنڈیلا تو وہ ایسا بند بن گیا کہ یاجوج ماجوج اسے توڑ کر دوسری آبادیوں پر حملہ نہ کر سکے۔

ایک ایسی آہنی دیوار بنائی گئی جسے پگھلے ہوئے تانبے سے مزید مستحکم بنایا گیا۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ سد بحر خزر اور بحر اسود کے درمیانی علاقے میں واقع ہے۔ کہتے ہیں آج بھی ''داریال'' کے علاقے میں اس آہنی دیوار کے آثار موجود ہیں اور اس کے سد ذوالقرنین ہونے پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ واحد دیوار ہے جس میں لوہا استعمال ہوا ہے۔

ابن خردار نے اپنی کتاب المسالك والممالك میں لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ واثق باللہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اس سد کو فتح کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے چند افراد کو اس سد کے مشاہدے کے لیے بھیجا تو انہوں نے دیکھا یہ سد لوہے کی اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور یہ اینٹیں پگھلے ہوئے تانبے سے جڑی ہوئی ہیں۔[1]

قَالَ هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعۡدُ رَبِّیۡ حَقًّا ﴿۹۸﴾

۹۸۔ ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے رب کی طرف سے رحمت ہے لہٰذا جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اسے زمین بوس کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔

تشریح کلمات

دَکَّآءَ: (د ك ك) الدك نرم اور ہموار زمین کے معنوں میں ہیں۔ دکا کے معنی کوٹ کر ہموار کرنے کے ہیں:

كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الۡاَرۡضُ دَكًّا دَكًّا ۙ[2]   ہرگز نہیں! جب زمین کوٹ کوٹ کر ہموار کی جائے گی.

الصدف: (ص د ف) پہاڑ کے کنارے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ: لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا ایک توفیق خداوندی اور رحمت الٰہی ہے جو اللہ کے

---

[1] بحار الانوار ۶: ۳۰۱   [2] ۸۹ فجر: ۲۱

خاص بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔

وَعۡدُ رَبِّیۡ: سے مراد وہ مقررہ وقت ہو سکتا ہے جس کے بعد یہ دیوار باقی نہیں رہے گی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ دیوار اگرچہ آہنی اور استحکام میں اپنی مثال آپ ہے تاہم یہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ ایک وقت تک یہ دیوار موجود رہے گی اور وہ وقت موعود آئے گا تو یہ دیوار زمین کے ساتھ ہموار ہو جائے گی۔

ظاہر ہے کہ لوہے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس کے بعد لوہا اپنی طاقت کھو دیتا ہے۔ وَعۡدُ رَبِّیۡ سے مراد قیامت لی جاتی ہے۔ اس پر بعد کی آیت کا قرینہ بن جانا بعید ہے چونکہ قول ذوالقرنین اسی آیت پر ختم ہو جاتا ہے۔ بعد کی آیت قول خدا ہے۔

اہم نکات

۱۔ خلق خدا کی خدمت کی توفیق خدائی رحمت ہے: ہٰذَا رَحۡمَۃٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ ....

وَ تَرَکۡنَا بَعۡضَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ یَّمُوۡجُ فِیۡ بَعۡضٍ وَّ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَجَمَعۡنٰہُمۡ جَمۡعًا ﴿۹۹﴾

۹۹۔ اور اس دن ہم انہیں ایسے حال میں چھوڑ دیں گے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا پھر ہم سب کو ایک ساتھ جمع کریں گے۔

تفسیر آیات

جن لوگوں سے اللہ نے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور وہ رحمت خدا سے محروم ہیں۔ وہ اس دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا اور ہرج و مرج کا شکار ہو جائیں گے۔ اس طوفان سے نکلنے کا انہیں کوئی راستہ نہیں ملے گا۔

وَ تَرَکۡنَا بَعۡضَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ: اس وقت اللہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دے گا اور جسے اللہ اپنے حال پر چھوڑ دے اس کے لیے تباہی ہے۔ یہ قیام قیامت سے پہلے کا اہم واقعہ ہے چونکہ اس کے بعد صور پھونکنے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے یہ پہلا صور ہے جس سے تمام زندہ موجودات موت کی نیند سو جائیں گی۔

وَّ عَرَضۡنَا جَہَنَّمَ یَوۡمَئِذٍ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ عَرۡضَا ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔ اور اس دن ہم جہنم کو کافروں کے سامنے پیش کریں گے۔

الَّذِیۡنَ کَانَتۡ اَعۡیُنُہُمۡ فِیۡ غِطَآءٍ

۱۰۱۔ جن کی نگاہیں ہماری یاد سے پردے میں پڑی

عَنۡ ذِکۡرِیۡ وَ کَانُوۡا لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَمۡعًا ﴿۱۰۱﴾　ہوئی تھیں اور وہ کچھ سن بھی نہیں سکتے تھے۔

تفسیر آیات

جہنم کو پیش کیا جائے گا۔ جہنم تک جانے کے لیے کوئی مسافت طے کرنا نہیں پڑے گی۔ آخرت میں زمان و مکاں کا وہ تصور نہ ہوگا جو اس دنیا میں ہے۔ لہٰذا وہاں مسافتوں کا وہ مفہوم نہ ہوگا جو یہاں ہے۔ چنانچہ جنت میں جانے کے سلسلے میں فرمایا:

وَ اُزۡلِفَتِ الۡجَنَّۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ[۱]　اس روز جنت پرہیزگاروں کے نزدیک لائی جائے گی۔

انسانی دماغ ان چیزوں میں غور وفکر کر سکتا ہے جو بصارت اور سماعت کے ذریعے ذہن میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ کافر آفاق میں موجود اللہ کی نشانیوں پر نگاہ رکھتے ہیں نہ ہی اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات کو سنتے ہیں اس لیے یاد خدا سے یہ لوگ غافل ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ آخرت میں زمان و مکان اور مسافت کا وہ تصور نہ ہوگا جو دنیا میں ہے۔

۲۔ سمعی و بصری ذرائع سے حاصل ہونے والے دروس سے یاد خدا دلوں میں تازہ ہو جاتی ہے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا عِبَادِیۡ مِنۡ دُوۡنِیۡۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَہَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ کیا کافر یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو سرپرست بنائیں گے؟ ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے مہمان سرا بنا کر تیار رکھا ہے۔

تفسیر آیات

بندوں کو اللہ کی جگہ مِنۡ دُوۡنِیۡۤ سرپرست بنا لینا شرک ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت ہونی چاہیے وہاں بندوں کی پرستش ہو جائے تو یہ شرک ہے۔

عِبَادِیۡ: "میرے بندوں" سے مراد فرشتے، جن اور نیک انسان ہو سکتے ہیں جن کی یہ مشرکین پوجا کرتے ہیں۔

---

[۱] ۲۶ شعراء۔ ۹۰

قُلۡ ہَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ کہدیجیے: کیا ہم تمہیں بتا دیں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے نامراد کون لوگ ہیں؟

اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ ہُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴۔ جن کی سعی دنیاوی زندگی میں لاحاصل رہی جب کہ وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ درست کام کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ ہَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ: سب سے زیادہ ناقابل تلافی خسارے میں وہ لوگ ہیں،

۲۔ اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ: جو مرکب ضلالت میں ہیں۔ مرکب ضلالت کا مطلب یہ ہے کہ ایک یہ کہ وہ خود ضلالت میں ہیں، دوسرا یہ کہ وہ اپنی اس ضلالت کو درست کام سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی گمراہی زیادہ خطرناک اور ہدایت سے دور ہوتی ہے۔ یہ بالکل جہل مرکب کی طرح ہے کہ ایک شخص ایک مطلب کونہیں جانتا اور اپنے اس نہ جاننے کو بھی نہیں جانتا۔ ایسا شخص جاننے کی کوشش کبھی نہیں کرے گا۔ اس لیے اس گمراہی کو سب سے زیادہ نامراد قرار دیا۔

اہم نکات

۱۔ اپنی ضلالت پر آگہی نہ ہونا سب سے بڑی ضلالت ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ وَ لِقَآئِہٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فَلَا نُقِیۡمُ لَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَزۡنًا ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں اور اللہ کے حضور جانے کا انکار کیا جس سے ان کے اعمال برباد ہو گئے لہٰذا ہم قیامت کے دن ان کے (اعمال کے) لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔

ذٰلِکَ جَزَآؤُہُمۡ جَہَنَّمُ بِمَا کَفَرُوۡا وَ اتَّخَذُوۡۤا اٰیٰتِیۡ وَ رُسُلِیۡ ہُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ ان کے کفر کرنے اور ہماری آیات اور رسولوں کا استہزاء کرنے کی وجہ سے ان کی سزا یہی جہنم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: جو لوگ بدترین خسارے میں ہیں ان کے بارے میں بیان جاری ہے کہ

یہ وہ لوگ ہیں جو آیات الٰہی اور آخرت کا انکار کرتے تھے۔ آیات الٰہی میں آفاق و انفس کے ساتھ رسالت و نبوت بھی شامل ہیں جن کے یہ لوگ منکر ہیں۔ ان کے اعمال حبط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اعمال جس کے لیے مطلوب تھے اس کے لیے نہیں کیے اور جس کے لیے کیے ہیں وہ مطلوب نہ تھے۔ جو مطلوب تھا وہ کیا نہیں اور جو کیا وہ مطلوب نہ تھا اس لیے حبط ہونا قدرتی بات ہے۔ جب حبط ہو گا تو قدروں کے ترازو میں ان اعمال کا کوئی وزن نہ ہو گا۔

۲۔ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ: جب ان کے اعمال حبط اور برباد ہیں اور ان کا آیات اور رسولوں کا استہزا کرنے کا جرم ثابت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ جہنم ہے۔

اہم نکات

۱۔ آیات الٰہی اور آخرت کے انکار کے بعد قدروں کے ترازو میں اعمال کا کوئی وزن نہیں رہتا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتۡ لَہُمۡ جَنّٰتُ الۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾	۱۰۷۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال بجا لائے ہیں ان کی میزبانی کے لیے یقیناً جنت الفردوس ہے۔
خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا لَا یَبۡغُوۡنَ عَنۡہَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾	۱۰۸۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہاں سے کہیں اور جانا پسند نہیں کریں گے۔

تشریح کلمات

جَنّٰتُ الۡفِرۡدَوۡسِ: فردوس ایسے باغ کو کہتے ہیں جس میں گھنے درخت ہوں اور غالب درخت انگور کے ہوں۔

تفسیر آیات

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لکل شیء ذروۃ و ذروۃ الجنۃ الفردوس و ھی لمحمد و آل..[۱]	ہر چیز کی چوٹی ہوتی ہے اور جنت کی چوٹی، فردوس ہے اور وہ محمد و آل محمد علیہم السلام کے لیے ہے۔

عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

جنت کے سو درجات ہیں۔ ہر دو درجے کے درمیان کا فاصلہ آسمان و زمین جتنا ہے اور جنت فردوس سب سے اعلیٰ ہے۔[۲]

---

۱ بحار الانوار۔ ۲۴: ۲۱۹ باب الایات الدالۃ　۲ مجمع البیان ذیل آیت

قُلۡ لَّوۡ کَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیۡ وَ لَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِہٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹۔ کہد یجیے: میرے پروردگار کے کلمات (لکھنے) کے لیے اگر سمندر روشنائی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن میرے رب کے کلمات ختم نہیں ہوں گے اگرچہ ہم اتنے ہی مزید (سمندر) سے کمک رسانی کریں۔

تفسیر آیات

کلمہ، بشری استعمال میں اس لفظ کو کہتے ہیں جو کسی معنی پر دلالت کرے۔ اللہ تعالیٰ کے کلمات ہر وہ شیء ہے جو اس کے وجود اور قدرت پر دلالت کرے۔ اس طرح تمام موجودات اللہ کے کلمات ہیں اور جس موجود میں اللہ کی قدرت کاملہ پر زیادہ دلالت ہو گی وہ اللہ کا کلمہ کہلانے کا زیادہ حقدار ہو گا۔ اسی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کہا گیا ہے:

اِنَّمَا الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ ...[1] بے شک مسیح عیسیٰ بن مریم تو اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں....

چونکہ بن پدر آپ کی ولادت قدرت الٰہی پر ایک واضح دلیل ہے۔ لا انقطاع فی الفیض فیض الٰہی ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ ۔[2] وہ ہر روز کرشمہ سازی میں مشغول ہے۔ فیض خدا لامحدود ہو جاتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایجاد و تخلیق میں توقف اور انقطاع نہیں ہے لہٰذا ان کلمات یعنی موجودات کا احاطہ کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے خواہ وہ سمندر کی طرح عظیم کیوں نہ ہو۔

چنانچہ سائنس کی بھی یہ تھیوری بن رہی ہے کہ کائنات وسعت اختیار کر رہی ہے اور کہکشاؤں کی شکل و صورت اور اتار چڑھاؤ کا مطالعہ اور ان میں موجود حرکتوں کو پرکھنے کے بعد وہ یہ دیکھ کر حیران ہیں کہ کائنات تقریباً روشنی کی رفتار سے کھل رہی ہے۔

کائنات کی اس عظمت کو سامنے رکھنے کے بعد قرآن کی یہ تعبیر سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اگر اللہ کے کلمات یعنی کل کائنات کی موجودات کو شمار کرنے کے لیے تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور مزید سمندر سے سیاہی فراہم کی جائے تو سمندر خشک ہو جائیں گے لیکن اللہ کے کلمات کا شمار ممکن نہ ہو گا۔ کائنات کا وہ حصہ جو بشر کی اطلاع میں ہے قابل شمار نہیں ہے۔ اس کائنات کے بارے میں بشر سوچ بھی نہیں سکتا جو روشنی کی رفتار سے پھیل رہی ہے۔

سچ فرمایا قادر لایزال نے:

---

[1] ۴ نساء: ۱۷۱ [2] ۵۵ رحمن: ۲۹

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝[1] اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا اور ہم ہی وسعت دینے والے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ کے لیے اللہ کے کلمات کا شمار کرنا ممکن نہیں۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۝۱۱۰

۱۱۰۔ کہد یجیے: میں تم ہی جیسا ایک انسان ہوں مگر میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود تو بس ایک ہی ہے لہٰذا جو اللہ کے حضور جانے کا امیدوار ہے اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائے۔

تفسیر آیات

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ: کہد یجیے میں تم جیسا انسان ہوں۔ مِّثْلُكُمْ ہوں۔ جسمانی طور پر تم جیسا ہوں۔ ظاہر میں لوگوں کے لیے تم جیسا ہوں۔ تمہاری طرح مادی وسائل کو استعمال میں لاتا ہوں۔ کھاتا ہوں، پیتا ہوں، سوتا ہوں، ازدواج کرتا ہوں، اولاد رکھتا ہوں۔ تم مجھے دیگر انسانوں کی طرح چلتے، اٹھتے، بیٹھتے اور بات کرتے دیکھ سکتے ہو۔ نامرئی وجود نہیں ہوں۔ میرا جو وجود تمہارے حاسہّ بصر میں آتا ہے اس میں تو تم جیسا ہوں۔

يُوْحٰۤى اِلَيَّ: میرے جس وجود پر وحی ہوتی ہے وہ تم جیسا نہیں ہے۔ میرا دل تمہارے دل کی طرح نہیں ہے۔ میرا دل رازہائے الٰہی کا مخزن ہے۔ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ[2] میرا قلب وحی الٰہی کی جائے نزول ہے۔ میری نگاہ بھی تمہاری نگاہ کی طرح نہیں ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝[3] نگاہ نے نہ انحراف کیا اور نہ تجاوز۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝[4] جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا۔

واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حواس ہمارے حواس کی طرح نہیں ہیں۔ بایں معنی کہ جو کچھ رسول اللہؐ کے حواس میں آتا ہے عام بشری حواس ان چیزوں کو درک کرنے سے عاجز ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۴۷   [2] ۲ بقرۃ: ۹۷   [3] ۵۳ نجم: ۱۷   [4] ۵۳ نجم: ۱۱

اَرَی نُوْرَالوَحْیِ وَ الرِّسَالَۃِ و اَشُمُّ رِیحَ النُّبُوَّۃِوَلَقَدْسَمِعْتُ رَنَّۃَالشَّیْطَانِ حِینَ نَزَلَ الْوَحْیُ عَلَیہِ ص فَقُلْتُ یَا رَسُولَ اللّٰہِ مَا ھٰذِہِ الرَّنَّۃُ فَقَالَ ھٰذَا الشَّیْطَانُ قَدْ آیِسَ مِنْ عِبَادَتِہِ اِنَّکَ تَسْمَعُ مَا اَسْمَعُ وَ تَرَی مَا اَرَی اِلَّا اَنَّکَ لَسْتَ بِنَبِیٍّ۔۔۔۔[1]

میں وحی اور رسالت کی روشنی کا مشاہدہ کرتا تھا اور نزول وحی کے موقع پر میں نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ نزول وحی کے موقع پر میں نے شیطان کی چیخ سن لی، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ چیخ کیا ہے؟ فرمایا: یہ شیطان ہے وہ اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ لوگ اس کی بندگی کریں گے۔ (اے علی) تو وہی کچھ سن سکتا ہے جو میں سن سکتا ہوں اور وہی کچھ دیکھ سکتے ہو جو میں دیکھ سکتا ہوں۔ صرف یہ کہ تو نبی نہیں ہے۔

اس روایت میں یہ جملے قابل توجہ ہیں: اِنَّکَ تَسْمَعُ مَا اَسْمَعُ وَ تَرَی مَا اَرَی۔ جو کچھ میں سن سکتا ہوں علی تو بھی سن سکتا ہے اور جو کچھ میں دیکھ سکتا ہوں تو بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسولؐ کی سماعت اور بصارت اور دوسروں کی سماعت اور بصرت میں نمایاں فرق ہے۔

اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: جو وحی میرے قلب پر نازل ہوتی ہے اس وحی کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

ان اللّٰہ تبارك و تعالیٰ اقسم بعزتہ و جلالہ ان لا یعذب اھل توحیدہ بالنار ابداً۔[2]

اللہ تعالیٰ نے اپنی عزت و جلالت کی قسم کھائی ہے کہ وہ کبھی بھی اہل توحید کو آتش کا عذاب نہیں دے گا۔

اہل توحید وہ لوگ ہیں جو جیسے عقیدے کے اعتبار سے ایک اللہ کو مانتے ہیں، عمل کی دنیا میں بھی ایک ہی اللہ کو مانتے ہیں۔ جب انسان عملی اعتبار سے موحد ہوتا ہے تو وہ حضرت خلیل علیہ السلام کی طرح کسی غیر اللہ کو خواہ وہ جبرئیل ہی کیوں نہ ہو اعتنا میں نہیں لاتا۔

فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ: رب کی بارگاہ میں جانے کا عقیدہ انسان کے عمل کا محرک بنتا ہے جو توحید کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر عمل نہیں ہے تو توحید کا عقیدہ ایک بے معنی دعویٰ ہے۔ اسی طرح شرک کی نفی بھی توحید ہی کی دوسری تعبیر ہے۔

وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا: اللہ کی بندگی میں کسی اور کو شریک کرنا اللہ تعالیٰ کی شان میں انتہائی گستاخی ہے۔ اس کی مخلوقات میں سے کسی کو خالق کائنات اور رب العالمین کی صف میں رکھا جائے۔ اسی لیے شرک سب گناہوں میں بدتر گناہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] نہج البلاغہ خ ۱۹۰ فضل الوحی [2] التوحید

اِنَّہٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ ...[1]

بے شک جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، بتحقیق اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ...[2]

اللہ صرف شرک سے درگزر نہیں کرتا اس کے علاوہ جس کو چاہے معاف کر دیتا ہے...

---

[1] ۵ مائدہ:۷۲ [2] ۴ نساء۔ ۱۱۶

خالی

سُورَةُ مَرْيَم

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ سورۃ مبارکہ مکی ہے اور اس کی آیات کی تعداد ۹۸ ہے۔ اس سورۃ کا نام مریم(س) اس لیے رکھا گیا کہ اس میں حضرت مریم (س) کے حالات کا ذکر ہے۔ اس کا نام سورۃ کھیعص بھی مذکور ہے۔

محمد بن اسحاق نے اپنی کتاب السیرۃ میں ام سلمہ سے اور احمد بن حنبل نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ ہجرت حبشہ میں جناب جعفر طیارؓ نے اس سورۃ کی ابتدائی چند آیات بادشاہ حبشہ نجاشی کو سنائیں تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس سورۃ مبارکہ کے مضامین میں انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے جو اس سورۃ مبارکہ کے مکی ہونے کے ساتھ مناسب ہے کہ منکرین رسالت کو یہ بتانا مقصود ہو کہ خاتم الرسل ﷺ گذشتہ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور سلسلۂ انبیاء آدم، نوح، ابراہیم علیہم السلام کی نسل میں موجود رہا ہے۔

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ   بنام خدائے رحمن رحیم

کٓہٰیٰعٓصٓ ①   ۱۔ کاف، ہا، یا، عین، صاد۔

تفسیر آیات

۱۔ کٓہٰیٰعٓصٓ: حروف مقطعات کے بارے میں سورۃ بقرۃ کی ابتدا میں ہم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ حروف رموز و اسرار ہیں۔ جن پر عام بشر کو مطلع کرنا مقصود نہیں ہے تاہم سورہ مریم کے شروع میں مذکورہ حروف مقطعات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جس کی بنا پر اس پر ہم قدرے روشنی ڈالیں گے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ حروف اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی کے اوائل کے حروف کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ معانی الاخبار میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

کٓہٰیٰعٓصٓ یعنی: انا الکافی الھادی الولی العالم الصادق الوعد .....۔[۱]   یعنی میں ہی کافی، ہدایت دہندہ، کارساز، عالم اور وعدے کا سچا ہوں۔

حدیث کا اشارہ اس طرف ہے کہ ك سے کافی، ھاء سے ھادی، یاء سے ولی، عین سے عالم، صاد سے صادق ہے۔

شیعہ سنی مصادر میں یہ بات کثرت سے روایت میں آئی ہے کہ مولائے موحدین حضرت علی علیہ السلام اپنی دعاؤں میں خاص کر دشمن کے ساتھ مقابلے کے وقت یا کٓہٰیٰعٓصٓ کہہ کر پکارتے تھے۔[۲] نیز دعاؤں میں بھی کثرت سے کٓہٰیٰعٓصٓ کا ذکر ملتا ہے۔[۳]

۱۔ معانی الاخبار صفحہ ۲۲

۲۔ نصر بن مزاحم متوفی ۲۱۲۔ وقعة صفين۔ مستدرك الوسائل ۱۱:۱۰۵ باب استجابة الدعاء، كنز العمال حديث: ۴۹۹۹۔۵۰۵۷، تفسير طبری ۱۶ ذیل آیہ

۳۔ شیخ طوسی متوفی ۴۶۰ھ مصباح المتهجد ص ۱۴۵۔ علی بن طاؤس متوفی ۶۶۴ھ الاقبال ص ۳۲۴۔۴۲۵،۳۴۳، مهج الدعوات ص ۳۱۵۔۲۴۴۔ كفعمی البلد الامين ص ۲۴۰۔۲۵۴

ان سب روایات سے اس بات پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ ان حروف کا تعلق اسمائے حسنی سے ہے۔

بعض حروف مقطعات ایک مکمل آیت اور بعض دیگر حروف کے مکمل آیت نہ ہونے سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان حروف میں مطالب و معانی مضمر ہیں مثلا الٓمٓ ایک آیت ہے۔ جب کہ الٓمّٓرٰ ایک آیت نہیں ہے۔

سورۃ شوریٰ میں حٰمٓ۔ عٓسٓقٓ دو آیتیں ہیں جب کہ سورہ مریم میں کٓھٰیٰعٓصٓ ایک آیت ہے اور دونوں پانچ پانچ حروف پر مشتمل ہیں۔

ذِکۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّکَ عَبۡدَہٗ زَکَرِیَّا ۚ﴿۲﴾ ۲۔ یہ اس رحمت کا ذکر ہے جو آپ کے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی۔

تفسیر آیات

حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر سورہ آل عمران آیت ۳۷ میں ہو چکا ہے۔ یہاں ان پر اللہ کی اس نعمت کا ذکر ہے جو ظاہری وسائل کے بغیر ان پر عنایت فرمائی۔ حضرت زکریا علیہ السلام خود بڑھاپے میں ہیں اور ان کی زوجہ بھی بانجھ ہیں۔ اس کے باوجود ان کو اولاد کی نعمت سے نوازا جاتا ہے۔

اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا ﴿۳﴾ ۳۔ جب انہوں نے اپنے رب کو دھیمی آواز میں پکارا۔

تفسیر آیات

حضرت زکریا علیہ السلام نے دھیمی آواز میں اللہ کو پکارا۔ اس سے آداب دعا کا ایک اہم پہلو معلوم ہوا کہ اللہ کو دھیمی آواز میں پکارنا چاہیے۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

اُدۡعُوۡا رَبَّکُمۡ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَۃً ...[1] اپنے رب کی بارگاہ میں دعا کرو عاجزی اور خاموشی کے ساتھ۔

وَ اذۡکُرۡ رَّبَّکَ فِیۡ نَفۡسِکَ تَضَرُّعًا وَّ خِیۡفَۃً وَّ دُوۡنَ الۡجَہۡرِ مِنَ الۡقَوۡلِ ...[2] (اے رسول) اپنے رب کو تضرع اور خوف کے ساتھ دل ہی دل میں اور دھیمی آواز میں صبح و شام یاد کیا کریں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ وَہَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ وَ ۴۔ عرض کی: پروردگارا! میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں

---

[1] ۷ الاعراف: ۵۵ [2] ۷ الاعراف: ۲۰۵

اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ④

اور بڑھاپے کی وجہ سے سر کے سفید بال چمکنے لگے ہیں اور اے میرے رب! میں تجھ سے مانگ کر کبھی ناکام نہیں رہا۔

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ⑤

۵۔ اور میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے پس تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ⑥

۶۔ جو میرا وارث بنے اور آل یعقوب کا وارث بنے اور میرے پروردگار! اسے (اپنا) پسندیدہ بنا۔

تفسیر آیات

یہ بات آج سب کے لیے واضح ہے کہ بڑھاپا ہڈیوں کی کمزوری سے آتا ہے۔ بڑھاپے کی دوسری علامت بالوں کی سفیدی ہے۔ زکریا علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں اپنا مدعا پیش کرنے سے پہلے چند باتوں کو بطور تمہید پیش کرتے ہیں:

i۔ عمر ڈھل گئی، بڑھاپے میں آگیا ہوں۔ ہڈیوں کی کمزوری اور سر کے بالوں کی سفیدی اس کی علامات ہیں۔

ii۔ پروردگار تجھ کو پکار کے میں کبھی ناکام اور نامراد نہیں رہا ہوں۔ ظاہر ہے ایک نبی کی دعا رد نہ ہو گی اور جو دعا دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے وہ رد نہیں ہوتی۔

iii۔ اپنے رشتے داروں سے مجھے خوف لاحق ہے۔ یہ خوف اپنے بعد کا ہے: مِنْ وَّرَآءِیْ انبیاء علیہم السلام کو ہمیشہ اپنے بعد کا خوف لاحق رہا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی موت کے موقع پر اپنی اولاد سے فرمایا:

اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ....[1]

اس وقت انہوں نے اپنے بچوں سے کہا: میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟

سورہ مریم: ۵۹ میں متعدد انبیاء علیہم السلام کے ذکر کے بعد فرمایا:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ....

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کے پیچھے چل پڑے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۳۳

نیز فرمایا:

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ...[1]

اور محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ) تو بس رسول ہی ہیں، ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں، بھلا اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

اَلۡمَوَالِیَ: رشتے دار سے مراد اولاد کے علاوہ باقی رشتے دار ہیں۔

انهم كانوا شرار بني اسرائيل۔[2] موالی سے مراد بنی اسرائیل کے برے لوگ ہیں۔

اس سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اولاد سے کوئی خوف نہ تھا۔ اولاد نہ ہونے کی صورت میں جو وارث بننے والے تھے ان سے خوف تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ نے اسی بنا پر اپنے بعد کے لیے فرمایا تھا:

انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله و عترتی ما ان تمسكتم بهما لن تضلوا بعدی۔

میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اللہ کی کتاب اور میری اولاد تم جب تک ان دونوں سے متمسک رہو گے میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔

iv۔ میری بیوی بانجھ ہے۔ اولاد کے لیے ظاہری وسائل کا فقدان ہے۔

ان تمہیدی عرائض کے بعد اصل مدعا پیش کرتے ہیں:

فَهَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا: مجھے اپنے پاس سے ایک ولی عنایت فرما۔ ولی سے ولد صلبی مراد ہے جیسا کہ سورہ آل عمران میں فرمایا:

رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً ۚ[3] پروردگارا! مجھے اپنی عنایت سے صالح اولاد عطا کر،

یہاں ذریت کی جگہ ولی کا لفظ آ گیا۔ لہٰذا ولی سے مراد صلبی اولاد ہے۔

وارث کے لیے دعا: حضرت زکریا علیہ السلام کی استدعا کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے فرزند کے لیے دعا کر رہے ہیں جس کے نہ ہونے کی صورت میں غیر فرزند وارث بننے والے تھے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام اپنی اولاد کے علاوہ دوسروں کے وارث ہونے پر رضامند نہ تھے بلکہ ان کے وارث بننے کا خوف لاحق تھا۔

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ مسئلہ نبوت کی وراثت کا نہ تھا ورنہ نبوت کے کسی نا اہل کے پاس جانے کا خوف نہیں ہوتا۔ علم اور نہ تقویٰ کے غیر اہل کے پاس جانے کا خوف ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے لیے اولاد کی دعا اس لیے کی تا کہ وہ اس گھر کے وارث بن جائے۔ اس میں مالی وراثت بھی شامل ہے اور حقیقتاً وراثت مالی ہی ذہن میں آتی ہے۔ جیسے ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا[4]

---

[1] ۳ آل عمران:۱۴۴ [2] حصاص [3] ۳ آل عمران:۳۸
[4] ۳۵ فاطر:۳۲ (ترجمہ) پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا ہے۔

میں لفظ کتاب قرینہ بنتا ہے کہ غیر مالی وراثت مراد ہے۔

عبدالرزاق، قتادہ حسن سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

رحم اللّٰہ اخی زکریا ما کان علیه من وراثة ماله حین قال: هب لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ..

اللہ کی رحمت ہو میرے بھائی زکریا پر جنہوں نے اپنے مال کی وراثت کے بارے میں جب کہا: هب لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ...[1]

ابن کثیر اپنی تفسیر میں اس روایت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

وهذه مرسلات لا تعارض الصحاح۔

یہ مرسل روایات صحیح روایت کی معارض نہیں ہوسکتیں۔

واضح رہے یہ اگرچہ مرسل ہیں مگر قرآن کے مطابق ہیں اور جو آپ کے نزدیک صحیح ہے وہ قرآن کے خلاف ہے۔

التحریر و التنویر ۱۶: ۱۱ میں لکھتے ہیں:

والظواهر تؤذن بان الانبیاء کانوا یورثون قال تعالی وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ ...۔

ظاہری دلالتوں کا اس اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سلیمان نے داؤد سے ارث لیا۔

ابن عطیہ اندلسی اپنی تفسیر المحرر الوجیز میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

والاکثر من المفسرین علی انه اراد وراثة المال۔

اکثر مفسرین کا موقف یہ ہے کہ اس سے مالی وراثت مراد ہے۔

ابن جریر طبری اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

یرثنی من بعد وفاتی مالی و یرث من آل یعقوب النبوة قال ابن عباس و مجاهد و قتاده: خاف ان یرثوا ماله وان ترکه الکلالة فاشفق ان یرثه غیر الولد۔

میری وفات کے بعد میرے مال کا وارث بن جائے اور آل یعقوب سے نبوت کا۔ ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ ان کو یہ خوف لاحق تھا کہیں اولاد کے علاوہ دوسرے لوگ وارث بن جائیں اور کلالہ کی نوبت آئے۔

الدر المنثور میں آیا ہے: ابن عباس مجاہد، عکرمہ اور ابو صالح نے کہا ہے کہ يَّرِثُنِيْ سے مراد مالی وراثت ہے۔

اعتراض کیا جاتا ہے: یہ کہنا کہ انبیاء کے لیے شایان شان نہیں ہے کہ وہ مالی وراثت کے لیے اس قدر اہمیت کے قائل ہو جائیں۔

---

[1] تفسیر ابن جریر

جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کے پاس گھر مال و دولت ہو اور اس گھر کو صحیح مصرف میں خرچ کرنے کے لیے صالح اولاد کی تمنا کریں۔ چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام کے بارے میں یہ بات ثابت ہے کہ آپؑ ہیکل بیت المقدس کے مسئول تھے اور آپؑ کی زوجہ حضرت سلیمان کے خاندان کی ایک فرد تھیں تو عین ممکن ہے کہ اس خاندان کے پاس تحائف و نذورات اور وراثت کے ذریعے ایک معتدبہ دولت موجود ہو اور حضرت زکریا علیہ السلام اس دولت کے ذریعے انسانی خدمات انجام دے رہے ہوں اور اپنے بعد کے لیے غیر صالح مالی وارثوں سے خائف ہوں۔

اس سلسلے میں امام شمس الدین سرخسی کا استنباط قابل توجہ ہے۔ آپ اپنی معروف فقہی کتاب المبسوط جلد ۱۲ صفحہ ۳۶ باب الوقف طبع دار الکتب العلمیہ بیروت میں لکھتے ہیں:

واستدل بعض مشایخنا رحمهم الله تعالیٰ بقوله علیه الصلوة والسلام: انا معاشر الانبیاء لانورث ما ترکناه صدقة۔ فقالوا معناه: ما ترکناه صدقة لا یورث ذلك، و لیس المراد ان اموال الانبیاء علیهم الصلوة والسلام لاتورث وقد قال الله تعالیٰ: وَوَرِثَ سُلَيۡمٰنُ دَاوٗدَ وقال الله تعالیٰ: فَهَبۡ لِىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِىۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ فحاشا ان یتکلم رسول الله صلی الله علیه وسلم بخلاف المنزل، فعلی هذا التاویل فی الحدیث بیان ان لزوم الوقف من الانبیاء علیهم الصلوة والسلام خاصة بناء علی ان الوعد منهم کالعهد من غیرهم۔

ہمارے بعض اساتذہ نے وقف کے ناقابل تنسیخ ہونے پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے: انا معاشر الانبیاء لانورث ما ترکناه صدقة وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو مال بعنوان صدقہ (وقف) ہم نے چھوڑا ہے اس کا ہم سے کوئی وارث نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے اموال کے وارث نہیں ہوتے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَوَرِثَ سُلَيۡمٰنُ دَاوٗدَ نیز فرمایا: فَهَبۡ لِىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِىۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ پس ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قرآن کے خلاف بات کریں۔ حدیث کی اس توجیہ سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی طرف سے وقف کا ناقابل تنسیخ ہونا ایک خصوصی بات ہے کیونکہ انبیاء کے "وعدے" دوسرے لوگوں کے "معاہدے" کی طرح ہیں۔

چنانچہ حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا نے اس آیت سے فدک کی وراثت پر استدلال فرمایا۔ تفصیل کے ملاحظہ ہو سورۃ نمل آیت ۱۶۔ وَوَرِثَ سُلَيۡمٰنُ دَاوٗدَ اور خطبہ فدک کا ہمارا ترجمہ۔

واضح رہے وقف کا لفظ جدید اصطلاح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں لفظ وقف کی جگہ نحلة هبة اور صدقة کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ احادیث اور تاریخ میں صدقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے

الفاظ بہت ملتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قدرت الٰہی پر خالص عقیدہ رکھنے والے ظاہری علل و اسباب پر انحصار نہیں کرتے۔

۲۔ اولاد صالح کے لیے دعا کرنا انبیاء علیہم السلام کی سیرت ہے۔

۳۔ انبیاء علیہم السلام اپنے بعد کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسۡمُهٗ يَحۡيٰى ۙ لَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ سَمِيًّا ۝۷

۷۔ (جواب ملا) اے زکریا! ہم آپ کو ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے، اس سے پہلے ہم نے کسی کو اس کا ہمنام نہیں بنایا۔

تشریح کلمات

سَمِيًّا: (س م ی) ہمنام، ہم نظیر۔

تفسیر آیات

انجیل لوقا ۱:۵۷-۶۲ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی تفصیل موجود ہے۔ انجیل میں ان کا نام یوحنا تھا۔ آپؑ کو بچپنے میں الٰہی منصب عطا ہوا اور آپؑ نے ازدواجی زندگی اختیار نہیں کی۔ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر آپؑ ایمان لے آئے۔

فرقہ صابئہ آپؑ کے پیروکار ہیں۔ آپؑ صاحب کتاب نہ تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے سے پہلے آپؑ شریعت موسیٰ علیہ السلام پر قائم تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لانے کے بعد آپ شریعت عیسوی کے تابع تھے۔ تاہم فرقہ صائبہ نے آپؑ کی اتباع کی بنیاد پر ایک مذہب بنا لیا ہے۔ فرقہ صائبہ کے پیروکار آج کل عراق کے بعض علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امۡرَاَتِىۡ عَاقِرًا وَّقَدۡ بَلَغۡتُ مِنَ الۡكِبَرِ عِتِيًّا ۝۸

۸۔ عرض کی: پروردگارا! میرے ہاں بیٹا کس طرح ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں؟

تشریح کلمات

عِتِیًّا: (ع ت و) العتو سرکش ہونے کو کہتے ہیں۔ یہاں بڑھاپے کی ایسی حالت کو عِتِیًّا کہا ہے جہاں اصلاح اور مداوا کی کوئی سبیل نہیں رہتی۔

تفسیر آیات

بڑھاپے کی وجہ سے طاقت تولید ختم ہونے اور بیوی کے بانجھ ہونے کی صورت میں بھی اولاد کی خوشخبری باعث تعجب ہے اور اس جملے میں اسی تعجب کا اظہار ہے۔ ورنہ خود حضرت زکریاؑ نے ان دونوں باتوں کا اپنی دعا سے پہلے ذکر کیا ہے یا ممکن ہے ایمان کے باوجود برائے اطمینان یہ سوال اٹھایا ہو۔

اہم نکات

۱۔ مزید اطمینان کا مطالبہ ایمان کے منافی نہیں ہے۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدۡ خَلَقۡتُكَ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ تَكُ شَيۡـًٔا ﴿۹﴾

۹۔ فرمایا: اسی طرح ہو گا، آپ کے پروردگار کا ارشاد ہے: یہ تو میرے لیے آسان ہے، چنانچہ اس سے پہلے خود آپ کو بھی تو میں نے پیدا کیا جب کہ آپ کوئی چیز نہ تھے۔

تفسیر آیات

بوڑھے باپ اور بانجھ عورت سے اولاد پیدا کرنا اللہ کا تخلیقی عمل ہے اور اللہ کا تخلیقی عمل ایک ارادے پر موقوف ہے۔ لہٰذا اللہ کے لیے کوئی کام مشکل اور آسان نہیں ہوتا۔ سب کام یکساں ہوتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَۃً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ﴿۱۰﴾

۱۰۔ کہا: اے پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما، فرمایا: آپ کی نشانی یہ ہے کہ آپ تندرست ہوتے ہوئے بھی (کامل) تین راتوں تک لوگوں سے بات نہ کر سکیں گے۔

تفسیر آیات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کو اس بات کا بھی اطمینان کامل درکار تھا کہ اولاد کی خوشخبری

واقعاً اللہ کی طرف سے ہے، کوئی خیالی یا شیطانی واہمہ تو نہیں ہے۔ اس لیے ایک ایسی نشانی کی درخواست کی جس سے یقین آ جائے کہ یہ خوشخبری اللہ طرف سے ہے۔

واضح رہے انبیاءؑ پر وحی کا نزول ان کے درجات کے مطابق ہوتا ہے۔ وحی کا درجہ اس نبی کے درجہ کے مطابق ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی یہی مسئلہ درپیش تھا کہ پہلے اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ میں اللہ ہوں کہہ کر خطاب فرمایا۔ بعد میں عصا اور ید بیضاء کے معجزوں کے ذریعے باور کرایا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

لیکن خاتم الانبیاءؐ کے لیے اس قسم کی نشانی کی ضرورت نہیں پیش آئی بلکہ اِنِّیۡۤ اَنَا اللّٰہُ کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ براہ راست فرمایا: اِقۡرَاۡ ....

چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام کو علامت یہ دی گئی کہ وہ تین رات تک لوگوں سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ سَوِیًّا یہ بات نہ کر سکنا کسی بیماری کی وجہ سے نہ تھا۔ تندرست حالت میں بات نہیں کر سکتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف سے وحی کو ناقابل شک و تردید بنایا جاتا ہے۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوۡمِہٖ مِنَ الۡمِحۡرَابِ فَاَوۡحٰۤی اِلَیۡہِمۡ اَنۡ سَبِّحُوۡا بُکۡرَۃً وَّ عَشِیًّا ﴿۱۱﴾

۱۱۔ پھر وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے اور ان سے اشارتاً کہا: صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔

تشریح کلمات

الۡمِحۡرَابِ: (ح ر ب) جائے عبادت کو محراب اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں شیطان کے خلاف حرب (جنگ) ہوتی ہے۔ (مجمع البیان)

اوحی: (و ح ی) یہاں وحی اشارے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

چنانچہ مروی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام سے لفظ وحی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

منه وحی النبوة و منه وحی الالهام ومنه وحی الاشارة .... | وحی کبھی نبوت کی وحی ہوتی ہے کبھی الہام کی اور کبھی اشارے کی وحی ہوتی ہے۔

اشارے کی وحی کے بارے میں اس آیت کی تلاوت فرمائی: فَاَوۡحٰۤی اِلَیۡہِمۡ ....[1]

---

[1] بحار الانوار ۱۴: ۱۸۰ باب ۱۵ قصص زکریا ....

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب اللہ کی طرف سے اولاد کی خوشخبری اور اس پر نشانی حاصل کر لی۔ اس کے بعد محراب عبادت سے نکل کر لوگوں کے سامنے آئے تو بول تو نہیں سکتے تھے اس لیے لوگوں کو اشارے میں ذکر و عبادت کی تلقین کیا کرتے تھے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ۙ۱۲	۱۲۔ اے یحییٰ! کتاب (خدا) کو محکم تھام لو اور ہم نے انہیں بچپن ہی سے حکمت عطا کی تھی۔
وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ۙ۱۳	۱۳۔ اور اپنے ہاں سے مہر و پاکیزگی دی تھی اور وہ پرہیزگار تھے۔
وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝۱۴	۱۴۔ اور وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے اور سرکش و نافرمان نہیں تھے۔

تشریح کلمات

حنان: (ح ن ن) شفقت اور رحم کے معنوں میں ہے۔ الحنان و المنان اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی میں سے ہے۔

تفسیر آیات

خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ: کتاب کو محکم تھام لو۔ حضرت یحییٰ صاحب شریعت نبی نہ تھے لہٰذا یہاں کتاب سے مراد توریت ہے چونکہ اس زمانے میں جو شریعت نافذ تھی وہ توریت کی شریعت تھی۔

بچپن میں حکمت۔ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا: ہم نے اسے (یحییٰ علیہ السلام کو) بچپن میں حکمت عنایت کی۔ حکمت سے مراد نبوت ہو سکتی ہے۔ (فخر رازی)

صَبِيًّا: قتادہ کہتے ہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو دو یا تین سال کی عمر میں حکمت ملی۔ مقاتل کہتے ہیں دو سال میں ملی۔ فقیہ جلیل ابن العربی مالکی نے لکھا ہے کے حکم کے یہاں تین معنی ہو سکتے ہیں: ایک، وحی دوسرے نبوت، تیسرے اس کی معرفت اور اس پر عمل۔ یہ تینوں معنی درست ہو سکتے ہیں۔ کم سنی میں نزول وحی اور مکاشفہ ملائکہ جائز ہیں۔ (احکام القرآن)

تھانوی نے فرمایا کہ یہ اصل اور دلیل ہے اس قول کی جو اکثر لوگوں کی زبان پر جاری رہتا ہے کہ فلاں شخص مادر زاد ولی ہے۔[1]

---

[1] تفسیر قرآن دریابادی صفحہ ۶۲۵

اس بات سے اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں رہتا کہ بعض ائمہ اہل بیت علیہم السلام کم سنی میں امامت کے منصب پر فائز ہو گئے۔ چونکہ بچپن میں نزول وحی، مکاشفہ ملائکہ اور اللہ کی طرف سے معاملات میں فیصلہ دینے کا اختیار ہو سکتا ہے تو لڑکپن میں اگر الٰہی منصب مل جائے تو جائے سوال نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر بچپن میں نبوت کے درجے پر فائز ہونا ممکن ہے تو لڑکپن میں امامت کے منصب پر فائز ہونا بھی ممکن ہے۔

چنانچہ تفسیر قرطبی میں اسی آیت کے ذیل میں آیا ہے کہ قتادہ کے مطابق حضرت یحییٰ علیہ السلام کو دو یا تین سال میں حکمت عطا ہوئی۔ مقاتل کہتے ہیں تین سال میں عطا ہوئی۔

وَّ حَنَانًا مِّنۡ لَّدُنَّا: اللہ کی طرف سے ان کے دل میں شفقت اور رحم کا ایک جذبہ موجزن تھا جس کے تحت وہ اپنی امت پر مہربان تھے اور ان کی نجات کے لیے بے تاب رہتے تھے۔

وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَیۡہِ: والدین کے ساتھ نیکی کرنا ایک ایسی اچھی خصلت ہے جو بڑے بڑے صاحب فضائل انبیاء کے لیے بھی ممتاز فضیلت ہے۔

وَ سَلٰمٌ عَلَیۡہِ یَوۡمَ وُلِدَ وَ یَوۡمَ یَمُوۡتُ وَ یَوۡمَ یُبۡعَثُ حَیًّا ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور سلام ہو ان پر جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس دن انہوں نے وفات پائی اور جس دن انہیں زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔

تفسیر آیات

انسان کی سیر ارتقا خاک سے ہے۔ پھر عالم نبات میں داخل ہوتا ہے۔ پھر عالم حیوانات (جراثیم) میں۔ پھر عالم جنین میں، پھر عالم دنیا میں، پھر عالم برزخ میں اور پھر عالم قیامت میں داخل ہوتا ہے۔ تین عوالم میں سے تین عالم شعور کے ہیں: عالم دنیا، عالم برزخ اور عالم قیامت۔ ان میں سے ہر ایک میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک نئے عالم میں قدم رکھ رہا ہے جس کا رہن سہن پچھلے عالم سے مختلف ہے چنانچہ عالم جنین سے عالم دنیا میں قدم رکھتے ہی زندگی کے طور وطریقے اور قوانین زیست بدل جاتے ہیں۔ یہاں آکر یہ انسان اپنی ہر حرکت و جنبش کا جوابدہ اور ذمے دار ہے اور ساتھ کڑی آزمائش کے سخت ترین مراحل بھی طے کرنا ہیں۔ سب سے اہم یہ کہ آنے والے عوالم کی تقدیر بھی اسی عالم میں رقم کرنا ہے۔ اس لیے اس عالم میں قدم رکھنے کا دن اس انسان کے لیے اہم ترین دن ہے۔ وَ سَلٰمٌ عَلَیۡہِ یَوۡمَ وُلِدَ سلام ہو ان پر جس دن وہ پیدا ہوئے، نہایت اہمیت کا حامل سلام ہے۔

اس پر آشوب اور پر خطر زندگی کے خاتمے کے بعد جب موت آتی ہے تو عالم برزخ میں قدم رکھنے والا دن بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے جہاں اس فصل سے فائدہ اٹھانا ہے جو عالم دنیا میں بوئی ہے۔ عالم

برزخ میں اور کسی چارہ سازی کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ اس روز کی سلامتی بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے۔
وَ يَوۡمَ يَمُوۡتُ سلام ہو ان پر جب انہوں نے وفات پائی۔
حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ان کے زمانے کے یہودی فرمانروا ہیرود نے قتل کیا۔ واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

> ہیرود اپنے بھائی کی بیوی پر فریفتہ ہو گیا تھا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام اس پر ہیرود کی ملامت کرتے تھے۔ اس پر ہیرود نے انہیں گرفتار کیا۔ بعد میں اس عورت کی خواہش پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کیا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک بھی تھال میں رکھ کر یزید کو پیش کرنا تھا۔ اس شباہت کی بنا پر حضرت امام حسین علیہ السلام حضرت یحییٰ علیہ السلام کو یاد فرما کر فرمایا کرتے تھے:

ان من هوان الدنيا على الله ان يهدى رأس يحيى بن زكريا الى بغي من بغايا بني اسرائيل۔۔۔۔[1]	اللہ کے نزدیک اس دنیا کی حقارت کی ایک مثال یحییٰ علیہ السلام کا سر ہے جو بنی اسرائیل کی ایک بدچلن کے لیے تحفتاً پیش کیا گیا۔

عالم قیامت کی ہولناکی کا کیا ذکر جس میں بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور جسے فزع اکبر کہتے ہیں۔ اس عالم نفسا نفسی میں قدم رکھتے ہوئے کسی کو سلامتی کی نوید ملے تو اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔
وَ يَوۡمَ يُبۡعَثُ حَيًّا: سلام ہو ان پر جس دن انہیں زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی منصب کے لیے سن و سال کی قید نہیں ہوتی۔
۲۔ نبی اپنی امت پر مہربان ہوتے ہیں۔
۳۔ والدین کے ساتھ نیکی ایک نبی کے لیے قابل ذکر فضیلت ہے۔
۴۔ تین دن انسان کے لیے اہم ترین ہیں: پیدائش، موت اور قیامت کا دن۔

وَ اذۡكُرۡ فِي الۡكِتٰبِ مَرۡيَمَ ۘ اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَهۡلِهَا مَكَانًا شَرۡقِيًّا ﴿۱۶﴾	۱۶۔ اور (اے رسول!) اس کتاب میں مریم کا ذکر کیجیے جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر مشرق کی جانب گئی تھیں۔

---

[1] الارشاد الشیخ المفید ۲: ۱۳۲۔ بحار ۴۴: ۳۶۴

تشریح کلمات

انۡتَبَذَتۡ : (ن ب ذ) یکسو ہو جانا۔ دور نکل جانا۔

تفسیر آیات

الۡکِتٰبِ: سے مراد قرآن ہے۔ مریم علیہا السلام کا ذکر قرآن میں ثبت کرنے کا حکم ہے۔ اس حکم کا خصوصی طور پر ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے ذکر کو تاریخ ادیان میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

مَکَانًا شَرۡقِیًّا: مشرق کی جانب سے مراد بیت المقدس کا مشرقی حصہ ہو سکتا ہے۔ اس مشرقی حصے کے ذکر میں کیا فلسفہ ہے؟ ابن عباس کی ایک روایت کا کہنا ہے کہ نصاریٰ نے اسی لیے مشرق کو اپنا قبلہ بنایا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت ہے۔ طبری کے مطابق اس زمانے کے لوگ مشرقی جانب کے تقدس کے قائل تھے۔

فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِہِمۡ حِجَابًا ۟ۚ فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡہَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَہَا بَشَرًا سَوِیًّا ﴿۱۷﴾

۱۷۔ پھر انہوں نے ان سے پردہ اختیار کیا تھا پس ہم نے ان کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا، پس وہ ان کے سامنے مکمل انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔

تفسیر آیات

دُوۡنِہِمۡ : مِنۡ اَہۡلِہَا سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر والوں سے الگ پردے میں گئیں۔

رُوۡحَنَا: فرشتہ۔ جبرئیل۔ قرآن مجید نے متعدد جگہوں پر جبرئیل کو روح اور روح الامین کہا ہے۔

فَتَمَثَّلَ لَہَا بَشَرًا: جبرئیل حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے بشر کی شکل میں نمودار ہوئے۔ بشر کی شکل سے مراد یہ ہے کہ خود بشر نہ تھے، بشر کی شکل میں تھے۔

سَوِیًّا: مکمل انسان، جس میں انسانی شکل کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔

اسی لیے حضرت مریم علیہا السلام کو اس کے انسان ہونے پر شک نہیں گزرا۔ حضرت مریم علیہا السلام جبرئیل کو ان کی اپنی شکل میں دیکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں لہٰذا ان کا ایک مانوس انسانی شکل میں نمودار ہونا ضروری تھا۔

قَالَتۡ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡکَ اِنۡ کُنۡتَ تَقِیًّا ﴿۱۸﴾

۱۸۔ مریم نے کہا: اگر تو پرہیزگار ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔

تفسیر آیات

ایک عصمت پناہ خاتون جب ایک اجنبی مرد کو اپنی خلوت میں آتے دیکھتی ہے تو گھبرا کر یہی کہے گی: تجھے اللہ کا واسطہ! یہاں سے دور ہو جا۔ حضرت مریم علیہا السلام نے یہی فرمایا: اگر تو خدا ترس ہے تو میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱﴾ تم غالب ہی رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

اہم نکات

۱۔ اللہ ہمیشہ بے پناہوں کے لیے پناہ ہے۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّکِ ٭ۖ لِاَہَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اس نے کہا: میں تو بس آپ کے پروردگار کا پیغام رساں ہوں تاکہ آپ کو پاکیزہ بیٹا دوں۔

تفسیر آیات

رَسُوۡلُ رَبِّکِ: آپ کے رب کا رسول ہوں۔ ایک مہم کے لیے آپ کے رب کا فرستادہ ہوں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ غیر نبی پر بھی جبرئیل کا نزول ہوتا ہے اور اللہ غیر نبی کی طرف بھی اپنا رسول بھیجتا ہے۔

لِاَہَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا: میں تجھے پاکیزہ لڑکا دوں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ کا فرستادہ اس بات کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے کہ "میں لڑکا دوں۔" کہنا یہ چاہیے کہ "اللہ کی طرف سے لڑکا دوں۔"

جواب یہ ہے: اگر کوئی شخص کسی کی طرف سے نمائندہ یا وکیل ہو تو کبھی اس فعل کو اس ذات کی طرف نسبت دیتا ہے جس کا نمائندہ یا وکیل ہے اور کبھی اپنی طرف نسبت دیتا ہے۔ جب اپنی طرف نسبت دیتا ہے تو نمائندہ ہونا اس بات پر قرینہ ہے کہ یہ عمل میرا اپنا نہیں ہے۔

جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

وَاُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ...﴿۲﴾ اور میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور برص کے مریض کو تندرست اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔

یہاں بھی باذن اللہ قرینہ ہے کہ یہ عمل اللہ کا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے نمائندوں کا عمل، اللہ کا عمل ہوتا ہے: لِاَہَبَ ....

۱۔ ۳ آل عمران: ۱۳۹ ۲۔ ۳ آل عمران: ۴۹

قَالَتۡ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ وَّ لَمۡ اَکُ بَغِیًّا ﴿۲۰﴾

۲۰۔ مریم نے کہا: میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا؟ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکردار بھی نہیں ہوں۔

تفسیر آیات

''کسی بشر نے نہیں چھوا'' سے جائز اور حلال مباشرت کی نفی ہو گئی اور ''بدکردار نہیں ہوں'' سے نامشروع مباشرت کی نفی ہو گئی۔

قَالَ کَذٰلِکِ ۚ قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَ لِنَجۡعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحۡمَةً مِّنَّا ۚ وَ کَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِیًّا ﴿۲۱﴾

۲۱۔ فرشتے نے کہا: اسی طرح ہوگا، آپ کے پروردگار نے فرمایا: یہ تو میرے لیے آسان ہے اور یہ اس لیے ہے کہ ہم اس لڑکے کو لوگوں کے لیے نشانی قرار دیں اور ہماری طرف سے رحمت ثابت ہو اور یہ کام طے شدہ ہے۔

تفسیر آیات

هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ: اس جملے کی تشریح سورہ آل عمران آیت ۴۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

وَ لِنَجۡعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ: غیر مانوس طریقہ تولید سے ایک بچے کی معجزانہ ولادت میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ اس طرف اشارہ ہے کہ اس میں ایک تو اللہ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی ہے کہ وہ اپنے ارادے میں کسی خاص طریقہ کا محتاج نہیں ہے۔

وَ رَحۡمَةً مِّنَّا: اور دوسری بات یہ ہے کہ اس مولود کے ذریعے اللہ اپنی رحمت کا جلوہ دکھانا چاہتا ہے کہ یہ مولود معاشرے کی مجبور و مقہور انسانیت کے لیے مریضوں کی شفایابی جیسی رحمت الٰہی کا ایک مظہر ہوگا۔ یہ اللہ کا ایک اٹل فیصلہ تھا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے لیے ہر کام آسان ہی ہوتا ہے: هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ....

۲۔ غیر مانوس طریقے سے انسان پیدا کرنا اللہ کی قدرت کاملہ کی نشانی ہے: اٰیَةً لِّلنَّاسِ ....

۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں رحمت کا پہلو غالب تھا: وَ رَحۡمَةً مِّنَّا ....

فَحَمَلَتۡهُ فَانۡتَبَذَتۡ بِهٖ مَکَانًا

۲۲۔ اور مریم اس بچے سے حاملہ ہو گئیں اور وہ

قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ اسے لے کر دور مقام پر چلی گئیں۔

تفسیر آیات

دور جگہ سے مراد بیت لحم ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ عفت و طہارت کے خاندان کی ایک پاکیزہ لڑکی جو تقویٰ و عبادت میں مشہور اور بیت المقدس میں اعتکاف و عبادت میں مشغول ہو، یکا یک بغیر شوہر کے حاملہ ہو جائے تو کس قدر لوگوں کی طرف سے مورد لعن وطعن قرار پاتی ہے یہ تو خدا بہتر جانتا ہے۔ حضرت مریم نے لوگوں کی طرف سے لعنت و ملامت سے بچنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دی اور بیت المقدس سے دور بیت لحم کی طرف نکل گئیں۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾

۲۳۔ پھر زچگی کا درد انہیں کھجور کے تنے کی طرف لے آیا، کہنے لگیں: اے کاش! میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی اور صفحہ فراموشی میں کھو چکی ہوتی۔

تشریح کلمات

اَلْمَخَاضُ: (م خ ض) دردزہ۔

تفسیر آیات

ایک باعفت و باغیرت دوشیزہ کے ہاں بن شوہر بچہ ہو جائے تو اس کا یہی حال ہونا چاہیے جس کا حضرت مریم اظہار کر رہی ہیں۔

یہاں ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام کو علم تھا کہ یہ بچہ اللہ کی طرف سے معجزانہ طور پر پیدا ہو رہا ہے تو گھبرانا نہیں چاہیے تھا بلکہ اللہ پر بھروسہ کر کے اطمینان سے پیش آنا چاہیے۔ اس کا جواب حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے مروی حدیث ہے جس میں آپؑ نے اس پریشانی کی وجہ بیان فرمائی:

لانها لم ترفی قومها رشیداً ذا فراسة ینزهها عن السوء۔[1]

کیونکہ مریم سمجھتی تھیں کہ ان کی قوم میں کوئی فہم و فراست کا مالک شخص نہیں ہے جو مریم کو اس بدنامی سے بچالے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ

۲۴۔ فرشتے نے مریم کے پائین پا سے آواز دی:

---

[1] مجمع البیان ذیل آیہ۔ بحار ۱۴: ۲۲۱

جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾

غم نہ کیجیے! آپ کے پروردگار نے آپ کے قدموں میں ایک نہر جاری کی ہے۔
۲۵۔ اور کھجور کے تنے کو ہلائیں کہ آپ پر تازہ کھجوریں گریں گی۔

تشریح کلمات

سَرِيًّا: (س ر ی) السری۔ چشمہ، نہر۔ حدیث میں آیا ہے: مثل الصلوۃ کمثل السری علی باب احدکم۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی شریف، بلند درجہ کے ہیں یعنی عیسیٰ علیہ السلام۔

جَنِيًّا: (ج ن ی) تازہ پھل جو حال ہی میں توڑا گیا ہو۔

تفسیر آیات

فَنَادٰىهَا: پائنتی سے مریم کو پکارا۔ پکارنے والا کون تھا؟ اکثر کے نزدیک جبرئیل یا فرشتے تھے۔ بعض کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ اس پر قرینہ مِنْ تَحْتِهَآ (پائنتی سے) کو قرار دیتے ہیں کہ اس وقت حضرت مریم علیہا السلام کی پائنتی میں نومولود حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس مرحلہ میں کوئی کلام کیا ہو۔

بہرحال کلام کا مضمون یہ ہے: غم نہ کر تیرے رب نے تیرے نیچے چشمہ پیدا کیا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کو غم اپنی بدنامی کا تھا۔ تسلی کے لیے چشمے کی نوید سنائی جا رہی ہے اور کھانے کے لیے تازہ کھجور کی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ بدنامی سے بچنے کے لیے پہلے کوئی سبیل بیان فرما دیتا بعد میں کھانے کی خبر سنا دیتا۔

جواب یہ ہے کہ بدنامی سے بچنے کا مسئلہ اگرچہ حضرت مریم علیہا السلام کے لیے کھانے پینے کے مسئلے سے زیادہ سنگین تھا تاہم اللہ تعالیٰ نے چشمے اور تازہ کھجور فراہم کر کے مریم علیہا السلام کو یہ جتایا کہ تیرا رب تیرے چھوٹے مسائل میں تجھ پر نظر رکھتا ہے۔ جہاں وہ تیرے کھانے پینے کا خیال رکھتا ہے وہاں تجھے بدنامی کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ: کھجور کے تنے کو ہلانے کے حکم میں اس بات کی تصریح ہے کہ اگر کوئی عمل انسان خود انجام دے سکتا ہے، اسے اللہ خود انسان پر چھوڑ دیتا ہے۔

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ

۲۶۔ پس آپ کھائیں اور پئیں اور آنکھیں ٹھنڈی کریں اور اگر کوئی آدمی نظر آئے تو کہدیں: میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے اس لیے

اُكَلِّمَ الۡيَوۡمَ اِنۡسِيًّا ﴿۲۶﴾ لیے آج میں کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی۔

تفسیر آیات

یہاں سے اصل پریشانی کا حل بیان ہونا شروع ہو گیا کہ بچے کے بارے میں نہ کوئی آپ کو پریشانی لاحق ہو گی، نہ کچھ بولنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ چپ کا روزہ رکھ لیں۔ مسئلے کا حل ہمارے ذمے ہے۔ واضح رہے کہ اس زمانے کی شریعت میں چپ کا روزہ رکھنے کا شرعی جواز تھا۔ اسلامی شریعت میں یہ حکم منسوخ ہے۔

فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ مَا كَانَ اَبُوۡكِ امۡرَاَ سَوۡءٍ وَّمَا كَانَتۡ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

۲۷۔ پھر وہ اس بچے کو اٹھا کر اپنی قوم کے پاس لے آئیں، لوگوں نے کہا: اے مریم! تو نے بہت غضب کی حرکت کی۔

۲۸۔ اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکردار تھی۔

تشریح کلمات

فَرِيًّا: (ف ر ی) الفری۔ الامر العظیم (العین)

تفسیر آیات

توقع کے مطابق قوم کے افراد نے اس معاملے کو بہت بڑی فضیحت قرار دیا۔

يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ: ھارون کی بہن۔ اس بارے میں متعدد اقوال مجمع البیان میں مذکور ہیں:

i۔ بنی اسرائیل میں ہارون نام کی ایک مقدس شخصیت گزری تھی۔ پرہیزگاری میں لوگ ان کو بطور مثال پیش کرتے تھے۔ اس طرح اخت ھارون سے مراد شبیہ ہارون ہے۔

ii۔ حضرت مریم علیہا السلام کے بھائی کا نام ہے جو باپ کی طرف سے بھائی تھے، نہ ماں سے۔

iii۔ ہارون سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون ہیں اور اخت سے مراد برادری ہے۔ جیسے اخو تمیم کہتے ہیں۔

مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کی طرف روانہ فرمایا۔ وہاں لوگوں نے کہا: أرأیت ما تقرئون يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ۔ جب کہ ہارون اور عیسیٰ (علیہما السلام) میں بڑا فاصلہ ہے۔ میں نے واپس آکر رسول اللہ کی خدمت میں عرض کیا تو فرمایا: کیا تم نے نہیں کہا: انہم یسمون بالانبیاء والصالحین

قبلھم۔ وہ سابقہ انبیاء و صالحین کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے۔[1]

نیز حضرت مریم علیہا السلام کا تعلق نسل ہارون کے قبیلہ لاوی سے ہے۔ لہٰذا جیسے اخا ھاشم، اخا تمیم کہتے ہیں، اخت ھارون کہنا بھی درست ہے۔

فَاَشَارَتۡ اِلَیۡہِ ؕ قَالُوۡا کَیۡفَ نُکَلِّمُ مَنۡ کَانَ فِی الۡمَہۡدِ صَبِیًّا ﴿۲۹﴾

۲۹۔ پس مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا لوگ کہنے لگے: ہم اس سے کیسے بات کریں جو بچہ ابھی گہوارے میں ہے؟

تفسیر آیات

حضرت مریم علیہا السلام کو یقین تھا کہ بچہ خود ماں کی طہارت کی گواہی دے گا۔ یہ یقین یا تو سابقہ تجربہ سے آیا ہے اگر پائنتی سے بات کرنے والے خود عیسیٰ علیہ السلام تھے یا فرشتوں کے کہنے پر یقین آیا ہوگا۔ یہ بات زیادہ قرین واقع نظر آتی ہے کہ جہاں چپ کا روزہ رکھنے کا حکم آیا ہے وہاں اس بات کی یقین دہانی ہوگئی ہوگی کہ بچہ خود گواہی دے گا۔

منکرین معجزہ کَانَ کو ماضی بعید کے معنوں میں لے جا کر یہ ترجمہ کرتے ہیں: ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ گہوارے کا ہے۔ جب کہ کَانَ یہاں ثبت کے معنوں میں آیا ہے۔ جیسا کہ سابقہ آیت میں اِنۡ کُنۡتَ تَقِیًّا میں ہے۔ اس لفظ کا ثبت کے معنوں میں آنا اصطلاح اور قرآنی استعمال میں فروان ہے۔ جیسے:

وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِیِّہٖ سُلۡطٰنًا فَلَا یُسۡرِفۡ فِّی الۡقَتۡلِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مَنۡصُوۡرًا ۝[2]

جو شخص مظلوم مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار دیا ہے، پس اسے بھی قتل میں حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، یقیناً نصرت اسی کی ہوگی۔

یعنی نصرت لازم و ثابت ہے۔

نیز سورہ آل عمران آیت ۴۶ اور سورہ مائدہ آیت ۱۱۰ میں فرمایا:

وَ یُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَہۡدِ وَ کَہۡلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۝

اور وہ لوگوں سے گہوارے میں اور بڑی عمر میں گفتگو کرے گا اور صالحین میں سے ہوگا۔

تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَہۡدِ وَ کَہۡلًا ۚ ....

تم گہوارے میں اور بڑے ہو کر لوگوں سے باتیں کرتے تھے۔

---

[1] کتاب سعد السعود: ۲۲۱　[2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۳۳

ان دو آیات میں کسی کانَ کے بغیر گہوارے میں بات کرنے کی صراحت موجود ہے۔

قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ﴿ۙ۳۰﴾	۳۰۔ بچے نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔
وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ۪ وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ﴿۪ۖ۳۱﴾	۳۱۔ اور میں جہاں بھی رہوں مجھے بابرکت بنایا ہے اور زندگی بھر نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا ہے۔
وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ ۫ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾	۳۲۔ اور اپنی والدہ کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والا قرار دیا ہے اور اس نے مجھے سرکش اور شقی نہیں بنایا۔

تفسیر آیات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی پیدائش کے مسئلے کو براہ راست نہیں چھیڑتے بلکہ اول تو گہوارے میں معجزانہ طور پر بات کرنا، پھر اللہ کی طرف سے کتاب و نبوت عطا ہونے کی گواہی سے ولادت کا مسئلہ ناقابل شک طریقہ سے حل ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے معجزانہ کلام میں چند باتوں کی صراحت فرمائی:

۱۔ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ: سب سے پہلے عبودیت و بندگی کا اقرار کیا جو ایمان بخدا رکھنے والوں کے لیے بالعموم اور انبیاء علیہم السلام کے لیے بالخصوص سب سے اہم اور اولین بات ہے اور بالاخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے جو معجزانہ طور پر بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کے بندہ خدا ہونے میں غلط فہمی کا امکان زیادہ تھا۔ چنانچہ دین توحید اسلام میں پہلے اپنے رسولؐ کی عبودیت کی گواہی دی جاتی ہے، بعد میں رسالت کی: اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

و کفانی عزا ان اکون لک عبداً۔[1]	میری عزت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ میں تیرا عبد ہوں۔

۲۔ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ: اس نے مجھے کتاب دی ہے۔ مستقبل میں کتاب دینا یقینی ہے اس لیے کہا گیا: اس نے مجھے کتاب دی ہے یا کتاب دینے کا عمل انجام پا چکا ہے۔ دونوں باتیں ممکن ہیں لیکن آیت کا ظہور

---

[1] شرح نہج البلاغۃ ۲۰: ۲۵۵

اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طفولیت میں کتاب دے دی گئی ہے۔ چنانچہ بغوی معالم التنزیل میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

وقال الاکثرون اوتی الانجیل وھو صغیر طفل وکان یعقل عقل الرجال۔	اکثر نے کہا ہے کہ عیسیٰ کو انجیل اس وقت دی گئی ہے جب آپ چھوٹے بچے تھے لیکن مردوں والی عقل رکھتے تھے۔

البحر المحیط میں لکھا ہے:

وَجَعَلَنِیۡ نَبِیًّا کے ظہور سے معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو طفولیت میں ہی نبی بنایا ہے اور ان کی عقل کو کامل کیا۔ پھر طفولیت میں ہی نبوت پر فائز کیا ہے۔ انس اور ابن عباس اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس وقت کتاب عنایت فرمائی جب آپؑ شکم مادر میں تھے۔

۳۔ وَجَعَلَنِیۡ نَبِیًّا: اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مستقبل میں نبی بنانے کی خبر ہے یا اسی وقت گہوارے میں نبی تھے؟

یہ بات تاریخ انبیاء و اوصیاء میں انوکھی نہیں ہے کہ عالم طفولیت میں ہی ایک ہستی صاحب کتاب اور منصب نبوت پر فائز ہو جائے۔ اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

۴۔ وَّجَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا: البرکۃ کے معنی النماء الزیادۃ کے ہیں ۔ اللہ نے مجھے خیر و برکت کا ذریعہ بنایا ہے اس طرح کہ لوگوں کی تعلیم و تزکیہ کے ذریعہ خیر پھیلانے اور مریضوں کو شفایابی کے ذریعے۔

۵۔ وَاَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ: نماز اور زکوٰۃ یعنی بندگی اور بندہ نوازی، تمام ادیان الٰہی کی تعلیمات میں ستون کی حیثیت رکھتی ہیں ۔انبیاء علیہم السلام نے مہد سے لحد تک اپنی پوری زندگی ان دو چیزوں کو عام کرنے پر صرف فرمائی ہے۔

۶۔ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ: مجھے اپنی والدہ کے ساتھ نیکی کرنے والا بنایا۔ والدین پر نیکی کرنا انبیاء علیہم السلام کا اخلاق ہے۔ یہ ایک ایسی نیک خصلت ہے کہ اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی ایک فضیلت اور امتیاز ہے۔

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَیَوۡمَ اَمُوۡتُ وَیَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾	۳۳۔ اور سلام ہو مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز میں وفات پاؤں گا اور جس روز زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

تشریح کے لیے ملاحظہ ہو اس سورہ کی آیت ۱۵۔

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾

۳۴۔ یہ ہیں عیسیٰ بن مریم، (اور یہ ہے) وہ حق بات جس میں لوگ شبہ کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حق پر مبنی واقعہ یہ ہے کہ وہ عبد خدا ہیں۔ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ انہیں کتاب دی گئی ہے۔ نہ وہ فرزند خدا ہیں جیسا کہ عیسائیوں کا نظریہ ہے اور نہ ہی ان کی ولادت باطہارت میں شک ہے۔ جیسا کہ یہود کی طرف سے الزام ہے۔

مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ ۖ سُبْحَانَهُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٣٥﴾

۳۵۔ اللہ کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے، وہ (ایسی باتوں سے) پاک ہے، جب وہ کسی امر کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس سے فرماتا ہے: ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ اور باقی کائنات کا تعلق کُنْ فَيَكُونُ ہے۔ خلق و ایجاد کا تعلق ہے، تولید کا تعلق نہیں ہے۔ مزید تشریح کے لیے البقرۃ آیت ۱۱۶ ملاحظہ ہو۔

وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٣٦﴾

۳۶۔ اور یقیناً اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے پس اس کی بندگی کرو، یہی راہ راست ہے۔

تفسیر آیات

سیاق کلام یہ ہے کہ اے رسول کہدیجیے کہ اللہ ہی تمہارا اور میرا رب ہے۔ رسول اللہؐ کے لیے حکم ہو رہا ہے اور کلام عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہے چونکہ کلام عیسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ تو آیت ۳۳ پر ختم ہوا ہے۔

اس آیۂ مبارکہ میں فرمایا: چونکہ اللہ ہی رب ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرو۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبادت صرف رب کی ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم نے عبادت کی یہ تعریف اختیار کی ہے: عبادت یہ ہے کہ کسی کی تعظیم اس عنوان سے کی جائے کہ وہ رب اور خالق ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی تعظیم رب اور خالق کے عنوان سے نہ ہو تو یہ تعظیم عبادت اور شرک نہیں ہے۔

فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَیۡنِہِمۡ ۚ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ مَّشۡہَدِ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ مگر (مختلف) فرقوں نے باہم اختلاف کیا پس تباہی ان کافروں کے لیے ہو گی بڑے دن کے حاضر ہونے سے۔

تشریح کلمات

الۡاَحۡزَابُ: (ح ز ب) وہ جماعت جس میں سختی اور شدت پائی جائے اور ایک نظریہ رکھتی ہو۔

تفسیر آیات

یہ مسیحی فرقوں کے آپس کے اختلافات کا ذکر ہے۔ کلیسا کی تاریخ نزاعات و اختلافات سے پر ہے۔ پہلے یہ اختلاف رونما ہوا کہ حضرت مسیح اللہ ہیں یا رسول۔ ایک نظریہ تو یہ تھا کہ مسیح اللہ کے رسول ہیں دوسرا یہ کہ رسول ضرور ہیں لیکن ایک خاص مقام ہے۔ تیسرا یہ کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، مخلوق ہے۔ چوتھا یہ کہ اللہ کا بیٹا ہے، مخلوق نہیں ہے۔ باپ کی طرح قدیم ہے۔

اس کے بعد روح القدس کے بارے میں ایک اور اختلاف پیدا ہوا۔ کچھ نے کہا روح القدس کو بھی خدا کا درجہ حاصل ہے، کچھ منکر ہو گئے۔ ۳۸۱ء عیسوی میں قسطنطنیہ میں ایک فیصلہ ہوا جس میں روح القدس بھی خدا کے درجہ پر فائز ہوا۔ تثلیث کے اس نظریے کو آخری شکل دے دی گئی۔ اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے انسانی، خدائی، ملکوتی، لاہوتی اور ناسوتی پہلوؤں پر اختلافات رونما ہوتے رہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المائدۃ آیت ۷۳۔

اَسۡمِعۡ بِہِمۡ وَ اَبۡصِرۡ ۙ یَوۡمَ یَاۡتُوۡنَنَا لٰکِنِ الظّٰلِمُوۡنَ الۡیَوۡمَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ جس دن وہ ہمارے سامنے ہوں گے تو اس وقت کیا خوب سننے والے اور کیا خوب دیکھنے والے ہوں گے لیکن آج یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

تفسیر آیات

دنیا میں ان کی بصارت و سماعت پر مفادات، خواہشات اور آرزوؤں کے تہ بہ تہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ قیامت کے دن یہ سارے پردے ہٹ جائیں گے اور ہر چیز کماحقہ نظر آئے گی۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

لَقَدۡ کُنۡتَ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ ہٰذَا فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ ۔[1]

تو اس چیز سے غافل تھا چنانچہ ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

اہم نکات

۱۔ پردے ہٹنے کے بعد کا ایمان کوئی فائدہ نہ دے گا۔

وَ اَنۡذِرۡہُمۡ یَوۡمَ الۡحَسۡرَۃِ اِذۡ قُضِیَ الۡاَمۡرُ ۘ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ وَّ ہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اور (اے رسول) انہیں حسرت کے دن سے ڈرائیے جب قطعی فیصلہ کر دیا جائے گا اور یہ لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور یہ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر آیات

حسرت کا دن کافروں اور مشرکوں کے لیے نہایت المناک دن ہو گا۔

مجمع البیان میں مذکور ہے کہ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: جب اہل جنت، جنت میں اور اہل جہنم، جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو صدا دی جائے گی: اے اہل جنت! تو وہ سر اٹھائیں گے اور دیکھنے لگیں گے اور صدا دی جائے گی: اے اہل جہنم! وہ بھی سر اٹھائیں گے اور دیکھنے لگیں گے۔ پھر موت کو ایک جانور کی شکل میں لایا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا: کیا تم موت کو پہچانتے ہو؟ کہیں گے: یہی ہے۔ سب اسے پہچان لیں گے۔ پھر اسے ذبح کیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا: جنت والو! جاوید ہو۔ تمہیں موت نہیں آئے گی۔ جہنم والو! تم بھی ہمیشہ رہو گے۔ موت نہیں آئے گی۔ یہی مطلب ہے: وَ اَنۡذِرۡہُمۡ یَوۡمَ الۡحَسۡرَۃِ کا۔

صاحب مجمع البیان فرماتے ہیں:

ہمارے علما نے اس روایت کے آخر میں یہ بات حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ اہل جنت اس قدر خوش ہوں گے کہ اگر اس دن کسی نے مرنا ہوتا تو یہ لوگ خوشی سے مر جاتے اور جہنم والے ایسی ایک چیخ ماریں گے کہ اس دن کسی نے اگر مرنا ہوتا تو مر جاتا۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو قیامت کے دن کی حسرت سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے۔

---

[1] ۵۰ ق: ۲۲

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾

۴۰۔ اور ہم ہی زمین کے اور جو کچھ اس پر ہے سب کے وارث ہوں گے پھر وہ ہماری طرف لوٹائے جائیں گے۔

تفسیر آیات

زمین اور زمین والوں پر صرف اللہ کی حکمرانی ہو گی۔ نہ زمین کا کوئی مالک رہے گا، نہ زمین والے کسی چیز کا مالک رہیں گے۔ دنیا میں اگرچہ زمین والے خود مختار، اپنے ارادے میں آزاد ہونے کی وجہ سے کسی چیز کا اختیار رکھتے تھے لیکن قیامت کے دن یہ خود مملوک اور مسلوب الاختیار ہو جائیں گے اور کلی طور پر اللہ کے قبضہ اختیار میں ہوں گے۔ ان کا وارث اللہ ہو گا۔ یہ آیت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی دوسری تعبیر ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن صرف اللہ کا اختیار نافذ ہو گا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ ۬ إِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾

۴۱۔ اور اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجیے، یقیناً وہ بڑے سچے نبی تھے۔

تفسیر آیات

صدیق: صدوق سے صیغہ مبالغہ ہے۔ سچائی میں انتہائی اعلیٰ مقام پر فائز ہونے والا۔ ابراہیم علیہ السلام اپنے ایمان بالتوحید میں سچائی کے ایک ایسے مقام پر فائز تھے کہ ان کے ذہن و خیال میں غیر اللہ کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسی لیے وہ وقت کے طاغوت کے مقابلے میں اکیلے ڈٹ گئے اور آتش نمرود میں جاتے ہوئے روح الامین جیسے مقتدر فرشتے کو بھی اعتنا میں نہیں لائے۔ جہاں جبرئیل نے خلیل علیہ السلام سے پوچھا تھا: هل لك من حاجة؟ آپ کی کوئی حاجت ہے؟ حضرت خلیل نے فرمایا: اما اليك فلا مگر آپ سے کوئی حاجت نہیں۔[۱]

اہم نکات

۱۔ صدیق وہ ہے جس کا کوئی فعل اس کے عقیدے کے خلاف نہ ہو۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا

۴۲۔ جب انہوں نے اپنے باپ (چچا) سے کہا:

---

[۱] علل الشرائع ۱: ۳۵

لَا یَسۡمَعُ وَ لَا یُبۡصِرُ وَ لَا یُغۡنِیۡ عَنۡکَ شَیۡـًٔا ﴿۴۲﴾

اے ابا! آپ اسے کیوں پوجتے ہیں جو نہ سننے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ دیکھنے کی اور نہ ہی آپ کو کسی چیز سے بے نیاز کرتا ہے۔

تفسیر آیات

عبادت کے دو اہم ارکان ہیں: ایک یہ کہ جس کی عبادت کی جائے وہ راضی ہو۔ دوسرا اپنے معبود کی رضایت سے فائدہ اٹھائے۔ بتوں میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ بت نہ عبادت کو دیکھتے ہیں، نہ سنتے ہیں کہ تمہاری عبادت کا علم ہو جائے اور تم پر راضی ہو جائیں۔ وہ شعور و حیات کے مالک نہ ہونے کی وجہ سے تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں دے سکتے۔

یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ قَدۡ جَآءَنِیۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ یَاۡتِکَ فَاتَّبِعۡنِیۡۤ اَہۡدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اے ابا! بتحقیق میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا پس آپ میری بات مانیں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے علم کے اس مقام پر فائز کیا تھا جس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کے لیے اللہ کی وحدانیت پر وہ یقین حاصل ہو گیا جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام چٹان کی طرح مضبوط اور دریا کی طرح بیکراں ہو گئے تھے۔ آپؑ کو اللہ نے مقام علم و یقین پر فائز کرنے کے لیے ملکوت کی سیر کرائی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس دعوت میں علم کو سند اور قابل اتباع قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اتباع عالم کا ہوتی ہے۔ جس کے پاس سب سے زیادہ علم ہو گا وہی قابل اتباع ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ اتباع عالم کی ہی ہوتی ہے: جَآءَنِیۡ مِنَ الۡعِلۡمِ ....

۲۔ امت میں جس کے پاس سب سے زیادہ علم ہو گا اتباع اسی کی ہو گی: فَاتَّبِعۡنِیۡۤ ....

۳۔ صراط مستقیم کی طرف ہدایت عالم کر سکتا ہے: اَہۡدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا ....

یٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّیۡطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ کَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِیًّا ﴿۴۴﴾

۴۴۔ اے ابا! شیطان کی پوجا نہ کریں کیونکہ شیطان تو خدائے رحمٰن کا نافرمان ہے۔

يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا﴿۴۵﴾	۴۵۔ اے ابا! مجھے خوف ہے کہ خدائے رحمٰن کا عذاب آپ کو گرفت میں لے لے، ایسا ہوا تو آپ شیطان کے دوست بن جائیں گے۔

تفسیر آیات

شیطان کی عبادت سے مراد اطاعت ہے۔ یہاں شیطان کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ....[1]	اے اولاد آدم! کیا ہم نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا؟

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا﴿۴۶﴾	۴۶۔اس نے کہا:اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے برگشتہ ہو گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے ضرور سنگسار کروں گا اور تو ایک مدت کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔

تشریح کلمات

رَاغِبٌ: (ر غ ب) رغب کے اصل معنی کسی چیز میں وسعت کے ہیں۔ رغب اگر فی اور الی کے ساتھ استعمال ہو تو رغبت اور حرص کے معنی دیتا ہے اور اگر عن کے ساتھ ہے تو بے رغبتی کے معنی دیتا ہے۔

مَلِيًّا: (م ل ی) الاملاء کے معنی ڈھیل دینے کے ہیں۔ ملی من الدھر محاورہ ہے عرصہ دراز کے لیے۔

تفسیر آیات

منکر کے پاس جب منطق نہیں ہوتی تو طاقت کے استعمال پر اتر آتا ہے۔ الھتی، الٰہ کی جمع ہے۔ وہ اپنے بہت سے معبودوں کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ کلدانی مذہب میں ان معبودوں کے پانچ ہزار تک ناموں کے کتبوں کا انکشاف ہوا ہے۔

اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا: آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے پاس سے ایک طویل مدت یا ہمیشہ کے لیے دور ہونے کو کہا۔ اس سے عندیہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزر کے پاس ہوتے تھے۔ اس سے اس بات کو تقویت

---

[1] ۳۶ یس: ۶۰

ملتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد اس وقت زندہ نہیں تھے۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَیۡکَ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَکَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِیۡ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾

۴۷۔ ابراہیم نے کہا: آپ پر سلام ہو! میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا یقیناً وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے۔

تشریح کلمات

حَفِیًّا: (ح ف و) الحفی نیکوکار اور نہایت مہربان کے معنوں میں ہیں نیز کسی چیز کو اچھی طرح جاننے والے کو بھی حفی کہتے ہیں: یَسۡـَٔلُوۡنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ ...۔[1]

تفسیر آیات

کفر و ایمان کے درمیان آداب کلام اور سلوک و رویے میں فرق نمایاں ہے۔ کفر کی طرف سے سنگساری کی دھمکی اور اپنے سے دور کرنے کی بات ہو رہی ہے اور ایمان کی طرف سے ابھی بھی سلام و استغفار ہے۔ سنگساری کے مقابلے میں سلام اور دوری و نفرت کے مقابلے میں استغفار۔

واضح رہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابتدائے دعوت میں آزر کے لیے اس لیے استغفار کی کہ یہ استغفار ایک مدت تک کے لیے تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سَاَسۡتَغۡفِرُ کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ ایک مدت کے بعد جب اس کے کفر پر قائم رہنے کا علم ہوا تو استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

ہم نے پہلے واضح کیا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حقیقی والد نہیں تھا اور مشرک کے لیے استغفار ممنوع ہے۔ چنانچہ فرمایا:

مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ یَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ ...۔[2]

نبی اور ایمان والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کے بارے میں فرمایا:

وَ مَا کَانَ اسۡتِغۡفَارُ اِبۡرٰہِیۡمَ لِاَبِیۡہِ اِلَّا عَنۡ مَّوۡعِدَۃٍ وَّعَدَہَاۤ اِیَّاہُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗۤ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنۡہُ ...۔[3]

اور (وہاں) ابراہیم کا اپنے باپ (چچا) کے لیے مغفرت طلب کرنا اس وعدے کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اس کے ساتھ کر رکھا تھا لیکن جب ان پر یہ بات کھل گئی کہ وہ دشمن خدا ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے۔

---

[1] ۷ اعراف: ۱۸۷۔ (ترجمہ) یہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا آپ اس کی کھوج میں ہوں
[2] ۹ توبہ: ۱۱۳ [3] ۹ توبہ: ۱۱۴

دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابتدائی دنوں کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر واضح ہو گیا تھا کہ آزر عدو اللہ (اللہ کا دشمن) ہے تو اس سے بیزاری اختیار کی۔

جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی آخری زندگی میں اپنے والدین کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں:

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ۝[1]

اے میرے رب! مجھے اور میرے والدین اور ایمان والوں کو بروز حساب مغفرت سے نواز۔

اس سے معلوم ہوا کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد نہیں ہے۔ آزر تو اللہ کا دشمن تھا۔ اس سے بیزاری ہوئی تھی۔ اب آخری عمر میں اس کے لیے طلب مغفرت کیسے ممکن ہے۔

اہم نکات

۱۔ ابتدائے دعوت میں ابراہیم علیہ السلام نے آزر کو اللہ کا دشمن ٹھہرایا اور اس سے بیزاری اختیار کی۔

۲۔ آخر عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کے لیے طلب مغفرت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آزر والد نہیں تھا۔

وَ اَعۡتَزِلُکُمۡ وَ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ ۫ۖ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَکُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور میں تم لوگوں سے نیز اللہ کے سوا جنہیں تم پکارتے ہو ان سے علیحدہ ہو جاتا ہوں اور میں اپنے پروردگار ہی کو پکاروں گا، مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب سے مانگ کر کبھی ناکام نہیں رہوں گا۔

تفسیر آیات

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ راہ راست پر نہیں آئیں گے تو ان سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کیا، ان کے معبود سے تو پہلے ہی کنارہ کش تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ ان کی یہ پکار سودمند رہے گی۔ آداب بندگی ہے کہ عبادت بجا لا کر اپنی عبادت کو ہیچ سمجھے، قبولیت کی امید رکھے اور ہمیشہ خوف و رجا، بیم و امید کے درمیان رہے۔ صرف خوف نہیں ہونا چاہیے چونکہ یہ ناامیدی اور کفر کی علامت ہے اور صرف امید نہیں ہونی چاہیے چونکہ یہ خود پسندی ہے، بندگی نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ عمل کر کے قبولت کی امید میں رہنا چاہیے جیسا کہ گناہ کر کے عذاب کے خوف میں رہنا چاہیے۔

---

[1] ۱۴ ابراھیم: ۴۱

فَلَمَّا اعۡتَزَلَہُمۡ وَ مَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ۙ وَہَبۡنَا لَہٗۤ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ وَ کُلًّا جَعَلۡنَا نَبِیًّا ﴿۴۹﴾

۴۹۔ پھر جب ابراہیم ان لوگوں سے اور اللہ کے سوا جنہیں یہ لوگ پوجتے تھے ان سے کنارہ کش ہوئے تو ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور سب کو ہم نے نبی بنایا۔

تفسیر آیات

اولاد کی عنایت اور سلسلہ نبوت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں قرار دینے کا فیصلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے جہاد، صبر و استقامت اور کڑی سی کڑی آزمائش سے نکلنے کے بعد ہوا۔ اس سلسلے کی آخری آزمائش ہجرت تھی۔ ہجرت کے بعد امتحان کا دور ختم ہوا اور دین و دنیا کی آسائش شروع ہوئی۔ جیسا کہ سورہ نحل آیت ۴۱ میں فرمایا:

وَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا فِی اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا لَنُبَوِّئَنَّہُمۡ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً ؕ وَ لَاَجۡرُ الۡاٰخِرَۃِ اَکۡبَرُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿﴾

اور جنہوں نے ظلم کا نشانہ بننے کے بعد اللہ کے لیے ہجرت کی انہیں ہم دنیا ہی میں اچھا مقام دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے اگر وہ جانتے ہوتے۔

اہم نکات

۱۔ راہ خدا میں ہجرت، دنیا و آخرت دونوں میں آسائش لاتی ہے۔

وَ وَہَبۡنَا لَہُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِنَا وَ جَعَلۡنَا لَہُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِیًّا ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اور ہم نے انہیں اپنی رحمت سے بھی نوازا اور انہیں اعلیٰ درجے کا ذکر جمیل بھی عطا کیا۔

تفسیر آیات

رَّحۡمَتِنَا: ابراہیم و آل ابراہیم (ع) کے لیے اللہ کی رحمت کا وصف تو خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ہم نے ان کو ملک عظیم دیا ہے۔

فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا ﴿﴾ [۱]

ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کی اور انہیں عظیم سلطنت عنایت کی۔

لِسَانَ صِدۡقٍ: عربی محاورہ میں لسان ستائش کے موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے:

لسان الناس علیك لحسنة۔		لوگوں کی ستائش تیرے حق میں بہتر ہے۔

---

[۱] ۴ نساء: ۵۴

مجمع البحرین میں لِسَانَ صِدۡقٍ کے معنی ثناء حسنا سے کیا ہے۔

اس سے زیادہ لسان صدق اور ثنائے جمیل کیا ہو سکتی ہے کہ تمام آسمانی ادیان آپ کو اپنے لیے سند سمجھتے ہیں اور اسلام میں تو حضرت خلیلؑ کے لیے ثنائے جمیل کا ایک اعلیٰ نمونہ یہ ہے کہ ہم جب اپنے رسول پر درود بھیجتے ہیں تو اس وقت ابراہیم اور آل ابراہیم کی عظمت کو سامنے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں:

اللّٰھم صلی علی محمد و علی آل محمد	اے اللہ درود بھیج محمد و آل محمد پر جیسا کہ تو نے ابراہیم
کما صلیت علی ابراھیم و آل ابراھیم۔	اور آل ابراہیم پر درود بھیجا ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ احزاب آیت ۶۵۔

یہ درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت ہے کہ آپؑ نے یہ دعا کی:

وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ۝ۙ [1]	اور آنے والوں میں مجھے ذکر جمیل عطا فرما۔

انبیاء کی طرف سے ذکر خیر کی خواہش یا اپنی اولاد سے محبت کی خواہش ذاتی خواہشات کی بنیاد پر نہیں ہے۔ بلکہ جو جہاد راہ خدا میں کیا ہے اور اللہ کی شریعت کو انسانوں میں متعارف کرایا ہے اس کے لیے دوام کی خواہش ہے اور وہ اس صورت میں ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل آنے والی نسلوں کے لیے لسان صدق کا درجہ حاصل رہے۔

اہم نکات

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ادیان سماوی کے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔ اپنے لیے ذکر جمیل کی خواہش الٰہی قدروں کے دوام کی خواہش ہے۔

۱۲۵

وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ مُوۡسٰۤی ۫ اِنَّہٗ کَانَ مُخۡلَصًا وَّ کَانَ رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾	۵۱۔ اور اس کتاب میں موسیٰ کا ذکر کیجیے، وہ یقیناً برگزیدہ نبی مرسل تھے۔

تفسیر آیات

مُخۡلَصًا: خالص، برگزیدہ۔ جس کے وجود، کردار اور افکار میں غیر اللہ کی کوئی جگہ نہ ہو۔ وہ خالص اللہ کے لیے زندہ رہتے اور اللہ کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ ہستی جس میں غیر اللہ کی کوئی آمیزش نہ ہو نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہوتی ہے۔ اسے مُخلَص کہتے ہیں۔

رَسُوۡلًا نَّبِیًّا: رسول اور نبی میں فرق ہم نے روایات کی روشنی میں مقدمہ میں بیان کیا ہے۔ رسول کے بعد نبی ہونے کے ذکر سے ہم نبی کے لغوی معنی مراد لے سکتے ہیں۔ بلند درجہ یا یہ کہ ترتیب ذکری سے

---

[1] ۲۶ شعراء: ۸۴

ترتیب درجہ لازم نہیں آتی۔

وَ نَادَیۡنٰہُ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ الۡاَیۡمَنِ وَ قَرَّبۡنٰہُ نَجِیًّا ﴿۵۲﴾

۵۲۔اور ہم نے انہیں طور کی داہنی جانب سے پکارا اور راز دار بنانے کے لیے انہیں قربت عطا کی۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے کوہ طور کی داہنی جانب۔ ورنہ خود کوہ کا دایاں بایاں نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین سے مصر جاتے ہوئے کوہ طور سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داہنی جانب سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی تھی۔

یہ سوال تشنہ جواب رہے گا کہ داہنی جانب کے ذکر میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ ممکن ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داہنی جانب سے ندا آئی ہو اور اَیمَن، یُمن و برکت کی طرف اشارہ ہو۔

وَ قَرَّبۡنٰہُ نَجِیًّا: یہ قربت حسی تو نہیں ہو سکتی کیونکہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے مناجات کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور بلایا تاہم کوہ طور اللہ کا مسکن نہیں ہے کہ اس کو قریب کرنا کہا جائے۔ لٰہذا قربت سے مراد اس مقام پر فائز کرنا ہے جس سے وہ اللہ سے ہم کلام ہو سکتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ سے ہمکلام ہونے کے لیے قرب کا ایک رتبہ ضروری ہے۔

وَ وَہَبۡنَا لَہٗ مِنۡ رَّحۡمَتِنَاۤ اَخَاہُ ہٰرُوۡنَ نَبِیًّا ﴿۵۳﴾

۵۳۔اور ان کے بھائی ہارون کو ہم نے اپنی رحمت سے نبی بنا کر (بطور معاون) انہیں عطا کیا۔

تفسیر آیات

ابتدائے بعثت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تھی:

وَ اجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا مِّنۡ اَہۡلِیۡ ﴿ۙ﴾ ہٰرُوۡنَ اَخِی ﴿ۙ﴾ [۱]

اور میرے کنبے میں سے میرا ایک وزیر بنا دے۔ میرے بھائی ہارون کو۔

اس دعا کو قبول کرتے ہوئے ہارون علیہ السلام کے ذریعے تقویت دینا اللہ کی رحمت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے علی علیہ السلام سے فرمایا:

---

[۱] ۲۰ طٰہ: ۲۹۔۳۰

اَنۡتَ مِنِّی بِمَنۡزِلَۃِ ھَارُونَ مِنۡ مُوسیٰ اِلَّا اَنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعۡدِی۔[1] تجھے مجھ سے وہی مقام حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھا صرف یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

یہاں حضرت علی علیہ السلام کے لیے نبوت کا استثنا فرمایا ورنہ باقی موہبہ الٰہی اور رحمت خداوندی میں حضرت علی علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام شریک ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہارون علیہ السلام موہبہ الٰہی، رحمت اور نبی تھے۔

وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِسۡمٰعِیۡلَ ۫ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الۡوَعۡدِ وَ کَانَ رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴿ۚ۵۴﴾

۵۴۔ اور اس کتاب میں اسماعیل کا (بھی) ذکر کیجیے، وہ یقیناً وعدے کے سچے اور نبی مرسل تھے۔

وَ کَانَ یَاۡمُرُ اَہۡلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ ۪ وَ کَانَ عِنۡدَ رَبِّہٖ مَرۡضِیًّا ﴿۵۵﴾

۵۵۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے۔

تفسیر آیات

حضرت اسماعیل ابن حضرت ابراہیم علیہما السلام، آپ حضرت ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ آپؑ قوم جرھم کی طرف مبعوث ہوئے۔ آپؑ کے لیے ان دو آیات میں پانچ اوصاف بیان ہوئے ہیں:

۱۔ صَادِقَ الۡوَعۡدِ: تمام انبیاء اور صالحین صادق الوعد ہیں۔ یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے اس کا خصوصی طور پر ذکر بتاتا ہے کہ آپؑ اس صفت میں ایک خصوصی رتبہ رکھتے تھے۔ ۱۲۷

۲۔ رَسُوۡلًا: آپؑ کو رسول کہنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قدیم عربوں میں آپؑ توحید کے داعی تھے۔ چنانچہ اسماعیل علیہ السلام کے بعد ایک جماعت ہمیشہ توحید پر قائم رہی۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

لم ازل انقل من اصلاب الطاھرین الی ارحام الطاھرات۔[2] میں پاکیزہ صلبوں سے پاکیزہ رحموں میں منتقل ہوتا رہا ہوں۔

۳۔ نَّبِیًّا: رسالت کے ذکر کے بعد نبوت کے ذکر سے مقام کی بلندی مراد لی جا سکتی ہے۔ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ ذکر میں ترتیب سے درجات میں ترتیب ضروری نہیں ہے۔

---

[1] الکافی ۸: ۱۰۶ [2] بحار الانوار ۱۵: ۱۱۷

۴۔ وَكَانَ يَاْمُرُ: اپنے خاندان کی نماز و زکوٰۃ کی عملی تربیت کرتے تھے۔ خاندان کی تربیت ایک ایسا اہم فریضہ ہے جس پر عمل کرنا سب کے لیے اہم ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا... [1]
اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ....

تاہم انبیاء علیہم السلام کے لیے اپنے خاندان کی تربیت کی اہمیت اپنے مشن کی اہمیت کے برابر ہے۔ چونکہ اس الٰہی پیغام کو تسلسل دینے کے لیے ہر نبی کا اپنے خاندان کو خصوصی تربیت دینا ہوتا لازمی ہے۔

۵۔ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا: رضائے رب کا حصول انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی ایک اہم مقام ہے۔ رضائے رب کے بھی درجات ہیں۔ یہاں اس مقام میں اعلیٰ درجے پر فائز ہونے کا ذکر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اپنے خاندان کے افراد کی نماز اور زکوٰۃ کی تعلیم و تربیت، انبیاء کے لیے بھی قابل ذکر فضیلت ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾
۵۶۔ اور اس کتاب میں ادریس کا (بھی) ذکر کیجیے، وہ یقیناً راستگو نبی تھے۔

وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾
۵۷۔ اور ہم نے انہیں اعلیٰ مقام پر اٹھایا۔

تفسیر آیات

حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے تھے اور بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے نہ تھے۔ اس لیے اسرائیل کی تاریخ میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔

بعض کے نزدیک یہ وہی نبی ہیں جن کا نام توریت میں حنوك آیا ہے۔ ان کا نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے: ادريس بن يارد بن مهلائيل بن قينان بن انوش بن شيث بن آدم۔

اخبار العلماء باخبار الحکماء سے منقول ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ادریس علیہ السلام مصر میں پیدا ہوئے۔ مصری اور عربی میں ان کو ہرمس اور یونانی میں ارملیس کہتے ہیں۔ عبرانی میں ان کو خنوخ اور قرآن نے ادریس کہا ہے۔

وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا: توریت میں قابیل کے فرزند حنوك کا ذکر آتا ہے۔ اگر حنوك سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام ہیں تو اس میں یہ ذکر بھی ہے کہ ان کو اللہ نے اٹھا لیا تھا۔ اسلامی روایات میں یہ ذکر ملتا ہے کہ ان کو آسمان چہارم پر اٹھا لیا گیا ہے۔

---

[1] ۶۶ تحریم: ۶

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾

۵۸۔ یہ وہ انبیاء ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا جو اولاد آدم میں سے ہیں اور ان میں سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں اٹھایا اور ابراہیم و اسماعیل کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور برگزیدہ کیا، جب ان پر رحمٰن کی آیات کی تلاوت کی جاتی تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے۔

تفسیر آیات

جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر آیا ہے یہ وہ انبیاء ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اللہ نے انبیاء علیہم السلام کو جن نعمتوں سے نوازا ہے ان سے مراد مادی نعمتیں نہیں ہو سکتیں بلکہ ان سے مراد نبوت و امامت اور رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ چنانچہ سورہ حمد میں اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ''جن پر انعام کیا ہے'' کے یہ اوصاف بتائے کہ نہ تو ان پر اللہ کا غضب ہوا ہے نہ وہ گمراہ ہوئے ہیں۔ رضائے الٰہی اور ہدایت کی راہ پر ہیں۔ یہ دو باتیں ان لوگوں کے اوصاف ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ تین نسلوں میں جاری رہا ہے۔ آدم، نوح اور ابراہیم علیہم السلام اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ میں گزشتہ تین سلسلوں کے انبیاء کے علاوہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی اور برگزیدہ کیا۔ وَ مِمَّنۡ ہَدَیۡنَا جملے کے اضافے سے اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ میں وہ انبیاء علیہم السلام بھی آ گئے جن کا ذکر سابقہ آیات میں نہیں آیا اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ صدیقین، شہداء اور صالحین بھی ان میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ دوسری جگہ اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ میں کون کون شامل ہیں:

وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیۡقِیۡنَ وَ الشُّہَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ؀ [1]

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ انبیاء، صدیقین، گواہوں اور صالحین کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔

وَ مِمَّنۡ ہَدَیۡنَا: یہاں سے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول یہ روایت قابل فہم ہو جاتی ہے:

وَ مِمَّنۡ ہَدَیۡنَا وَ اجۡتَبَیۡنَا نحن عنینا بھا. [2]

''جنہیں ہم نے ہدایت دی اور برگزیدہ کیا'' سے ہم مراد لیے گئے ہیں۔

---

[1] ۴ نساء: ۶۹ [2] بحار الانوار ۲۴: ۱۴۷

اہم نکات

۱۔ انبیاء کا سلسلہ تین نسلوں پر مشتمل ہے آدم، نوح اور ابراہیم۔

۲۔ جن پر اللہ کا انعام ہوتا ہے وہ مغضوب اور ضالین نہیں ہوتے۔ رضا و ہدایت الٰہی سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

۳۔ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ میں انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین شامل ہیں۔

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّبَعُوا الشَّہَوٰتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا ﴿۵۹﴾

۵۹۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کے پیچھے چل پڑے پس وہ عنقریب ہلاکت سے دوچار ہوں گے۔

تشریح کلمات

خلف: (خ ل ف) جانشین کے معنوں میں ہے۔ کبھی خلف سے ناخلف مراد لیتے ہیں جیسے اس آیت میں ہے۔ کہتے ہیں کہ خَلَف لام پر فتحہ کے ساتھ اچھے اور خَلۡف بہ سکون لام برے جانشین کے لیے آتا ہے۔

تفسیر آیات

انبیاء، صدیقین اور صلحاء سب کو اپنی زندگی کے بعد ناخلف لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جنہوں نے ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی بگاڑ اور تغیر پیدا کرنا شروع کر دیا اور ہر امت کے ناخلف لوگوں نے اپنی قوم کو ایسے خطوط پر ڈال دیا جس کے نتیجے میں یہ قوم اپنے دین کے ستون یعنی نماز جیسی عبادت سے دور ہو گئی۔

اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ: نماز کے ضیاع کا مطلب واضح ہے کہ اس کے تمام احکام و آداب درست نہ ہوں تو نماز کا ضیاع ہے۔ ضیاع کے مقابلے میں محافظت ہے کہ نماز کا کوئی حصہ ضائع نہ جانے دیا جائے۔ وضو، غسل، قرائت، رکوع، سجود، قیام میں سے ہر ایک کی محافظت ہو، صحیح طریقے سے انجام دیے جائیں۔ یہ اس طرح ہے کہ کسی چیز کو حفاظت سے رکھا جائے تو وہ چیز مرغوب ہو جاتی ہے اور اگر اس چیز کو حفاظت سے نہ رکھا جائے تو وہ چیز مرغوب نہیں رہتی۔

حدیث میں آیا ہے رسول اللہ ﷺ نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے ایک یہ ہے کہ نقرۃ الغراب نہ کرو[1] یعنی کوئے کے چونچ مارنے کی طرح ہو اور سجدہ اور رکوع میں ٹھہراؤ و سکون نہ ہو صرف

---

[1] مستدرک الوسائل ۴:۶۹

ماتھا لگے اور فوراً اٹھا لے۔

وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ: نماز چونکہ برائیوں سے دور رکھنے کا ایک موثر روحانی ذریعہ تھی۔ اس کے ضیاع کے بعد نفسانی خواہشات بے لگام ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

ومن لم یعذل نفسه فی الشهوات خاض فی الخبیثات[1]	جو شخص اپنے آپ کو خواہشات سے دور نہ رکھے وہ برائیوں میں ملوث ہو جائے گا۔

اس آیت کے ذیل میں وہ مسلمہ حدیث بھی پڑھیے جس کے تحت جو کچھ سابقہ امتوں میں ہوا وہی کچھ اس امت میں بھی رونما ہو گا۔

چنانچہ حضرت حزیفة بن یمانؓ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ولتسلکن طریق من کان قبلکم حذو القذة بالقذة وخدوا لنعل بالنعل.[2]	تم لوگ اپنے سے پہلے لوگوں کی روش و انداز کے برابر قدم بہ قدم چلو گے۔

اس سلسلے میں مزید تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ آل عمران آیت ۱۴۴۔

اہم نکات

۱۔ انبیاءؑ کے بعد ناخلف لوگوں نے ہمیشہ بگاڑ پیدا کیا ہے۔

۲۔ کسی امت میں بگاڑ اس وقت آئے گا جب معاشرے میں نماز کا اہتمام نہ ہو گا۔

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا ﴿۶۰﴾	۶۰۔ مگر جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور نیک اعمال بجا لائیں تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ بھی ظلم نہ ہو گا۔

تفسیر آیات

ان انحرافیوں پر رحمت خدا کا دروازہ بند نہ ہو گا اگر یہ لوگ انحراف کے بعد:

۱۔ تَابَ: اللہ کی طرف واپس آ جائیں چونکہ یہ لوگ انحراف کی وجہ سے اللہ سے منہ موڑ چکے تھے۔

وَاٰمَنَ: اپنے ایمان کی نئے سرے سے تجدید کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان انحرافیوں کا ایمان بھی مخدوش ہو گیا تھا۔

وَعَمِلَ صَالِحًا: عمل صالح کے ذریعے اپنے ایمان کے تقاضے بھی پورے کریں تو ان کو نجات مل جائے گی اور داخل جنت ہوں گے۔

---

[1] الکافی ۲: ۳۹۳ باب صفة النفاق　[2] تہذیب الاثار طبری ۷: ۱۷۔ مسند الشامیین طبرانی ۳: ۳۲۳

جَنّٰتِ عَدۡنِ ۣالَّتِیۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ وَعۡدُہٗ مَاۡتِیًّا ﴿۶۱﴾

۶۱۔ ایسی جاودانی بہشت (میں) جس کا اللہ نے اپنے بندوں سے غیبی وعدہ فرمایا ہے، یقیناً اس کا وعدہ آنے والا ہے۔

لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَ لَہُمۡ رِزۡقُہُمۡ فِیۡہَا بُکۡرَۃً وَّ عَشِیًّا ﴿۶۲﴾

۶۲۔ وہاں وہ بیہودہ باتیں نہیں سنیں گے سوائے سلام کے اور وہاں انہیں صبح و شام رزق ملا کرے گا۔

تفسیر آیات

عَدۡنِ: دائمی قیام گاہ کو کہتے ہیں۔ وہ ایسی جنت میں داخل ہوں گے جس میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ وہی جنت جس کے بارے میں اللہ کی طرف سے وعدہ ہے۔ یہ وعدہ اگرچہ وعدہ بالغیب ہے تاہم اللہ کا وعدہ مَاۡتِیًّا ضمانت شدہ ہے۔

لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا: جنت میں لغویات کا وجود نہ ہو گا کیونکہ جنت کی زندگی میں کسی چیز کا نقص نہ ہو گا کہ لغویات اور بیہودگی کی نوبت آئے۔ یہاں امن وسکون کیف و سرور اور رضائے رب کے سائے میں ہر خواہش پوری ہو رہی ہو گی تو وہاں کی فضا سلام ہی سلام کی فضا ہو گی: اِلَّا سَلٰمًا۔

وَ لَہُمۡ رِزۡقُہُمۡ فِیۡہَا بُکۡرَۃً وَّ عَشِیًّا: صبح و شام رزق کے میسر آنے کا مطلب یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو رزق ان کو وہاں میسر ہو گا اس میں تعطل نہیں، ہمیشہ ملتا رہے گا یا اس سے ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ جنت کی زندگی میں اگرچہ سورج، چاند نہ بھی ہوں تاہم صبح و شام قسم کے اوقات ہوں گے۔

تِلۡکَ الۡجَنَّۃُ الَّتِیۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ کَانَ تَقِیًّا ﴿۶۳﴾

۶۳۔ یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے متقین کو بنائیں گے۔

تفسیر آیات

ان کو بھی وہی جنت مل جائے گی جو اہل تقویٰ کو بطور وراثت مل جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وراثت تو کسی سے منتقل ہونے والے مال کو کہتے ہیں، جنت کسی سے منتقل نہیں ہوتی۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اللہ نے تمام انسانوں کے لیے جنت میں جگہ بنا دی ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے لیے مختص جنت اہل تقویٰ کو منتقل کی جاتی ہے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡنَا وَمَا خَلۡفَنَا وَمَا بَيۡنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾

۶۴۔اور ہم (فرشتے) آپ کے پروردگار کے حکم کے بغیر نہیں اتر سکتے، جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اسی کا ہے اور آپ کا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا فَاعۡبُدۡهُ وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾

۶۵۔وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو، کیا اس کا کوئی ہمنام تمہارے علم میں ہے؟

شان نزول: ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہونے میں کچھ دنوں کا وقفہ آیا۔ جب وقفہ ختم ہوا تو حضورؐ نے جبرئیل سے تاخیر کا سبب پوچھا تو جبرئیل یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔

ہم تو امر رب کے تابع فرماں ہیں۔ اس میں ہمارا اپنا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ ہر سو ہر سمت اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس کے حکم کے بغیر نہ ہم آگے جا سکتے ہیں: لَهٗ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡنَا نہ ہم پیچھے جا سکتے اور تاخیر کر سکتے ہیں: وَمَا خَلۡفَنَا، نہ ہم تاخیر و تقدیم کے درمیان کوئی راستہ بنا سکتے ہیں: وَمَا بَيۡنَ ذٰلِكَ ۔ ہم ہمہ جہت اور ہر سو سے اللہ کے دائرہ اختیار میں ہیں۔

اس آیت کی مرکزی توجہ اس بات پر مرکوز ہے کہ وحی کے عمل میں اللہ کے علاوہ کسی اور کی کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔

تفسیر آیات

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا: فرشتوں کے نزول اور عدم نزول میں منشاء و ارادہ الٰہی کارفرما ہوتا ہے جو حکمت و مصلحت سے لبریز ہے۔ اس میں نسیان جیسے مہمل عمل کا تصور نہیں ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: اس پوری کائنات کا وہی رب اور مالک ہے۔ تدبیر کائنات کا عمل اسی رب سے مربوط ہے منجملہ نزول وحی کا عمل بھی اسی واحد رب سے مربوط ہے۔

هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا: اس ذات کے علاوہ کوئی اور ذات نہیں ہے جو رب ہونے میں اللہ کے ساتھ ہمنام ہو۔ اس کائنات میں ایک ہی ذات ہے جس پر رب کا اطلاق ہوتا۔

فَاعۡبُدۡهُ: عبادت صرف رب کی ہوتی ہے۔ جب عالمین کا ایک رب ہے تو عبادت بھی صرف اسی کی ہوگی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ ہی اس کائنات کا مالک ہے۔ پس اسی کی عبادت ہونی چاہیے۔

وَ يَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ ءَ اِذَا مَا مِتُّ لَسَوۡفَ اُخۡرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾

۶۶۔ اور انسان کہتا ہے: جب میں مر جاؤں گا تو کیا میں زندہ کر کے نکالا جاؤں گا؟

اَوَلَا یَذۡکُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰہُ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ یَکُ شَیۡئًا ﴿۶۷﴾

۶۷۔ کیا اس انسان کو یاد نہیں کہ ہم نے اسے پہلے اس وقت پیدا کیا، جب وہ کچھ بھی نہ تھا؟

تفسیر آیات

وَ یَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ: انسان ہو کر اللہ کی قدرت کے بارے میں شک پیدا کرنا انسانی عقل و شعور اور مشاہدات کے خلاف ہے۔ عقل و شعور کے خلاف اس لیے ہے کہ اس عظیم کائنات کو پیدا کرنے والی ذات کے لیے انسان کا دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ ...[۱]

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے خلق کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے....

اَوَ لَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَہُمۡ ...[۲]

جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، آیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کرے؟

مشاہدات کے خلاف اس لیے ہے کہ انسان اپنی پیدائش پر تو علم رکھتا ہے کہ عدم سے وجود میں لایا گیا ہے۔

وَ لَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَۃَ الۡاُوۡلٰی فَلَوۡ لَا تَذَکَّرُوۡنَ ۝[۳]

اور بتحقیق پہلی پیدائش کو تم جان چکے ہو، پھر تم عبرت حاصل کیوں نہیں کرتے؟

اہم نکات

۱۔ ایک عاقل انسان کے لیے قدرت الٰہی پر سوالیہ نشان لگانا تعجب خیز ہے۔

فَوَ رَبِّکَ لَنَحۡشُرَنَّہُمۡ وَ الشَّیٰطِیۡنَ ثُمَّ لَنُحۡضِرَنَّہُمۡ حَوۡلَ جَہَنَّمَ جِثِیًّا ﴿۶۸﴾

۶۸۔ آپ کے رب کی قسم! پھر ہم ان سب کو اور شیاطین کو ضرور جمع کریں گے پھر ہم انہیں جہنم کے گرد گھٹنوں کے بل ضرور حاضر کریں گے۔

تشریح کلمات

جِثِیًّا: (ج ث و) گھٹنوں کے بل بیٹھنا۔

---

[۱] ۴۰ غافر: ۵۷ [۲] ۳۶ یٰس: ۸۱ [۳] ۵۶ واقعہ: ۶۲

تفسیر آیات

معاد کے منکرین کے بارے میں ہے کہ یہ اور ان کو گمراہ کرنے والے شیاطین ایک ساتھ اٹھائے جائیں گے جیسے فرمایا:

اِنَّا جَعَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ لِلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿﴾[1] — ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا آقا بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

’’زانو کے بل‘‘ کی تعبیر سے ان کی بے چارگی کا اظہار ہوتا ہے۔

ثُمَّ لَنَنۡزِعَنَّ مِنۡ کُلِّ شِیۡعَۃٍ اَیُّہُمۡ اَشَدُّ عَلَی الرَّحۡمٰنِ عِتِیًّا ﴿۶۹﴾ — ۶۹۔ پھر ہم ہر فرقے میں سے ہر اس شخص کو جدا کر دیں گے جو رحمٰن کے مقابلے میں زیادہ سرکش تھا۔

ثُمَّ لَنَحۡنُ اَعۡلَمُ بِالَّذِیۡنَ ہُمۡ اَوۡلٰی بِہَا صِلِیًّا ﴿۷۰﴾ — ۷۰۔ پھر (یہ بات) ہم بہتر جانتے ہیں کہ جہنم میں جھلسنے کا زیادہ سزاوار ان میں سے کون ہے۔

تشریح کلمات

عِتِیًّا: (ع ت و) العتو حکم عدولی کرنا، سرکش ہونا۔

تفسیر آیات

ہر فرقہ و ہر جماعت میں سے سرکش افراد کو جدا کریں گے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ میدان قیامت میں لوگ گروہ در گروہ ہوں گے کیونکہ ہر شخص اپنے پیشوا کے ساتھ محشور ہوگا:

یَوۡمَ نَدۡعُوۡا کُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِہِمۡ ...[2] — قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے....

دوسرا اشارہ یہ ملتا ہے کہ ہر جماعت میں مختلف لوگ ہو سکتے ہیں، ان میں کچھ سرکش لوگ ہوں گے اور کچھ لوگ سرکش نہیں ہوں گے۔

لفظ رحمٰن کا اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ سرکش لوگ ایسی ذات کے خلاف سرکش ہو گئے جس کی رحمت ہر شئی کو شامل ہے۔

ثُمَّ لَنَحۡنُ اَعۡلَمُ: اس آیت میں فرمایا ہمیں علم ہے کہ ہر جماعت میں کون کون جہنم میں جھلسنے کا سزاوار ہے۔

---

[1] اعراف: ۲۷ [2] بنی اسرائیل: ۷۱

وَ اِنۡ مِّنۡکُمۡ اِلَّا وَارِدُہَا ۚ کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتۡمًا مَّقۡضِیًّا ﴿ۚ۷۱﴾

۷۱۔ اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہوگا جو جہنم پر وارد نہ ہو، یہ حتمی فیصلہ آپ کے رب کے ذمے ہے۔

ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡہَا جِثِیًّا ﴿۷۲﴾

۷۲۔ پھر اہل تقویٰ کو نجات دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا چھوڑ دیں گے۔

تشریح کلمات

وَارِدُہَا : (و ر د) الورود پانی کا قصد کرنا۔ پانی پر پہنچنے والے کو وارد کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

تمام مکلّف انسانوں کو ایک مرتبہ جہنم میں وارد ہونا ہے۔ اس مطلب کو نہایت تاکیدی لفظوں کے ساتھ بیان فرمایا: کَانَ عَلٰی رَبِّکَ آپ کے رب کے ذمے ہے۔ یہ بات اللہ پر لازم اور واجب ہے۔ اللہ پر کوئی اور لازم اور واجب نہیں کر سکتا بلکہ خود اللہ اپنے اوپر لازم کر فرماتا ہے۔ جیسا کہ کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ...[1] تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا۔ اس طرح تمام انسانوں کو ایک مرتبہ آتش جہنم میں وارد کرنا مشیت الٰہی میں واجب ہے۔

حَتۡمًا: واجب اور لازمی شئ کو حتمی کہتے ہیں۔ لسان العرب میں آیا ہے: حتمت علیہ الشئ اوجبتہ۔ میں نے اس پر حتمی یعنی واجب کر دیا۔ مَّقۡضِیًّا فیصلہ شدہ ہے جس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ جیسے وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ ....[2] اور آپ کے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

۱۔ یہاں خطاب تمام مکلّف انسانوں سے ہے خواہ مؤمن ہوں یا کافر۔ اس پر دلیل بعد کی آیت ہے جس میں فرمایا: ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا پھر ہم تقویٰ والوں کو نجات دیں گے۔ وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیۡنَ اور ظالموں کو اس میں چھوڑ دیں گے۔

۲۔ کیا وَارِدُہَا میں ورود، حضور کے معنوں میں ہے یا داخل ہونے کے معنوں میں؟ کیونکہ یہ لفظ اگرچہ لغت میں پانی کا قصد کرنے اور پانی پر پہنچنے کے معنوں میں ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدۡیَنَ [3] جب مدین کے پانی پر پہنچے، لیکن اس لفظ کا استعمال داخل ہونے کے معنوں میں بھی ہوا ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

اِنَّکُمۡ وَ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ حَصَبُ — تحقیق تم اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر

---

[1] ۶ انعام: ۵۴ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۲۳ [3] ۲۸ قصص: ۲۳

جَهَنَّمَ ؕ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ ○ [1]　　پوجتے تھے جہنم کا ایندھن ہیں جہاں تمہیں داخل ہونا ہے۔

ان دونوں معنوں میں استعمال کی وجہ سے یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ وَارِدُهَا میں وارد کے معنی حضور کے ہیں یا داخل ہونے کے ہیں۔ کیا مؤمن و غیر مؤمن سب جہنم میں داخل ہو جائیں گے پھر مؤمنین کو نجات ملے گی یا ان سب کو جہنم کے پاس حاضر کیا جائے گا۔

پہلے نظریہ پر تین دلیلیں قائم کی جاتی ہیں:

اول: قرآن میں وارد داخل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

دوم: یہ کہ ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا پھر ہم تقویٰ والوں کو نجات دیں گے قرینہ ہے کیونکہ داخل نہ ہوئے ہوں تو نجات کس چیز سے۔

سوم: اس سلسلے میں وارد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں داخل ہونا مراد ہے۔

اس نظریہ پر یہ سوال آتا ہے کہ مؤمن جہنم میں کس لیے جائے گا؟

جواب دیتے ہیں: مؤمن کے لیے آتش جہنم گلزار بن جائے گی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آتش نمرود گلزار بن گئی تھی۔

دوسرا جواب یہ بھی دیتے ہیں: جہنم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں آتش باعث عذاب نہیں ہوتی۔ خود جہنم کے زبائن (کارندے) جہنم میں ہوتے ہیں لیکن ان کو عذاب نہیں ہوتا۔

تیسرا جواب اس صورت میں دیتے ہیں کہ مؤمن کا جسم آتش جہنم کو قبول نہیں کرتا جب کہ کافر کا جسم جہنم کے لیے ایندھن بنتا ہے۔

اس سوال کے جوابات سے معلوم ہوا کہ اس نظریے کو قبول کرنے میں تکلف کرنا پڑ رہا ہے۔

دوسرے نظریے پر یہ دلائل قائم کرتے ہیں:

i۔ وارد کے لغوی معنی حضور کے ہیں۔ لفظ جب قرینہ کے بغیر استعمال ہوتا ہے تو لغوی معنی مراد لیا جاتا ہے۔ ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا قرینہ نہیں بنتا کیونکہ نجات، آتش جہنم میں داخل ہونے پر موقوف نہیں۔ ''آتش میں داخل ہونے سے نجات'' مراد لی جا سکتا ہے۔

ii۔ قرآن میں مؤمن کے بارے میں آیا ہے۔

اُولٰٓئِکَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ ○ لَا یَسۡمَعُوۡنَ حَسِیۡسَهَا ۚ ... [2]　　وہ اس آتش سے دور ہوں گے جہاں وہ اس کی آہٹ تک نہ سنیں گے۔

iii۔ وہ روایات جو انسان کو صراط سے گزارنے کے بارے میں کثرت سے آئی ہیں، اس پر دلیل بنتی ہیں کہ وارد سے مراد حضور ہے اور ممکن ہے اس آیت کو ہم صراط پر تطبیق کریں۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۹۸　　[2] ۲۱ انبیاء: ۱۰۱۔۱۰۲

iv۔ دیگر متعدد روایات میں آیا ہے کہ مؤمن کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے جہنم کے پاس ضرور لے جایا جائے گا تاکہ جنت کی نعمتوں کی قدر کرے۔ اسی طرح جہنمی کو جنت کے پاس سے گزارا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ ہر مکلّف کو قریب سے جہنم کا مشاہدہ کرایا جائے گا۔

۲۔ یہ بات مصلحت الٰہی کے تحت حتمی فیصلہ ہے۔

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا ۙ اَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ خَیۡرٌ مَّقَامًا وَّ اَحۡسَنُ نَدِیًّا ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور جب انہیں ہماری صریح آیات سنائی جاتی ہیں تو کفار اہل ایمان سے کہتے ہیں: دونوں فریقوں میں سے کون بہتر مقام پر (فائز) ہے اور کس کی محفلیں زیادہ بارونق ہیں؟

تشریح کلمات

نَدِیًّا: (ن د ی) نادی۔ منتدی مجلس کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

کافر کے سامنے اللہ کی وحدانیت اور آخرت پر دلیل اور منطق پیش کی جاتی ہے تو وہ اس کے جواب میں بے دینوں کی رعنائیوں اور دینداروں کی ناداریوں کا تقابلی منظر پیش کرتے اور کہتے ہیں اگر عبد اللہ کے یتیم پر ایمان لانے والے اللہ کے پسندیدہ بندے ہیں اور ہمارا شرک اللہ کو ناپسند ہے تو ہماری محفلوں کی رنگینی دیکھو اور مسلمانوں کی مصائب کی سنگینی دیکھو۔ اگر شرک اللہ کو ناپسند ہے تو ہمیں مال و دولت، عیش و عشرت سے کیسے نوازا اور مسلمانوں کو فقر و فلاکت سے دوچار کیا۔ یقین نہیں آتا ہے تو ولید بن مغیرہ، عمرو بن ہشام، ابوجہل کا مقام و منزلت دیکھو اور دوسری طرف بلالؓ، عمارؓ و خبابؓ کا فقر و مذلت دیکھو۔ اس منطق کے جواب میں فرمایا:

وَ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا قَبۡلَہُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ ہُمۡ اَحۡسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءۡیًا ﴿۷۴﴾

۷۴۔ اور ہم ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو سامان زندگی اور نمود میں اس سے کہیں بہتر تھیں۔

تفسیر آیات

جو چند روز اللہ نے تمہیں ڈھیل دی ہے اسے اپنے حق میں اللہ کی طرف سے رعایت سمجھتے ہو۔ ان چند دنوں کے بعد تمہاری ہلاکت کا وقت آئے گا تو تم تاریخ کے کوڑے دان کا حصہ بن جاؤ گے اور تمہارے نام سے نفرت و مذلت کا تعفن پھیلے گا جب کہ عمارؓ و بلالؓ انسانیت کی چمکتی تاریخ کی جبین پر فخر و مباہات کی علامت بن جائیں گے۔

یقین نہیں آتا ہے تو تاریخ امم کا مطالعہ کرو۔ اپنے سے بہتر سامان عیش و نوش میں بدمست لوگوں کا انجام دیکھو۔ ان لوگوں کا بھی انجام دیکھو جو تم سے زیادہ اس دنیا کی خوبصورت رعنائیوں کے مالک تھے۔ آج ان کا نام داخل دشنام ہے۔

قُلۡ مَنۡ کَانَ فِی الضَّلٰلَۃِ فَلۡیَمۡدُدۡ لَہُ الرَّحۡمٰنُ مَدًّا ۬ۚ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوۡا مَا یُوۡعَدُوۡنَ اِمَّا الۡعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَۃَ ؕ فَسَیَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ ہُوَ شَرٌّ مَّکَانًا وَّ اَضۡعَفُ جُنۡدًا ﴿۷۵﴾

۷۵۔ کہد یجیے: جو شخص گمراہی میں ہے اسے خدائے رحمٰن لمبی مہلت دیتا ہے لیکن جب وہ اس کا مشاہدہ کریں گے جس کا وعدہ ہوا تھا، خواہ وہ عذاب ہو یا قیامت تو اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ کس کا مقام زیادہ برا ہے اور کس کا لاؤ لشکر زیادہ کمزور ہے۔

تفسیر آیات

۱۳۹ وہ جس ڈھیل کو اپنے حق میں اللہ کا اکرام سمجھتے ہیں، درحقیقت سرکشوں کے خلاف سب سے بڑی سزا یہی ڈھیل ہے. چنانچہ سورہ آل عمران ۱۷۸ میں فرمایا:

وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ خَیۡرٌ لِّاَنۡفُسِہِمۡ ؕ اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ....

اور کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہم انہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو انہیں صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں تا کہ یہ لوگ اپنے گناہوں میں اور اضافہ کر لیں۔

جب وعدہ الٰہی کا وقت آئے گا تو معلوم ہو گا کس کا مقام بُرا ہے۔ وعدہ الٰہی کے دو مرحلوں کا ذکر آیا ہے: اِمَّا الۡعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَۃَ۔

پہلا مرحلہ عذاب کا ہے۔ قیامت سے پہلے جب ان پر عذاب الٰہی کا نزول ہو گا۔ اسی دنیا میں جب وہ ذلت و خواری سے دوچار اور مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا رہے ہوں گے، اس وقت انہیں معلوم

ہوگا کہ کس کا مقام بُرا ہے۔ چشم جہاں نے ان کی ذلت و خواری کا مشاہدہ میدان بدر سے کرنا شروع کیا۔

دوسرا مرحلہ قیامت کا ہے۔ جب قیامت کے دن ابدی ذلت و رسوائی کے ساتھ عذاب جہنم کا مشاہدہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ کس کا مقام بُرا ہے۔

اہم نکات

۱۔ گمراہ لوگوں کا انجام عبرتناک ہوگا۔ خواہ دنیا میں ہو یا قیامت میں۔

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ۝۷۶

۷۶۔ اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے اور آپ کے پروردگار کے نزدیک باقی رہنے والی نیکیاں ثواب کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا اہم فیصلہ ہے:

۱۔ جو لوگ ناقابل ہدایت ہو جاتے ہیں ان کو اللہ اپنے جرم میں اضافہ کرنے کا موقع اور ڈھیل دیتا ہے۔ یہ ڈھیل ان گمراہوں کے لیے سب سے بڑی سزا ہے۔

۲۔ جو لوگ راہ راست پر آتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ مزید ہدایت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اپنی توفیقات سے نوازتا ہے۔

وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ: مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے باقیات الصالحات کے بارے میں سوال ہوا تو آپ ؑ نے فرمایا:

هی الصلوۃ فحافظوا علیها۔[1] یہ نماز ہے۔ تم نماز کی محافظت کرو۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ باقیات الصالحات سے مراد مؤمن کا یہ ذکر پڑھنا ہے: سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔[2]

واضح رہے ان احادیث میں باقیات الصالحات کے اہم مصادیق کی نشاندہی ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ۝۷۷

۷۷۔ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو ہماری آیات کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے: مجھے مال اور اولاد کی عطا ضرور بالضرور جاری رہے گی؟

۱۔ مستدرک الوسائل ۳: ۲۹ ۲۔ مستدرک الوسائل ۵: ۳۲۷

اَطَّلَعَ الۡغَيۡبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ﴿۷۸﴾

۷۸۔ کیا اس نے غیب کی اطلاع حاصل کی ہے یا خدائے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟

كَلَّا ؕ سَنَكۡتُبُ مَا يَقُوۡلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الۡعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾

۷۹۔ ہرگز نہیں، جو کچھ یہ کہتا ہے ہم اسے لکھ لیں گے اور ہم اس کے عذاب میں مزید اضافہ کردیں گے۔

وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوۡلُ وَ يَاۡتِيۡنَا فَرۡدًا ﴿۸۰﴾

۸۰۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کے ہم مالک بن جائیں گے اور وہ ہمارے پاس اکیلا حاضر ہوگا۔

شان نزول: شان نزول میں آیا ہے:

> خباب بن ارت کہتے ہیں میں مالدار تھا اور عاص بن وائل کے ذمے میرا قرض تھا۔ اس سے مطالبہ کیا تو اس نے کہا: جب تک تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کفر نہ کرے تیرا قرض ادا نہیں کروں گا۔ میں نے کہا: میں تیرے مرنے اور مبعوث ہونے تک کفر نہیں کروں گا تو اس نے کہا: اچھا! میں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جاؤں گا تو جب میں اپنے مال و اولاد کے پاس واپس جاؤں گا تو تمہارا قرض ادا کر دوں گا۔[1]

یہ روایت آیت کے مفہوم کے ساتھ کاملاً موافق نہیں ہے۔ کیونکہ عاص بن وائل کا یہ کہنا کہ میں قیامت کے دن تیرا قرض ادا کروں گا ایک تمسخر ہے، سنجیدہ بات نہیں ہے۔ آیت کا لہجہ کسی سنجیدہ موقف کی رد کے بارے میں ہے کہ اسے مال و اولاد ملنے کا یقین ہے جس کا اظہار وہ تاکیدی لفظوں میں کرتا ہے: لَاُوۡتَیَنَّ۔

تفسیر آیات

سَنَكۡتُبُ مَا يَقُوۡلُ: اس کی بات کو ہم ضبط تحریر میں لائیں گے۔ اللہ کی طرف سے ضبط تحریر میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ مجرم کا جرم علم خدا میں ثبت ہو جاتا ہے اور جو علم خدا میں ثبت ہوتا ہے اس میں بھول چوک وغیرہ ممکن نہیں ہے جیسا کہ کسی مطلب کو ضبط تحریر میں لانے کی صورت میں بھول چوک اور اشتباہ کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوۡلُ: کافر کا یہ تمسخر اور اس کی باتیں اس کے مرنے کے بعد اس کے لیے وبال جان بن کر باقی رہ جاتی ہیں اور ہمارے پاس وہ اکیلا پہنچ جائے گا۔ اس کے ساتھ نہ مال و اولاد ہوں گے، نہ وہ چیزیں، جنہیں اس نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا تھا۔

اہم نکات

۱۔ گناہ کی لذت ختم ہو جاتی ہے، اس کا وبال باقی رہتا ہے۔

---

[1] مجمع البیان ذیل آیہ۔ صحیح بخاری و مسلم کچھ فرق کے ساتھ۔

۲۔ ثروتمندوں کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ انہوں نے اکیلے اللہ کی بارگاہ میں جانا ہے۔

وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اٰلِـہَۃً لِّیَکُوۡنُوۡا لَہُمۡ عِزًّا ﴿۸۱﴾
۸۱۔ اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں تاکہ ان کے لیے باعث تقویت بنیں۔

کَلَّا ؕ سَیَکۡفُرُوۡنَ بِعِبَادَتِہِمۡ وَ یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ ضِدًّا ﴿۸۲﴾
۸۲۔ ہرگز نہیں، (کل) یہ سب ان کی عبادت ہی سے انکار کریں گے اور ان کے سخت مخالف ہوں گے۔

تشریح کلمات

عِزًّا: (ع ز ز) العز اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔

تفسیر آیات

لِّیَکُوۡنُوۡا لَہُمۡ عِزًّا: مشرکین ان معبودوں سے اپنی دنیاوی زندگی کے لیے تقویت چاہتے تھے۔ مشرکین آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے لہٰذا وہ ان معبودوں کو اپنے دنیاوی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

جواب میں فرمایا: جس یوم آخرت کے تم منکر ہو وہ دن ضرور آئے گا اور اس دن تمہارے یہ معبود نہ صرف تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے بلکہ تمہارے خلاف ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ کی پوجا کرنے والے غیر اللہ کے حوالے ہوں گے جو ان کے خلاف ہوں گے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ تَؤُزُّہُمۡ اَزًّا ﴿۸۳﴾
۸۳۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیاطین کو کفار پر مسلط کر رکھا ہے جو انہیں اکساتے رہتے ہیں؟

تشریح کلمات

اَزًّا: (ا ز ز) اَزّ۔ ازا کے معنی ہیں برانگیختہ کرنا، ورغلانا۔

تفسیر آیات

اَرۡسَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ: ہم نے شیاطین کو کافروں پر چھوڑ یا مسلط کر رکھا ہے۔ آیت میں اَرۡسَلۡنَا کے معنی ہیں عدم مانع۔ کافروں نے جب اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت کو مسترد کیا اور یہ قابل ہدایت نہ

رہے تو اللہ نے شیاطین کو ان پر مسلط ہونے سے نہیں روکا اور رکاوٹ پیدا نہ کی۔ ورنہ:

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ .... [1]　　جو میرے بندے ہیں ان پر یقیناً تیری بالادستی نہ ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ ناقابل ہدایت لوگوں پر شیطان کے مسلط ہونے سے کوئی روکنے والا نہیں ہے۔

فَلَا تَعۡجَلۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَہُمۡ عَدًّا ﴿۸۴﴾　　۸۴۔ پس آپ ان پر (عذاب کے لیے) عجلت نہ کریں، ہم ان کی گنتی یقیناً پوری کریں گے۔

تفسیر آیات

خطاب اگرچہ رسول اکرم ﷺ سے ہے کہ مشرکین کے مظالم سے تنگ آکر ان کی ہلاکت و عذاب کی خواہش میں جلدی نہ کریں۔ ان ظالموں کی گنتی پوری کریں گے۔ دنوں یا سانسوں کی یا ان کے جرائم کی گنتی۔

ان کے جرائم ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ انہیں اپنی عمر پوری کرنا ہے۔ اللہ کافر کو مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنے جرائم میں اضافہ کرے اور مؤمن کو بھی مہلت دیتا ہے کہ اپنے حسنات میں اضافہ کرے۔

اہم نکات

۱۔ مہلت، کافر کے لیے باعث عذاب اور مؤمن کے لیے باعث ثواب ہے۔

یَوۡمَ نَحۡشُرُ الۡمُتَّقِیۡنَ اِلَی الرَّحۡمٰنِ وَفۡدًا ﴿۸۵﴾　　۸۵۔ اس روز ہم متقین کو خدائے رحمٰن کے پاس مہمانوں کی طرح جمع کریں گے۔

وَّ نَسُوۡقُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ اِلٰی جَہَنَّمَ وِرۡدًا ﴿۸۶﴾　　۸۶۔ اور مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح ہانک کر لے جائیں گے۔

تشریح کلمات

وَفۡدًا: (و ف د) اپنی ضروریات لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کو وفد کہتے ہیں۔

---

[1] ۱۵ حجر: ۴۲

وِرۡدًا: (و ر د) پانی کا قصد کرنا۔
نَسُوۡقُ: (س و ق) اونٹ کو ہانکنے اور چلانے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اہل تقویٰ کے لیے اس آیت میں دو بشارتیں ہیں: ایک یہ کہ ان کو رحمٰن کے پاس لے جایا جائے گا۔ اس ذات کی بارگاہ میں جمع ہوں گے جو رحمٰن ہے۔ رحمٰن کے جوار میں مقام پانا ایک ناقابل وصف و بیان نعمت ہے۔ دوسری بشارت وَفۡدًا ہے جو ایک مہمان کی حیثیت سے رحمٰن کی بارگاہ میں جائیں گے۔ مجرمین کے لیے بھی دو بُری خبریں ہیں:

ایک: نَسُوۡقُ ہے جس کے معنی ہانکنے کے ہیں۔ ان مجرموں کو جانوروں سے تشبیہ دی ہے جنہیں چلایا اور ہانکا جاتا ہے۔ چلنے میں جانوروں کا اپنا ارادہ نہیں ہوتا۔

دوسری: وِرۡدًا جس میں بتانا مقصود ہو سکتا ہے کہ ان کو اس طرح ہانکا جائے گا جیسا کہ پیاسے جانوروں کو پانی کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ انہیں اپنی ہلاکت کی طرف اس طرح لے جایا جائے گا جیسے پیاس بجھانے کے لیے لے جایا جاتا ہے۔

لَا یَمۡلِکُوۡنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَہۡدًا ﴿۸۷﴾

۸۷۔ کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہو گا سوائے اس کے جس نے رحمٰن سے عہد لیا ہو۔

تفسیر آیات

مشرکین اپنے معبودوں کی پوجا اس لیے کرتے تھے کہ یہ اللہ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے۔ اس آیت میں اس تصور کا رد ہے کہ شفاعت کا اختیار صرف اسے مل سکتا ہے جس نے اللہ سے عہد لے رکھا ہے۔

پہلی تفسیر یہ ہے کہ دوسروں کو شفاعت کرنے کا اختیار نہیں مل سکتا مگر اس ہستی کو جس نے اللہ سے شفاعت کے اختیار کا عہد لے رکھا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہو سکتی ہے کہ لَا یَمۡلِکُوۡنَ الشَّفَاعَۃَ شفاعت مل نہیں سکتی مگر ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ سے عہد لے رکھا ہے۔

ان دونوں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر کی روشنی میں مشرکین کے نظریے کی رد ہے چونکہ مشرکین یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے ارباب کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دوسروں کی شفاعت کریں۔

یہ عہد کیا ہے؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال کی طرف جانے سے بہتر ہے خود قرآن کی طرف رجوع

کیا جائے۔ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی منصب پر فائز ہونے کے لیے ایک عہد کی ضرورت ہے جس کے بغیر کوئی بھی کسی الٰہی منصب پر فائز نہیں ہوتا۔ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ [1] دوسروں کی شفاعت کا اختیار حاصل ہونا ایک الٰہی منصب ہے اس لیے اللہ سے ایک خاص عہد کے مقام پر فائز ہونا چاہیے۔

بعض احادیث میں عہد سے مراد ولایت علی علیہ السلام یا نماز یا ایمان باللہ کا ذکر ہے۔ یہ بات دوسری تفسیر کے مطابق درست ہے۔ یعنی شفاعت ملنے کے لیے جس عہد کی ضرورت ہے، اس کا ذکر ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾
لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا إِدًّا ﴿۸۹﴾
تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾
اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾
وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾

۸۸۔ اور وہ کہتے ہیں: رحمٰن نے کسی کو فرزند بنالیا ہے۔
۸۹۔ تحقیق تم بہت سخت بیہودہ بات (زبان پر) لائے ہو۔
۹۰۔ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں۔
۹۱۔ اس بات پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے فرزند (کی موجودگی) کا الزام لگایا ہے۔
۹۲۔ اور رحمٰن کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔

تشریح کلمات

اِدًّا: (ا د د) ادا کے معنی ہیں نہایت ناپسندیدہ بات، جس سے ہنگامہ برپا ہو جائے۔

يَتَفَطَّرْنَ: (ف ط ر) الفطر پھاڑنے کے معنوں میں ہے۔ فطور خلل اور شگاف کے معنی میں ہے۔ فَطَرَ خَلَقَ پیدا کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے فطرت یعنی خلق مراد لیا جاتا ہے۔

تَخِرُّ: (خ ر ر) خر کسی چیز کے آواز کے ساتھ نیچے گرنے کے معنوں میں ہے۔

هَدًّا: (ھ د د) کے معنی کسی چیز کو زوردار آواز کے ساتھ گرا دینے کے ہیں۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کے لیے فرزند کا تصور شان الٰہی میں انتہائی گستاخی ہے اور اس قدر سنگین گستاخی ہے کہ

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۲۴

کائنات کا ضمیر اسے برداشت نہیں کر سکتا اور کائنات اس نازیبا نسبت کو سن کر لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔ یہ گستاخی نہ آسمانوں کے لیے قابل تحمل ہے، نہ زمین اس گستاخانہ نسبت کو سن سکتی ہے۔ نہ ہی پہاڑوں میں اس نسبت کو سننے کی تاب ہے لیکن نادان انسان اس قسم کی سنگین گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے چونکہ اس کا ضمیر مردہ اور وہ فطرت سے بہت دور نکل گیا ہے۔

اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ﴿۹۳﴾

۹۳۔ جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس رحمٰن کے حضور صرف بندے کی حیثیت سے پیش ہوگا۔

تفسیر آیات

کائنات کی تمام موجودات بلا استثناء اللہ کی بندگی میں ہیں۔ کوئی اور نسبت ممکن نہیں ہے۔ موجودات میں کوئی ایسا وجود نہیں جس کی اللہ کے ساتھ بندگی کے علاوہ کوئی اور نسبت ہو۔ اگر رسول اللہ اور ولی اللہ کے لیے رسالت اور ولایت کی نسبت ہے تو پہلے بندگی کی نسبت ہے، بعد میں دوسری نسبتیں، مثلاً رسالت و ولایت کی قائم ہو سکتی ہیں۔ اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔

اہم نکات

۱۔ کائنات میں کوئی ایسا وجود نہیں جو اللہ کی بندگی کے دائرے سے بالاتر ہو۔

لَقَدۡ اَحۡصٰہُمۡ وَ عَدَّہُمۡ عَدًّا ﴿ؕ۹۴﴾

۹۴۔ بتحقیق اس نے ان سب کا احاطہ کر رکھا ہے اور انہیں شمار کر رکھا ہے۔

وَ کُلُّہُمۡ اٰتِیۡہِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فَرۡدًا ﴿۹۵﴾

۹۵۔ اور قیامت کے دن ہر ایک کو اس کے سامنے تنہا حاضر ہونا ہے۔

تفسیر آیات

اَحۡصٰہُمۡ: کائنات کی تمام موجودات اللہ کی بندگی میں ہونے کے اعتبار سے اللہ کی مملوک ہیں اور مالک کے قبضہ میں ہیں جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ گھیرے اور احاطے میں رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کے گھیرے سے نکل نہیں سکتیں۔

وَ عَدَّہُمۡ: یہ امکان بھی نہیں ہے کہ کوئی اللہ کی نظر سے اوجھل ہو جائے۔ ہر موجود اللہ کی کتاب تکوین میں شمار شدہ اور ثبت شدہ ہے۔

وَ کُلُّہُمۡ اٰتِیۡہِ: قیامت کے دن جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوگا تو اکیلا ہوگا۔ اس کے ساتھ کوئی

اور چیز نہ ہو گی چونکہ وہ کسی چیز کا مالک نہ تھا بلکہ وہ خود مملوک تھا۔ نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور آدمی ہو گا چونکہ اس کے رشتہ دار سب اس سے بھاگتے ہوں گے۔ نہ اس کے معبود ہوں گے چونکہ اس کے معبود بھی اس سے برائت چاہتے ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ مالک حقیقی اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی حقیقی مالک نہیں ہے بلکہ وہ خود مملوک ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

۹۶۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال بجا لائے ہیں ان کے لیے رحمٰن عنقریب دلوں میں محبت پیدا کرے گا۔

تفسیر آیات

کائنات میں کوئی فرد اللہ کی بندگی سے بالاتر نہیں ہے۔ البتہ اس بندگی میں مراتب ضرور ہیں۔ جب بندہ ایمان و عمل صالح کے ایک خاص مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اللہ کے نزدیک قرب و منزلت کے علاوہ لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک مقام پیدا فرماتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے ان لفظوں میں دعا کی:

فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ [1] (اے ہمارے پروردگار) لہٰذا تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے۔

شیعہ سنی مصادر میں یہ روایت بکثرت موجود ہے کہ یہ آیت مولائے متقیان حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی۔ اس کے درج ذیل اصحاب راوی ہیں:

۱۔ عبد اللہ بن عباسؓ
۲۔ ابو سعید الخدریؓ
۳۔ جابر بن عبد اللہؓ
۴۔ براء بن عازبؓ
۵۔ جد رافعؓ
۶۔ محمد بن الحنفیۃؓ

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شواھد التنزیل ا: ۵۶، ۴۷۴، ۴۶۴، ۴۶۸۔ خصائص الائمۃ صفحہ ۱۷

---

[1] ۱۴ ابراھیم: ۳۷

تاویل الآیات ۳۰۲۔ الدر المنثور۔

فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الۡمُتَّقِيۡنَ وَتُنۡذِرَ بِهٖ قَوۡمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

۹۷۔ (اے محمد) پس ہم نے یہ قرآن آپ کی زبان میں یقیناً آسان کیا ہے تاکہ آپ اس سے صاحبان تقویٰ کو بشارت دیں اور جھگڑالو قوم کی تنبیہ کریں۔

تشریح کلمات

لُدًّا: (ل د د) سخت جھگڑالو کو کہتے ہیں جو کسی کی بات مانتا ہی نہ ہو۔

تفسیر آیات

رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے کہ ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں آسان کیا ہے تاکہ آپ کو متقین کو خوش خبری دینے اور جھگڑالو قوم کو تنبیہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ ؕ هَلۡ تُحِسُّ مِنۡهُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَوۡ تَسۡمَعُ لَهُمۡ رِكۡزًا ﴿۹۸﴾

۹۸۔ اور ہم نے اس سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کیا ہے۔ کیا آج آپ کہیں بھی ان میں سے کسی ایک کا نشان پاتے ہیں یا ان کی کوئی آہٹ سنتے ہیں؟

تشریح کلمات

الرکز: (ر ك ز)۔ آواز۔

تفسیر آیات

اس جھگڑالو قوم کو گزشتہ امتوں کی تاریخ اور سرگزشت کے ذریعے سمجھایا جا رہا ہے کہ ان لوگوں نے بھی اپنے نبیوں کے ساتھ جھگڑا کیا، دشمنی کی۔ آج اس وادی کی طرف نگاہ کرو۔ کوئی آواز ہے؟ ہر طرف موت کی خاموشی اور سکوت طاری ہے۔ جب کہ ان انبیاء علیہم السلام کا ہر جگہ ذکر ہے۔ ان کی آواز ہر جگہ بلند ہے۔

سُوْرَۃُ طٰہٰ

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ کے مضمون سے اس کا مکی ہونا ظاہر ہے۔

مضمون آیات اور بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے یہ سورۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اس وقت نازل ہوا جب مسلمان مکہ میں نہایت غیر مساعد حالات سے دوچار تھے۔

تفسیر برھان میں آیا ہے: ابو رافع کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک یہودی کے پاس بھیجا کہ کچھ قرض لیا جائے۔ اس یہودی نے قرض دینے سے انکار کیا۔ اس پر آیت ۱۳۱ نازل ہوئی لیکن اس روایت سے سورۃ کا مدنی ہونا ثابت نہیں۔

یہ سورہ موجودہ ترتیب کے مطابق بیسواں سورہ ہے۔ کہا جاتا ہے یہ سورہ بعثت کے پانچویں سال نازل ہوا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا تَدَعُوا قِرَاءَ ةَ سُورَةِ طه فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهَا وَ يُحِبُّ مَنْ قَرَءَ هَا۔[1]	سورہ طٰہ پڑھنا نہ چھوڑو چونکہ اللہ تعالیٰ اس سورہ اور اس کے پڑھنے والے کو دوست رکھتا ہے۔

یہ سورہ مبارکہ درج ذیل مضامین پر مشتمل ہے:

۱۔ توحید الٰہی۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ۔

---

[1] تفسیر البرھان

۳۔ سامری کا واقعہ۔
۴۔ آدم علیہ السلام و ابلیس کا واقعہ۔
۵۔ معاد کے بارے میں بعض حقائق۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ　　بنام خدائے رحمن رحیم

طٰہٰ ۚ﴿۱﴾　　۱۔ طاء، ہا۔

مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ﴿۲﴾　　۲۔ ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔

تفسیر آیات

طٰہٰ: یہ ہر سورے کی ابتداء میں مذکور حروف مقطعات میں سے ہے لیکن بعض روایات کے مطابق یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسمائے مبارکہ میں سے ہے۔

تفسیر ثعلبی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

طٰہٰ کے معنی اہل البیت علیہم السلام کی طہارت کے ہیں پھر امام علیہ السلام نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔

ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اسی قسم کی روایت ابو سعید خدری صحابی اور ابو الحمراء سے بیان کی ہے۔ یہی روایت طبرانی نے اپنی معجم میں ابو سعید خدری سے بیان کی ہے۔[1]

مَاۤ اَنۡزَلۡنَا: اس آیت کے شان نزول میں شیعہ سنی مصادر میں بعض ایسی روایات موجود ہیں جو سیاق آیت سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نماز میں صرف ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے تھے۔ بعض دیگر روایات میں آیا ہے کہ آپؐ انگلیوں پر کھڑے ہوتے تھے جس پر یہ آیت نازل ہوئی: ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔

البتہ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ساری رات اٹھا کرتے اور پاؤں میں ورم پڑ جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے آپؐ (باری باری) ایک پاؤں پر وزن رکھتے دوسرے کو اٹھا کر رکھتے تھے جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

---

[1] البیاضی۔ الصراط المستقیم ۱:۱۸۶

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ[1] اے کپڑوں میں لپٹنے والے! رات کو اٹھا کیجیے مگر کم۔

دوسری بہت سی روایات سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً

كَانَ النَّبِيُّ يُصَلِّي حَتّٰى تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ۔[2] نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس قدر نماز پڑھتے کہ آپ کے دونوں پاؤں میں ورم پڑ جاتا تھا۔

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۙ﴿۳﴾ ۳۔ بلکہ یہ تو خوف رکھنے والوں کے لیے صرف ایک یاد دہانی ہے۔

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ؕ﴿۴﴾ ۴۔ یہ اس کی طرف سے نازل ہوا ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو بنایا ہے۔

تفسیر آیات

لِّمَنْ يَّخْشٰى: صرف خدا کا خوف دل میں رکھنے والوں کے لیے قرآن یاد دہانی ہے۔ واضح رہے ہر انسان کی فطرت اور جبلت میں خدا پرستی ودیعت ہے مگر اکثر لوگ اپنے فطری تقاضے پورے نہیں کرتے کیونکہ منفی تربیت اور مخالف رجحانات فطرت پر غالب آ جاتے ہیں جس کی وجہ سے فطرت کی آواز دب جاتی ہے اور اگر مخالف رجحانات کا دباؤ نہیں ہے تو ایسے لوگوں کو فطرت کی طرف بلایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہوں گے جن کے دل میں خدا کا خوف ہے۔ اپنی فطرت پر قائم ہیں تاہم فطرت کے تقاضے پورے کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کو یاد دلایا جائے تو ان کی فطرت زندہ ہو جاتی ہے۔ اگر فطرت میں یہ باتیں پہلے سے موجود نہ ہوتیں تو انبیاء کی دعوت کو کوئی پذیرائی نہ ملتی۔

چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے انبیاء علیہم السلام کے فرائض بیان فرماتے ہوئے فرمایا:

فَبَعَثَ فِيهِمْ رُسُلَهُ وَ وَاتَرَ اِلَيْهِمْ اَنْبِيَاءَهُ لِيَسْتَأْدُوهُمْ مِيثَاقَ فِطْرَتِهِ وَ يُذَكِّرُوهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهِ وَ يَحْتَجُّوا عَلَيْهِمْ بِالتَّبْلِيغِ ....[3] اللہ نے ان میں ان میں اپنے رسول مبعوث کیے اور لگاتار انبیاء بھیجے تاکہ ان سے فطرت کے عہد و پیمان پورے کرائیں اس کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں، پیغام ربانی پہنچا کر حجت تمام کریں۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿۵﴾ ۵۔ وہ رحمٰن جس نے عرش پر اقتدار قائم کیا۔

---

[1] ۷۳ المزمل: ۱۔۲ [2] مستدرک الوسائل ۱: ۱۲۹ باب استحباب الجد [3] نہج البلاغۃ خ ۱

تفسیر آیات

اللہ کے عرش پر متمکن ہونے کے سلسلے میں چند ایک مباحث سورہ اعراف آیت ۵۴ میں گزر چکے ہیں۔

عرش، کائنات کی تخلیق کے بعد تدبیر کائنات سے مربوط مقام کا نام ہے۔ اس اعتبار سے عرش کی یہ تعریف بنتی ہے:

عرش اس مقام کا نام ہے جہاں سے کائنات کے نظام سے متعلق احکام صادر ہوتے ہیں۔[1]

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝

۶۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان اور جو کچھ زمین کی تہ میں ہے سب کا وہی مالک ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کل موجودات کا مالک ہے۔ ان موجودات میں سے جو انسان کے لیے قابل فہم و ادراک ہیں ان کا ذکر ہے، اس لیے زمین کی تہ کا ذکر ہے تاکہ انسان کا ذہن یہ باور کرے کہ کوئی چیز اللہ کی ملکیت سے خارج نہیں ہے۔

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝

۷۔ اور اگر آپ پکار کر بات کریں تو وہ رازوں کو بلکہ اس سے زیادہ مخفی باتوں کو بھی یقیناً جانتا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کے علم کی جامعیت کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بات بلند آواز سے کہو یا راز میں رکھو، اللہ جانتا ہے بلکہ اس سے زیادہ پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے جو انسان کی رسائی میں نہیں ہیں۔

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ....[2]

اللہ نگاہوں کی خیانت اور جو کچھ سینوں میں پوشیدہ ہے سے واقف ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝

۸۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، بہترین نام اسی کے ہیں۔

---

[1] تفسیر المیزان　[2] ۴۰ غافر: ۱۹

تفسیر آیات

پرستش کے جتنے محرکات ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ ہی میں موجود ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ سورہ فاتحہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کی تفسیر) اللہ کے علاوہ کسی اور پر کوئی لفظ دلالت کرتا ہے تو وہ کماحقہ نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کسی کو عالم کہا جائے تو عالم اس شخص پر کماحقہ دلالت نہیں کرتا کیونکہ جو علم اس عالم کے پاس ہے وہ عارضی اور ناقص ہے۔ نہ اس کا ذاتی ہے بلکہ کسی کا دیا ہوا ہے۔ نہ وہ تمام معلومات کا علم رکھتا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا علم کسی کا دیا ہوا نہیں بلکہ ذاتی ہے اور وہ تمام معلومات کا علم رکھتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حیات ذاتی اور کامل ہے، عارضی اور ناقص نہیں ہے۔ لہٰذا علم، حیات، قدرت وغیرہ میں جو بھی جمال و کمال قابل تصور ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ ہم علیم، قدیر، حی و قادر کے اسماء سے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اسمائے حسنیٰ کے بارے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ الاعراف آیت ۱۸۰۔

وَ ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ مُوۡسٰی ۘ﴿۹﴾

۹۔ اور کیا آپ تک موسیٰ کی خبر پہنچی ہے؟

اِذۡ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَہۡلِہِ امۡکُثُوۡۤا اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَی النَّارِ ہُدًی ﴿۱۰﴾

۱۰۔ جب انہوں نے ایک آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا: ٹھہر جاؤ! میں نے کوئی آگ دیکھی ہے، شاید میں اس میں سے تمہارے لیے کوئی انگارہ لے آؤں یا آگ پر پہنچ کر راستے کا پتہ کر لوں۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے واپس مصر جاتے ہوئے صحرائے سینا سے گزر رہے تھے۔

اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ کی روشنی صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھی تھی۔

فَقَالَ لِاَہۡلِہِ: بال بچے ہمراہ تھے۔

امۡکُثُوۡۤا: سے ظاہر ہوتا ہے کنبہ کے افراد دو سے زیادہ تھے۔

بِقَبَسٍ: سے معلوم ہوتا ہے موسم جاڑے کا تھا۔

اَوۡ اَجِدُ عَلَی النَّارِ ہُدًی: سے معلوم ہوتا ہے کہ راستہ گم کر دیا تھا مگر درحقیقت منزل کے قریب یعنی مقدس وادی طویٰ پہنچ گئے تھے۔

فَلَمَّاۤ اَتٰىہَا نُوۡدِیَ یٰمُوۡسٰی ﴿ؕ۱۱﴾

۱۱۔ پھر جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو آواز آئی: اے موسیٰ!

اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّکَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ ۚ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی ﴿۱۲﴾

۱۲۔ میں ہی آپ کا رب ہوں، پس اپنی جوتیاں اتار دیں، بتحقیق آپ طویٰ کی مقدس وادی میں ہیں۔

تشریح کلمات

طُوًی: کوہ سینا، بقول بعضے کوہ طور کے دامن میں موجود میدان کا نام ہے اور آیہ وَنَادَیۡنٰہُ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ الۡاَیۡمَنِ...[1] ”ہم نے موسیٰ کو طور کی دائیں جانب سے پکارا“ اس قول پر شاہد بن جاتی ہے۔

تفسیر آیات

نُوۡدِیَ یٰمُوۡسٰی: اس ندا کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہچان لیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ اس آواز کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عام ظاہری حواس سے نہیں سنا کہ شک کی گنجائش رہ جائے بلکہ اپنے باطنی حواس سے سنا جس میں شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ: جوتا اتارنا بلحاظ ادب و احترام ہی ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں اسرائیلی تہذیب میں بھی جوتا اتارنا ادب میں شمار ہوتا تھا۔ آیت کا اگلا جملہ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی آپ طویٰ کی مقدس وادی میں ہیں، بتاتا ہے کہ نعلین کا اتارنا ادب و احترام کے لیے تھا۔

طویٰ کی وادی کو نزول وحی کا مقام ہونے کی وجہ سے تقدس حاصل ہوا۔ اس لیے اس وادی کی مٹی سے پاؤں کا مس ہونا بھی مطلوب ہو سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مہبط وحی کا احترام لازم ہے۔

وَ اَنَا اخۡتَرۡتُکَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور میں نے آپ کو منتخب کر لیا ہے لہٰذا جو وحی کی جا رہی ہے اسے سنیں۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت و رسالت کے لیے برگزیدہ فرمایا۔ الٰہی مناصب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اندھی بانٹ نہیں ہوتی بلکہ اہلیت و قابلیت کی بنیاد پر ملتے ہیں۔

---

[1] ۱۹ مریم: ۵۲

فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی: اس سے پہلے کے کلمات تمہیدی تھے۔ اس جملے کے بعد وحی کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کندھوں پر بار رسالت رکھا جا رہا ہے۔

اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس صرف میری بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کریں۔

تفسیر آیات

اصل وحی کا آغاز یا بار رسالت کی ابتدا توحید سے ہوتی ہے: لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا... جو تمام انبیا کی رسالت کی بنیاد ہے۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ: میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ یہ عبادت کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے کہ نماز نہ برائے ثواب پڑھی جائے، نہ برائے نجات از عذاب پڑھی جائے بلکہ صرف برائے خدا پڑھی جائے چونکہ کمال کے سامنے جھکنا خود ایک کمال ہے۔ اگرچہ برائے ثواب یا برائے خوف عذاب پڑھی جانے والی نماز بھی درست ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّہُمۡ کَانُوۡا یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ وَ یَدۡعُوۡنَنَا رَغَبًا وَّ رَہَبًا ؕ وَ کَانُوۡا لَنَا خٰشِعِیۡنَ ﴿﴾ [1]

یہ لوگ کارہائے خیر میں سبقت کرتے تھے اور شوق و خوف (دونوں حالتوں) میں ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے لیے خشوع کرنے والے تھے۔

اہم نکات

۱۔ سب سے اعلیٰ مرتبے کی عبادت اللہ کی کبریائی کا درک کرنا اور پھر سجدہ ریز ہونا ہے۔

اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی ﴿۱۵﴾ فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنۡہَا مَنۡ لَّا یُؤۡمِنُ بِہَا وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ فَتَرۡدٰی ﴿۱۶﴾

۱۵۔ قیامت یقیناً آنے والی ہے، میں اسے پوشیدہ رکھوں گا تاکہ ہر فرد کو اس کی سعی کے مطابق جزا ملے۔

۱۶۔ پس جو شخص قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے کہیں وہ آپ کو اس راہ سے نہ روک دے ایسا ہوا تو آپ ہلاک ہو جائیں گے۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۹۰

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ السَّاعَۃَ: توحید کے بعد دین کا بنیادی عقیدہ معاد ہے جس میں ہر شخص کو اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔

۲۔ اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا: قیامت کب برپا ہوگی؟ یہ اس علم غیب میں سے ایک ہے جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرۡسٰہَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُہَا عِنۡدَ رَبِّیۡ ۚ ....[1] یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ قیامت واقع ہونے کا وقت کب ہے؟ کہد یجیے: اس کا علم صرف میرے رب کے پاس ہے۔

۳۔ فَلَا یَصُدَّنَّکَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے ہی قدم پر منکرین قیامت کے مقابلے میں قیام کے لیے آمادہ کیا، ساتھ منکرین کے عزائم سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ وہ آپ کی قیامت کی تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں گے۔

۴۔ وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ: منکرین کے انکار قیامت کے عوامل کی نشاندہی بھی فرمائی، جو خواہش پرستی ہے۔ چونکہ قیامت کا تصور نہ ہونے کی صورت میں انسان خواہش پرستی میں آزاد ہو جاتا ہے۔

۵۔ فَتَرۡدٰی: انکار قیامت کا نتیجہ ابدی ہلاکت ہے کیونکہ قیامت کا منکر کسی جرم کے ارتکاب سے باز نہیں آئے گا۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

۲۔ خواہش پرست مجرم، حساب و عدالت سے بھاگتا ہے۔

وَ مَا تِلۡکَ بِیَمِیۡنِکَ یٰمُوۡسٰی ﴿۱۷﴾ قَالَ ہِیَ عَصَایَ ۚ اَتَوَکَّؤُا عَلَیۡہَا وَ اَہُشُّ بِہَا عَلٰی غَنَمِیۡ وَ لِیَ فِیۡہَا مَاٰرِبُ اُخۡرٰی ﴿۱۸﴾

۱۷۔ اور اے موسیٰ! یہ آپ کے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

۱۸۔ موسیٰ نے کہا: یہ میرا عصا ہے، اس پر میں ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور میرے لیے اس میں کئی اور مفادات بھی ہیں۔

----

[1] ۷ اعراف۔ ۱۸۷

تشریح کلمات

اَتَوَکَّؤُا: (ت ک ء) الاتکاء ٹیک لگانا۔

اَھُشُّ: (ھ ش ش) الھش کسی چیز کو حرکت دینے کے معنوں میں ہے۔ ھش الورق درخت سے پتے جھاڑنا۔

مَاٰرِبُ: (ا ر ب) مأربۃ سخت حاجت کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع مآرب ہے۔

تفسیر آیات

وَمَا تِلۡکَ: یہ سوال اس بات کی تاکید کے لیے ہے کہ آنے والے معجزاتی واقعہ کے لیے کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے، موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں وہی جامد اور خشک بے جان عصا ہے جس سے ہمیشہ مختلف کام لیے جاتے رہے ہیں۔

قَالَ ہِیَ عَصَایَ: جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہا کہ یہ میرا عصا ہے بلکہ ان کاموں کا بھی ذکر کیا جو اس عصا سے لیے جاتے ہیں۔ اس عصا سے معمول کے سارے کام لیے جاتے ہیں جو ایک جامد اور بے جان لاٹھی سے لیے جا سکتے ہیں۔

اَھُشُّ بِہَا عَلٰی غَنَمِیۡ: اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں، سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرانے کا کام کرتے تھے۔ روایات کے مطابق جب مصر واپس جا رہے تھے تو کچھ بکریاں ہمراہ تھیں۔ اس سے پہلے بھی حضرت شعیب علیہ السلام کے لیے دس سال بکریاں چرانے کا کام کرتے رہے تھے۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء علیہم السلام بھی اپنی معیشت کے لیے ذرائع استعمال فرماتے ہیں: عَلٰی غَنَمِیۡ ....

قَالَ اَلۡقِہَا یٰمُوۡسٰی ﴿۱۹﴾	۱۹۔ فرمایا: اسے موسیٰ! اسے پھینکیں۔
فَاَلۡقٰہَا فَاِذَا ہِیَ حَیَّۃٌ تَسۡعٰی ﴿۲۰﴾	۲۰۔ پس موسیٰ نے اسے پھینکا تو وہ یکایک سانپ بن کر دوڑنے لگا۔

تفسیر آیات

لاٹھی کا دفعتہً سانپ بن جانا معجزہ ہے۔ معجزات عام طبیعیاتی قوانین کے دائرے میں وقوع پذیر نہیں ہوتے کیونکہ ایک خشک لکڑی کا دفعتہً متحرک سانپ میں تبدیل ہونا عام طبیعیاتی قوانین کے تحت ممکن نہیں

ہے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ معجزے کو عام طبیعاتی قوانین کے تناظر میں دیکھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ معجزے کے پیچھے اس کے اپنے علل و اسباب ہوتے ہیں جنہیں ہر کوئی تسخیر نہیں کر سکتا۔ یہاں سے معجزہ، معجزہ ہوتا ہے۔ کسی مریض کو دوائی کے ذریعے شفا ملی ہے تو اس کے علل و اسباب قابل تسخیر ہیں اور اگر دست مسیحا سے شفا ملی ہے تو یہاں جو علل و اسباب کارفرما رہے ہیں وہ دوسروں کے لیے قابل تسخیر نہیں ہیں۔

واضح رہے کہ مصر میں جہاں موسیٰ علیہ السلام کو تبلیغ کرنا تھی، وہاں سانپ کی حیثیت ایک دیوتا کی تھی اور اس کی پوجا ہوا کرتی تھی۔[1]

قَالَ خُذۡهَا وَ لَا تَخَفۡ ٝ سَنُعِیۡدُهَا سِیۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰی ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اللہ نے فرمایا: اسے پکڑ لیں اور ڈریں نہیں، ہم اسے اس کی پہلی حالت پر پلٹا دیں گے۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام سانپ کو دیکھ کر ڈر گئے تھے اور یہ خوف ایک طبعی امر ہے۔ بعض لوگ خوف اور خشیۃ میں فرق کے قائل ہیں کہ غیر خدا سے خشیۃ انبیاء کے لیے روا نہیں ہے جب کہ خوف میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعض دیگر لوگ کہتے ہیں اگر حادثہ مخلوق کی طرف سے ہو، جیسے آتش نمرود تو نہ ڈرنا کمال ہے اور جو امر خالق کی طرف سے ہو اس سے ڈرنا کمال ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں نہیں کہ جو حادثہ اللہ ارحم الراحمین کی طرف سے ہو اس سے نہیں ڈرنا چاہیے اور جو حادثہ ناداں انسانوں کی طرف سے ہو اس سے خوف کرنا اور بچنا چاہیے۔ بہرحال اس قسم کے خوف کا مطلب شر سے بچنے کی کوشش کا نام ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بادی النظر میں اس سانپ کو شر سمجھے تھے۔ اس شر سے بچنے کے احساس کو خوف کہتے ہیں جو ایک طبعی امر ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف کوئی نامناسب بات نہیں ہے۔

وَ اضۡمُمۡ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ اٰیَۃً اُخۡرٰی ﴿ۙ۲۲﴾

۲۲۔ اور اپنا ہاتھ اپنی بغل میں رکھیے تو وہ بغیر کسی عیب کے چمکتا ہوا نکلے گا، یہ دوسری نشانی ہے۔

لِنُرِیَکَ مِنۡ اٰیٰتِنَا الۡکُبۡرٰی ﴿۲۳﴾

۲۳۔ (یہ اس لیے) کہ ہم تمہیں اپنی بڑی نشانیاں دکھا دیں۔

---

[1] تفسیر دریا بادی: ۶۳۹

تفسیر آیات

یہ دوسرا معجزہ ید بیضاء ہے۔ یہ معجزہ، جو ہاتھ چمکنے سے عبارت ہے، مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ بغیر عیب کے ہے چونکہ عیب معجزہ نہیں، عیب ہوتا ہے۔ اس جملے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ توریت میں ہاتھ چمکنے کو برص کا مرض بتایا ہے۔

اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۲۴﴾　　۲۴۔اب آپ فرعون کی طرف جائیں کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔

تفسیر آیات

رسالت کا حکم ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ زمانے کی بڑی طاقت، سرکش فرعون کی طرف جانے کا حکم نہایت سنگین حکم ہے چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاصر فرعون بڑا جابر اور متکبر تھا۔

قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ ﴿۲۵﴾　　۲۵۔موسیٰ نے کہا: میرے پرودگار! میرا سینہ کشادہ فرما،

وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ ﴿۲۶﴾　　۲۶۔اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے،

تفسیر آیات

صدر کے لغوی معنی ہیں ’’سینہ‘‘ مگر یہاں شرح صدر سے مراد سینہ کی کشادگی نہیں بلکہ فکری افق میں کشادگی ہے۔ اس کشادگی کی صورت میں فکر و ذہن میں حقائق کے لیے گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ افق ذہن میں وسعت سے ذہن آفاقی ہو جاتا ہے۔ مشکلات کا صحیح خدوخال سامنے آ جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان مشکلات سے مرعوب نہیں ہوتا۔

اس لیے رسالت کا بارگراں دوش رسول پر رکھتے ہوئے شرح صدر کے ذریعے آنے والی مشکلات کے لیے رسولوں کو تیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۙ[۱]　　کیا ہم نے آپ کا سینہ کشادہ نہیں کیا۔

دوسری جگہ فرمایا:

اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰهُ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ...[۲]　　کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو اور جسے اپنے رب کی طرف سے روشنی ملی ہو..

---

[۱] ۹۴ الشرح: ۱　[۲] ۳۹ زمر: ۲۲

مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شرح صدر کی تعریف میں فرمایا:

نور یقذفه اللّٰه فی قلب المؤمن .[1]   شرح صدر ایک نور ہے جو اللہ قلب مؤمن میں ڈال دیتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مروی ہے:

اِتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُورِ اللّٰهِ.... [2]   مؤمن کی فہم و فراست سے ہوشیار رہو کیونکہ وہ نور خدا کی روشنی میں دیکھتا ہے۔

اس نور کی وجہ سے مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ شرح صدر مؤمن کے لیے اللہ کی ایک خاص نعمت ہے۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾   ۲۷۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے،

يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾   ۲۸۔ تاکہ وہ میری بات سمجھ جائیں۔

تفسیر آیات

ان جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت موجود تھی۔

يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ: سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لکنت ایسی تھی جس سے لوگوں کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ چنانچہ دوسری جگہ فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی بات کا طعنہ دیتے ہوئے کہا:

وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ○ [3]   اور صاف بات بھی نہیں کر سکتا۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾   ۲۹۔ اور میرے کنبے میں سے میرا ایک وزیر بنا دے۔

تشریح کلمات

الوزرُ: (و ز ر) کے معنی بار گراں کے ہیں۔ الوزیر بروزن فعیل، جو امیر کا بوجھ اٹھائے۔

الأزر: (ا ز ر) کے معنی مضبوط قوت کے ہیں۔

تفسیر آیات

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا: اس بار سنگین کو تنہا اٹھانا زیادہ مشکل ہوگا۔ ایک وزیر، ایک بوجھ بانٹنے والا،

---

[1] بحار الانوار۔ ۶۵: ۲۳۶   [2] الکافی۔ ۱: ۲۱۸   [3] ۴۳ زخرف: ۵۲

اس طویل سفر کے لیے ایک ہمسفر عنایت کیجیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت شرح صدر ہونے سے موسیٰ علیہ السلام کو آنے والی مشکلات کا اندازہ ہو گیا اور آپؑ نے اللہ سے ایک وزیر کے لیے دعا فرمائی۔

مِّنۡ اَهۡلِیۡ: اسی شرح صدر کا نتیجہ ہے کہ دعا میں یہ بات بھی شامل کی کہ یہ وزیر اپنے خاندان کا ایک فرد ہو۔ خاندان ایک ہونے کی صورت میں ترجیحات میں باہمی ہمآہنگی وجود میں آتی ہے اور مشکلات ایک، مزاج بھی تقریباً ایک ہونے سے ایک دوسرے کے لیے ایثار و اعتماد پختہ ہو جاتا ہے۔ مشکلات کے وقت دوسرے لوگ میدان چھوڑ جاتے ہیں لیکن اپنے خاندان کے لوگ ساتھ نہیں چھوڑتے۔

هٰرُوۡنَ اَخِی ﴿۳۰﴾

اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِیۡ ﴿۳۱﴾

وَ اَشۡرِکۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ﴿۳۲﴾

۳۰۔ میرے بھائی ہارون کو۔

۳۱۔ اسے میرا پشت پناہ بنا دے،

۳۲۔ اور اسے میرے امر (رسالت) میں شریک بنا دے۔

تفسیر آیات

خاندان کے اس فرد کی نشاندہی بھی کی گئی۔ بھائی ہارون کے ذریعے قوت میں مضبوطی پیدا فرما۔ بھائی ہوتے ہی پشت پناہ ہیں۔

وَ اَشۡرِکۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ: امر رسالت میں اسے میرا شریک بنا دے۔ امر رسالت سے مراد وحی وصول کرنے میں شریک منظور نہیں ہو گا چونکہ اللہ سے وحی وصول کرنے میں موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوئی دقت نہیں تھی بلکہ تبلیغ رسالت میں شرکت کی درخواست ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ اس بات کی صراحت موجود ہے کہ ہارون علیہ السلام کو تبلیغ رسالت میں شریک کرنے کی درخواست تھی:

وَ اَخِیۡ هٰرُوۡنُ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡهُ مَعِیَ رِدۡاً یُّصَدِّقُنِیۡۤ ۫ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ ۝ [1]

اور میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے لہٰذا اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج کہ وہ میری تصدیق کرے کیونکہ مجھے خوف ہے کہ لوگ میری تکذیب کریں گے۔

شیعہ سنی مصادر میں آیا ہے کہ عیناً یہی دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں فرمائی:

----

[1] ۲۸ قصص: ۳۴

اللّٰھم انی اقول کماقال اخی موسیٰ. اللّٰھم اجعل لی وزیراً من اھلی علیا اخی اشددبه ازری واشرکه فی امری کی نسبحك کثیراً ونذکرك کثیراً انك کنت بنا بصیراً۔	اے اللہ میں بھی وہی دعا کرتا ہوں جو میرے بھائی موسیٰ نے کی ہے۔ اے اللہ میرے کنبے میں سے میرا ایک وزیر بنا دے میرے بھائی علی کو اسے میرا پشت پناہ بنا دے اور اسے میرے امر میں شریک بنا دے کہ ہم تیری خوب تسبیح کریں اور تجھے کثرت سے یاد کریں۔ یقیناً تو ہمارے حال پر نظر رکھتا ہے۔

اس روایت کے راوی درج ذیل ہیں:

۱۔ عبد اللہ بن عباس: شواھد التنزیل ۱: ۵۶ میں حسکانی نے، ابونعیم نے مانزل القرآن فی علی اور منقبة المطھرین میں، نطنزی نے الخصائص العلویه میں ابن عباس کی روایت نقل کی ہے۔ ملاحظہ ہو المناقب شھر آشوب ۳: ۵۷۔

۲۔ ابوذر۔ تفسیر ثعلبی ملاحظہ ہو: الصراط المستقیم ۱: ۲۶۰

۳۔ سلمان فارسی: کتاب سلیم بن قیس صفحہ ۹۰۹

۴۔ حذیفہ بن اسید: شواھد التنزیل ۱: ۴۷۸

۵۔ اسماء بنت عمیس: شواھد التنزیل ۱: ۴۷۹۔ الدرالمنثور۔

واضح رہے حضرت علی علیہ السلام کے بارے وَاَشۡرِکۡہُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ سے مراد نبوت میں شرکت کی درخواست نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث منزلت میں حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا:

اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ ھَارُونَ مِنْ مّوسیٰ اِلَّا اَنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعْدِی۔[1]	تجھے مجھ سے وہی مقام حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھا صرف یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

اس میں صراحتاً نبوت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے بلکہ اَمۡرِیۡ سے مراد امر تبلیغ رسالت ہے۔ سورہ برائت کے شروع میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ تبلیغ کے دو مرحلے ہیں: پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ حکم لوگوں کے لیے بیان کرنا۔ دوسرا مرحلہ رسول کی طرف سے بیان ہونے کے بعد سب سننے والوں پر واجب ہے کہ وہ دوسروں تک پہنچا دیں۔ فلیبلغ الشاھد الغائب۔ جب تبلیغ پہلے مرحلے میں ہوتی ہے تو یہ رسول اللہ کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کو اس مرحلے میں شریک کرنے کی دعا کی ہے۔ چنانچہ برائت از مشرکین کی تبلیغ پہلے مرحلے میں تھی خود رسول اللہ کی جگہ حضرت علی علیہ السلام نے برائت از مشرکین کی تبلیغ کی۔

اہم نکات

۱۔ کسی مشن کی کامیابی کے لیے خاندانی مزاج و الفت طبعی مددگار ثابت ہوتی ہے: وَزِیۡرًا مِّنۡ اَھۡلِیۡ...

---

[1] الکافی ۸: ۱۰۶

كَیۡ نُسَبِّحَكَ كَثِیۡرًا ﴿۳۳﴾ ۳۳۔ تاکہ ہم تیری خوب تسبیح کریں،

وَّ نَذۡكُرَكَ كَثِیۡرًا ﴿۳۴﴾ ۳۴۔ اور تجھے کثرت سے یاد کریں۔

اِنَّكَ كُنۡتَ بِنَا بَصِیۡرًا ﴿۳۵﴾ ۳۵۔ یقیناً تو ہی ہمارے حال پر خوب نظر رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

اس رسالت کی کامیابی کی صورت میں زمین شرک سے پاک ہو جائے گی اور تیری تسبیح و تنزیہ کثرت سے ہو سکے گی اور کثرت سے ذکر خدا اور عبادت ہو جایا کرے گی۔

بِنَا بَصِیۡرًا: ہم اہل البیت کا حال تو بہتر جانتا ہے یا ممکن ہے کہ اس سے مراد اپنا بھائی ہارون علیہ السلام ہو کہ میرے اور میرے بھائی کے حال سے تو باخبر ہے کہ ہم تیری تسبیح و عبادت چاہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ہر قدم کی منزل مقصود ذکر و تسبیح الٰہی ہونا چاہیے۔

قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَكَ یٰمُوۡسٰی ﴿۳۶﴾ ۳۶۔ فرمایا: اے موسیٰ! یقیناً آپ کو آپ کی مراد دے دی گئی۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری درخواستیں منظور ہو جاتی ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسانات کے سلسلوں میں ایک عظیم احسان ہے۔ دیگر احسانوں کا اگلی آیت میں ذکر ہوتا ہے۔

وَ لَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡكَ مَرَّةً اُخۡرٰۤی ﴿۳۷﴾ ۳۷۔ اور بتحقیق ہم نے ایک مرتبہ پھر آپ پر احسان کیا۔

اِذۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّكَ مَا یُوۡحٰۤی ﴿۳۸﴾ ۳۸۔ جب ہم نے آپ کی والدہ کی طرف اس بات کا الہام کیا جو بات الہام کے ذریعے کی جانا تھی۔

اَنِ اقۡذِفِیۡهِ فِی التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِیۡهِ فِی الۡیَمِّ فَلۡیُلۡقِهِ الۡیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاۡخُذۡهُ عَدُوٌّ لِّیۡ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلۡقَیۡتُ عَلَیۡكَ مَحَبَّةً مِّنِّیۡ ۬ۚ وَ ۳۹۔ (وہ یہ) کہ اس (بچے) کو صندوق میں رکھ دیں پھر اس (صندوق) کو دریا میں ڈال دیں تو دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا (تو) میرا اور اس کا دشمن اسے اٹھا لے گا اور میں نے آپ پر اپنی طرف سے محبت

لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ ﴿۳۹﴾

ڈال دی تا کہ آپ میرے سامنے پرورش پائیں۔

اِذۡ تَمۡشِیۡۤ اُخۡتُکَ فَتَقُوۡلُ ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی مَنۡ یَّکۡفُلُہٗ ؕ فَرَجَعۡنٰکَ اِلٰۤی اُمِّکَ کَیۡ تَقَرَّ عَیۡنُہَا وَ لَا تَحۡزَنَ ۬ؕ وَ قَتَلۡتَ نَفۡسًا فَنَجَّیۡنٰکَ مِنَ الۡغَمِّ وَ فَتَنّٰکَ فُتُوۡنًا ۬۟ فَلَبِثۡتَ سِنِیۡنَ فِیۡۤ اَہۡلِ مَدۡیَنَ ۬ۙ ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوۡسٰی ﴿۴۰﴾

۴۰۔(وہ وقت یاد کرو) جب آپ کی بہن (فرعون کے پاس) گئیں اور کہنے لگیں: کیا میں تمہیں ایسا شخص بتا دوں جو اس بچے کی پرورش کرے؟ اس طرح ہم نے آپ کو آپ کی ماں کے پاس پہنچا دیا تا کہ ان کی آنکھ ٹھنڈی ہو جائے اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور آپ نے ایک شخص کو قتل کیا پس ہم نے آپ کو غم سے نجات دی اور ہم نے آپ کی خوب آزمائش کی، پھر سالوں تک آپ مدین والوں کے ہاں مقیم رہے پھر اے موسیٰ! اب عین مقرر وقت پر آ گئے ہیں۔

تفسیر آیات

اس زمانے میں کہانت کا دور دورہ تھا۔ کاہنوں نے فرعون کو بتایا کہ تیری حکومت کا زوال بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ایک بچے کے ہاتھ ہو گا۔ فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیلیوں میں جہاں بچہ پیدا ہو اسے ہلاک کر دیا جائے۔ انہی دنوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مادر موسیٰ کے دل میں بذریعہ الہام یہ بات ڈال دی کہ بچے کو ایک تابوت میں رکھ کر دریائے نیل میں بہا دیا جائے۔ دریائے نیل فرعون کے قصر کے نیچے سے گزرتا ہے۔ جب تابوت قصر کے پاس سے گزرے گا تو لوگوں کی اس صندوق (تابوت) پر نظر پڑے گی، بچے کو نکال لیا جائے گا۔ خوب صورت بچہ دیکھ کر وہ اسے نہیں ماریں گے بلکہ اسے اپنا بیٹا بنا لیں گے چونکہ فرعون بے اولاد تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یہ بچہ اپنی ماں کے پاس واپس پہنچا دے گا۔

چنانچہ مادر موسیٰ نے ایسے ہی کیا۔ جب بچے کو دریائے نیل کے حوالے کر دیا تو مادر موسیٰ نے اپنی ایک بیٹی (موسیٰ کی بہن) کو تجسس کے لیے بھیجا۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن قصر فرعون کے گرد چکر لگاتی رہی۔ فرعون کا بندہ بچے کو دودھ پلانے والی دائی کی تلاش میں نکلا تو ہارون علیہ السلام کی بہن نے کہا: کیا میں ایک ایسے خاندان کی نشاندہی کروں جو اس بچے کو دودھ پلائے۔ اس طرح بچہ اپنی ماں کی گود میں واپس آ گیا۔

اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّکَ : مادر موسیٰ کی طرف جو وحی آئی تھی وہ نبوتی وحی نہ تھی بلکہ اس قسم کی وحی کو الہام کہتے ہیں۔ الہام کسی کے دل میں کوئی بات ڈالنے کو کہتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ تفسیر ہذا صفحہ ۳۷۔

فَلۡیُلۡقِہِ الۡیَمُّ بِالسَّاحِلِ: فلیلق امر کا صیغہ ہے اس لیے اس جملے کا لفظی ترجمہ تو اس طرح ہونا چاہیے: ''دریا کو چاہیے کہ وہ اس (موسیٰ) کو ساحل پر ڈال دے'' لیکن اس امر تکوینی میں وقوع پذیری یقینی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ''دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا۔'' اس پر قرینہ بعد کے جملے میں یَاۡخُذۡہُ ہے۔

یَاۡخُذۡہُ عَدُوٌّ لِّیۡ وَ عَدُوٌّ لَّہٗ: میرا اور اس (موسیٰ علیہ السلام) کا دشمن سے مراد فرعون ہے۔

وَ اَلۡقَیۡتُ عَلَیۡکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیۡ : اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نہایت خوبصورت تھے۔ جسے دیکھتے ہی دل میں محبت آ جاتی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ فرعون کے گھر میں سب اسے چاہنے لگے۔

وَ لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ : تاکہ تو میرے سامنے پرورش پائے۔ وَ لِتُصۡنَعَ میں الصنع کے معنی پرورش کے ہیں۔ مجمع البحرین میں مادہ (ص ن ع) میں آیا ہے:

وَلِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ: ای تربی وتغذ بمرأی منی۔	تاکہ تو میرے سامنے پرورش پائے اور غذا حاصل کرے۔

اسی معنی میں ناحیہ کی حدیث:

ونحن صنائع ربنا و الخلق بعد صنائعنا... [1]	ہم اپنے پروردگار کے پرورش یافتہ ہیں اور مخلوق ہماری پرورش یافتہ ہے۔

نہج البلاغۃ میں حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے فرمان کے یہی معنی ہیں جہاں آپؑ نے فرمایا:

فانا صنائع ربنا و الناس بعد صنائع لنا... [2]	ہم وہ ہیں جو براہ راست اللہ سے نعمتیں لے کر پروان چڑھے ہیں اور دوسرے ہمارے احسان کے پروردہ ہیں۔

اس کے علاوہ الصنیعۃ احسان کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

المن یهدم الصنیعۃ۔ [3]	جتانے سے احسان برباد ہو جاتا ہے۔

فَرَجَعۡنٰکَ اِلٰۤی اُمِّکَ : ماں کی ممتا دوبارہ واپس دلانا ایک عظیم احسان ہے۔

کَیۡ تَقَرَّ عَیۡنُہَا وَ لَا تَحۡزَنَ : ماں کو اس کی آنکھوں ٹھنڈک واپس دلانا بھی ایک عظیم احسان ہے۔

وَ قَتَلۡتَ نَفۡسًا: قبطی کے قتل کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی حکومت سے خوف لاحق تھا۔ اس سے اللہ نے نجات دلائی۔ پھر مدین میں چند سال گزارنے کے بعد آج اس جگہ پر ہو۔

ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوۡسٰی : جو دن قدرت نے تیری رسالت کے لیے متعین کیا تھا اسی معین وقت

[1] الاحتجاج ۲: ۲۷۶　[2] نہج البلاغہ۔ مکتوب: ۲۸ ترجمہ از مفتی جعفر حسینؒ　[3] الکافی ۴: ۲۲

میں تم یہاں آ گئے ہو اے موسیٰ۔

اہم نکات

۱۔ نیک مقاصد کے لیے فرعون جیسے طاغوتوں سے بھی کام لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ وقت کے سب سے بڑے اولوالعزم پیغمبر وقت کے سب سے بڑے طاغوت کے گھر میں پرورش پا رہے ہیں۔

وَاصۡطَنَعۡتُکَ لِنَفۡسِیۡ ﴿۴۱﴾ ۴۱۔ اور میں نے آپ کو اپنے لیے اختیار کیا ہے۔

تشریح کلمات

الاصطناع: (ص ن ع) سے باب افتعال۔ اصطنع اتخذ کے معنوں میں آتا ہے۔ (لسان العرب) یعنی میں نے اپنی رسالت کے لیے تجھے انتخاب کیا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میں نے تجھے اپنے لیے منتخب کیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منزلت اور عند اللہ ان کا رتبہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر اپنی ذات کے لیے ان کو چنا ہے۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے توحید کی سب سے مشکل ترین تحریک کو وقت کے سب سے قوی ترین طاغوت کے مقابلے میں چلانا ہے۔

اِذۡہَبۡ اَنۡتَ وَ اَخُوۡکَ بِاٰیٰتِیۡ وَ لَا تَنِیَا فِیۡ ذِکۡرِیۡ ﴿۴۲﴾ ۴۲۔ لہٰذا آپ اور آپ کا بھائی میری آیات لے کر جائیں اور دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا۔

اِذۡہَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾ ۴۳۔ دونوں فرعون کے پاس جائیں کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔

فَقُوۡلَا لَہٗ قَوۡلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوۡ یَخۡشٰی ﴿۴۴﴾ ۴۴۔ پس دونوں اس سے نرم لہجے میں بات کرنا شاید وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو اللہ نے اپنے معجزاتی اسلحہ سے مسلح کرنے کے بعد فرمایا: میرے ان معجزات کو فرعون کے پاس لے جاؤ۔

وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ: ذکر خدا کی طاقت سے کبھی بھی غافل نہ ہونا۔ اگرچہ معجزات موسیٰ عظیم تھے تاہم اس کی پشت پر ذکر خدا اس سے زیادہ عظیم طاقت ہے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا: اگرچہ فرعون سرکش ہو گیا ہے تاہم گفتگو میں پھر بھی نرمی ہو کیونکہ انداز کلام میں اگر شیرینی نہیں ہے تو مضمون کلام خواہ کتنا ہی منطقی اور معقول کیوں نہ ہو کلام موثر واقع نہیں ہوتا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: اِنَّهٗ طَغٰى فرعون سرکش ہو گیا ہے لیکن موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے لیے نرم لہجے میں بات کرنے کا حکم ہے۔ یعنی وہ اگرچہ سرکش ہو گیا ہے مگر اسے سرکش کہہ کر خطاب نہیں کرنا۔

اہم نکات

۱۔ دشمن کے مقابلے کے وقت ذکر خدا سب سے بڑی طاقت ہے: وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ...

۲۔ انداز کلام خود کلام سے زیادہ مؤثر ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے بھی وسائل استعمال کرنے کا حکم دیا ہے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾

۴۵۔ دونوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہمیں خوف ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا مزید سرکش ہو جائے گا۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ﴿۴۶﴾

۴۶۔ فرمایا: آپ دونوں خوف نہ کریں میں آپ دونوں کے ساتھ ہوں اور (دونوں کی بات) سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

تشریح کلمات

يَّفْرُطَ: (ف ر ط) فرط کے معنی قصداً آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے: اَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ۔[۱] میں حوض (کوثر) پر تمہارا پیشرو ہوں۔ اس آیت میں فرط حد سے آگے بڑھ جانے یعنی زیادتی کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اِنَّنَا نَخَافُ: میں خوف، ذاتی اور جانی خوف نہیں ہے کیونکہ اللہ کا وعدہ ہو چکا ہے:

وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا...[۲] — اور ہم آپ دونوں کو غلبہ دیں گے اور ہماری نشانیوں (معجزات) کی وجہ سے وہ آپ تک نہیں پہنچ پائیں گے.

---

۱ مستدرک الوسائل ۲: ۳۹۸ — ۲ ۲۸ قصص: ۳۵

بلکہ یہاں خوف، دعوت کی کامیابی اور پیشرفت کے بارے میں ہے کہ کہیں دعوت کی راہ میں فرعون کی زیادتی اور سرکشی حائل نہ ہو جائے۔

قَالَ لَا تَخَافَاۤ: خوف نہ کر۔ جس ذات نے اس دعوت کا حکم دیا ہے وہ تم دونوں سے غائب نہیں ہے۔

اِنَّنِیۡ مَعَکُمَاۤ: تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ میری حمایت اور نصرت تم دونوں کے ساتھ ہے۔

اَسۡمَعُ وَ اَرٰی: جو باتیں کی جاتی ہیں ان کو سنتا ہوں اور جو قدم اٹھایا جاتا ہے اسے دیکھتا ہوں۔ یہ ہے معیت کی تفصیل و تاکید اور مزید وضاحت۔

اہم نکات

۱۔ اپنی مشکلات کو اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

۲۔ جو اللہ کے لیے کام کرتا ہے اللہ اسے رسوا نہیں کرتا۔

۳۔ جو اپنے آقا کے لیے خود آقا کے سامنے کام کر رہا ہو اسے لطف آتا ہے۔

فَاۡتِیٰهُ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّکَ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۬ۙ وَ لَا تُعَذِّبۡهُمۡ ؕ قَدۡ جِئۡنٰکَ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الۡهُدٰی ﴿۴۷﴾

۴۷۔ دونوں اس کے پاس جائیں اور کہیں: ہم دونوں تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان پر سختیاں نہ کر، بلاشبہ ہم تیرے رب کی طرف سے نشانی لے کر تیرے پاس آئے ہیں اور سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔

اِنَّا قَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡنَاۤ اَنَّ الۡعَذَابَ عَلٰی مَنۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ﴿۴۸﴾

۴۸۔ ہماری طرف یقیناً وحی کی گئی ہے کہ عذاب اس شخص کے لیے معین ہے جو تکذیب کرے اور منہ موڑے۔

تفسیر آیات

حمایت اور نصرت کی یقین دہانی کے بعد فرعون کے پاس جانے کا دوبارہ حکم ہوا۔ یہ حکم حضرت موسیٰ کے مصر پہنچنے اور حضرت ہارون علیہما السلام سے ملنے کے بعد ملا ہو گا۔

رَسُوۡلَا رَبِّکَ: اس میں بات کی صراحت موجود ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام شریک رسالت تھے۔

فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ: فرعون بنی اسرائیل سے بیگار میں کام لیتا تھا اور مصری معاشرے میں بنی اسرائیل نسلی تعصب کا شکار رہتے تھے۔ اس لیے بنی اسرائیل کو اس ذلت آمیز زندگی سے نکالنا حضرت

موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داری بن گئی۔

قَدۡ جِئۡنٰکَ بِاٰیَۃٍ: اپنی صداقت پر دلیل اور معجزہ بھی لے کر آیا ہوں۔

وَ السَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الۡہُدٰی: تمام ادیان کی دعوت کا آخری نتیجہ امن و سلامتی ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ لوگوں کو اس دنیا میں عزت کی زندگی دینا انبیاء علیہم السلام کی ذمہ داری ہے: فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۔۔

۲۔ دنیا و آخرت کا امن و سلامتی انبیاء علیہم السلام کی ہدایت پر چلنے میں ہے۔

۳۔ آپ اگر کسی پر سلام کرنا نہیں چاہتے تو یہ جملہ وَ السَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الۡہُدٰی استعمال کریں۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام اپنے ان خطوط میں یہی آیت لکھتے جہاں وہ مخاطب کو سلام کرنا نہیں چاہتے تھے۔اس آیت کے معنی یہ ہیں: سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی ﴿۴۹﴾

۴۹۔ فرعون نے کہا: اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۵۰﴾

۵۰۔ موسیٰ نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

تفسیر آیات

مصر میں فرعون کو سورج دیوتا کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔جس طرح سورج ان کا سب سے بڑا معبود تھا خود فرعون بھی معبود کا درجہ رکھتا تھا کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق فرعون کی پرستش عین سورج کی پرستش سمجھی جاتی تھی۔

فرعون کا سوال: تم دونوں کا رب کون ہے؟ بتاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام و فرعون میں بنیادی اختلاف رب پر ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام جس رب کی بات کرتے ہیں، فرعون اس رب کو نہیں جانتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ ذکر ہے کہ فرعون نے اس جگہ کہا: وَ مَا رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔۔۔[1] اور رب العالمین کیا ہے؟ چونکہ فرعون کی ثقافت میں یہ لفظ ایک اجنبی سا لفظ تھا۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں رب کی جامع تعریف ہے اور فرعون کے مزاعم کی رد بھی۔فرعون اور دیگر بت پرستوں کا زعم یہ ہے کہ خالق بے شک اللہ ہے لیکن خلقت کے بعد

۱؎ ۲۶ شعراء: ۲۳

موجودات کے امور کی تدبیر دیگر ارباب کے ہاتھ میں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جس نے جہاں ہر شیٔ کو اس کی خلقت عنایت کی ہے وہاں اس کی بقا و ارتقاء کے لیے ہدایت بھی عنایت فرمائی ہے۔ یعنی خلق اور تدبیر دونوں جس کے اختیار میں ہیں وہ میرا رب ہے۔ دوسرے لفظوں میں میرا رب وہ ہے جس نے پہلے ہر شیٔ کو خلق کیا اس کے بعد اسے طریقہ زیست بھی بتایا۔ لوازم حیات کی سوجھ دی۔ دوست اور دشمن کی پہچان دی۔ میرا رب صرف تخلیق کر کے اسے کسی اور کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتا بلکہ تخلیق کرتا ہے پھر اس مخلوق کو زندگی کا سلیقہ بھی خود دیتا ہے۔ جن باتوں پر ان موجودات کی بقاء و ارتقا موقوف ہے، ان کی سوجھ بھی ان میں ودیعت فرماتا ہے۔ جو سوجھ بوجھ خلقت کے ہمراہ ودیعت ہوتی ہے وہ تکوینی و فطری ہدایت ہے اور جو خلقت کی تکمیل کے بعد ہدایت ملتی ہے وہ تشریعی ہے۔ اگر ان موجودات میں خداداد سلیقہ زندگی نہ ہوتا تو کوئی اپنی زندگی کے لوازمات سے آشنا نہ ہوتا۔ نہ اپنی غذا کی پہچان ہوتی نہ دوست و دشمن کی شناخت۔ نہ ماں میں مامتا کی شناخت ہوتی، نہ بچے کو ماں کی چھاتی سے انس ہوتا۔

اہم نکات

۱۔　　اللہ نے تمام موجودات میں اپنی زندگی کو قائم رکھنے کا سلیقہ ودیعت فرمایا ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ﴿۵۱﴾　　۵۱۔ فرعون بولا: پھر گزشتہ نسلوں کا کیا بنا؟

تشریح کلمات

البال: (ب ی ل) اس حالت کو کہتے ہیں جس کی فکر یا پرواہ کی جائے واصلح بالھم ان کی حالت سنوار دی۔

تفسیر آیات

فرعون نے کہا: اگر رب کی یہی تعریف ہے جو تم بیان کر رہے ہو تو ہمارے آباء و اجداد کے بارے میں کیا کہتے ہو، کیا وہ سب گمراہ تھے؟ ان کے پاس کوئی عقل و فہم نہیں تھی کہ انہوں نے نسلاً بعد نسلٍ رب کے بارے میں وہی تصور اختیار کیے رکھا جو آج ہم رکھتے ہیں۔ اگر وہ گمراہ تھے تو تم بتا سکتے ہو کہ وہ کس حال میں ہیں؟

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی ﴿۵۲﴾　　۵۲۔ موسیٰ نے کہا: ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں ہے، میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ان کے اعمال کا پورا دفتر میرے پروردگار کے ہاں محفوظ ہے جہاں بھول چوک کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہ جواب قَوۡلًا لَّیِّنًا (نرم گفتگو) کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ورنہ اس سوال کا جواب یہ تھا کہ تمہارے آبا واجداد جہنم کے ذلت آمیز عذاب میں مبتلا ہیں۔

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا وَّ سَلَکَ لَکُمۡ فِیۡہَا سُبُلًا وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾

۵۳۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہارے لیے راستے بنائے اور آسمانوں سے پانی برسایا پھر اس سے ہم نے مختلف نباتات کے جوڑے اگائے۔

کُلُوۡا وَ ارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی ﴿۵۴﴾

۵۴۔ تم بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ، صاحبان علم کے لیے اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

عالم تخلیق و تدبیر میں ربوبیت کی جو تعریف کی گئی اس کی تفصیل ہے۔ اس میں ایک اہم نکتے کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ کائنات کی تدبیر اس کی تخلیق سے جدا نہیں ہو سکتی بلکہ تدبیر کا مسئلہ تخلیق سے مربوط اور منسلک ہے۔

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا: ایسا نہیں کہ اللہ نے زمین بنائی اور کسی اور نے آ کر اس کو گہوارہ بنا دیا تا کہ یہاں زندگی پنپ سکے۔

چنانچہ زمین اللہ کی طرف سے ودیعت شدہ ہدایت پر عمل پیرا ہے اور زندگی کے لیے نامساعد فضا میں ایک مہمان نواز سیارہ ہے۔ صرف مہمان نواز ہی نہیں بلکہ یہ زمین انسانی ارتقا کے لیے ایسی ہے جیسے بچے کے لیے گہوارہ، جس میں ایک ناتواں بچے کے لیے زندگی کے تمام وسائل فراہم ہیں۔

وَّ سَلَکَ لَکُمۡ فِیۡہَا سُبُلًا: اگر یہ راستے نہ ہوتے تو سربفلک پہاڑوں سے بہنے والے پانی سے میدانوں کی آبادکاری ممکن نہ ہوتی اور راستہ نہ ہونے کی وجہ سے زمین پر بسنے والے باہم مربوط نہ ہوتے۔

وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اسی ہدایت تکوینی کے تحت سمندروں کے بخارات آسمان کی طرف اٹھتے ہیں، بادل بنتے ہیں۔ یہ بادل پانی لے کر دور و دراز علاقوں میں پانی برساتے ہیں۔ اسی ہدایت تکوینی

کے تحت زمین اپنا سینہ چاک کرتی ہے اور یہاں بسنے والوں کی ضرورت کی تمام اشیاء اگاتی ہے۔

کُلُوۡا وَ ارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ: جس سے انسان کے لیے غذا اور جانوروں کے لیے چارہ فراہم ہوتا ہے۔

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی: عقل و خرد رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ انسانی بقا و ارتقاء کے لیے یہ چیزیں خالق نے فطرت میں ودیعت فرمائی ہیں لہٰذا اس کائنات کا مدبر وہی ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہمارا رب وہ ہے جس نے تخلیق کے ساتھ سامان زیست فراہم کیا ہے۔

مِنۡہَا خَلَقۡنٰکُمۡ وَ فِیۡہَا نُعِیۡدُکُمۡ وَ مِنۡہَا نُخۡرِجُکُمۡ تَارَۃً اُخۡرٰی ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔

تفسیر آیات

ہر انسان کو تین حالتوں سے گزرنا ہے: زمین کے شکم سے بیرون آنا۔ پھر زمین کے شکم میں واپس جانا اور پھر ایک مرتبہ اور زمین کے شکم سے بیرون آنا ہے۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا:

یَا ابۡنَ عَمِّ خَیۡرِ خَلۡقِ اللّٰہِ مَا مَعۡنَی السَّجۡدَۃِ الۡاُولٰی؟

اے بہترین خلق خدا کے چچازاد بھائی پہلے سجدہ کا کیا مطلب ہے؟

آپ علیہ السلام نے فرمایا:

تَاوِیلُہَا اللّٰہُمَّ اِنَّکَ مِنۡہَا خَلَقۡتَنَا یَعۡنِی مِنَ الۡاَرۡضِ وَ تَاوِیلُ رَفۡعِ رَاۡسِكَ وَ مِنۡہَا اَخۡرَجۡتَنَا وَ تَاوِیلُ السَّجۡدَۃِ الثَّانِیَۃِ وَ اِلَیۡہَا تُعِیدُنَا وَ رَفۡعِ رَاۡسِكَ وَ مِنۡہَا تُخۡرِجُنَا تَارَۃً اُخۡرَی۔[1]

اس کی تاویل یہ ہے کہ اے اللہ آپ نے ہم کو زمین سے خلق فرمایا اور سجدے سے سر اٹھانے کی تاویل یہ ہے کہ اے اللہ تو نے زمین سے ہمیں نکالا ہے۔ دوسرے سجدے کی تاویل یہ ہے کہ تو ہمیں دوبارہ زمین میں واپس کرے گا۔ پھر سجدے سے سر اٹھانے کی تاویل یہ ہے کہ تو ایک مرتبہ پھر ہم کو زمین سے نکالے گا۔

وَ لَقَدۡ اَرَیۡنٰہُ اٰیٰتِنَا کُلَّہَا فَکَذَّبَ وَ اَبٰی ﴿۵۶﴾

۵۶۔ اور بتحقیق ہم نے فرعون کو ساری نشانیاں دکھا دیں سو اس نے پھر بھی تکذیب کی اور انکار کیا۔

---

۱ الفقیہ ۱: ۳۱۴ باب وصف الصلوۃ

تفسیر آیات

ان معجزات سے مراد عصا و ید بیضا و دیگر معجزات ہو سکتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے بعد دکھائے گئے۔

قَالَ اَجِئۡتَنَا لِتُخۡرِجَنَا مِنۡ اَرۡضِنَا بِسِحۡرِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۵۷﴾

۵۷۔ فرعون نے کہا: اے موسیٰ! کیا تم اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہماری سرزمین سے نکالنے ہمارے پاس آئے ہو؟

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام تو خود مصر کی سرزمین سے نکلنا چاہتے تھے اور اپنی قوم کو بھی یہاں سے نکال کر لے جانے کا مطالبہ کر رہے تھے تو پھر فرعون کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام انہیں مصر کی سرزمین سے نکالنا چاہتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون اپنے آپ کو سورج دیوتا کا مظہر اور نمایندہ سمجھتا تھا جسے اس کے زعم میں حکومت کرنے کا حق حاصل تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ کہا: میں اللہ کا نمایندہ ہوں تو فرعون کی حکومت غیر قانونی ہو جاتی تھی۔ اس لیے اس نے کہا: یہ اپنے جادو سے ہمیں اپنے ملک سے نکالنا چاہتا ہے۔ جب کہ جادو کے ذریعے کوئی کسی ملک کو فتح نہیں کر سکتا۔

فَلَنَاۡتِيَنَّكَ بِسِحۡرٍ مِّثۡلِهٖ فَاجۡعَلۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكَ مَوۡعِدًا لَّا نُخۡلِفُهٗ نَحۡنُ وَلَاۤ اَنۡتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

۵۸۔ پس ہم بھی تمہارے مقابلے میں ایسا ہی جادو پیش کریں گے، لہٰذا ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت جس کی نہ ہم خلاف ورزی کریں اور نہ تم، صاف میدان مقرر کرلو۔

تشریح کلمات

سُوًى: (س و ی) کے معنی وسط کے ہیں مکان سوی، وہ جگہ جس کی نسبت دونوں طرف مساوی ہو۔

تفسیر آیات

کوئی ایسی جگہ مقرر کرو جو آبادی کے وسط میں واقع ہو۔ جہاں حاضر ہونا سب کے لیے آسان ہو۔

قَالَ مَوۡعِدُکُمۡ یَوۡمُ الزِّیۡنَۃِ وَاَنۡ یُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًی ﴿۵۹﴾

۵۹۔ موسیٰ نے کہا: تمہارے ساتھ جشن کے دن وعدہ ہے اور یہ کہ دن چڑھے لوگ جمع کیے جائیں۔

تفسیر آیات

یَوۡمُ الزِّیۡنَۃِ: وقت اور دن کے تعین کی پیشکش حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہو رہی ہے۔ قومی تہوار کا دن، جس میں پوری قوم اپنی زیب و زینت کے ساتھ جمع ہوتی ہے اور جشن کے دن وقت کا بھی تعین کر دیا کہ ضُحًی کا ہو۔ یعنی جب دن چڑھ جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دن اور وقت ایسا منتخب فرمایا جس میں پوری قوم حاضر ہو۔

فَتَوَلّٰی فِرۡعَوۡنُ فَجَمَعَ کَیۡدَہٗ ثُمَّ اَتٰی ﴿۶۰﴾

۶۰۔ پس فرعون نے پلٹ کر اپنی ساری مکاریوں کو یکجا کیا پھر (مقابلے میں) آ گیا۔

تفسیر آیات

جس مجلس میں یہ بات طے ہو گئی، اس سے فرعون واپس اپنے محل میں گیا۔

فَجَمَعَ کَیۡدَہٗ: پورے ملک میں آدمی پھیلا دیے کہ جادوگروں کو لے آئیں اور جادو کا ایسا عظیم مظاہرہ ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کے اژدھے کا رعب داب لوگوں کے اذہان سے نکل جائے۔

قَالَ لَہُمۡ مُّوۡسٰی وَیۡلَکُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا فَیُسۡحِتَکُمۡ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدۡ خَابَ مَنِ افۡتَرٰی ﴿۶۱﴾

۶۱۔ موسیٰ نے ان سے کہا: تم پر تباہی ہو! تم اللہ پر جھوٹ بہتان نہ باندھو ورنہ اللہ تمہیں ایک عذاب سے نابود کرے گا اور جس نے بھی بہتان باندھا وہ نامراد رہا۔

تشریح کلمات

وَیۡلَکُمۡ: (و ی ل) حسرت و فضیحت برائی۔ خرابی کے معنوں میں ہے۔

فَیُسۡحِتَکُمۡ: (س ح ت) السحت اصل میں اس چھلکے کو کہتے ہیں جو پوری طرح اتار لیا جائے اسی سے تباہ کرنے اور حرام کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چونکہ حرام تباہی کا باعث ہے۔ اسی سے رشوت کو سحت کہا گیا ہے۔

تفسیر آیات

جب وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ میدان میں اتر آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نصیحت کی:

لَا تَفۡتَرُوۡا: اللہ پر بہتان مت باندھو۔ اللہ کے معجزے کو جادو مت کہو۔ اللہ کی دعوت کی غلط تشریح نہ کرو اور یہ کہ اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو کائنات کا مدبر نہ مانو۔ اس افتراء اور بہتان کا نتیجہ تمہاری ہلاکت ہو گی اور تمہاری ساری امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔

فَتَنَازَعُوۡۤا اَمۡرَہُمۡ بَیۡنَہُمۡ وَ اَسَرُّوا النَّجۡوٰی ﴿۶۲﴾

۶۲۔ پھر انہوں نے اپنے معاملے میں آپس میں اختلاف کیا اور (باہمی) مشورے کو خفیہ رکھا۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مواعظ یا ان کی للکار کے نتیجے میں فرعونیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ جھگڑا ساحروں اور فرعون کے درباریوں میں رونما ہوا ہو، ممکن ہے ساحروں کو پہلے ہی اندازہ ہو گیا ہو کہ موسیٰ علیہ السلام نے جس چیز کا مظاہرہ کیا ہے وہ جادو نہیں ہے۔ تاہم انہوں نے اپنے مشوروں کو خفیہ رکھا تا کہ ان کا داخلی خلفشار فاش نہ ہو اور بددلی پھیل نہ جائے۔

قَالُوۡۤا اِنۡ ہٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیۡدٰنِ اَنۡ یُّخۡرِجٰکُمۡ مِّنۡ اَرۡضِکُمۡ بِسِحۡرِہِمَا وَ یَذۡہَبَا بِطَرِیۡقَتِکُمُ الۡمُثۡلٰی ﴿۶۳﴾

۶۳۔ وہ کہنے لگے: یہ دونوں تو بس جادوگر ہیں، دونوں چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہاری اس سرزمین سے نکال باہر کریں اور دونوں تمہارے اس مثالی مذہب کا خاتمہ کر دیں۔

فَاَجۡمِعُوۡا کَیۡدَکُمۡ ثُمَّ ائۡتُوۡا صَفًّا ۚ وَ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡیَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰی ﴿۶۴﴾

۶۴۔ لہٰذا اپنی ساری تدبیریں یکجا کرو پھر قطار باندھ کر میدان میں آؤ اور آج جو جیت جائے گا وہی فلاح پائے گا۔

تفسیر آیات

آخر میں یہ طے ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کا اعلان کیا جائے اور اس اعلان میں درج ذیل نکات اٹھائے جائیں:

i۔ یہ دونوں کوئی پیغمبر نہیں ہیں۔ یہ صرف جادوگر ہیں۔ ان کی جادوگری میں شک نہیں کرنا چاہیے۔

ii۔ یہ دونوں ہماری حکومت کی قانونی حیثیت کو چیلنج کر رہے ہیں اور ہمیں اس سرزمین سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔

iii۔ یہ دونوں ہماری مثالی تہذیب، تمدن اور ثقافت کی تباہی اور اس کی جگہ اپنے نظریات کا غلبہ چاہتے ہیں۔

iv۔ فَاَجۡمِعُوۡا کَیۡدَکُمۡ : اپنی ساری تدبیریں یکجا کرو۔ پوری طاقت استعمال میں لے آؤ۔

v۔ ائۡتُوۡا صَفًّا: پوری قوم یک صف ہو کر مقابلے کے لیے آجائے۔

سیاق کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلے کے موضوع پر اختلاف تھا اور مقابلے کے لیے ساحروں کو ہی بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ لہٰذا زیادہ امکان یہی ہے کہ ساحروں میں یا ساحروں اور درباریوں میں اختلاف تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ساحروں کے جادو پر غالب آیا اور ساحر ایمان لے آئے تو اس وقت اظہار کیا کہ ہمیں مقابلے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ چنانچہ ساحروں نے فرعون سے کہا:

اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغۡفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَاۤ اَکۡرَہۡتَنَا عَلَیۡہِ مِنَ السِّحۡرِ ...[1]

ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تاکہ وہ ہمارے گناہ معاف کرے اور جس جادوگری پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا اسے بھی معاف کر دے۔

وَ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡیَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰی: فرعون اس مقابلے کو فیصلہ کن قرار دے رہا ہے کہ جو آج جیت جائے گا کامیابی اسی کا مقدر ہے۔

قرآن میں کوئی غلطی نہیں ہے: حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ قرآن میں تین جگہ غلطی ہے جو قرآن کی کتابت کرنے والوں سے سرزد ہوئی ہے۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ اِنۡ ھٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ....

۲۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ھَادُوۡا وَ الصّٰبِـُٔوۡنَ ....[2]

۳۔ وَ الۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ الۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ ....[3]

کہتے ہیں یہ روایت بشرط شیخین صحیح ہے۔[4] جب کہ قرآن لفظ بہ لفظ حرف بحرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے تواتر سے ثابت ہے پھر یہ اعتراض حفص کی قرائت پر جو کہ اِنۡ سکون بہ نون کے ساتھ پڑھی جاتی ہے وارد نہیں ہوتا اور یہ قرائت، قرآن ناطق امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے متصل ہونے کی وجہ سے قابل ترجیح ہے۔ اعتراض اِنَّ کو شد کے ساتھ پڑھنے پر وارد ہوتا ہے جو قابل قبول قرائت نہیں ہے۔ پھر قابل توجہ بات یہ ہے کہ جہاں عربیت جاہلی اشعار سے ثابت ہوتی ہے وہاں اصلی عربیت قرآن سے ثابت ہوتی ہے۔ عربیت

---

[1] طہ:۷۳ [2] مائدہ:۶۹ [3] نساء:۱۶۲ [4] روح المعانی ذیل آیت

کے صحت و سقم کے لیے قرآن معیار ہے۔ اگر قرآن میں عربیت کے خلاف کوئی بات ہوتی تو آج کے معترضین سے زیادہ، وقت نزول قرآن کے مشرکین کو ضرورت تھی۔

قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ نَّکُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰی ﴿۶۵﴾

۶۵۔ (جادوگروں نے) کہا: اے موسیٰ! تم پھینکو گے یا پہلے ہم پھینکیں؟

قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا ۚ فَاِذَا حِبَالُہُمۡ وَ عِصِیُّہُمۡ یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ اَنَّہَا تَسۡعٰی ﴿۶۶﴾

۶۶۔ موسیٰ نے کہا: بلکہ تم پھینکو، اتنے میں ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کو دوڑتی محسوس ہوئیں۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحروں کو پہل کرنے کے لیے کہا تا کہ باطل اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرے۔ اسی طرح حق، باطل کو جب اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کی مہلت دیتا ہے اور باطل اس مہلت میں اچھل کود کرتا ہے تو چشم ظاہر بین انجام کا انتظار کیے بغیر اس کو باطل کی کامیابی تصور کرتی ہے۔

یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ: چنانچہ باطل نے اپنی کاذب طاقت کا مظاہرہ کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں آیا کہ ان کی لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں جب کہ حقیقت میں ان لاٹھیوں اور رسیوں میں روح نہیں آئی تھی لیکن جادو کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ایک غیر واقع چیز کو واقع دکھایا جائے۔

چنانچہ سورۃ الاعراف: ۱۱۶ میں فرمایا:

سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ .... لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا۔

اور اسی سورہ کی آیت ۱۱۷ میں فرمایا:

فَاِذَا ہِیَ تَلۡقَفُ مَا یَاۡفِکُوۡنَ۔ یکایک ان کے خود ساختہ جادو کو نگلنا شروع کیا۔

اہم نکات

۱۔ اہل حق کو باطل کی وقتی اُچھل کود سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی ﴿۶۷﴾

۶۷۔ پس موسیٰ نے اپنے اندر خوف محسوس کیا۔

تشریح کلمات

فَاَوۡجَسَ: (و ج س) الایجاس دل میں کوئی بات محسوس کرنا۔

تفسیر آیات

مروی ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَمْ يُوجِسْ مُوسَى (ع) خِيفَةً عَلَى نَفْسِهِ اَشْفَقَ مِنْ غَلَبَةِ الْجُهَّالِ وَ دُوَلِ الضَّلَالِ ....[1]

حضرت موسیٰ (ع) نے اپنی جان کے لیے خوف کا احساس کبھی نہیں کیا بلکہ جاہلوں کے غلبہ اور گمراہی کے تسلط کا ڈر تھا۔

قُلۡنَا لَا تَخَفۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰى ﴿۶۸﴾ وَ اَلۡقِ مَا فِىۡ يَمِيۡنِكَ تَلۡقَفۡ مَا صَنَعُوۡا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوۡا كَيۡدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفۡلِحُ السَّاحِرُ حَيۡثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾

۶۸۔ ہم نے کہا: خوف نہ کر یقیناً آپ ہی غالب آنے والے ہیں۔

۶۹۔ اور جو کچھ آپ کے دائیں ہاتھ میں ہے اسے پھینک دیں کہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے یہ ان سب کو نگل جائے گا، یہ لوگ جو کچھ بنا لائے ہیں وہ فقط جادوگر کا فریب ہے اور جادوگر جہاں بھی ہو کامیاب نہیں ہو سکتا۔

تفسیر آیات

لَا تَخَفۡ: ڈرو نہیں۔ یہ نہی تسکین و تقویت کے لیے ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں خوف اپنی ذات کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ خوف حق کے خلاف جاہلوں کے غلبہ کا تھا۔ اس لیے لَا تَخَفۡ کی نہی میں کوئی خفت کا پہلو نہیں ہے۔

اِنَّكَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰى: آپ ہی غالب آنے والے ہیں۔ اس بات کی یقین دہانی ہو گئی جس کے بارے میں خوف تھا۔

تَلۡقَفۡ مَا صَنَعُوۡا: اس موضوع پر گفتگو سورۃ الاعراف آیت ۱۱۷ میں ہو گئی۔

فَاُلۡقِىَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوۡنَ وَ مُوۡسٰى ﴿۷۰﴾

۷۰۔ پھر جادوگر سجدے میں گر پڑے اور کہنے لگے: ہم ہارون اور موسیٰ کے پروردگار پر ایمان لے آئے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ اعراف آیت ۱۲۱۔۱۲۲

قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَہٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ ؕ اِنَّہٗ لَکَبِیۡرُکُمُ الَّذِیۡ عَلَّمَکُمُ السِّحۡرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ وَ اَرۡجُلَکُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّکُمۡ فِیۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ ۫ وَ لَتَعۡلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبۡقٰی ﴿۷۱﴾

۷۱۔ فرعون بولا: تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں، یہ یقیناً تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا اب میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کٹوا دوں گا اور کھجور کے تنوں پر تمہیں یقیناً سولی چڑھوا دوں گا پھر تمہیں ضرور معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے سخت اور دیرپا عذاب دینے والا کون ہے۔

تفسیر آیات

قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ: "میری اجازت سے پہلے" کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ اجازت کے بعد ایمان لانے میں کوئی حرج نہ تھا۔ ممکن ہے مطلب یہ ہے کہ میرا موقف سننے سے پہلے۔ چنانچہ وہ اپنا موقف بتا دیتا ہے کہ یہ کہ تمہاری اور موسیٰ کی ملی بھگت ہے بلکہ موسیٰ تمہارا استاد ہے۔ جس سے تم نے جادو سیکھ لیا ہے۔

یہ ایک نعرہ تھا جس سے رائے عامہ کو اپنے خلاف اور موسیٰ علیہ السلام کے حق میں جانے سے روکنا چاہتا تھا ورنہ سبھی کو معلوم تھا کہ یہ جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شاگرد نہیں ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہو سکتی ہے: مصری عوام کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ فرعون کی اجازت کے بغیر کوئی فیصلہ کرے اور ساحروں کا فیصلہ پہلا واقعہ تھا جو فرعون کی اجازت کے بغیر رونما ہوا۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ: موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے اور ہمارا آبائی مذہب چھوڑنے کی سزا یہ ہے کہ پہلے تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹے جائیں گے۔ یعنی پہلے دائیں طرف سے ہاتھ، بائیں جانب سے پاؤں پھر بائیں طرف سے ہاتھ، دائیں طرف سے پاؤں کاٹیں گے۔ من خلاف کا فرعونی طریقۂ عذاب یہ ہے۔ جب کہ اسلامی قانون مجازات میں بھی من خلاف ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا ہے جو اللہ اور رسولؐ کے ساتھ جنگ اور فساد فی الارض کرنے والوں کے لیے ہے۔ اسلامی سزا یہ ہے کہ ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹا جائے۔ یعنی ایک ہاتھ، ایک پاؤں۔ فرعونی سزا میں دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹے جاتے تھے۔ اس کے بعد سولی چڑھاتے تھے۔

اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبۡقٰی: فرعون کہتا ہے: اس قسم کا شدید ترین عذاب دینے کے بعد پتہ چلے گا کہ موسیٰ کے رب کا عذاب شدید ہے یا میرا۔ موسیٰ علیہ السلام کے دین کو زیادہ دوام و بقا حاصل ہے یا میرے دین کو۔

قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیۡ فَطَرَنَا فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقۡضِیۡ ہٰذِہِ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿ؕ۷۲﴾

۷۲۔ جادوگروں نے کہا: جو دلائل ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں ان پر اور جس نے ہمیں خلق کیا ہے اس پر ہم تجھے مقدم نہیں رکھیں گے لہٰذا اب تو نے جو فیصلہ کرنا ہے کر ڈال، تو بس اس دنیا کی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

تفسیر آیات

جن کے قلب و وجدان پر مفادات کے پردے پڑے ہوئے تھے اور فرعون کی طاغوتی کی قسم کھا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو زیر کرنے کی باتیں کرتے تھے آج حقائق سے پردہ اٹھ جانے کے بعد یہی لوگ فرعون کی طاغوتیت کو اعتنا میں نہیں لا رہے ہیں اور نہایت دلیری سے کہہ رہے ہیں:

فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ: جو فیصلہ کرنا ہے کر ڈال۔

اِنَّمَا تَقۡضِیۡ ہٰذِہِ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا: تو صرف اس دنیا کی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ یقین کی منزل پر آنے کے بعد دنیا کی زندگی حقیر نظر آنے لگتی ہے اور دائمی زندگی پر نظر مرکوز ہو جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ دلیل کی طاقت ہر طاقت سے بڑی ہے۔

اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغۡفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَاۤ اَکۡرَہۡتَنَا عَلَیۡہِ مِنَ السِّحۡرِ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی ﴿۷۳﴾

۷۳۔ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور جس جادوگری پر تم نے ہمیں مجبور کیا تھا اسے بھی معاف کر دے اور اللہ سب سے بہتر اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے۔

اِنَّہٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّہٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَہَنَّمَ ؕ لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَ لَا یَحۡیٰی ﴿۷۴﴾

۷۴۔ بے شک جو مجرم بن کر اپنے رب کے پاس آئے گا اس کے لیے یقیناً جہنم ہے جس میں وہ نہ مرے گا اور نہ جیے گا۔

وَ مَنۡ یَّاۡتِہٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِکَ لَہُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰی ﴿ۙ۷۵﴾

۷۵۔ اور جو مومن بن کر اس کے پاس حاضر ہو گا جب کہ وہ نیک اعمال بھی بجا لا چکا ہو تو ایسے لوگوں کے لیے بلند درجات ہیں۔

جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَکّٰی ﴿۷۶﴾

۷۶۔دائمی باغات جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی پاکیزہ رہنے والے کی جزا ہے۔

تفسیر آیات

ایمان و یقین کی منزل پر فائز ہونے کے بعد جن الٰہی قدروں کا ان ساحروں نے اعلان کیا ہے وہ نہایت قابل توجہ ہیں۔

۱۔ ایمان کے دائرے میں داخل ہونے پر گزشتہ کفر کی حالت کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں: اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغۡفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا ....

۲۔ فرعون نے ان ساحروں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے مجبور کیا تھا۔ ممکن ہے یہ جبر اس وقت عمل میں آیا ہو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا موعظہ سننے کے بعد فرعونیوں میں اختلاف ہو گیا تھا: وَ مَاۤ اَکۡرَہۡتَنَا عَلَیۡہِ مِنَ السِّحۡرِ ....

۳۔ یقین کی منزل پر فائز ہونے پر یہ بات ان کے لیے واضح ہو گئی کہ فرعون کے مقابلے میں جو اللہ کے پاس ہے وہ ابدی اور دائمی ہے: وَ اللّٰہُ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی۔

۴۔ جو مجرم بن کر اپنے رب کی بارگاہ میں پہنچے گا اسے زندگی کی لذت ملے گی نہ موت کی راحت۔

۵۔ ایمان کے ساتھ عمل صالح ہو تو نجات ہے: مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ ....

۶۔ جنت عدن کی زندگی دائمی اور ابدی ہے: خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ....

اہم نکات

۱۔ ایمان و یقین کی منزل پر آنے کے بعد حقائق کے وسیع صفحات کھل جاتے ہیں۔

وَ لَقَدۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی ۬ۙ اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ فَاضۡرِبۡ لَہُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَکًا وَّ لَا تَخۡشٰی ﴿۷۷﴾

۷۷۔اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو لے کر رات کے وقت چل پڑیں پھر ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنا دیں، آپ کو (فرعون کی طرف سے) نہ پکڑے جانے کا خطرہ ہو گا اور نہ ہی (غرق کا) خوف۔

تشریح کلمات

یَبَسًا: (ی ب س) یبس خشک ہو جانے کے معنوں میں ہے۔ یبَس بفتح باء پانی ہو پھر خشک ہو

جائے۔

درك (د ر ك) العین میں آیا ہے: الحق من التبعة۔ پیروی کرنے پر ملحق ہونے کو کہتے ہیں۔
لسان العرب میں آیا ہے: الدرك اللحاق الدرك کے معنی ملحق ہونے کے ہیں۔

تفسیر آیات

ساحروں کے واقعہ کے بعد سے لے کر مصر سے خروج کے وقت تک کے اہم واقعات سورۃ الاعراف میں بیان ہوئے ہیں۔

بنی اسرائیل اور واقعہ سحر کے بعد ایمان لانے والوں کو فرعون کے ظلم و بربریت سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ ایک مقررہ رات کو مصر سے نکل پڑیں۔

عبادی: اسرائیلی و غیر اسرائیلی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔

فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ طَرِيۡقًا فِى الۡبَحۡرِ يَبَسًا: اس کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو البقرۃ آیت ۵۰۔

فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ بِجُنُوۡدِهٖ فَغَشِيَهُمۡ مِّنَ الۡيَمِّ مَا غَشِيَهُمۡ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرۡعَوۡنُ قَوۡمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

۷۸۔ پھر فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور پھر سمندر ان پر ایسا چھایا کہ جس طرح چھا جانا چاہیے تھا۔

۷۹۔ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا اور ہدایت کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

تفسیر آیات

جس دریا کو بنی اسرائیل نے فلسطین جانے کے لیے عبور کیا اور فرعون جس میں غرق ہوا وہ دریائے نیل نہیں ہو سکتا کیونکہ دریائے نیل جہاں سے اسرائیلیوں نے سفر شروع کیا وہاں سے مغرب کی طرف واقع تھا جب کہ بنی اسرائیل فلسطین کی طرف مشرق میں سفر کر رہے تھے بلکہ اس دریا سے مراد بحر احمر ہی ہو سکتا ہے جسے عبور کر کے وہ صحرائے سینا پہنچ گئے تھے۔

يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ قَدۡ اَنۡجَيۡنٰكُمۡ مِّنۡ عَدُوِّكُمۡ وَوٰعَدۡنٰكُمۡ جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنَ وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰى ﴿۸۰﴾

۸۰۔ اے بنی اسرائیل! تمہارے دشمن سے یقیناً ہم نے تمہیں نجات دی اور تمہیں طور کی دائیں جانب وعدہ دیا اور ہم نے تم پر من و سلویٰ نازل کیا۔

تفسیر آیات

طور، ایمن اور من و سلویٰ کے بارے میں سورۃ البقرۃ میں تشریح گزر گئی ہے۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾

۸۱۔ جو پاکیزہ رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور اس میں سرکشی نہ کرو ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا بتحقیق وہ ہلاک ہو گیا۔

تشریح کلمات

هَوٰى: اوپر سے نیچے گرنا۔ خواہشات کو بھی هَوٰى کہتے ہیں چونکہ یہ بھی انسان کو اپنی منزلت سے گرا دیتی ہیں۔

تفسیر آیات

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ: رزق حلال ہی طیب و پاکیزہ ہے۔ اس کے کھانے میں کوئی مضایقہ نہیں بلکہ حکم ہے۔ کلوا کھاؤ میں جائز مصرف ہے اور کبھی کھانا واجب ہو جاتا ہے، جب زندگی بچنا کھانے پر موقوف ہو۔

وَلَا تَطْغَوْا: البتہ حد سے تجاوز کرنے کی صورت میں یہ غضب الٰہی کا باعث بن جاتا ہے۔ حد سے تجاوز کے ضمن میں ان نعمتوں کو گناہ کے ارتکاب کے لیے ذریعہ بنانا ہے۔ کم سے کم تجاوز پرخوری اور اسراف ہے اور غضب الٰہی کے مصداق میں بھی کم سے کم غضب، پرخوری کے صحت پر پڑنے والے برے اثرات ہیں۔

اہم نکات

۱۔ رزق کے استعمال میں طغیان باعث غضب الٰہی ہے۔

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٨٢﴾

۸۲۔ البتہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل انجام دے پھر راہ راست پر چلے تو میں اسے خوب بخشنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

شرک سے توبہ کرے، اللہ و رسولؐ پر ایمان لائے، پھر عمل صالح کے ساتھ ہدایت پر قائم رہے تو اللہ اس کے لیے غفار ہے۔

غفار: بہت زیادہ معاف کرنے والا۔ اگر انسان سے بار بار گناہ سرزد ہوتا ہے تو اللہ ہر بار معاف فرماتا ہے۔ بندہ گناہ کرتا جاتا ہے اور اللہ معاف کرتا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہاں بندہ ظالم ہو گا وہاں اللہ غفار ہے مگر یہ بات ہر صورت اور ہر فرد کے لیے نہیں۔

ایمان و عمل صالح والوں کے لیے ہے۔ پھر راہ راست پر قائم رہنے والوں کے لیے ہے۔

دوسری آیت میں ثُمَّ اهْتَدٰى کی جگہ وَاَصْلَحُوْا آیا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ [1] | سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی، پس اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ غفار ہے لیکن بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو مغفرت الٰہی کے لیے اہل بنائے۔ چنانچہ اللہ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ہے لیکن بندے کو چاہیے اپنے آپ کو رحمت الٰہی کے لیے اہل بنائے۔

احادیث میں آیا ہے کہ ایمان و عمل صالح کے بعد اہل بیت علیہم السلام کی محبت سے انسان مغفرت الٰہی کا اہل بنتا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے۔

...ثم اهتدى قال الى ولايتنا اهل البيت۔ | توبہ، ایمان اور عمل صالح کے بعد جس ہدایت کا ذکر ہے وہ ہم اہل بیت کی محبت ہے۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے پھر فرمایا:

ان اللّٰہ تعالیٰ یقول: وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى و ثم قال لعلی بن ابی طالب الی ولایتك۔ | ..."پھر ہدایت پایا" کے بارے میں علی بن ابی طالب سے فرمایا: تیری محبت کی طرف ہدایت پایا۔

اس نوع کی احادیث کے راوی درج ذیل ہیں:

i۔ علی بن ابی طالب علیہ السلام ملاحظہ ہو بحار الانوار ۳۶:

ii۔ امام زین العابدین علیہ السلام ملاحظہ ہو المناقب شهر آشوب ۴: ۱۲۹

iii۔ امام محمد باقر علیہ السلام ملاحظہ ہو شواهد التنزيل ۱: ۴۹۲

iv۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ملاحظہ ہو الکافی ۱: ۳۹۲

v۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ملاحظہ ہو شواهد التنزيل ۱: ۴۹۴

واضح رہے تفسیر میں ایک کلیہ مسلم ہے: العبرة بعموم اللفظ لابخصوص السبب۔ قرآنی آیات میں الفاظ کی عمومیت دیکھی جاتی ہے، شان نزول کا خاص سبب نہیں دیکھا جاتا۔ لہٰذا اگرچہ یہ آیت بنی

---

[1] ۳ آل عمران: ۸۹

اسرائیل کے واقعات کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے تاہم بنی اسرائیل کا واقعہ گزر چکا پھر بھی آیت کی عمومیت قیامت تک باقی رہتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ شرک سے توبہ، ایمان اور عمل صالح کے ساتھ محبت اہل بیتؑ ہے تو مغفرت الٰہی اس کے شامل حال ہو گی۔

وَمَاۤ اَعۡجَلَکَ عَنۡ قَوۡمِکَ یٰمُوۡسٰی ﴿۸۳﴾

۸۳۔ اور (فرمایا) اے موسیٰ! آپ نے اپنی قوم سے پہلے (آنے میں) جلدی کیوں کی؟

قَالَ ہُمۡ اُولَآءِ عَلٰۤی اَثَرِیۡ وَ عَجِلۡتُ اِلَیۡکَ رَبِّ لِتَرۡضٰی ﴿۸۴﴾

۸۴۔ موسیٰ نے عرض کیا: وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں اور میرے رب! میں نے تیری طرف (آنے میں) جلدی اس لیے کی کہ تو خوش ہو جائے۔

تفسیر آیات

جب حضرت موسیٰؑ کو اپنی قوم سے ستر سرداران کو منتخب کر کے کوہ طور پر حاضر ہونے کا حکم ملا تو حضرت موسیٰؑ نقبائے قوم سے پہلے کوہ طور پر پہنچ گئے۔

وَمَاۤ اَعۡجَلَکَ: عام طور پر قافلہ سالار، قافلے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ کا جواب سننے کے لیے یہ سوال فرمایا ورنہ خود اللہ بہتر جانتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جلدی کیوں کی۔

وَ عَجِلۡتُ اِلَیۡکَ رَبِّ لِتَرۡضٰی: حضرت موسیٰؑ نے جواب میں عرض کیا: یہ عجلت، جلدی تیری رضاجوئی کے لیے تھی۔ تجھ سے مناجات کی حلاوت، راز و نیاز کے کیف و سرور اور تیری قربت کی چاشنی نے مجھے عجلت کرنے پر مجبور کیا۔

حضرت موسیٰؑ اس سے پہلے بھی کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے مناجات اور راز و نیاز کی لذت سے آشنا ہو چکے تھے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ نَادَیۡنٰہُ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ الۡاَیۡمَنِ وَ قَرَّبۡنٰہُ نَجِیًّا ۔[۱]

اور ہم نے انہیں طور کی داہنی جانب سے پکارا اور رازدار بنانے کے لیے انہیں قربت عطا کی۔

اسی جگہ نبوت ملی، قربت ملی، حرم الٰہی کی رازداری کے کیف و سرور کی لذت ملی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی موسیٰؑ کی اس عجلت کی وجہ سے مدت مناجات بڑھا کر تیس سے چالیس رات کر دی۔ لہٰذا اس جگہ کی طرف دوبارہ آتے

---

[۱] ۱۹ مریم: ۵۲

ہوئے عجلت سے کام لینا ایک اجتہادی عمل نہ تھا۔ جس کا کوئی سابقہ نہ ہو، جس پر کوئی دلیل نہ ہو، وہاں غیر انبیاء کے لیے اجتہاد کی نوبت آتی ہے۔ لہٰذا غیر شیعہ مفسرین کا یہ کہنا تعجب کا مقام ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اجتہاد سے یہ خیال کیا کہ وعدہ گاہ پر حاضری میں پیش قدمی کرنا اور زیادہ خوشنودی کا سبب ہوگا۔[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد در مقابل نص کو میدان دینے کے لیے اجتہاد در مقابل نص کر رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ عاشقان خدا کے لیے رضائے رب میں تاخیر قابل تحمل نہیں ہوتی: لِتَرۡضٰی....

قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَکَ مِنۡۢ بَعۡدِکَ وَ اَضَلَّہُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ فرمایا: پس آپ کے بعد آپ کی قوم کو ہم نے آزمائش میں ڈالا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن گزارنے کے بعد خبر دی کہ آپ کی قوم آزمائش میں آکر گمراہ ہوگئی ہے۔

فَتَنَّا قَوۡمَکَ: اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے ایمان کا امتحان لیا جائے تا کہ لوگوں کے ایمان کی حقیقت عملاً ظاہر ہو جائے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

ان الناس عبید الدنیا والدین لعق علی السنتھم یحوطونه مادرت معایشھم فاذا محصوا بالبلاء قل الدیانون۔[2]

لوگ دنیا پرست ہوتے ہیں۔ دین صرف ان کی زبانوں پر ایک چکھائی سے زیادہ نہیں ہے۔ جب (دین کے ساتھ) ان کی معیشت چلتی ہے اس وقت دین کو اپنا لیتے ہیں اور جب آزمائش کے ذریعہ چھانٹی ہو جائے تو دیندار تھوڑے رہ جاتے ہیں۔

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے معجزات دکھائے۔ فرعون کے ظلم و ستم سے نجات دی اور اس کے بعد ایک مختصر عرصے کے لیے امتحان میں بٹھا دیا۔

وَ اَضَلَّہُمُ السَّامِرِیُّ: سامری نے گوسالہ پرستی کے ذریعے ان کو گمراہی میں ڈال دیا۔

سامری کون ہے؟: سامری ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ کسی مقام، نسل یا قبیلے کی طرف نسبت ہے۔ سامری یعنی سمر والا۔

i۔ بعض اہل تحقیق کے مطابق قدیم مصری زبان میں غیر ملکی، پردیسی کو سمر کہتے تھے۔ ممکن ہے

---

[1] دریابادی: ۶۴۷ بحوالہ (مدارک)　[2] تحف العقول ص ۲۴۵

کوئی اجنبی بنی اسرائیل کے ساتھ ہو گیا ہو۔ چنانچہ بعض یہودی روایات میں آیا ہے کہ یہ شخص مصری تھا جو بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکل آیا تھا۔

ii۔ سمیری نام کی ایک قوم عراق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور میں آباد تھی۔ ممکن ہے کوئی شخص اس قوم سے متعلق مصر میں آباد تھا جو بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکل آیا ہو۔

iii۔ بائیبل میں آیا ہے کہ اسرائیل کے ایک فرمانروا نے ایک شخص سے ایک پہاڑ خریدا جس پر اس نے بعد میں دار الامارت تعمیر کیا۔ جس شخص سے یہ جگہ خریدی تھی اس کا نام سمر تھا۔ اسی لیے بعد میں اس شہر کا نام ''سامریہ'' رکھا گیا۔ (سلاطین ۱۶۔۴۲)

iv۔ سامری سے مراد ہو سکتا ہے سامری العقیدہ ہو۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گوسالہ پرست کو سامری نہیں کہتے تھے تاہم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کئی صدیوں بعد ایک نسل پیدا ہو گئی تھی جو گوسالہ پرستی میں شہرت رکھتی تھی۔ اس گوسالہ پرست قوم کو سامری کہتے تھے۔ قرآن نے گوسالہ پرست شخص کے لیے وہی نام دیا ہو جو نزول قرآن کے وقت یہودیوں میں رائج تھا۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ نام رائج نہ تھا۔

v۔ صاحب تفسیر من ھدی القرآن لکھتے ہیں:

> سامری سمرون کی اولاد میں سے تھا اور اس کے باپ کا نام یشاکر تھا جو یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔

ان سب میں زیادہ قابل اطمینان تحقیق علامہ بلاغی کی ہے۔ آپ الھدی الی دین المصطفیٰ ۱:۱۰۳ میں لکھتے ہیں:

> جس سامری کا قرآن میں ذکر ہے وہ شہر السامرۃ کی طرف منسوب نہیں ہے بلکہ یہ شہر شمرون کی طرف منسوب ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت شمعون علیہما السلام کے زمانے میں آباد تھا۔ اس شہر کی طرف منسوب کو شمرونی کہتے ہیں۔ اس کا عربی تلفظ سامری ہے۔ اس کی جمع شمرونیم ہے۔ سامریین۔ اسے یوشع نے فتح کر کے (زبولون) خاندان کی زیر نگیں کر دیا ملاحظہ ہو: سفر یشوع۔ صحاح ۱۱۔ واضح رہے عبری زبان کی شین عربی میں سین میں بدل جاتی ہے۔ جیسے یشوع، یسوع میں اور موشیٰ، موسیٰ میں بدل جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں شمرونی، سامری میں بدل گیا ہے۔

لہٰذا ان تمام وجوہات کی بنا پر مستشرقین کا یہ اعتراض بے بنیاد ہے:

سامری کے نام سے شہرت پانے والی قوم حضرت موسیٰ سے صدیوں بعد وجود میں آئی

ہے۔ قرآن کے مصنف نے لاعلمی میں اس کو حضرت موسیٰ کا معاصر بتا دیا۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء کی محنتوں پر پانی پھیرنے والے سامری ہر جگہ ہوتے ہیں۔

فَرَجَعَ مُوۡسٰۤی اِلٰی قَوۡمِہٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۬ۚ قَالَ یٰقَوۡمِ اَلَمۡ یَعِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَیۡکُمُ الۡعَہۡدُ اَمۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ یَّحِلَّ عَلَیۡکُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ فَاَخۡلَفۡتُمۡ مَّوۡعِدِیۡ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ چنانچہ موسیٰ غصے اور حزن کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹے، بولے: اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا مدت تمہارے لیے لمبی ہو گئی تھی؟ یا تم نے یہ سوچا کہ تمہارے رب کا غصہ تم پر آ کر رہے؟ اسی لیے تم نے میرے ساتھ وعدہ خلافی کی؟

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب چالیس راتوں میں توریت حاصل کی تو اللہ نے یہ خبر دی کہ آپؑ کی قوم سامری کے ہاتھوں گمراہ ہوگئی ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام گمراہ کرنے والوں پر غصے اور گمراہ ہونے والوں پر حزن و ملال غَضۡبَانَ اَسِفًا کی حالت میں واپس آگئے۔

اَلَمۡ یَعِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: کیا تمہارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ یہ وعدۂ حسن توریت کی شکل میں ایک دستور حیات تھا جس میں بنی اسرائیل کے لیے دنیا اور دین کی سعادتیں موجود تھیں یا بنی اسرائیل کو زمین کا وارث بنانے کا وعدہ تھا۔

اَفَطَالَ عَلَیۡکُمُ الۡعَہۡدُ: کیا اتنی مدت گزر گئی تھی کہ تم میری واپسی سے مایوس ہوگئے ہو۔ صرف چالیس راتوں کی مدت میں دین سے کلی انحراف؟ یہ تو غضب الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

فَاَخۡلَفۡتُمۡ مَّوۡعِدِیۡ: بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کی غیر حاضری کے دنوں کے لیے جو وعدہ کیا تھا، وہ وعدہ ان کے جانشین حضرت ہارون علیہ السلام کی اطاعت تھی۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد مفاد پرست لوگ نبی کے عہد پر باقی نہیں رہنے دیتے۔

قَالُوۡا مَاۤ اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَکَ

۸۷۔ انہوں نے کہا: ہم نے آپ سے وعدہ خلافی

بِمَلۡکِنَا وَ لٰکِنَّا حُمِّلۡنَاۤ اَوۡزَارًا مِّنۡ زِیۡنَۃِ الۡقَوۡمِ فَقَذَفۡنٰہَا فَکَذٰلِکَ اَلۡقَی السَّامِرِیُّ ﴿۸۷﴾

اپنے اختیار سے نہیں کی بلکہ ہوا یہ کہ ہم پر قوم کے زیورات کا بوجھ لادا گیا تھا تو ہم نے اسے پھینک دیا اور سامری نے بھی اس طرح ڈال دیا۔

فَاَخۡرَجَ لَہُمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّہٗ خُوَارٌ فَقَالُوۡا ہٰذَاۤ اِلٰـہُکُمۡ وَ اِلٰہُ مُوۡسٰی ۬ۙ فَنَسِیَ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ اور ان کے لیے ایک بچھڑے کا قالب بنا کر نکالا جس میں گائے کی سی آواز تھی پھر وہ بولے: یہ ہے تمہارا معبود اور موسیٰ کا معبود پھر وہ بھول گیا۔

اَفَلَا یَرَوۡنَ اَلَّا یَرۡجِعُ اِلَیۡہِمۡ قَوۡلًا ۬ۙ وَّ لَا یَمۡلِکُ لَہُمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا ﴿۸۹﴾

۸۹۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ (بچھڑا) ان کی کسی بات کا جواب تک نہیں دے سکتا اور وہ نہ ان کے کسی نفع اور نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

بِمَلۡکِنَا: (م ل ک) ملك اختیار کے معنوں میں ہے۔

جَسَدًا: (ج س د) اس ڈھانچے کو کہتے ہیں جس میں جان نہ ہو۔

خُوَارٌ: (خ و ر) یہ لفظ گائے بیل کی آواز کے ساتھ مختص ہے۔

تفسیر آیات

بنی اسرائیل کا جواب یہ تھا: ہم نے یہ جرم اپنے اختیار سے نہیں کیا۔ ہم نے قصداً گوسالہ نہیں بنایا۔ ہم نے تو صرف اپنے زیورات کو جمع کرایا تھا جسے سامری نے بھٹے میں ڈال دیا۔

آیت میں لوگوں کے عمل کو قذف اور سامری کے عمل کو اَلۡقَی کہا ہے۔

قذف دور پھینکنے کے معنوں میں ہے اور اَلۡقَی ڈالنے کے معنوں میں ہے۔ اس سے ایک یہ عندیہ ملتا ہے کہ لوگوں کے عمل اور سامری کے عمل میں فرق تھا۔ لوگوں نے نہ معلوم کس غرض سے زیوارت پھینکے تھے بہر حال گوسالہ بنانے کا قصد نہیں تھا۔ مگر سامری کا قصد تھا۔

حُمِّلۡنَاۤ اَوۡزَارًا مِّنۡ زِیۡنَۃِ الۡقَوۡمِ: قوم سے مراد مصری قوم لی جاتی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے نکلتے ہوئے اپنے پڑوسیوں سے زیوارت مانگے اور اپنے ساتھ کافی زیورات لوٹ کر لائے تھے۔ بائیبل کے مطابق ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو بائیبل باب ۳ آیت ۱۴۔۲۲

فَاَخۡرَجَ لَہُمۡ عِجۡلًا: پھر ان کے لیے گوسالہ کا قالب بنا کر نکالا۔ اَخۡرَجَ لَہُمۡ۔ کس چیز سے

نکلا ہو گا کوئی صراحت نہیں ہے۔ ممکن ہے قالب سے یا بٹھے سے گوسالہ کی شکل میں نکالا ہو۔

لَّهٗ خُوَارٌ: اس کی بیل کی سی آواز تھی۔ اس بچھڑے کی مورت کو دیکھ کر لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا: هٰذَاۤ اِلٰـهُكُمۡ وَ اِلٰهُ مُوۡسٰى یہ ہے تمہارا اور موسیٰ کا معبود۔ جب سوال پیدا ہوا کہ اگر یہ موسیٰ کا معبود ہے تو موسیٰ کوہ طور پر کس معبود کے پیچھے گئے ہیں؟ جواب دیا گیا: فَنَسِیَ وہ بھول گئے ہیں کہ اصل معبود کہاں ہے۔

اسباب ہدایت و اسباب ضلالت میں تقابل: بنی اسرائیل نے ایک عرصہ حضرت موسیٰ کی تعلیم اور معجزات کے ساتھ گزارا:

i۔ توحید کی تعلیم دی اور عبادت کا عملی نمونہ پیش کیا۔

ii۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں گوسالہ پرستی یا بت پرستی کی نفی موجود تھی۔

iii۔ حضرت ہارون علیہ السلام جیسے حجت خدا ان کے درمیان موجود تھے۔

iv۔ نو کی تعداد میں عظیم معجزات دکھائے گئے تھے۔

ایک خُوَارٌ نو معجزات: لیکن یہ تمام تعلیمات، تربیت اور معجزات ایک بیل کی آواز کے مقابلے میں غیر موثر ثابت ہو گئے۔

یہ بات ہمیشہ قابل توجہ و تعجب ہے کہ ایک طرف انبیاء، اوصیاء، صلحاء، علماء کی تعلیمات، صدیوں کی تربیت، بے شمار دلائل۔ دوسری طرف ایک بیل کی آواز یا اس سے بھی کمتر چیز پر لوگ فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

وکم سمعنا خواراً فی عصرنا ضد الثوابت الدینیة فی مسئلة التوحید و نفی الشرك۔

اہم نکات

۱۔ ہدایت کی طرف لانے کا کام کس قدر مشکل اور گمراہی کی طرف جانے کے لیے ایک خفیف سا واہمہ کافی ہے۔

وَ لَقَدۡ قَالَ لَهُمۡ هٰرُوۡنُ مِنۡ قَبۡلُ يٰقَوۡمِ اِنَّمَا فُتِنۡتُمۡ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحۡمٰنُ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ وَ اَطِيۡعُوۡۤا اَمۡرِیۡ ﴿۹۰﴾

۹۰۔ اور ہارون نے ان سے پہلے کہدیا تھا: اے میری قوم! بے شک تم اس کی وجہ سے آزمائش میں پڑ گئے ہو جب کہ تمہارا پروردگار تو رحمٰن ہے لہٰذا تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو۔

تفسیر آیات

حضرت ہارون علیہ السلام نے اصل سازش سے پردہ اٹھایا اور فرمایا: اِنَّمَا فُتِنۡتُمۡ بِهٖ اس گوسالہ سے تمہاری آزمائش ہو رہی ہے۔

اِنَّ رَبَّکُمُ الرَّحۡمٰنُ: تمہارا رب تو رحمٰن ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بنی اسرائیل نے گوسالہ کو رحمٰن کی جگہ دی تھی۔

بائیبل کے نزدیک گوسالہ پرستی کا جرم حضرت ہارون علیہ السلام سے سرزد ہوا تھا۔ قرآن نے بائیبل کے اس الزام کو رد کر کے حضرت ہارون علیہ السلام کو اس ناکردہ گناہ سے بری الذمہ قرار دیا۔

لیکن آج بھی مستشرقین کو یہ اصرار ہے کہ گوسالہ پرستی جیسے مشرکانہ جرم کا ارتکاب ہارون علیہ السلام ہی نے کیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ ہر انحراف کے وقت اللہ کی طرف سے ایک حجت قائم ہوتی ہے۔

قَالُوۡا لَنۡ نَّبۡرَحَ عَلَیۡہِ عٰکِفِیۡنَ حَتّٰی یَرۡجِعَ اِلَیۡنَا مُوۡسٰی ﴿۹۱﴾

۹۱۔ وہ کہنے لگے: ہم موسیٰ کے ہمارے پاس واپس آنے تک برابر اسی کی پرستش میں منہمک رہیں گے۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی کی نصیحت کو ٹھکرا دیا۔ البتہ فیصلے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک انتظار کا بھی اظہار ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر وقت کے رسول واپس نہ آتے تو ساری امت گوسالہ پرست ہو جاتی اور اجماع امت کو اس پر دلیل کے طور پر پیش کرتے۔

اہم نکات

۱۔ ہر سامری کا حمایتی ہر ہارون کی بات کو ٹھکرا دیتا ہے۔

قَالَ یٰہٰرُوۡنُ مَا مَنَعَکَ اِذۡ رَاَیۡتَہُمۡ ضَلُّوۡۤا ﴿۹۲﴾

اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیۡتَ اَمۡرِیۡ ﴿۹۳﴾

۹۲۔ موسیٰ نے کہا: اے ہارون! جب آپ دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ گمراہ ہو رہے ہیں۔

۹۳۔ تو میری پیروی کرنے سے آپ کو کس چیز نے روکا؟ کیا آپ نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر سے واپس آ گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام کی ملامت کی اور قوم کی گمراہی کا انہی کو ذمے دار ٹھہرایا چونکہ جاتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ نصیحت کر گئے تھے:

وَاَصۡلِحۡ وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِیۡلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ۝[۱] اور اصلاح کرتے رہنا اور مفسدوں کا راستہ اختیار نہ کرنا۔

۱؎ اعراف: ۱۴۲

قَالَ یَبۡنَؤُمَّ لَا تَاۡخُذۡ بِلِحۡیَتِیۡ وَ لَا بِرَاۡسِیۡ ۚ اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَ لَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِیۡ ﴿۹۴﴾

۹۴۔ ہارون نے جواب دیا: اے ماں جائے! میری داڑھی اور سر کے بال نہ پکڑیں، مجھے تو اس بات کا خوف تھا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا انتظار نہ کیا۔

تفسیر آیات

معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ نے ہارون علیہما السلام کے سر اور داڑھی سے پکڑ کر مارنا چاہا۔ چنانچہ سورہ اعراف میں آیا ہے:

اَخَذَ بِرَاۡسِ اَخِیۡهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیۡهِ ...[1]		اور اپنے بھائی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا...

ہارون علیہ السلام نے جواب میں کہا: مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈالا اور میری بات کا انتظار نہ کیا۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے توحید پر اتحاد کو مقدم کیا جب کہ توحید کو کسی اور چیز پر قربان نہیں کیا جاتا۔

جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے شرک کے مقابلے میں سکوت اختیار کیا ہو۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے شرک کے خلاف اس حد تک قیام کیا کہ انہیں اپنے قتل کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ چنانچہ سورہ اعراف: ۱۵۰ میں آیا ہے:

قَالَ ابۡنَ اُمَّ اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِیۡ وَ کَادُوۡا یَقۡتُلُوۡنَنِیۡ ...		اے ماں جائے! یقیناً قوم نے مجھے کمزور بنا دیا تھا اور وہ مجھے قتل کرنے والے تھے...

جب نوبت مقاتلہ تک پہنچی تو حضرت ہارون علیہ السلام نے دیکھا کہ اگر اس قوم میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو دھڑے بندی اس حد تک آگے بڑھ جائے گی کہ بعد میں واپسی ممکن نہ ہو گی۔ اس عذر کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبول کیا اور اپنے بھائی کے لیے دعا کی۔

اہم نکات

۱۔ داعی حق کو چاہیے کہ حجت پوری کرنے کے بعد انتظار کرے۔

قَالَ فَمَا خَطۡبُکَ یٰسَامِرِیُّ ﴿۹۵﴾

۹۵۔ کہا: اے سامری! تیرا مدعا کیا ہے؟

---

[1] ۷ اعراف: ۱۵۰

قَالَ بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ یَبۡصُرُوۡا بِہٖ فَقَبَضۡتُ قَبۡضَۃً مِّنۡ اَثَرِ الرَّسُوۡلِ فَنَبَذۡتُہَا وَ کَذٰلِکَ سَوَّلَتۡ لِیۡ نَفۡسِیۡ ﴿۹۶﴾

۹۶۔ اس نے کہا: میں نے ایسی چیز کا مشاہدہ کیا جس کا دوسروں نے مشاہدہ نہیں کیا پس میں نے فرستادہ خدا کے نقش قدم سے ایک مٹھی (بھر خاک) اٹھالی پھر میں نے اسے (بچھڑے کے قالب میں) ڈال دیا اور میرے نفس نے یہ بات میرے لیے بھلی بنا دی۔

تفسیر آیات

قدیم مفسرین اس آیت کی مختلف تفسیریں کرتے ہیں:

پہلی تفسیر ایک روایت کی بنا پر کرتے ہیں: سامری نے جبرئیل کے گھوڑے کو فرعون کے گھوڑے کے آگے چلتے دیکھ لیا تھا تاکہ وہ دریا کے شق شدہ راستے میں داخل ہو اور اس گھوڑے کے سم کے نیچے سے مٹی اٹھائی تھی۔ اس کا اثر یہ تھا کہ جس چیز میں وہ مٹی ڈال دے اس میں جان آ جاتی تھی۔ سامری نے اسی مٹی کو گوسالہ کے قالب میں ڈالا، اس میں جان آ گئی اور آواز نکلنی شروع ہوگئی۔

قرآنی تعبیر جَسَدًا لَّہٗ خُوَارٌ اس روایت کو رد کرتی ہے چونکہ جسد، بے جان چیز کو کہتے ہیں اور یہ آواز اسی بے جان جسد میں تھی۔

دوسری تفسیر یہ کرتے ہیں کہ سامری نے کہا: میں نے دین موسیٰ میں وہ کمزوری دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی۔ چنانچہ اس رسول کی کچھ تعلیمات کو لیا، پھر چھوڑ دیا۔

اس تفسیر کا سیاق و سباق آیت کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں بنتا چونکہ:

قبض، اخذ کے معنی میں، اثر، دین کے معنی میں اور نبذ، ترک کے معنی میں قرآنی استعمالات سے نہایت بعید ہے۔

تیسری تفسیر یہ کرتے ہیں: مجھے زرگری میں وہ مہارت حاصل تھی جو دوسروں کو نہ تھی۔ میں نے رسول کے آثار یعنی زیورات میں سے کچھ حصہ اپنے قبضے میں کیا تھا۔ اس تفسیر میں زیورات کو رسول کے آثار میں سے قرار دینا بہت زیادہ بعید از قیاس ہے۔

چوتھی تفسیر و توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ سامری نے خود یہ بات گھڑ لی تھی کہ یہ رسول کے قدموں کی مٹی کی کرامت تھی کہ اس سے گوسالہ کی آواز آ گئی۔ ہو سکتا ہے رسول سے مراد جبرئیل ہوں یا خود حضرت موسیٰ (ع) ہوں جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اس گوسالہ کی ساخت کچھ اس طرح تھی کہ اس سے ہوا کے گزرنے سے آواز نکلتی تھی۔ والعلم عند اللّٰہ۔

اہم نکات

۱۔ لوگوں نے رسول کے نمایندے کے مقابلے میں ایک شعبدہ باز کو مان لیا۔

قَالَ فَاذۡهَبۡ فَاِنَّ لَكَ فِي الۡحَيٰوةِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوۡعِدًا لَّنۡ تُخۡلَفَهٗ ۚ وَانۡظُرۡ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِىۡ ظَلۡتَ عَلَيۡهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنۡسِفَنَّهٗ فِى الۡيَمِّ نَسۡفًا ﴿۹۷﴾

۹۷۔ موسیٰ نے کہا: دور ہو جا (تیری سزا یہ ہے کہ) تجھے زندگی بھر یہ کہتے رہنا ہوگا مجھے ہاتھ نہ لگانا اور تیرے لیے ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں ہے اور تو اپنے اس معبود کو دیکھ جس (کی پوجا) میں تو منہمک تھا، ہم اسے ضرور جلا ڈالیں گے پھر اس (کی راکھ) کو اڑا کر دریا میں ضرور بکھیر دیں گے۔

تفسیر آیات

زندگی بھر اپنے اچھوت ہونے کا لوگوں میں اظہار کرتے رہو۔ نہ کسی سے تعلقات رکھ سکتے ہو، نہ کسی سے کوئی چیز لے سکتے، ہو نہ دے سکتے ہو، نہ کسی کی صحبت میں رہ سکتے ہو۔ تجھے تنہائی کی زندگی گزارنا ہوگی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ سامری کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے کوڑھ کی بیماری لاحق ہو گئی جس کی وجہ سے وہ ہر قریب آنے والے کو مطلع کرتا رہتا تھا کہ میں ناپاک ہوں، مجھے نہ چھونا۔

وَاِنَّ لَكَ مَوۡعِدًا: ایک معین وقت میں ضرور مرنا ہے۔

وَانۡظُرۡ اِلٰۤى اِلٰهِكَ: اس سے معلوم ہوا کہ سامری نے اسے اپنا معبود بنا لیا تھا۔

لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ: گوسالہ کی مورت سونا ہونے کی صورت میں جلانے کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اسے پگھلا کر ریزہ ریزہ کیا گیا ہو اور دریا میں بہا دیا گیا ہو۔

اہم نکات

۱۔ شرک کے آثار کو کسی بھی شکل میں باقی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَىۡءٍ عِلۡمًا ﴿۹۸﴾

۹۸۔ بتحقیق تمہارا معبود تو وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔

تفسیر آیات

تمہارا معبود وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ معبود وہ ہوتا ہے جو اپنی معبودیت میں یکتا ہو۔ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جب بھی کسی معبودیت میں شرکت آ جائے وہ باطل ہے۔

وَسِعَ كُلَّ شَيۡءٍ عِلۡمًا: بے جان گوسالہ معبود نہیں ہو سکتا۔ معبود وہ ہے جس کا علمی احاطہ ہر چیز پر ہو کہ کس نے کس محرک کے تحت اپنے معبود عبادت کی ہے تا کہ اسی کے مطابق اسے جزا دی جائے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ مَا قَدۡ سَبَقَ ۚ وَقَدۡ اٰتَيۡنٰكَ مِنۡ لَّدُنَّا ذِكۡرًا ﴿۹۹﴾

۹۹۔ (اے رسول) اسی طرح ہم آپ سے گزشتگان کی خبریں بیان کرتے ہیں اور ہم نے آپ کو اپنے ہاں سے ایک نصیحت عطا کی ہے۔

تفسیر آیات

گزشتہ قوموں کی سرگزشت میں آنے والی قوموں کے لیے درسہائے عبرت ہیں جن سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

مِنۡ لَّدُنَّا ذِكۡرًا: ذکر سے مراد قرآن مجید ہے اور ممکن ہے ان حوادث اور واقعات کو ذکر کہا ہو چونکہ ان میں انسان کے لیے عبرتوں، اخلاقیات اور احکام وغیرہ پر مشتمل نصائح موجود ہیں۔

مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡهُ فَاِنَّهٗ يَحۡمِلُ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وِزۡرًا ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔ جو اس سے منہ موڑے گا پس بروز قیامت وہ یقیناً ایک بوجھ اٹھائے گا۔

خٰلِدِيۡنَ فِيۡهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ حِمۡلًا ﴿۱۰۱﴾

۱۰۱۔ جس میں یہ لوگ ہمیشہ مبتلا رہیں گے اور قیامت کے دن یہ ان کے لیے بدترین بوجھ ہو گا۔

تشریح کلمات

حِمۡلًا: (ح م ل) الحمل بفتح الحاء، حاء کو زبر دے کر پڑھیں تو حمل شکم میں بوجھ اٹھانے کو کہتے ہیں۔ الحمل بکسر الحاء، حاء کو زیر دے کر پڑھیں تو پشت کے اوپر اٹھانے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

جس نے بھی اس ذکر یعنی ان عبرتوں سے منہ موڑ لیا اس نے اپنی پشت پر گناہوں کا بوجھ اٹھا

لیا۔ یہ بوجھ اس کی پشت پر ہمیشہ سوار رہے گا۔

وَ سَآءَ: جو بوجھ الی الابد پشت پر سوار رہے اس سے بدتر بوجھ کیا ہوسکتا ہے۔

یَّوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ وَ نَحۡشُرُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ یَوۡمَئِذٍ زُرۡقًا ﴿۱۰۲﴾ یَّتَخَافَتُوۡنَ بَیۡنَہُمۡ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا عَشۡرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ اِذۡ یَقُوۡلُ اَمۡثَلُہُمۡ طَرِیۡقَۃً اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا یَوۡمًا ﴿۱۰۴﴾

۱۰۲۔ اس دن صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو جمع کریں گے (خوف کے مارے) اس روز جن کی آنکھیں بے نور ہو جائیں گی۔

۱۰۳۔ (اس وقت) وہ آپس میں دھیمے کہیں گے (دنیا میں) تم صرف دس دن رہے ہو گے۔

۱۰۴۔ ہم خوب جانتے ہیں جو باتیں یہ کرتے ہیں جب ان میں سے زیادہ صائب الرائے کا یہ کہنا ہو گا کہ تم تو صرف ایک دن رہے ہو۔

تشریح کلمات

زُرۡقًا: (ز ر ق) نیلاہٹ اور نابینا کے معنوں میں ہے۔

امثل: (م ث ل) اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اقرب الی الخیر ہو۔ مثالی، نمونہ۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن تمام مخلوقات کو جمع کرنے کے لیے جو آواز دی جائے گی اس کو صور کہتے ہیں اور مجرموں کو نابینائی کی حالت میں اٹھایا جائے گا:

وَ نَحۡشُرُہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ عَلٰی وُجُوۡہِہِمۡ عُمۡیًا ...۔[1]　　ہم ان کو قیامت کے دن اوندھے منہ اندھے جمع کریں گے...

قیامت کی حقیقی اور ابدی زندگی کا معائنہ کرنے کے بعد دنیاوی عارضی زندگی کی بے مائگی سامنے آ جاتی ہے اور اس پوری زندگی کو صرف دس دن تصور کریں گے اور جو زیادہ صائب الرائے ہو گا، جسے آخرت کی ابدی زندگی کا صحیح ادراک ہو گا، وہ دنیوی زندگی کو اس کے مقابلے میں صرف ایک دن شمار کرے گا۔

آخرت کی زندگی کا بہترین ادراک کرنے والی ہستی، حضرت علی علیہ السلام سے دنیا کے بارے میں روایت ہے:

الدنیا احقر من عضو خنزیر میتۃٍ بال علیه الکلب فی ید مجزوم ۔[2]　　دنیا مردہ سور کے اس عضو سے بدتر ہے جس پر کتے نے پیشاب کیا ہو اور جزامی کے ہاتھ میں ہو۔

---

[1] ۱۷ اسراء: ۹۷　　[2] روح المعانی ذیل آیہ وَ الرُّجۡزَ فَاھۡجُرۡ (۷۴ مدثر: ۵)

اہم نکات

۱۔ آخرت کی ابدی زندگی کا جس قدر بہتر ادراک ہوگا، دنیوی زندگی حقیر تر نظر آئے گی۔

وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡجِبَالِ فَقُلۡ یَنۡسِفُہَا رَبِّیۡ نَسۡفًا ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ اور یہ لوگ ان پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، پس آپ کہد یجیے: میرا رب انہیں اڑا کر بکھیر دے گا۔

فَیَذَرُہَا قَاعًا صَفۡصَفًا ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ پھر اسے ہموار میدان بنا کر چھوڑے گا۔

لَّا تَرٰی فِیۡہَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمۡتًا ﴿۱۰۷﴾

۱۰۷۔ نہ آپ اس میں کوئی ناہمواری دیکھیں گے نہ بلندی۔

تشریح کلمات

نَسۡفًا: (ن س ف) کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے کے معنوں میں ہے۔

قَاعًا: (ق و ع) میدان۔ صفصف ہموار بے آب وگیاہ۔

امت: (ا م ت) نشیب وفراز۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن کے بارے میں سوال ہوا کہ پہاڑوں کی کیا صورت ہوگی؟ جواب میں فرمایا: پہاڑ نابود ہو جائیں گے۔ پورا کرہ ارض ایک ہموار میدان بن جائے گا۔

یَوۡمَئِذٍ یَّتَّبِعُوۡنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَہٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الۡاَصۡوَاتُ لِلرَّحۡمٰنِ فَلَا تَسۡمَعُ اِلَّا ہَمۡسًا ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔اس دن لوگ منادی کے پیچھے دوڑیں گے جس میں کوئی انحراف نہ ہوگا اور رحمٰن کے سامنے آوازیں دب جائیں گی، پس آپ آہٹ کے سوا کچھ نہ سنیں گے۔

تشریح کلمات

ھمس: (ھ م س) آہستہ آواز۔

تفسیر آیات

لوگ قیامت کے دن اللہ کی طرف سے پکارنے والے کی ایسا اتباع کریں گے جس میں کسی قسم کی کوتاہی یا انحراف نہ ہوگا (لہ کی ضمیر اتباع کی طرف ہے) چونکہ قیامت کا دن یوم حساب ہے۔صرف اللہ کا

حکم چلے گا۔ دنیا کی طرح آزاد نہیں ہیں کہ کوئی سرکشی کر سکے۔

فَلَا تَسۡمَعُ اِلَّا ہَمۡسًا: سرکشی کی تو مجال نہ ہوگی حلق سے نکلنے والی آواز کو بھی اونچی نہیں کر سکیں گے اور خوف کے مارے نہایت آہستہ بات کریں گے۔

یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا ﴿۱۰۹﴾	۱۰۹۔ اس روز شفاعت کسی کو فائدہ نہ دے گی سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور اس کی بات کو پسند کرے۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن ہر مجرم کو اپنے جرم کی سزا ملے گی۔ یہاں اللہ کی عدالت میں عدل و انصاف کے ساتھ ہونے والے فیصلوں کے سامنے کوئی رکاوٹ موجود نہ ہوگی۔ لہٰذا کسی کی شفاعت فائدہ مند نہ ہوگی۔ یہاں دو حالتوں کی استثناء ہے:

۱۔ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ: قیامت کے دن اذن خدا کے بغیر کوئی بات تک نہیں کر سکے گا کیونکہ قیامت کے دن صرف اللہ کی حاکمیت ہوگی۔ علل و اسباب کی تاثیر ختم ہو جائے گی جیسا کہ دنیا میں ہے کہ اللہ کی مرضی نہ بھی ہو گولی اور تلوار مؤمن کی گردن پر اپنا اثر جاری کر دیتی ہے۔ قیامت کے دن کے بارے میں فرمایا:

یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡئًا ؕ وَ الۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ ﴿۱۹﴾[1]	اس دن کسی کو کسی کے لیے کچھ (کرنے کا) اختیار نہیں ہوگا اور اس دن صرف اللہ کا حکم چلے گا۔

۲۔ وَ رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا: دنیا میں اللہ اس شخص کی بات کو پسند کرتا ہے جو اس کے عمل کے عین مطابق ہو اور اس کا عمل اس کے کسی قول کے خلاف نہ ہو۔

وَ ہُدُوۡۤا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الۡقَوۡلِ ...[2]	اور انہیں پاکیزہ گفتار کی طرف ہدایت دی گئی۔

یہ آخرت میں بھی اللہ کی مزاج شناس ہستیاں ہوں گی جو صرف اللہ کی مرضی کے مطابق شفاعت کریں گی۔

اہم نکات

۱۔ شفاعت کا حق اذن خدا سے عصمت کے مالک کو مل جائے گا: رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا ....

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا	۱۱۰۔ اور وہ لوگوں کے سامنے اور پیچھے کی سب باتیں

---

[1] ۸۲ انفطار: ۱۹ [2] ۲۲ حج: ۲۴

خَلۡفَہُمۡ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا ﴿۱۱۰﴾ جانتا ہے اور وہ کسی کے احاطہ علم میں نہیں آ سکتا۔

تفسیر آیات

متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کا تعلق علم سے ہے۔ اعمال عباد پر علم ہو تو شفاعت کے لیے گنجائش بنتی ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کو اللہ شفاعت کی اجازت دے، اس کی زندگی کا کوئی گوشہ اللہ سے پوشیدہ ہو اور وہ اللہ کو دھوکہ دے سکے۔

وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا: اور اللہ کسی کے احاطہ علم میں نہیں آ سکتا۔

مروی ہے کہ ابو قرہ نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے کہا: ہماری روایتوں میں ہے کہ اللہ نے انبیاء میں کلام اور دید کو تقسیم کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اللہ کا دیدار عنایت فرمایا: تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

فَمَنِ الْمُبَلِّغُ عَنِ اللّٰهِ اِلَی الثَّقَلَیْنِ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ۔ لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ [1] وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا [2] وَ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ [3] اَلَیْسَ مُحَمَّدٌ؟ قَالَ: بَلَی. قَالَ: کَیْفَ یُجِیءُ رَجُلٌ اِلَی الْخَلْقِ جَمِیعاً فَیُخْبِرُهُمْ اَنَّهُ جَاءَ مِنْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَنَّهُ یَدْعُوهُمْ اِلَی اللّٰهِ بِاَمْرِ اللّٰهِ فَیَقُولُ: لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ۔ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا. وَ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ۔ ثُمَّ یَقُولُ: اَنَا رَاَیْتُهُ بِعَیْنِی وَ اَحَطْتُ بِهِ عِلْماً وَ هُوَ عَلَی صُورَةِ الْبَشَرِ اَمَا تَسْتَحُونَ مَا قَدَرَتِ الزَّنَادِقَةُ اَنْ تَرْمِیَهُ بِهٰذَا اَنْ یَکُونَ یَاْتِی مِنْ عِنْدَ اللّٰهِ بِشَیْءٍ ثُمَّ یَاْتِی بِخِلَافِهِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ ... وَ قَدْ قَالَ اللّٰهُ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا فَاِذَا رَاَتْهُ الْاَبْصَارُ فَقَدْ اَحَاطَتْ بِهِ الْعِلْمُ ....۔ [4]

پھر جن و انس کی طرف یہ آیات پہنچانے والا کون ہے؟ نگاہیں اس کو درک نہیں کر سکتیں۔ اس پر علم کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ اس جیسا کوئی نہیں۔ کیا وہ محمدؐ نہیں ہیں؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص پوری مخلوق کی طرف آئے اور کہے وہ اللہ کی طرف سے آیا ہے اور وہ بحکم خدا اللہ کی طرف دعوت بھی دیتا ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے: نگاہیں اسے درک نہیں کر سکتیں اور اس پر علم کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ پھر کہے: میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس پر میں نے احاطۂ علم کیا۔ وہ بشر کی شکل میں ہے۔ کیا تم شرم نہیں کرتے۔ زندیق لوگ یہ الزام نہیں لگا سکے کہ وہ اللہ کی طرف سے ایک چیز لے کر آتا ہے پھر اس کے خلاف بھی پیش کرتا ہے... جب کہ اللہ نے خود کہا ہے کہ وہ احاطہ علم میں نہیں آ سکتا۔ اگر آنکھوں نے اسے دیکھ لیا تو وہ احاطہ علم میں آ گیا۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۰۳ [2] ۲۰ طٰہٰ: ۱۱۰ [3] ۴۲ شوریٰ: ۱۱ [4] الکافی ۱: ۹۵ باب ابطال الرؤیۃ

وَ عَنَتِ الۡوُجُوۡہُ لِلۡحَیِّ الۡقَیُّوۡمِ ؕ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ حَمَلَ ظُلۡمًا ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ سب چہرے اس حی اور قیوم کے سامنے جھکے ہوئے ہوں گے اور جو کوئی ظلم کا بوجھ اٹھائے گا وہ نامراد ہوگا۔

وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا یَخٰفُ ظُلۡمًا وَّ لَا ہَضۡمًا ﴿۱۱۲﴾

۱۱۲۔ اور جو نیک اعمال بجا لائے اور وہ مومن بھی ہو تو اسے نہ ظلم کا خوف ہو گا اور نہ حق تلفی کا۔

تشریح کلمات

عَنَتِ : (ع ن و) جھک جانا۔ مبتلا کرنا۔

ہَضۡمًا : (ھ ض م) کسی نرم چیز کو کچلنا۔

تفسیر آیات

اللہ زندہ جاوید ہے اور کائنات پر اس کی قیومیت اور بادشاہت قائم ہے۔ باقی سب اس کے سامنے ناچیز اور بے حیثیت ہوں گے۔ اس وجہ سے اللہ کی قیومیت اور بادشاہت میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ البتہ دنیا میں بھی اس کی بادشاہت تھی تاہم یہاں کوئی سرکش جابر بھی ہوتا تھا لیکن آخرت میں یہ سب خوار ہوں گے۔

وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ : نیکیاں ایمان کے ساتھ ہوں وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ تو نیکیاں رہتی ہیں۔ غیر مومن سے صادر ہونے والا کام نیکی نہیں ہوسکتا۔ اگر غیر مومن کوئی نیکی انجام دیتا ہے تو اس کا عمل کفر کی وجہ سے حبط ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عمل کے نیک ہونے کے لیے عمل کنندہ کا نیک ہونا ضروری ہے۔

وَ کَذٰلِکَ اَنۡزَلۡنٰہُ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا وَّ صَرَّفۡنَا فِیۡہِ مِنَ الۡوَعِیۡدِ لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ اَوۡ یُحۡدِثُ لَہُمۡ ذِکۡرًا ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳۔ اور اسی طرح ہم نے یہ قرآن عربی میں نازل کیا اور اس میں مختلف انداز میں تنبیہیں بیان کی ہیں کہ شاید وہ پرہیزگار بن جائیں یا (قرآن) ان کے لیے کوئی نصیحت وجود میں لائے۔

تفسیر آیات

وَ کَذٰلِکَ اَنۡزَلۡنٰہُ : جس طرح گزشتہ مطالب صاف اور فیصلہ کن لفظوں میں بیان ہوئے ہیں اسی

وضاحت کے ساتھ ہم نے قرآن کو نازل کیا اور اس کو عربی جیسی شیرین اور موثر زبان میں رکھا۔

صَرَّفۡنَا فِیۡہِ مِنَ الۡوَعِیۡدِ: اس قرآن میں تنبیہات کو مختلف عبارتوں اور متعدد تعبیروں میں بیان کیا۔

لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ: تاکہ وہ آنے والی ہولناکیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ یعنی وہ ایمان کی پناہ میں آ کر اپنے آپ کو جہنم کے ابدی عذاب سے بچائیں۔ اَوۡ یُحۡدِثُ لَہُمۡ ذِکۡرًا یا اس امید کے ساتھ قرآن نازل کیا ہے کہ ان مشرکین کے دلوں میں قبول نصیحت کے لیے آمادگی پیدا ہو جائے، شاید ان کے ضمیر بیدار ہو جائیں۔

اہم نکات

۱۔ جو کسی کو آنے والی ہولناکیوں سے بچنے کے لیے تنبیہ کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسے اسے بشارت دیتا ہے: مَنْ حَذَّرَكَ كَمَنْ بَشَّرَكَ۔[۱]

فَتَعٰلَی اللّٰہُ الۡمَلِکُ الۡحَقُّ ۚ وَ لَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ ۫ وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾

۱۱۴۔ پس وہ بادشاہ حقیقی اللہ برتر ہے اور آپ پر ہونے والی اس کی وحی کی تکمیل سے پہلے قرآن پڑھنے کی عجلت نہ کریں اور کہدیا کریں: پروردگارا میرے علم میں اضافہ فرما۔

تفسیر آیات

وہ حقیقی مالک اور واقعی بادشاہ ہے۔ اپنی مملکت میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ البتہ اللہ کی چاہت اندھی بانٹ نہیں ہے بلکہ وہ اہل کو ہدایت دیتا ہے نااہل کو اپنے حال پر چھوڑتا ہے۔ سرکش کو سزا دیتا ہے۔ جن و انس کی ہدایت کے لیے انبیاء بھیجتا ہے، ہدایت کی کتاب نازل کرتا ہے۔ بلند و برتر ہے وہ بادشاہ حقیقی۔

وَ لَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ: قرآن پڑھنے میں عجلت نہ کرو۔ وحی ختم ہونے کا انتظار کرو۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ وحی ختم ہونے سے پہلے ہر جملے کو نزول کے ساتھ ساتھ نہ پڑھو بلکہ پہلے خاموشی سے پوری وحی سن لو اور وحی ختم ہونے کے بعد پڑھا کرو۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ چونکہ آپؐ کے سینے میں قرآن پہلے سے موجود ہے لہٰذا وحی کی تکمیل ہونے سے پہلے آپؐ پوری آیت پڑھ دیتے ہیں، ایسا نہ کریں۔

---

[۱] الامام علی علیہ السلام۔ نہج البلاغۃ۔ باب المختار من حکم....:۵۹

ان دونوں میں پہلی تفسیر زیادہ قرین حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ ١

(اے نبی) آپ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ ٢

(عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

چنانچہ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول کریم ﷺ بھولنے کے خوف سے وحی کو ساتھ ساتھ پڑھ لیتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نہ بھولنے کی ضمانت فراہم فرمائی ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا: وحی کے ذریعہ جو علم آپ کو دیا جا رہا ہے اس کے بھولنے کا خطرہ نہیں ہے۔ لہٰذا بھولنے کی فکر کی جگہ مزید علم کی فکر کرنی چاہیے۔

پروردگار میرے علم میں اضافہ کر: یہ جملہ ایک تعلیم، ایک نمونہ عمل ہے۔ آداب بندگی، ایک رہنمائی ہے۔ ایک فکر ہے کہ اس صفحہ ہستی کا موجود اول اپنے علم میں اضافے کے لیے دست سوال دراز کرتا ہے۔ یہ حصول علم کے لیے ایک اسوہ ہے۔ علم کی اہمیت کے لیے ایک درس ہے۔ اللہ کے بعد اس کائنات میں سب سے زیادہ علم رکھنے والی ہستی مزید علم کے لیے سوال کرتی ہے تو بے علم لوگوں کو حصول علم کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں آداب بندگی ہے کہ علم خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، اللہ کے سامنے عاجزی کرنی چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی پوری زندگی زِدْنِيْ عِلْمًا پر مشتمل ہونی چاہیے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾

۱۱۵۔ اور بتحقیق ہم نے اس سے پہلے آدم سے عہد لیا تھا لیکن وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں عزم نہیں پایا۔

تفسیر آیات

عہد سے مراد وہ نصیحت ہو سکتی ہے جس کے تحت شجر ممنوعہ کے نزدیک نہ جانے کے لیے کہا گیا تھا۔

مِنْ قَبْلُ: آپ یا تمام انسانوں یا تمام انبیاء سے پہلے ابتدائی انسان سے عہد لیا تھا کہ وہ جنت میں

---

١ ۷۵ قیامت: ۱۶۔۱۷   ٢ ۸۷ اعلیٰ: ۶

سکونت کے دوران درخت کے نزدیک نہ جائے۔

فَنَسِیَ: وہ بھول گئے۔ یہاں بھول غفلت کے معنوں میں ہے۔ چنانچہ امام علیہ السلام سے سوال ہوا کہ اللہ نے آدم سے بھول پر مواخذہ کیسے کیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

انہ لم ینس و کیف ینسی و ھو یذکرہ ویقول لہ ابلیس مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنۡ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَا مَلَكَيۡنِ اَوۡ تَكُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِيۡنَ ۔[1]

وہ بھولے نہیں تھے وہ بھولتے بھی کیسے ان کو یاد دلایا گیا اور ابلیس نے ان سے کہا: تمہارے رب نے اس درخت سے تمہیں صرف اس لیے منع کیا ہے کہ مبادا تم فرشتے بن جاؤ یا زندہ جاوید بن جاؤ۔

وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا: عزم یعنی مضبوط ارادہ۔ ظاہر ہے غفلت، عزم میں مضبوطی نہ ہونے کی وجہ سے سرزد ہوتی ہے کیونکہ عزم اور غفلت میں ربط ہے۔ کسی کام میں عزم میں کمزوری آتی ہے تو انسان اس سے غافل ہو جاتا ہے۔

وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کے لیے سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا۔

فَقُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ ہٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَ لِزَوۡجِکَ فَلَا یُخۡرِجَنَّکُمَا مِنَ الۡجَنَّۃِ فَتَشۡقٰی ﴿۱۱۷﴾

۱۱۷۔ پھر ہم نے کہا: اے آدم! یہ آپ اور آپ کی زوجہ کا دشمن ہے، کہیں یہ آپ دونوں کو جنت سے نکال نہ دے پھر آپ مشقت میں پڑ جائیں گے۔

تفسیر آیات

آدم و حوا کو پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو جنت سے نکال دیا جائے۔

اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِیۡہَا وَ لَا تَعۡرٰی ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸۔ یقیناً اس جنت میں آپ نہ تو بھوکے رہیں گے اور نہ ننگے۔

وَ اَنَّکَ لَا تَظۡمَؤُا فِیۡہَا وَ لَا تَضۡحٰی ﴿۱۱۹﴾

۱۱۹۔ اور یقیناً اس میں آپ نہ تو پیاسے رہیں گے اور نہ دھوپ کھائیں گے۔

تفسیر آیات

اس جنت کا محل وقوع جہاں بھی ہو، اس کے یہ اوصاف تھے۔ وہاں خوراک و پوشاک کی کوئی کمی

---

[1] بحار الانوار ۱۱: ۱۸۷

نہیں تھی۔ اس سے ایک نکتہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے جسم پر لباس موجود تھا۔ لہٰذا یہ توجیہ درست ثابت نہیں ہوتی کہ درخت کا پھل کھانے سے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی برہنگی کا احساس ہوا بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ درخت کا پھل کھانے سے جنت کا لباس اتر گیا۔

فَوَسۡوَسَ اِلَیۡہِ الشَّیۡطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ ہَلۡ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَۃِ الۡخُلۡدِ وَ مُلۡکٍ لَّا یَبۡلٰی ﴿۱۲۰﴾

۱۲۰۔ پھر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا: اے آدم! کیا میں تمہیں ہیشگی کے درخت اور لازوال سلطنت کے بارے میں بتاؤں؟

تفسیر آیات

آدم کی نفسیات میں جو کمزوریاں تھیں ابلیس نے ان کے ذریعے حملہ کیا۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ اس میں حب بقا ہے۔

انسان قدرتی طور پر بقا کو پسند کرتا ہے اور موت کو ناپسند کرتا ہے۔

اسی طرح سلطنت و اقتدار کو بھی، پھر سلطنت بھی ایسی جسے زوال نہ ہو۔ اس قسم کی خواہشات کے راستے سے شیطان انسان میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ فرزند آدم میں موجود خواہشات کے ذریعے شیطان حملہ کرتا ہے۔

فَاَکَلَا مِنۡہَا فَبَدَتۡ لَہُمَا سَوۡاٰتُہُمَا وَ طَفِقَا یَخۡصِفٰنِ عَلَیۡہِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّۃِ ۫ وَ عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی ﴿۱۲۱﴾

۱۲۱۔ چنانچہ دونوں نے اس میں سے کھایا تو دونوں کے لیے ان کے ستر کھل گئے اور دونوں نے اپنے اوپر جنت کے پتے گانٹھنے شروع کر دیے اور آدم نے اپنے رب کے حکم میں کوتاہی کی تو غلطی میں رہ گئے۔

تفسیر آیات

اس درخت کا پھل کھانے سے حضرت آدم علیہ السلام کے جنتی لباس اتر گئے یا چھین لیے گئے۔ تفصیل کا ہمیں علم نہیں، البتہ پھل کھانے اور بے لباس ہونے میں کوئی گہرا ربط ضرور تھا۔

وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّہٗ: یہ تکوینی حکم کی نافرمانی تھی جسے حکم ارشادی کہتے ہیں۔ جس طرح طبیب مضر صحت چیزوں سے پرہیز کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو قدرتی اثر اس پر

مترتب ہوتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کے بعد نبوت سے سرفراز کیا اور مکلّف بنایا۔

ثُمَّ اجۡتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیۡہِ وَ ہَدٰی ﴿۱۲۲﴾

۱۲۲۔ پھر ان کے پروردگار نے انہیں برگزیدہ کیا اور ان کی توبہ قبول کی اور ہدایت دی۔

تفسیر آیات

جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیج دیا، انہیں نبوت عطا فرمائی اور مکلّف بنایا تو اس کے بعد:

۱۔ اللہ نے انہیں برگزیدہ کیا۔ مقام نبوت پر فائز کیا۔

۲۔ فَتَابَ عَلَیۡہِ۔ اللہ کی توجہات ان پر مرکوز رہیں۔ فَتَابَ عَلَیۡہِ یعنی توجہ الیہ۔

۳۔ وَ ہَدٰی: ان کی راہنمائی فرمائی۔ اللہ کی مرضی کے حصول کی راہنمائی۔ آیندہ کے لیے نوع انسانی کی نسل کو چلانے کی راہنمائی۔ زندگی کے لوازمات کی راہنمائی۔ لفظ ہَدٰی مطلق ہے ہر قسم کی راہنمائی کو شامل کرتا ہے۔

قَالَ اہۡبِطَا مِنۡہَا جَمِیۡعًۢا بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی ۬ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ ہُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشۡقٰی ﴿۱۲۳﴾

۱۲۳۔ فرمایا: یہاں سے دونوں اکٹھے اتر جاؤ ایک دوسرے کے دشمن ہو کر پھر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی اتباع کرے گا وہ نہ گمراہ ہو گا اور نہ شقی۔

وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا وَّ نَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی ﴿۱۲۴﴾

۱۲۴۔ اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اسے یقیناً ایک تنگ زندگی نصیب ہو گی اور بروز قیامت ہم اسے اندھا محشور کریں گے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِیۡۤ اَعۡمٰی وَ قَدۡ کُنۡتُ بَصِیۡرًا ﴿۱۲۵﴾

۱۲۵۔ وہ کہے گا: پروردگارا! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا حالانکہ میں تو بینا تھا؟

قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتۡکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیۡتَہَا ۚ وَ کَذٰلِکَ الۡیَوۡمَ تُنۡسٰی ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶۔ جواب ملے گا: ایسا ہی ہے! ہماری نشانیاں تیرے پاس آئی تھیں تو نے انہیں بھلا دیا تھا اور آج تو بھی اسی طرح بھلایا جا رہا ہے۔

تشریح کلمات

الضنک: (ض ن ك) کسی مقام یا زندگی کے تنگ ہو جانے کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

قَالَ اهۡبِطَا: حضرت آدم کے جنت سے اخراج کے بارے میں مباحث کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۳۰۔ ۳۵، الاعراف۔ ۱۹

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ: انسان اپنے وجود کے تمام زاویوں کے ماوراء ایک شعور رکھتا ہے۔ یہ شعور اپنے خالق سے مانوس ہوتا ہے۔ جس ہستی نے اس کے وجود کے تاروں کو جوڑا ہے، اس ہستی کا جس قدر قرب حاصل ہو اس قدر شعور کو سکون و سرور مل جاتا ہے اور اس سے جدائی اور دوری کی صورت میں یہ بے سکون ہو جاتا ہے خواہ دنیا کی ساری دولت اور حکومت اس کو میسر آ جائے۔

اس سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ انسان صرف اس دنیا کی زندگی کے لیے پیدا نہیں ہوا کیونکہ اس دنیا کی ریل پیل سے اس کا جی نہیں بھرتا بلکہ وہ مزید بے سکون ہو جاتا ہے۔

اگر انسان صرف اسی دنیاوی زندگی کے لیے پیدا ہوا ہوتا تو اس دنیا کی چیزوں سے اسے اس طرح سکون ملنا چاہیے تھا جس طرح مچھلی کو پانی میں سکون ملتا ہے۔

لِمَ حَشَرۡتَنِیۡۤ اَعۡمٰی: دنیا کی زیب و زینت میں انہماک کی وجہ سے اس دنیا دار کی چشم ضمیر نابینا ہو جاتی ہے اور قیامت کے دن انسان اسی حالت میں محشور ہو جاتا ہے جس حالت میں اس نے دنیا کی زندگی گزاری ہے۔ لہٰذا دنیا میں اس کی حسی بصارت سالم تھی لیکن قیامت کے روز دنیا میں اس کے ضمیر اور وجدان کی کیفیت کے مطابق معاملہ ہو گا۔

وَمَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ۝ [۱]

اور جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ (اندھے سے بھی) زیادہ گمراہ ہو گا۔

وَکَذٰلِکَ نَجۡزِیۡ مَنۡ اَسۡرَفَ وَلَمۡ یُؤۡمِنۡۢ بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَشَدُّ وَاَبۡقٰی ﴿۱۲۷﴾

۱۲۷۔ اور ہم حد سے تجاوز کرنے والوں اور اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان نہ لانے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب تو زیادہ شدید اور تا دیر باقی رہنے والا ہے۔

تفسیر آیات

اسراف حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ جو شخص اللہ کی بندگی کی حدود سے باہر نکلتا ہے، اس کا بے سکون

---

[۱] ۱۷ بنی اسرائیل: ۷۲

ہونا قدرتی مکافات ہے۔ آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے۔

اَفَلَمۡ یَہۡدِ لَہُمۡ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا قَبۡلَہُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ یَمۡشُوۡنَ فِیۡ مَسٰکِنِہِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی ﴿۱۲۸﴾

۱۲۸۔ کیا انہوں نے اس بات سے کوئی ہدایت حاصل نہیں کی کہ ان سے پہلے بہت سی نسلوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جن کی بستیوں میں آج یہ لوگ چل پھر رہے ہیں؟ اس بات میں یقیناً ہوشمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

تشریح کلمات

النُّہٰی: (ن ھ ی) النہیۃ عقل جو انسان کو قبیح باتوں سے روکتی ہے۔

تفسیر آیات

گزشتہ اقوام کی سرگزشت میں دروس عبرت موجود ہیں۔ جن کے تباہ شدہ محلات سے لوگوں کا گزر ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اہل مکہ احقاف یمن جاتے ہوئے قوم عاد کے تباہ شدہ تمدن، شام جاتے ہوئے قوم ثمود کی تباہ شدہ تہذیب اور فلسطین جاتے ہوئے قوم لوط کی تباہ حالی کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے۔

وَلَوۡلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ لَکَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّی ﴿۱۲۹﴾

۱۲۹۔ اور اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی اور ایک مدت کا تعین نہ ہو چکا ہوتا تو (عذاب کا نزول) لازمی تھا۔

تشریح کلمات

اَجَلٌ: کَلِمَۃٌ پر عطف ہے۔ یعنی و لو لا کلمۃ سبقت من ربك و اجل مسمی لکان العقاب و الھلاك لازماً۔

تفسیر آیات

قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اللہ کا ایک اٹل فیصلہ ہے جس کے تحت قوموں، مجرموں، فرعونوں اور نمرودوں کو ایک وقت تک مہلت دی جاتی ہے۔ اگر یہ اٹل فیصلہ نہ ہوتا تو جرم سرزد ہوتے ہی مجرم کو ہلاک کر دیا جاتا۔

فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ غُرُوۡبِہَا ۚ وَ مِنۡ اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَ اَطۡرَافَ النَّہَارِ لَعَلَّکَ تَرۡضٰی ﴿۱۳۰﴾

۱۳۰۔ لہٰذا جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کریں اور طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے اپنے پروردگار کی ثنا کی تسبیح کریں اور کچھ اوقات شب میں اور دن کے اطراف میں بھی اس کی تسبیح کیا کریں تاکہ آپ خوش رہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاصۡبِرۡ: جب اللہ تعالیٰ کی حکمت میں مجرم کو فوری سزا دینا نہیں ہے تو ان مجرموں کے بارے میں بھی فوری سزا کی توقع نہ رکھو بلکہ صبر سے کام لو اور جو کچھ ان مشرکوں سے آپ روز سنتے ہیں ان کو کچھ دیر اَجَلٌ مُّسَمًّی تک برداشت کریں۔

۲۔ وَ سَبِّحۡ: دوران صبر اللہ کی تسبیح و تمجید کرتے رہا کریں جس سے آپ کی قوت تحمل میں اضافہ ہو جائے گا۔

۳۔ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ: سے مراد نماز صبح، وَ قَبۡلَ غُرُوۡبِہَا سے مراد نماز عصر، اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ سے مراد مغرب و عشاء اور وَ اَطۡرَافَ النَّہَارِ سے مراد نماز ظہر ہونے میں مفسرین کو طویل بحث کرنا پڑی ہے چونکہ ظہر وَ اَطۡرَافَ النَّہَارِ نہیں، وسط النہار ہے۔

لیکن چونکہ یہ سورہ مکی ہے اور پانچ نمازیں بالاتفاق معراج کے بعد واجب ہوئی ہیں لہٰذا یہ آیت اوقات نماز سے مربوط نہیں ہے بلکہ دن اور رات کے مختلف اوقات میں تسبیح کا ذکر ہے۔

لَعَلَّکَ تَرۡضٰی: شاید آپ اللہ کے فیصلے پر راضی ہوں۔ مخالفین کی طرف سے ہونے والے گھمبیر مظالم پر صبر کا حکم سنگین ہو سکتا ہے۔ یہ سنگینی تسبیح اور عبادت سے ختم ہو جائے گی اور اللہ کے فیصلے پر آپ راضی ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ تسبیح اور عبادت سے انسان چٹان کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے۔

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ زَہۡرَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۬ۙ لِنَفۡتِنَہُمۡ فِیۡہِ ؕ وَ

۱۳۱۔ اور (اے رسول) دنیاوی زندگی کی اس رونق کی طرف اپنی نگاہیں اٹھا کر بھی نہ دیکھیں جو ہم نے آزمانے کے لیے ان میں سے مختلف لوگوں کو دے رکھی ہے اور آپ کے رب کا دیا ہوا

رِزۡقُ رَبِّکَ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی ﴿۱۳۱﴾ رزق بہتر اور زیادہ دیرپا ہے۔

تشریح کلمات

تَمُدَّنَّ : مد العین نگاہ دیر تک مرکوز رکھنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ: اپنے رسولؐ سے خطاب کر کے اس حکم کو زیادہ تاکید کے ساتھ سب کے لیے بیان فرمایا: اپنی نگاہ کو مرکوز نہ رکھیں زندگی کی اس رونق کی طرف جو ہم نے ان کافروں کو دے رکھی ہے۔

۲۔ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ : کافروں کی مختلف صنفوں کو جو دنیا کی زیب و زینت ملی ہوئی ہے اس کی طرف نگاہ اس اعتبار سے نہ کریں کہ اس زیب و زینت سے دل چسپی ہو جائے اور دل میں خیال گذرے کہ مجھے یہ چیز کیوں حاصل نہیں یا حاصل ہونی چاہیے کیونکہ دنیا پر نگاہ مرکوز کرنے سے دل اندھا ہوجاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایات ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

وَ مَنْ اَبْصَرَبِھَا بَصَّرَتْہُ وَ مَنْ اَبْصَرَ اِلَیْھَا اَعْمَتْہُ....[1] جو شخص دنیا کو عبرتوں کا آئینہ سمجھ کر دیکھتا ہے تو وہ اس کی آنکھوں کو روشن و بینا کر دیتی ہے اور جو صرف دنیا ہی پر نظر رکھتا ہے تو وہ اسے کور و نابینا بنا دیتی ہے۔

۳۔ لِنَفۡتِنَہُمۡ: ہم ان کو دنیا دے کر آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ..[2] تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں....

بعض کے نزدیک لِنَفۡتِنَہُمۡ کے معنی لنعذبھم ہیں کہ ہم ان کو دنیا دے کر عذاب دینا چاہتے ہیں۔ اس دنیا کا مال و دولت خود دنیا میں عذاب ہے جب کہ دوسرے لوگ آرام کی نیند سوتے ہیں۔

۴۔ وَ رِزۡقُ رَبِّکَ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی: دنیا میں امن وسکون، آخرت میں ثواب دائم، سب رزق رب ہیں جو دائمی ہیں جن کو کوئی زوال نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنے خاص بندوں کو مال و دولت کی آزمائش میں نہیں ڈالتا۔

۲۔ مال و دولت خود دنیا میں بھی عذاب ہے۔

۳۔ مؤمن کو دوسروں کے مال و دولت کو حسرت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے۔

وَ اۡمُرۡ اَہۡلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَ اصۡطَبِرۡ ۱۳۲۔ اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں اور خود بھی

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۸۲ [2] ۸ انفال: ۲۸

عَلَيۡهَا ؕ لَا نَسۡـَٔلُكَ رِزۡقًا ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكَ ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰى ﴿۱۳۲﴾

اس پر ثابت قدم رہیں، ہم آپ سے کوئی رزق نہیں مانگتے بلکہ ہم آپ کو رزق دیتے ہیں اور انجام (اہل) تقویٰ ہی کے لیے ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاۡمُرۡ اَهۡلَكَ بِالصَّلٰوةِ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کی مکی زندگی میں اَهۡلَكَ کے مصداق حضرت علی علیہ السلام اور حضرت خدیجہ رضوان اللہ علیہا ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ ابتدائے بعثت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کے پیچھے حضرت علی علیہ السلام اور حضرت خدیجہ علیہا السلام نماز پڑھتے تھے۔ بعد میں جعفر اور زید بھی شامل ہو گئے۔[1]

لہٰذا ابتدائے اسلام میں نماز کا حکم اہل بیت رسولؑ سے شروع ہوا ہے۔

۲۔ وَاصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا: اقامۂ نماز میں صبر و تحمل سے کام لو۔ ابتدائے اسلام میں رسولؐ اور اہل بیت رسول کے لیے نماز پڑھنا آسان کام نہ تھا۔ مشرکین حالت نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کی پشت پر غلاظت ڈالتے تھے۔ اس طرح نماز پڑھنا صبر آزما کام تھا۔ اسی لیے حضرت ابوطالب نے جب دیکھا کہ علی علیہ السلام حضور کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں تو اپنے فرزند جعفر کو حکم دیا کہ اپنے ابن عم کے ساتھ نماز میں شریک ہو جاؤ۔[2]

۳۔ لَا نَسۡـَٔلُكَ رِزۡقًا: نماز قائم کرنے کے حکم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم آپ کی نماز کے محتاج ہیں۔ نَحۡنُ نَرۡزُقُكَ آپ ہمارے محتاج ہیں اور نماز کے ذریعے آپ کی احتیاج پورا ہوتی ہے۔ یعنی نماز پڑھنا کسی کی ضرورت پوری کرنا نہیں، اپنی ضرورت پوری کرنا ہے۔

۴۔ وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰى: انجام ان لوگوں کا بخیر ہو گا جو بچتے رہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ بچنے والے بچ جاتے ہیں۔ لاابالی کرنے والے پھنس جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ رسولؐ و اہل بیت رسولؐ نے نماز کی ابتدا کی۔

۲۔ نماز صبر آزما دور سے گذری ہے۔

۳۔ عاقبت، اہل تقویٰ کی بخیر ہے۔

وَقَالُوۡا لَوۡلَا يَاۡتِيۡنَا بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمۡ تَاۡتِهِمۡ بَيِّنَةُ مَا فِى

۱۳۳۔ اور لوگ کہتے ہیں: یہ اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے؟ کیا ان کے پاس

الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ اگلی کتابوں میں سے واضح ثبوت نہیں آیا؟

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ: مشرکین ہٹ دھرمی کے ساتھ آئے دن معجزوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کے جواب میں فرمایا:

۲۔ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى: کیا ان کے پاس سابقہ کتب میں واضح دلائل پر مشتمل کتاب (قرآن) نہیں آئی؟ چنانچہ سابقہ کتابیں معجزہ نہیں تھیں جب کہ قرآن معجزہ ہے۔ یعنی الم تاتهم بينة التي في الصحف الاولي۔

دوسری تفسیر یہ کی جاتی ہے: سابقہ آسمانی کتابوں میں ہم نے جو دلائل پیش کیے ہیں ان کا انہیں علم نہیں کہ لوگوں نے پھر بھی انہیں تسلیم نہیں کیا؟

وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾

۱۳۴۔ اور اگر ہم (نزول قرآن سے) پہلے ہی انہیں عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ ضرور کہتے: ہمارے پروردگار! تو نے ہماری طرف کسی رسول کو کیوں نہیں بھیجا کہ ذلت و رسوائی سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی اتباع کر لیتے؟

تفسیر آیات

اگر کسی رسول کے ذریعے دلیل و معجزہ پیش کرنے سے پہلے انہیں عذاب میں ڈالتے تو وہ یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ اگر آپ کسی رسول کے ذریعے کوئی دلیل معجزہ پیش کرتے تو ہم اس پر ایمان لے آتے۔

مِّنْ قَبْلِهٖ نزول قرآن یا رسول اسلامؐ کے مبعوث ہونے سے پہلے۔

اس میں ضمناً اس بات کو قبول کیا گیا ہے کہ حجت پوری کرنے سے پہلے عذاب دینا درست نہ ہوتا:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝[1] اور جب تک ہم کسی رسول کو مبعوث نہ کریں عذاب دینے والے نہیں ہیں۔

اس صورت میں کافروں کے ہاتھ میں جو عذر آتا وہ معقول ہوتا۔ ہم نے اس بات کے علم کے باوجود کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، انبیاء بھیجے۔ چونکہ صرف علم خدا کی بنا پر اور جب تک جرم کا ارتکاب عمل میں نہ آئے، عذاب دینا درست نہ ہوتا۔

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۱۵

اہم نکات

۱۔ اتمام حجت سے پہلے مؤخذاہ درست نہیں ہے۔

قُلۡ کُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوۡا ۚ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَصۡحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَ مَنِ اہۡتَدٰی ﴿۱۳۵﴾

۱۳۵۔ کہدیجیے: سب انتظار میں ہیں لہٰذا تم بھی انتظار کرو پھر عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ راہ راست پر چلنے والے کون ہیں اور ہدایت پانے والے کون ہیں۔

تشریح کلمات

التربص : انتظار

تفسیر آیات

کہدیجیے ہم اور تم میں سے ہر ایک انتظار میں ہے۔ ہم تمہارے انجام کے بارے میں اور تم ہمارے انجام کے بارے میں۔ ہم اس انتظار میں ہیں کہ تمہارے خلاف اللہ کا وعدہ پورا ہونے والا ہے اور تم ابدی رسوائی میں مبتلا ہونے والے ہو اور تم اس خام خیالی میں ہو کہ ہم گردش زمانہ کی زد میں آ کر سب کچھ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

فَسَتَعۡلَمُوۡنَ: انتظار کے لمحات ختم ہونے پر تمہیں علم ہو جائے گا کہ راہ راست پر کون لوگ تھے۔ اس میں فتح و ظفر کی پیشگوئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ عمل کے بعد انجام کا انتظار کرنا چاہیے۔ بغیر عمل کے انتظار بے معنی ہے۔

خالی

سورۃ الانبیاء

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ سورہ مبارکہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس کی آیات کی تعداد ایک سو بارہ ہے۔ یہ قرائت عاصم کے مطابق ہے۔ دوسرے لوگ ایک سو گیارہ شمار کرتے ہیں اور آیت ٦٦ اور ٦٧ کو ایک آیت شمار کرتے ہیں، اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الانبیاء اس لیے ہوا کہ اس سورۃ میں انبیاء میں سے حضرت نوح، ابراہیم، یعقوب، اسحاق، لوط، موسیٰ، ہارون، داؤد، سلیمان، ایوب، اسماعیل، ادریس، ذوالکفل، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا تذکرہ ہے۔

اس سورۃ کے دیگر مضامین توحید اور اثبات معاد پر مشتمل ہیں جو مکی سورہائے قرآن کے مخاطبین کی ذہنیت کے مطابق ہیں۔

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ﴿۱﴾	۱۔ لوگوں کے لیے ان کے حساب کا وقت قریب آ گیا ہے جب کہ وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِقۡتَرَبَ: لوگوں کے لیے حساب نزدیک آ گیا۔ خود حساب۔ (نہ وقت، نہ دن) چونکہ اس دنیا کے بعد دوسرے عالم میں وقت اور زمانے کا سوال نہیں اٹھتا۔ وہاں کا زمان و مکان، دنیا کے تصور زمان و مکان سے مختلف ہو گا۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ حیات برزخی سب کے لیے نہیں ہے بلکہ مقرب بارگاہ، صالحین اور شہداء کے لیے یا بہت بڑے مجرموں کے لیے برزخ میں عذاب کی زندگی ہے۔ باقی افراد کے لیے برزخی زندگی نہیں ہے۔ اس نظریے کے مطابق روز قیامت اور روز حساب نہایت قریب ہے کہ جیسے ہی انسان کو موت آتی ہے، قیامت برپا ہو گی تو ایسے محسوس ہو گا کہ گویا دوسرے لمحے میں قیامت برپا ہو گئی۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

من مات فقد قامت قیامتہ۔[1] جیسے ہی کوئی مرتا ہے اس کی قیامت برپا ہو جاتی ہے۔

۲۔ لِلنَّاسِ: میں الناس سے مراد جنس بشر ہے۔

۳۔ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ: وہ اس حساب کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر رہے ہیں۔ چونکہ دنیا میں ان کے دل حب دنیا میں مغمور ہیں لہٰذا منہ موڑنا، عدم توجہ کی وجہ سے اور عدم توجہ غفلت کی وجہ سے ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے سامنے حساب کے لیے حاضر ہونے میں کوئی زیادہ دیر نہیں ہے: اِقۡتَرَبَ ....

---

[1] بحار الانوار۔ ۷۰: ۶۵

۲۔ مؤمن کو حساب کے لیے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیے: فِیۡ غَفۡلَۃٍ ....

مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡہُ وَ ہُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ۙ﴿۲﴾

۲۔ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو بھی تازہ نصیحت آتی ہے یہ لوگ اسے کھیلتے ہوئے سنتے ہیں۔

لَاہِیَۃً قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجۡوَی ٭ۖ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ٭ۖ ہَلۡ ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳﴾

۳۔ان کے دل لہویات میں مصروف ہوتے ہیں اور ظالم آپس کی سرگوشیاں چھپاتے ہیں کہ یہ شخص بھی تم جیسا بشر ہے، تو کیا تم لوگ دانستہ طور پر جادو کے چکر میں آتے ہو؟

تشریح کلمات

مُّحۡدَثٍ: (ح د ث) تازہ۔

لَاہِیَۃً: (ل ھ ی) لہو۔ بیہودہ اور بے سود عمل۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ مُّحۡدَثٍ: اس آیت میں ذکر سے مراد وہ کلام ہے جس میں نصیحت ہے اور وہ قرآن ہے۔ محدث، تازہ۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس جب بھی قرآنی آیات کی صورت میں کوئی تازہ نصیحت آ جاتی ہے تو یہ اس نصیحت کو کھیلتے ہوئے سنتے ہیں، اس نصیحت کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے ہیں۔

۲۔ لَاہِیَۃً قُلُوۡبُہُمۡ: جب ان پر وہ نصیحت دہرائی جاتی ہے تو ان کے دل لہویات میں ہوتے ہیں۔ دل اگر کسی مطلب کی طرف متوجہ ہونا نہیں چاہتا تو آواز تو کانوں میں آتی ہے: اسۡتَمَعُوۡہُ مگر ذہن میں کوئی بات نہیں بیٹھتی۔

۳۔ وَ اَسَرُّوا النَّجۡوَی ٭ۖ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا: یہاں تقدیم و تاخیر ہے۔ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا، وَ اَسَرُّوا النَّجۡوَی ظلم کا ارتکاب کرنے والے سرگوشی کرتے ہیں۔ النَّجۡوَی خفیہ سرگوشی کو کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ اَسَرُّوا برائے تاکید ہے۔

اس کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا بدل ہوسکتا ہے اَسَرُّوا کی واو کا اور اَسَرُّوا کا تعلق آیت کی ابتدا میں موجود الناس کے ساتھ ہے۔ تیسری توجیہ یہ کرتے ہیں الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا سے پہلے یَقُوۡلُ محذوف ہے تو یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا[۱] ہے۔ ہَلۡ ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ اس کا مقول ہے۔ قرآن میں اس کی

---

[۱] ۶ انعام: ۲۵

مثال موجود ہے: الۡمَلٰٓئِکَۃُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ ۞ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ [1] یہاں یَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ ہے۔

چوتھی توجیہ میں کہتے ہیں ضمیر فاعل کے بعد اسم ظاہر کا فاعل آنا بھی ایک عربی لغت ہے۔ جیسے اکلونی البراغیث مشہور جملہ ہے۔

۴۔ ھَلۡ ھٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ: وہ بشر اور انسان کو اللہ کی نمائندگی کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی نمائندگی صرف فرشتے کر سکتے ہیں اور جس نے بھی دعوائے نبوت کے ساتھ معجزہ پیش کیا ہے اس نے جادو کیا ہے۔

قٰلَ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِی السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ۫ وَ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ۝۴

۴۔ رسول نے کہا: میرا پروردگار ہر وہ بات جانتا ہے جو آسمان و زمین میں ہے اور وہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

الۡقَوۡلَ: خفیہ اور علانیہ دونوں باتوں کو شامل ہے۔ اس میں نبوت کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ دیا کہ وہی نبوت پر فائز کرتا ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کے سپرد کرنا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

قُلۡ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰہِ ۪ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۝ [3]

کہدیجیے: علم تو صرف اللہ کے پاس ہے جب کہ میں تو صرف واضح تنبیہ کرنے والا ہوں۔

بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۭ بَلِ افۡتَرٰىہُ بَلۡ ھُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلۡیَاۡتِنَا بِاٰیَۃٍ کَمَاۤ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ ۝۵

۵۔ بلکہ وہ کہتے ہیں: یہ (قرآن) تو پریشان خوابوں کا ایک مجموعہ ہے بلکہ یہ اس کا خودساختہ ہے بلکہ یہ تو شاعر ہے ورنہ یہ کوئی معجزہ پیش کرے جیسے پہلے انبیاء (معجزوں کے ساتھ) بھیجے گئے تھے۔

تفسیر آیاتا

بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍ: قرآن کے خلاف مختلف الزمات عائد کرنے کی ناکام کوشش کی گئی

---

[1] ۱۳ رعد: ۲۳۔۲۴　[2] ۱۶ نحل: ۳۲　[3] ۶۷ ملک: ۲۶

پہلے تو کہدیا کہ یہ قرآن رات کو آنے والے پریشان خوابوں کا مجموعہ ہے لیکن اس الزام پر غور کیا تو اس میں یہ کمزوری دیکھی کہ پریشان خوابوں میں نظم کلام نہیں ہوتا اور اعلیٰ سطح کے مطالب بھی نہیں ہو سکتے پھر کہا:

بَلِ افۡتَرٰىهُ: پھر الزام عائد کیا کہ یہ خود ساختہ ہے اور اسے اللہ کا کلام بتاتا ہے۔ خودساختہ کلام میں غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے تو کلام میں نظم آتا ہے اور سطح کلام بھی بلند رکھی جا سکتی ہے۔ اس الزم میں یہ کمزوری دیکھی کہ اگر ایسا کلام وہ خود بنا سکتا ہے تو دوسرے لوگ بھی بنا سکتے ہیں۔

بَلۡ هُوَ شَاعِرٌ: پھر یہ الزام عائد کیا: یہ شاعر ہے۔ شاعر کبھی یگانہ روزگار ہو سکتا ہے۔ اس جیسا کلام دوسرے لوگ نہیں بنا سکتے۔ اس الزام میں دیکھا کہ شاعر کی باتیں خیالی ہوتی ہیں۔ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور قرآن حقائق پر مشتمل ہے تو کہا:

فَلۡيَاۡتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ: گزشتہ انبیاء کی طرح کا معجزہ پیش کرو۔ یعنی کما ارسل الاولون بالایات۔ اس کا جواب اگلی آیت میں ہے۔

مَاۤ اٰمَنَتۡ قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا ۚ اَفَهُمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ ۝

۶۔ ان سے پہلے جس بستی کو بھی ہم نے ہلاک کیا وہ ایمان نہیں لائی، تو کیا یہ لوگ ایمان لائیں گے؟

تفسیر آیات

سابقہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے وہ لوگ ایمان نہیں لائے جنہوں نے معجزے کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ اگر مطالباتی معجزہ دکھا بھی دیا جاتا تو اس صورت میں ایمان نہ لانے سے فوری عذاب آ جاتا۔ گزشتہ لوگ جب معجزے پر ایمان نہیں لائے تو کیا یہ لوگ ایمان لائیں گے؟ مطلب یہ ہے کہ لوگ معجزے کے بعد ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ نتیجتاً یہ ہلاک ہو جائیں گے۔ لہٰذا مطالباتی معجزہ نہ دکھانا رحمت ہے۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝

۷۔ اور ہم نے آپ سے پہلے بھی مردان (حق) ہی کی طرف وحی بھیجی ہے، اگر تم لوگ نہیں جانتے ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا: تاریخ انبیاء میں کسی غیر انسان کو اللہ نے نبوت کے درجہ پر فائز نہیں فرمایا۔ انبیاء علیہم السلام بھی رجال، انسان ہیں مگر ان کا امتیاز یہ ہے:

۲۔ نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ : ان پر اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ جس وجود کو لوگ انسانوں کی طرح سمجھتے ہیں وہ اور ہے، وہ انسانوں میں سے ایک انسان ہے لیکن جس وجود پر وحی ہوتی ہے وہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہے۔

۳۔ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ : اگر تم نہیں جانتے ہو کہ انبیاء انسانوں میں سے مبعوث ہوتے رہے ہیں تو اَہۡلَ الذِّکۡرِ سے پوچھ لو۔ الذِّکۡرِ سے مراد کتب سماوی ہیں اور اَہۡلَ الذِّکۡرِ ان کتابوں کا علم رکھنے والے اہل کتاب ہیں۔ چونکہ مشرکین اور اہل کتاب دونوں رسول اللہؐ کے خلاف تھے اور اہل کتاب مشرکین کی حمایت کرتے تھے تو یہاں ان سے کہا گیا: خود تمہاری حمایت کرنے والے اہل کتاب سے پوچھ لو کہ ان کے انبیاء رجال تھے یا فرشتے؟

اَہۡلَ الذِّکۡرِ : حضرت امام باقر علیہ السلام سے زرارہ نے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ہم اَہۡلَ الذِّکۡرِ ہیں۔ یہی روایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ملاحظہ ہو: محمد بن مسلم کی روایت تفسیر طبری ۱۴: ۶۹، تفسیر ابن کثیر ۲: ۵۷، حافظ ابن مؤمن کی تفسیر جو بارہ تفاسیر کا خلاصہ ہے، روح المعانی ۱۴: ۱۳۴ میں۔

تفسیر اور شان نزول: قرآن کی تفسیر اور شان نزول کے بارے میں یہ بات ہر قاری کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ قرآن صرف شان نزول میں محدود نہیں ہے بلکہ قرآن اپنے لفظی اور تعبیری دائرے میں شان نزول سے وسیع تر ہے۔ چنانچہ اصول تفسیر میں ایک جملہ مشہور ہے:

العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔ لفظ کے عموم کو اعتبار حاصل ہے، سبب نزول کی خصوصیت کو نہیں۔

اس آیت میں نزول کے اعتبار سے یہ بات ناممکن ہے کہ منکرین رسالت سے کہا جائے: اہل بیت رسول سے پوچھ لو۔ وہ خود رسول کو نہیں مانتے اہل بیت کو کیسے مان سکتے ہیں لیکن تعبیر کے عموم میں مسلمان بھی شامل ہیں کہ کوئی بات اگر تم نہیں جانتے تو اھل ذکر سے پوچھو۔ قرآن کے ذکر ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہے:

اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ وَّ قُرۡاٰنٌ مُّبِیۡنٌ ۙ [۱] یہ تو بس ایک نصیحت (کی کتاب) اور روشن قرآن ہے۔

اسی طرح اہل بیت علیہم السلام کے عالم قرآن ہونے کی وجہ سے اھل ذکر ان پر صادق آتا ہے۔ اسی طرح اہل بیت علیہم السلام کے رُتبے کا کوئی بھی عالم بالقرآن ہو، وہ بھی اس کا مصداق بن سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کے رتبے کا کوئی عالم بالقرآن نہیں ہے۔

وَ مَا جَعَلۡنٰہُمۡ جَسَدًا لَّا یَاۡکُلُوۡنَ ۸۔ اور ہم نے انہیں ایسے جسم نہیں بنایا جو کھانا نہ کھاتے

---

[۱] ۳۶ یس: ۶۹

الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ⑧ ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ (زندہ) رہنے والے تھے۔

تفسیر آیات

یہ رد ہے مشرکین کے اس اعتراض کی: مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ۔

ہم نے انبیاء علیہم السلام کو ایسے جسد کا مالک نہیں بنایا جو طعام کا محتاج نہ ہو۔ یعنی ایسا کوئی زندہ جسم نہیں بنایا جو تحلیل نہ ہوتا ہو اور تدارک کے لیے طعام کا محتاج نہ ہو۔

وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ: اگر کوئی زندہ جسم تحلیل نہ ہوتا تو اسے خلود حاصل ہوتا اور موت نہ آتی۔ لہٰذا جس طرح جسم کے اجزاء (Cell) کی ایک عمر ہے۔ اسی طرح جسم و جان کے مجموعہ انسان کی بھی، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، ایک عمر معین ہے۔

نبی کے جسم کے تحلیل ہونے اور اس جسم میں موجود روح پر وحی نازل ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر ذی روح کا محتاج ہونا اس ذات کے وجود کی دلیل ہے، لوگ جس کے محتاج ہیں۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَ مَنْ نَّشَآءُ وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ⑨

۹۔ پھر ہم نے ان کے ساتھ وعدہ پورا کیا پس ہم نے انہیں اور جنہیں ہم نے چاہا بچا لیا اور تجاوز کرنے والوں کو ہلاک کر دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ: ان انبیاء کے ساتھ اللہ نے جو وعدہ فرمایا تھا اسے پورا کر دیا۔ وہ وعدہ یہ تھا:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ [1]	اور بتحقیق ہمارے بندگان مرسل سے ہمارا یہ وعدہ ہو چکا ہے۔ یقیناً وہ مدد کیے جانے والے ہیں۔ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب آ کر رہے گا۔

۲۔ فَاَنْجَيْنٰهُمْ: اس وعدہ کے پورا ہونے کا نتیجہ یہی تھا کہ مرسلین کو اور ان کے ساتھ ان پر ایمان لانے والوں کو نجات مل گئی اور حق سے تجاوز کرنے والے ہلاک ہو گئے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ۱۰۔ بتحقیق ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب

---

[1] ۳۷ صافات: ۱۷۱ تا ۱۷۳

ذِکۡرُکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰﴾

نازل کی ہے جس میں تمہاری نصیحت ہے تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

تفسیر آیات

ذِکۡرُکُمۡ: اس قرآن میں تمہاری عزت و شرافت ہے۔ اس کتاب نے تمہیں اقوام عالم میں سربلند کیا جب کہ اقوام عالم میں تمہارا کوئی مقام نہ تھا۔ تمہارا وجود تک محسوس نہ تھا۔ نہ تمہاری کوئی تاریخ تھی، نہ کوئی تہذیب و تمدن۔ اگر ذکر ہے تو تمہاری جاہلیت، تمہارے وحشی معاشرے، آپس کے قتل و غارت اور بیٹیوں کو زندہ در گور کرنے کا ہے۔

فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ: ہم نے ایک کتاب تمہاری طرف نازل کی جس نے نہ صرف تمہیں تہذیب سکھائی بلکہ تم اس قابل ہوگئے کہ دنیا کو تہذیب و تمدن کا درس دے سکو۔ چنانچہ دنیا نے تم سے تہذیب سیکھی اور انسان کو انسانی قدروں سے آگاہ کیا۔

وَ اِنَّہٗ لَذِکۡرٌ لَّکَ وَ لِقَوۡمِکَ ۚ...[1]

اور یہ (قرآن) آپ کے اور آپ کی قوم کے لیے ایک نصیحت ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہوسکتی ہے فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ اس قرآن میں تمہاری نصیحت ہے جس سے تم انسانی اخلاق و اقدار کے مالک بن سکتے ہو۔ بعض نے کہا ہے: اس قرآن میں حسن ذکر ہے۔

وَ کَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ کَانَتۡ ظَالِمَۃً وَّ اَنۡشَاۡنَا بَعۡدَہَا قَوۡمًا اٰخَرِیۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ اور ہم نے کتنی ظالم بستیوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا اور ان کے بعد دوسری قوم کو پیدا کیا۔

فَلَمَّاۤ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ اِذَا ہُمۡ مِّنۡہَا یَرۡکُضُوۡنَ ﴿ؕ۱۲﴾

۱۲۔ پس جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا تب وہ وہاں سے بھاگنے لگے۔

لَا تَرۡکُضُوۡا وَ ارۡجِعُوۡۤا اِلٰی مَاۤ اُتۡرِفۡتُمۡ فِیۡہِ وَ مَسٰکِنِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تُسۡـَٔلُوۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ بھاگو نہیں، اپنی عیش پرستی میں اور اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ، شاید تم سے پوچھا جائے۔

قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَاۤ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ کہنے لگے: ہائے ہماری تباہی! بے شک ہم لوگ ظالم تھے۔

[1] ۴۳ زخرف:۴۴

فَمَا زَالَتۡ تِّلۡكَ دَعۡوٰىهُمۡ حَتّٰی جَعَلۡنٰهُمۡ حَصِيۡدًا خٰمِدِيۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔اور وہ فریاد کر رہے ہیں یہاں تک کہ ہم نے انہیں (جڑوں سے) کاٹ کر خاموش کر دیا۔

تشریح کلمات

قَصَمۡنَا: (ق ص م) القصم کے معنی ہلاک کرنے اور کسی چیز کو توڑ دینے کے ہیں۔

يَرۡكُضُوۡنَ: (ر ك ض) رکض کے اصل معنی ٹانگ کو حرکت دینے کے ہیں۔ اسی سے دوڑنے اور بھاگنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اُتۡرِفۡتُمۡ: (ت ر ف) الترفة عیش وعشرت میں فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔

حَصِيۡدًا: (ح ص د) الحصد و الحصاد کے معنی کھیتی کاٹنے کے ہیں۔

خٰمِدِيۡنَ: (خ م د) خمدت النار آگ کے شعلوں کا ساکن ہونا۔ استعارۃ بمعنی موت بھی آجاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَكَمۡ قَصَمۡنَا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہایت غیض وغضب کا اظہار ہے کیونکہ قصم کی تعبیر (درہم برہم) میں زیادہ شدت ہے۔ یہ غضب ایسی بستی پر آیا جو ظلم و زیادتی میں ملوث تھی۔ یہ کفر اور شرک کا ظلم ہوسکتا ہے: اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ۔ [1]

۲۔ وَّاَنۡشَاۡنَا بَعۡدَهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ: قرآن میں متعدد مقامات پر اس مطلب کو بیان فرمایا کہ کوئی قوم اگر نافرمانی پر اڑ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے نابود کر کے اس کی جگہ دوسری قوم پیدا کرتا ہے۔

۳۔ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ: اس بستی کے لوگوں نے دیکھا کہ عذاب سر پر آگیا ہے تو اس سے بچنے یعنی فرار ہونے کی کوشش کی حالانکہ اللہ سے فرار نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کی مملکت کو چھوڑ کر کہیں اور جایا جا سکتا ہے۔

۴۔ لَا تَرۡكُضُوۡا: ندا آتی ہے کہ فرار نہ ہو۔ اب جائے فرار تمہیں نہیں ملے گی۔

۵۔ وَارۡجِعُوۡۤا: اپنے عشرت کدوں کی طرف لوٹ آؤ۔ اپنے گھروں میں جا کر عیش و نوش کی جگہوں کا نظارہ کرو اور ان کو تباہ و برباد ہوتے دیکھ لو۔

۶۔ لَعَلَّكُمۡ تُسۡـَٔلُوۡنَ: ان کو اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتے ہوئے دیکھ لو۔ کل لوگوں کی طرف سے سوال ہوگا کہ تمہارے عشرت کدے کیسے تباہ ہوئے؟ تو تم بتا سکو یا تم دوبارہ محترم اور مرجع عوام بن سکو اور تمہارے سامنے ہاتھ پھیلانا شروع کریں۔ ایک تمسخر ہے۔

---

[1] ۳۱ لقمان: ۱۳ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

۷۔ قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَاۤ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ: اب معلوم ہوا کہ وہ ظلم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ جب موت آنے لگتی ہے تو لوگ بیدار ہو جاتے ہیں۔ جب آنکھ بند ہو جاتی ہے تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ جب دنیاوی مفادات کا پردہ ہٹ جاتا ہے تو بینائی آ جاتی ہے۔

۸۔ فَمَا زَالَتۡ تِّلۡکَ دَعۡوٰىہُمۡ: وہ یا ویل کی پکار میں مشغول تھے، ادھر عذاب نے انہیں آ لیا اور انہیں جڑوں سے کاٹ کر خاموش کر دیا۔

یہ کون سی بستی تھی؟ ایک روایت کے مطابق یہ یمن کی ایک بستی کا ذکر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ سے فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے: لَا تَرۡکُضُوۡا...

۲۔ اللہ تعالیٰ احیائے دین کے لیے کسی ایک قوم پر انحصار نہیں فرماتا: قَوۡمًا اٰخَرِیۡنَ...

وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا لٰعِبِیۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور ہم نے اس آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کو بیہودہ خلق نہیں کیا۔

لَوۡ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نَّتَّخِذَ لَہۡوًا لَّاتَّخَذۡنٰہُ مِنۡ لَّدُنَّاۤ ٭ۖ اِنۡ کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اگر ہم کھیل کا ارادہ کرتے تو ہم اسے اپنے پاس سے بنا لیتے اگر ہم (ایسا) کرنے والے ہوتے (تو تمہیں خلق کرنے کی کیا ضرورت تھی)۔

تشریح کلمات

لٰعِبِیۡنَ: (ل ع ب) اس منظم فعل کو کہتے ہیں جس کا مقصد غیر واقعی، خیالی ہوتا ہے۔ چنانچہ کھیلوں میں فتح و شکست خیالی ہے جسے کھیلنے والوں نے آپس میں ایک قرارداد کے ذریعے مقرر کیا ہے۔ اس قرارداد کو بدلنے سے فتح و شکست کا معیار بدل جاتا ہے۔ ورنہ واقعی فتح و شکست کسی قرارداد سے نہیں واقع سے مربوط ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَ الۡاَرۡضَ: آسمان اور زمین کو اللہ تعالیٰ نے ایک واقعی مقصد کے لیے بنایا ہے۔ اس واقع اور حقیقت کے تحت ہر ایک کو بروز حساب اپنے اعمال کا جواب دینا ہوگا۔

۲۔ لَوۡ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نَّتَّخِذَ لَہۡوًا: اگر ہم کسی قسم کا کھیل اور لہو و لعب کرنا چاہتے تو اس کام کے لیے کسی تخلیق کی ضرورت پیش نہ آتی بلکہ یہ کام اپنے پاس سے کر لیتے۔

۳۔ مِنۡ لَّدُنَّاۤ : کے معنی میں بعض نے کہا ہے: من انفسنا۔ یہ کام مرحلہ ذات سے لیتے۔ مرحلہ خلق کی نوبت نہ آتی۔ بعض دیگر مفسرین نے فرمایا ہے: مِنۡ لَّدُنَّاۤ یعنی من اھل السماء لا من اھل الارض۔ یہ قول قابل قبول نہیں ہے چونکہ آیت میں آسمان کو بھی عدم لغو میں شامل فرمایا ہے۔ اسی طرح مِنۡ لَّدُنَّاۤ سے مراد مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ بھی درست نہیں ہے۔ مگر لدنا سے ذات مراد لینا بھی بعید معلوم ہوتا ہے لہٰذا ممکن ہے مراد یہ ہو کہ اگر ہم نے لغو کرنا ہوتا تو عالم خلق کے ذریعے ایسا کرنا ضروری نہ تھا بلکہ تخلیق کے علاوہ دیگر عالموں سے، جو ہمارے پاس موجود ہیں، یہ کام لیتے چونکہ اللہ کے پاس جو متصور ہے وہ اس موجودہ کائنات میں منحصر نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات ایک مقصد کی طرف رواں دواں ہے۔

بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَی الۡبَاطِلِ فَیَدۡمَغُہٗ فَاِذَا ہُوَ زَاہِقٌ ؕ وَ لَکُمُ الۡوَیۡلُ مِمَّا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۸﴾	۱۸۔ بلکہ ہم باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر کچل دیتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے اور تم پر تباہی ہو ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔

تشریح کلمات

نَقۡذِفُ : (ق ذ ف) القذف کے معنی دور پھینکنے کے ہیں۔

الدمغ: (د م غ) کے اصل معنی دماغ پھوڑ دینے کے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ کائنات لغو اور بے مقصد نہیں ہے بلکہ واقعیت پر مشتمل مقصد کی طرف رواں دواں ہے۔ وہ واقعیت اور حق اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کائنات اپنے کمال کی طرف رواں دواں ہے اور اس کا منتہائے مقصد لقائے رب ہے۔

۱۔ بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ : کائنات لغو نہیں ہے، ایک حق پر مبنی ہے۔ حق اسے کہتے ہیں جو ثبات رکھتا ہو اور جو ثبات نہیں رکھتا وہ باطل ہے۔ مثلاً آپ کی بات امر واقع کے مطابق ہو تو اس واقع کو حق اور آپ کی بات کو سچ کہتے ہیں اور اگر آپ کی بات واقع کے مطابق نہیں ہے تو آپ کی بات کو جھوٹ اور غیر واقع کو باطل کہتے ہیں۔ لہٰذا حق اور باطل، وجود و عدم کی طرح ہیں۔ تاہم بہت سے لوگوں کے لیے یہ عدم ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ اسے وجود سمجھتے ہیں۔ حق اپنی طاقت سے اس موہوم چیز کو وہم سے بھی مٹا دیتا ہے۔

۲۔ وَلَكُمُ الْوَيْلُ: جو لوگ حق کے خلاف باتیں کرتے ہیں ان کے لیے ایک تہدید ہے کہ ان کا مقدر تباہی ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ حق واقع ہے اور باطل عدم ہے۔

۲۔ حق ایک طاقت ہے اور باطل موہوم ہے۔ موہوم چیز کا قدرتی انجام مٹ جانا ہے۔

وَلَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَنۡ عِنۡدَهٗ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسۡتَحۡسِرُوۡنَ ﴿۱۹﴾	۱۹۔ اور آسمانوں اور زمین میں موجود مخلوقات اسی کی ہیں اور جو اس کے پاس ہیں وہ اللہ کی عبادت سے نہ تو تکبر کرتے ہیں اور نہ ہی اکتاتے ہیں۔
یُسَبِّحُوۡنَ الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفۡتُرُوۡنَ ﴿۲۰﴾	۲۰۔ وہ شب و روز تسبیح کرتے ہیں، تساہل نہیں برتتے۔

تشریح کلمات

یَسۡتَحۡسِرُوۡنَ: (ح س ر) الحسر کے معنی کسی چیز کو ننگا کرنے کے ہیں۔ تھکنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ناقة حسیر تھکی ہوئی اونٹنی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَهٗ: کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مملکت سے بھاگ جائے یا اس کی نظر سے چھپ جائے۔ سب کو اللہ کے پاس حاضر ہونا اور حساب دینا ہے۔

۲۔ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ: جو اللہ کے پاس ہوتے ہیں وہ نہ عبادت سے تکبر کرتے ہیں اور نہ ہی اکتاتے ہیں۔ عِنۡدَهٗ سے مراد مقربین لئے گئے ہیں۔ جو مقرب درگاہ ہیں، خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیاء، اوصیاء اور صلحاء، وہ ذوق عبادت رکھتے اور سرّ عبودیت سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ عبادت سے تکبر کیا بلکہ وہ اسے اپنے لیے معراج سمجھتے ہیں اور اکتانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے کیف و سرور حاصل کرتے ہیں۔ بندگی کی لذت تو تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرب الٰہی کی علامت عبادت کا ذوق رکھنا ہے۔

۲۔ جو ذوق عبادت رکھتے ہیں وہ عبادت سے اکتاتے نہیں ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوۡۤا اٰلِہَۃً مِّنَ الۡاَرۡضِ ہُمۡ یُنۡشِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ کیا انہوں نے زمین سے ایسے معبود بنا رکھے ہیں جو انہیں زندہ کرتے ہوں؟

تفسیر آیات

سوال: مشرکین کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا تو کسی زمینی معبود کے لیے اس بات کو کس طرح وہ ممکن سمجھتے ہیں؟ پھر یہ کہ ان کا اس قسم کا کوئی عقیدہ بھی نہیں ہے:

مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَ ہِیَ رَمِیۡمٌ ۝ [1]

اور کہنے لگتا ہے: ان ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کرے گا؟

جواب: یُنۡشِرُوۡنَ سے مراد صرف احیاء ہے، احیاء بعد الموت نہیں ہے۔ آیت کا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ معبود وہ ہوتا ہے جو خالق ہو۔ ہم نے عبادت کی تعریف میں بیان کیا ہے کہ کسی ذات کو رب یا خالق سمجھ کر اس تعظیم کرنا عبادت ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَہٗ ... [2]

اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بنانے پر بھی ہرگز قادر نہیں ہیں خواہ اس کام کے لیے وہ سب جمع ہو جائیں....

ظاہر ہے ان کے زمینی معبود (اصنام) کسی چیز کے خلق پر قدرت نہیں رکھتے۔ خود مشرکین اپنے بتوں کو خالق نہیں سمجھتے، وہ بھی اللہ کو خالق سمجھتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ معبود وہ ہو سکتا ہے جو خلق پر قادر ہو۔

لَوۡ کَانَ فِیۡہِمَاۤ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا معبود ہوتے تو دونوں (کے نظام) درہم برہم ہو جاتے، پس پاک ہے اللہ، پروردگار عرش ان باتوں سے جو یہ بناتے ہیں۔

---

[1] ۳۶ یس: ۷۸ [2] ۲۲ حج: ۷۳

تفسیر آیات

۱۔ لَوۡ کَانَ فِیۡہِمَاۤ: واضح رہے مشرکین معبود اسے بناتے تھے جو ان کے زعم میں کائنات کی تدبیر میں حصہ دار اور شریک ہے۔ لہٰذا تعدد معبود کا مطلب ان کے نزدیک تعدد مدبر ہے۔ چنانچہ وہ کسی ذات کو اپنے امور کا مدبر تسلیم کر کے اسے رب مانتے، پھر اس کی پرستش کرتے اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے ایک مدبر اور رب کو مانتے تھے۔ مثلاً فتح و نصرت کا رب، رزق کا رب، آسمان کا رب، زمین کا رب وغیرہ وغیرہ ورنہ وہ بھی ایک ہی خالق کو مانتے تھے۔ وہ تعدد خالق کے قائل نہ تھے:

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَہُمۡ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ...[1] اور اگر آپ ان سے پوچھیں: انہیں کس نے خلق کیا ہے؟ تو یہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔

یہ آیت معبود کی وحدت پر اس طرح دلیل قائم کرتی ہے: اگر اس کائنات میں ایک سے زیادہ معبود و مدبر ہوتے تو ذاتاً ایک دوسرے سے مختلف ہوتے۔ ذات میں مختلف ہونے سے تدبیر میں اختلاف لازم آتا ہے۔ تدبیر میں اختلاف سے نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا نظام کی وحدت، نظام دہندہ کی وحدت کی دلیل ہے۔ قانون کی وحدت، قانون ساز کی وحدت کا واضح ثبوت ہے۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہشام بن حکم روایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: اللہ کے ایک ہونے پر کیا دلیل ہے؟ فرمایا:

اتصال التدبیر و تمام الصنع ....[2] تدبیر میں ہم آہنگی اور صناعیت میں کمال۔

یعنی اگر ایک سے زائد مدبر ہوتے تو تدبیر میں خلا آ جاتا اور صناعیت میں نقص۔

۲۔ اگر ایک سے زیادہ معبود و مدبر ہوتے تو دونوں محدود ہوتے۔ محدود اپنی حدود میں محصور، دوسرے کی حدود میں مقہور ہوتا ہے۔ محصور اور مقہور معبود و مدبر نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اگر دو مدبر ہیں تو ایک چیز پر ہر دو ارادوں کا نافذ ہونا لازم آتا ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ ایک چیز دو مرتبہ وجود میں آئے۔ مثلاً زمین پر ایک ارادہ نافذ ہونے سے اس میں روئیدگی آ گئی۔ دوسری مرتبہ ایک اور ارادہ نافذ ہوا تو زمین کی روئیدگی وجود میں نہیں آ سکے گی چونکہ ایک موجود پر دو ارادے نافذ نہیں ہو سکتے۔

۴۔ روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: معبود ایک ہونے کی دلیل اتصال التدبیر ہے۔ یعنی تدبیر میں ہم آہنگی۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے: موجودہ تدبیر میں خاک، پانی اور دھوپ میں ہم آہنگی ہے جس کی وجہ سے دانہ اُگتا ہے۔ اگر ایک مدبر نے خاک بنائی، دوسرے نے پانی بنایا تو خاک اور

---

[1] ۴۳ زخرف: ۸۷ [2] ابن بابویہ۔ التوحید: ۲۵۰

پانی میں ہم آہنگی نہ ہوتی۔ خاک پر پانی پڑنے سے خاک سڑ جاتی اور پانی خراب ہو جاتا چونکہ جس مدبر نے پانی بنایا وہ خاک کی خاصیت سے بے خبر ہے اور جس نے خاک بنائی وہ پانی کی خاصیت سے آگاہ نہیں۔ اگر دونوں نے اتفاق کیا ہے تو متفقہ فیصلہ ایک ہوا، دو نہ ہوئے۔ یعنی تدبیر ایک ہو گئی۔ اس طرح جو فرض کیا تھا وہ ایک ہو جاتا ہے۔

۵۔ فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ: پاکیزہ ہے اللہ مشرکین کے وہم و خیال سے، جس میں وہ اللہ کے معبود اور مدبر کے مقام پر اس کی مخلوق کو بھی شریک کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ پروردگار عرش ہے۔ اس جگہ رب العرش کہنے سے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ عرش اللہ تعالیٰ کے مقام تدبیر سے عبارت ہے۔ چنانچہ اکثر جہاں بھی تدبیر سے مربوط کسی موضوع کا ذکر آتا ہے وہاں عرش کا ذکر بھی آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآنی تصریحات میں اللہ، خالق، رب اور مدبر ایک ہی ذات سے عبارت اور ناقابل تفریق ہے۔

۲۔ شرک کا بنیادی عقیدہ اللہ، خالق، رب اور مدبر میں تفریق پر قائم ہے۔

لَا یُسۡـَٔلُ عَمَّا یَفۡعَلُ وَ ہُمۡ یُسۡـَٔلُوۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ وہ جو کام کرتا ہے اس کی پرسش نہیں ہو گی اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کی ان سے پرسش ہو گی۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ پر سوال نہیں آتا کہ یہ کام کیوں انجام دیا؟ یعنی اعتراضی سوال نہیں ہوتا۔

۱۔ چونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور کوئی کام بغیر حکمت و مصلحت کے انجام نہیں دیتا لہٰذا اس کے کسی عمل پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جب کہ غیر اللہ سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ لہٰذ غیر اللہ سے سوال ہو سکتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک حقیقی ہے۔ وہ اپنے مملوک پر جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اس نے اپنی مملوک پر اس قسم کا تصرف کیوں کیا؟ پھر اللہ تعالیٰ نے خود ہمیں بتایا ہے کہ وہ حکیم ہے۔ بلا حکمت و مصلحت کوئی عمل انجام نہیں دیتا۔

کیا اللہ تعالیٰ کے افعال کسی غرض و غایت کے تابع معلل بالاغراض ہیں؟

اشاعرہ اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کسی غرض و غایت اور مصلحت و حکمت کے تابع نہیں ہیں۔ وہ فاعل الخیر والشر ہے۔ اللہ اپنے اعمال کی انجام دہی میں کسی غرض و غایت اور حکمت و مصلحت کا محتاج نہیں ہے۔ اس لیے اللہ کے افعال کے بارے میں سوال نہیں ہو سکتا۔

جواب دیا گیا ہے کہ اللہ اپنی ذات سے خارج کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے افعال کا حکمت کے تحت ہونا خود ذات خدا سے مربوط ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں موجود مصلحت کا محتاج نہیں ہے بلکہ اللہ کے افعال میں مصلحت کا ہونا، اس فعل کا ذات خدا سے صادر ہونے کے لیے ضروری ہے۔ فافھم ذلک۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ جب اللہ نے پانی خلق کیا تو اللہ پانی کے اندر موجود مصلحتوں کا محتاج نہیں ہے لیکن پانی کے اندر مصلحتوں کا ہونا پانی کے خلق کے لیے ضروری ہے ورنہ بے مصلحت، بے فائدہ، عبث کام اللہ سے صادر نہیں ہوسکتا۔

وَهُمۡ يُسۡـَٔلُوۡنَ: دوسرے لوگوں سے پوچھا جائے گا۔ چونکہ وہ مملوک بندے خطاکار ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ ۚ هٰذَا ذِكۡرُ مَنۡ مَّعِىَ وَذِكۡرُ مَنۡ قَبۡلِىۡ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ الۡحَـقَّ فَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝۲۴

۲۴۔ کیا انہوں نے اللہ کے سوا معبود بنا لیے ہیں؟ کہد یجیے: تم اپنی دلیل پیش کرو، یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب اور مجھ سے پہلے والوں کی کتاب ہے، (ان میں کسی غیر اللہ کا ذکر نہیں) بلکہ اکثر لوگ حق کو جانتے نہیں اس لیے (اس سے) منہ موڑ لیتے ہیں۔

تشریح کلمات

هَاتُوۡا: ھات۔ لے آؤ۔

برھان: اس دلیل کو کہتے ہیں جس سے یقین حاصل ہو۔

ذِكۡرُ: سے مراد یہاں وہ کتاب ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمِ اتَّخَذُوۡا: رسول اللہ ﷺ کے لیے حکم مل رہا ہے کہ آپؐ ان مشرکین سے غیر اللہ کے معبود برحق ہونے پر یقینی دلیل کا مطالبہ کریں۔ یہ دلیل وسند اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتابوں سے ہی مل سکتی ہے۔

۲۔ هٰذَا ذِكۡرُ مَنۡ مَّعِىَ: یہ قرآن میرے ساتھ والوں کی نصیحت ہے۔ اس میں بھی تمہارے لیے کوئی سند موجود نہیں ہے اور مجھ سے پہلے والوں کی نصیحت میں بھی توحید کا ذکر ہے، تمہارے مدعا پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

۳۔ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ: ان کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ ان کے مدعا پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر پاتے اور حق سے منہ موڑتے ہیں۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۲۵﴾

۲۵۔اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجا ہے اس کی طرف یہی وحی کی ہے، بتحقیق میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم صرف میری عبادت کرو۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں موجود اشارے کی تفصیل یہ ہے کہ تمام انبیاء توحید کی دعوت کے لیے مبعوث ہوئے اور سب کی دعوت کا مرکزی نقطہ ایک ہی معبود کی عبادت کرنا تھا۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا سُبۡحٰنَہٗ ؕ بَلۡ عِبَادٌ مُّکۡرَمُوۡنَ ﴿ۙ۲۶﴾ لَا یَسۡبِقُوۡنَہٗ بِالۡقَوۡلِ وَ ہُمۡ بِاَمۡرِہٖ یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۶۔ اور وہ کہتے ہیں: اللہ نے بیٹا بنایا ہے، وہ پاک ہے (ایسی باتوں سے) بلکہ یہ تو اللہ کے محترم بندے ہیں۔

۲۷۔ وہ تو اللہ (کے حکم) سے پہلے بات (بھی) نہیں کرتے اور اسی کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالُوا: مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی اولاد ہیں۔ سُبۡحٰنَہٗ اللہ کی ذات اس سے منزہ اور پاکیزہ ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اللہ اور غیر اللہ میں خالق و مخلوق اور عبد و معبود کا رشتہ ہو سکتا ہے، باپ بیٹے کا رشتہ ہونا اللہ تعالیٰ کی شان خالقیت کے منافی ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے علاوہ کوئی وجود ہو اور وہ اس کی مخلوق نہ ہو۔

۲۔ بَلۡ عِبَادٌ مُّکۡرَمُوۡنَ: یہ فرشتے عزت و تکریم کے قابل بندے ہیں۔ ان کی بندگی قابل احترام ہے چونکہ یہ بندگی کا حق ادا کرتے ہیں۔

۳۔ لَا یَسۡبِقُوۡنَہٗ بِالۡقَوۡلِ: وہ اللہ کے حکم سے پہلے بات تک نہیں کرتے۔ ان کی ہر بات حکم خدا کے تابع ہوتی ہے۔

۴۔ وَ ہُمۡ بِاَمۡرِہٖ یَعۡمَلُوۡنَ: ان کا عمل بھی اللہ کے حکم کے تابع ہوتا ہے۔ یہ فرشتے بندگی میں قابل

احترام اس لیے ہیں کہ وہ قول و فعل میں اللہ کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حقیقی بندگی یہ ہے کہ بندہ قول و فعل دونوں میں اللہ کے حکم کے تابع ہو۔

يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى وَ هُمۡ مِّنۡ خَشۡيَتِهٖ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اللہ ان باتوں کو جانتا ہے جو ان کے روبرو اور جو ان کے پس پردہ ہیں اور وہ فقط ان لوگوں کی شفاعت کر سکتے ہیں جن سے اللہ راضی ہے اور وہ اللہ کی ہیبت سے ہراساں رہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ يَعۡلَمُ: اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کے گزشتہ اور آیندہ اعمال کو جانتا ہے کہ ان میں کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔ وہ معصوم ہوتے ہیں۔

۲۔ وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ: مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم ان فرشتوں کی بندگی اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ کی بارگاہ میں یہ ہماری شفاعت کریں۔ واضح رہے کہ مشرکین آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنی دنیاوی زندگی کی آسائش کے حصول کے لیے فرشتوں کو شفیع سمجھتے تھے۔ اس آیت میں اس نظریے کی رد ہے کہ فرشتے مشرکوں کی شفاعت کریں گے۔ فرمایا: وہ صرف ان لوگوں کی شفاعت کریں گے جن سے اللہ راضی ہے۔ اللہ مشرکین سے راضی نہیں ہوسکتا۔ اس آیت میں فرشتوں کی شفاعت کی نفی نہیں فرمائی، مشرکین کے لیے شفاعت ملنے کی نفی فرمائی ہے۔

۳۔ وَهُمۡ مِّنۡ خَشۡيَتِهٖ مُشۡفِقُوۡنَ: اور وہ فرشتے خوف خدا کی وجہ سے ہراساں رہتے ہیں۔ شفق اس خوف کو کہتے ہیں جس کے ساتھ ہمدردی اور نصیحت کا امتزاج ہوتا ہے۔ شفیق وہ ہے جو کسی پر مہربانی کی وجہ سے اس کے بارے میں خوف کرے کہ بچہ کہیں گر نہ جائے، چوٹ نہ لگ جائے۔ فرشتے خوف خدا کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا رہے ہوتے ہیں۔ اسی شفقیت کی بنا پر فرشتے معصوم ہوتے ہیں۔

وَمَنۡ يَّقُلۡ مِنۡهُمۡ اِنِّىۡۤ اِلٰهٌ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَذٰلِكَ نَجۡزِيۡهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اور ان میں سے جو کوئی یہ کہدے کہ اللہ کے علاوہ میں بھی معبود ہوں تو ہم اسے جہنم کی سزا دیتے ہیں، چنانچہ ظالموں کو ہم اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

اگر بالفرض فرشتوں میں سے کوئی اللہ کی جگہ اپنے آپ کو معبود بنائے تو وہ فرشتہ جہنمی ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے نافرمانی کرنے پر قادر ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ مکلّف نہ ہوں اور یکطرفہ مخلوق ہوں، گناہ کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔ شیخ طوسی التبیان میں فرماتے ہیں:

وذلك يدلُّ على ان الملائكة ليسوا مطبوعين على الطاعات كما يقول الجهال۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ملائکہ خدا کی اطاعت پر مجبور نہیں ہیں جس طرح جاہل لوگ کہتے ہیں۔

اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا ؕ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ کیا کفار اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ یہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کر دیا ہے اور تمام جاندار چیزوں کو ہم نے پانی سے بنایا ہے؟ تو کیا (پھر بھی) وہ ایمان نہیں لائیں گے؟

تشریح کلمات

رتق: (ر ت ق) الرتق کے معنی جوڑنا اور ملانا کے ہیں۔

فتق: (ف ت ق) الفتق کے معنی دو متصل چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَلَمۡ یَرَ: یہاں رؤیت سے مراد علمی رویت ہو سکتی ہے جیسا کہ اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ۔[1] میں علمی رؤیت مراد ہے اور بعض تفسیروں کے مطابق بصری رؤیت بھی ہو سکتی ہے۔

۲۔ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا: یہاں اہل کفر سے مراد مشرکین ہیں جو تخلیق و تدبیر میں تفریق کے قائل تھے اور اللہ کو خالق اور اپنے معبودوں کو مدبر مانتے تھے۔ ان مشرکین کے نظریات کی رد میں کائنات کی تدبیر کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں کہ تخلیق و تدبیر دونوں ایک ہی ذات کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

۳۔ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ: آسمان و زمین کی تخلیق و تدبیر میں ارتقائی مراحل کا بیان ہے کہ زمین و آسمان ایک زمانے میں باہم متصل تھے بعد میں اللہ نے ان کو جدا کر دیا۔

اس موضوع پر متعدد تفسیری مواقف سامنے آتے ہیں:

---

[1] ۱۰۵ فیل: ۱

i۔ آسمان اور زمین میں سے ہر ایک باہم متصل تھے۔ اللہ نے ان میں شگاف ڈال دیا اور ہر ایک کو سات سات بنایا۔

ii۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ابتداء میں آسمان بند تھا، بارش نہیں برساتا تھا اور زمین بھی بند تھی، سبزہ نہیں اگاتی تھی۔ پھر اللہ نے ان دونوں میں شگاف ڈال دیا تو آسمان بارش برسانے لگا اور زمین سبزہ اگانے لگی۔

اس صورت میں السَّمٰوٰتِ سے مراد آسمان اول کے آفاق لیے جا سکتے ہیں اور اس تفسیر کے مطابق رؤیت سے مراد بصری ہو گی جو مشرکین کے لیے قابل مشاہدہ ہے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت بھی اس تفسیر کے مطابق ہے۔

كَانَتِ السَّمَاءُ رَتْقاً لَا تُنْزِلُ الْمَطَرَ وَ كَانَتِ الْاَرْضُ رَتْقاً لَا تُنْبِتُ الْحَبَّ فَلَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى الْخَلْقَ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ فَتَقَ السَّمَاءُ بِالْمَطَرِ وَالْاَرْضَ بِنَبَاتِ الحَبِّ...[1]	آسمان بند تھا، بارش نہیں برساتا تھا اور زمین بھی بند تھی، دانہ نہیں اگاتی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا اور جانداروں کو پھیلایا تو آسمان میں بارش کے ساتھ اور زمین میں دانہ اگنے کے ساتھ شگاف آ گیا۔

نیز اس روایت میں السَّمٰوٰتِ کی جگہ السماء مفرد آیا ہے۔ آیت میں آفاق اور روایت میں بلندی مراد لی جا سکتی ہے۔

اس تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین میں سے ہر ایک باہم ملے ہوئے تھے درمیان میں کوئی شگاف نہ تھا۔ ہم نے ان دونوں میں شگاف ڈال دیا تو آسمان برسنے اور زمین سبزہ اُگانے لگی۔

۳۔ آسمان سے مراد اجرام سماوی ہیں۔ نظام شمسی میں موجود تمام کرات ایک تھے۔ بعد میں ایک دھماکے کے نتیجے میں یہ کرات سورج سے جد ہو گئے۔ اس طرح زمین اور باقی کرات سورج کے ساتھ ایک تھے۔ بعد میں الگ ہو گئے ہیں۔

۴۔ جن عناصر سے آسمان اور زمین وجود میں آئے ہیں ان سب کا مادہ اصلیہ ایک ہے۔ ممکن ہے یہ مادہ ابتدا میں سحابی شکل میں ہو جسے قرآن نے دخان (دھواں) کہا ہے اور بعد میں آسمان اور زمین میں منقسم ہو کر جدا ہو گیا ہو۔

اس امکان کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ کائنات کی ابتدا ایک نقطے سے ہوئی جس کے پھیلنے سے تمام اجرام وجود میں آ گئے اور پھیلنے کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ کہتے ہیں: فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا جملہ اس نظریہ پر قرینہ ہے چونکہ فطر شگافتہ کرنے کو کہتے ہیں۔

---

[1] الکافی: ۸: ۹۴

یہ اپنی جگہ درست ہے کہ اگر آسمان و زمین سے اجرام فلکی مراد لیے جاتے ہیں تو ان تمام اجرام کا مادہ اولیہ ایک ہے مگر اس مادہ اولیہ کے وصل و فصل (رتق و فتق) کی تفصیل بیان کرنا اور اس کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے سائنسی نظریات کی طرف رجوع کرنا، جو ہنوز صرف تھیوری کے مرحلے میں ہیں اور انہیں سند قرار دینا درست نہ ہو گا چونکہ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں جب کہ قرآن ایک لا یتغیر اور ثابت حقیقت ہے۔ ثانیاً قرآن ایک دستور حیات ہے، سائنسی اور فلکیاتی موضوع کی کتاب نہیں ہے۔

۵۔ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ: تمام جاندار چیزوں کو ہم نے پانی سے بنایا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ ۔۔۔ [1] اللہ نے زمین پر چلنے والے ہر جاندار کو پانی سے خلق فرمایا۔

پانی زندہ اشیاء کی تخلیق اور بقا دونوں کے لیے بنیادی عنصر ہے چنانچہ انسان، حیوانات اور نباتات کی حیات پانی پر موقوف ہے۔ انسان کو اپنے ذرائع سے بھی پتہ چلا ہے کہ زندہ مخلوقات پانی کے کناروں سے پیدا ہونا شروع ہوتی ہیں۔ چنانچہ دوسرے کرات پر زندگی کا سوال ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہاں پانی کے وافر مقدار میں موجود ہونے کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔

اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ: کیا یہ مشرکین اللہ کے تدبیری معجزات دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے کہ اس کائنات کی تدبیر کسی غیر اللہ کا ہاتھ میں نہیں ہے۔

وَجَعَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِہِمۡ ۪ وَجَعَلۡنَا فِیۡہَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۳۱﴾	۳۱۔ اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنا دیے تاکہ وہ لوگوں کو متزلزل نہ کرے اور ہم نے اس میں کشادہ راستے بنائے کہ لوگ راہ پائیں۔

تشریح کلمات

تَمِیۡدَ: (م ی د) مید ڈولنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَجَعَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ: زمین مختلف تہوں پر مشتمل ہے۔ ان سب تہوں کو مربوط رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے ذریعے میخ کوبی کی ہے جس سے زمین کی ایک تہ دوسری تہ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ ورنہ حرکت زمین کی وجہ سے زمین کے اوپر کا حصہ نیچے کے سیال حصہ پر ڈولنے لگتا۔

---

[1] ۲۴ نور: ۴۵

۲۔ وَجَعَلۡنَا فِیۡہَا فِجَاجًا سُبُلًا: پہاڑوں کے درمیان کشادہ راستے نہ ہوتے تو پہاڑوں سے بہنے والا پانی وادیوں اور میدانی علاقوں کو سیراب نہ کرتا اور ساتھ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جانے میں دشواریاں پیش آتیں۔

وَ جَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ۚۖ وَّ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِہَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا اور اس کے باوجود وہ اس کی نشانیوں سے منہ موڑتے ہیں۔

تفسیر آیات

زمین پر بسنے والوں کے لیے فضائے بالا (آسمان) کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ چھت بنا دیا ہے جس کی وجہ سے اہل ارض محفوظ رہتے ہیں۔

۱۔ شب و روز میں گرنے والے لاکھوں آسمانی پتھروں سے محفوظ رہتے ہیں۔ چنانچہ کرۂ ارض کے گرد موجود فضائی ٹائٹل آسمان سے گرنے والے شہابوں کو روک لیتا ہے اور فضا میں پاش پاش کر دیتا ہے۔ یہ ہوائی غلاف نہ ہوتا تو زمین پر بسنے والے ان شہابوں سے نابود ہو جاتے۔

۲۔ سورج کی طرف سے آنے والی قاتل شعاعوں کو اوزون اپنے اندر جذب کر لیتی اور زمین پر آنے سے روک دیتی ہے۔

حفظ و نگہداری کا عمل تدبیر سے ہے لہٰذا مشرکین کے لیے ایک دعوت فکر ہے کہ ان تدبیری آیات اور علامات سے اعراض نہ کرو۔ ان میں فکر کرو تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ اس کائنات کی تدبیر میں کوئی غیر اللہ شریک نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ آسمان میں اللہ کی تدبیری نشانیاں، تخلیقی نشانیوں سے کم نہیں ہیں۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ وَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور اسی نے شب و روز اور آفتاب و ماہتاب پیدا کیے، یہ سب کسی نہ کسی فلک میں تیر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں تخلیقی اور تدبیری دونوں نشانیوں کا ذکر ہے:

۱۔ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ: شمس و قمر کی تخلیق اللہ کی خلاقیت کی نشانی ہے اور ساتھ لیل و نہار کی گردش اللہ تعالیٰ کی تدبیری نشانی ہے کہ ہمیشہ دن یا ہمیشہ رات ہونے کی صورت میں بھی زمین پر انسان آباد نہیں رہ سکتا تھا۔

۲۔ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ: شمس و قمر میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تدبیری نشانی ہے کہ شمس و قمر کی تخلیق کے بعد ان کو اپنے مدار میں چھوڑ دیا۔ اربوں سال سے یہ اپنے رب کے حکم تکوینی کے عین مطابق گردش کر رہے ہیں۔ اس گردش کے بغیر نظام زندگی اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا۔

کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ: کا تعلق شمس و قمر سے ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کی اپنے اپنے مدار میں گردش کی وجہ سے زمین پر تدبیر حیات انجام پاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کا ہر ذرہ اللہ کی تدبیر کا محتاج ہے۔

وَ مَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ الۡخُلۡدَ ؕ اَفَا۠ئِنۡ مِّتَّ فَہُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی انسان کو حیات جاودانی نہیں دی تو کیا اگر آپ انتقال کر جائیں تو یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟

تفسیر آیات

مشرکین اس انتظار میں تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بے اولاد ہیں، ان کے دنیا سے جانے کے بعد ہمارے معبودوں کے خلاف اسلامی تحریک بھی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ کہتے تھے:

نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ ۝[1] ہم اس کے بارے میں گردش زمانہ (موت) کے منتظر ہیں۔

۱۔ وَ مَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ الۡخُلۡدَ: بشر زمانے کی زد میں ہے اور جو چیز بھی زمانے کی زد میں ہو گی اس کے لیے دوام نہیں ہے۔ جس کی کوئی ابتدا ہے، اس کی انتہا بھی ہے۔

آیت کے اس جملے سے حضرت خضر علیہ السلام کی حیات کی نفی نہیں ہوتی چونکہ اس آیت میں دوام (خلود) کی نفی ہو رہی ہے، طول العمری کی نہیں۔ چنانچہ ایک دن حضرت خضر علیہ السلام نے بھی موت کا سامنا کرنا ہے۔ مِّنۡ قَبۡلِکَ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کے بعد کسی بشر کو حیات جاودانی مل جائے گی۔

۲۔ اَفَا۠ئِنۡ مِّتَّ فَہُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ: اے رسول اگر آپ نے اس دنیا سے جانا ہے تو کیا یہ مشرکین ہمیشہ رہیں گے؟ ان مشرکوں نے بھی مرنا اور نابود ہونا ہے۔

---

[1] ۵۲ طور: ۳۰

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی اسلامی تحریک کے لیے دوام کی بشارت ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی شماتت کرنے والوں کے لیے پیغام موت ہے۔

۲۔ دنیاوی زندگی میں کسی کے لیے بھی خلود کا تصور نہیں ہے۔

كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ وَ نَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَيۡرِ فِتۡنَةً ؕ وَ اِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۵﴾	۳۵۔ ہر نفس کو موت (کا ذائقہ) چکھنا ہے اور ہم امتحان کے طور پر برائی اور بھلائی کے ذریعے تمہیں مبتلا کرتے ہیں اور تم پلٹ کر ہماری ہی طرف آؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ: ہر زندہ کو موت کا سامنا کرنا ہے۔ ہر صاحب نفس کی انتہا موت ہے۔

نَفۡسٍ۔ عین ذات۔ ''خود'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے:

كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ...[1] تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔

پھر یہ لفظ انسان کے لیے بھی استعمال ہونے لگا: يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ [2] خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ ...[3]

اس آیت میں نفس سے مراد انسان ہے جیسے:

مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ...[4]	جس نے کسی ایک کو قتل کیا جب کہ یہ قتل خون کے بدلے میں یا زمین میں فساد پھیلانے کے جرم میں نہ ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا۔

۲۔ وَ نَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَيۡرِ: اللہ تعالیٰ دو طریقوں سے انسان کو امتحان میں ڈالتا ہے: صبر و شکر کے ذریعے:

۱۔ بِالشَّرِّ: جب شر کے ذریعے آزمائش کی جاتی ہے تو اس میں صبر کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے امتحان بالشر کی تصویر سورہ بقرۃ آیت ۱۵۵ میں بیان فرمائی ہے۔

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَـوۡفِ وَالۡجُـوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ۞	اور ہم تمہیں کچھ خوف، بھوک اور جان و مال اور ثمرات (کے نقصانات) سے ضرور آزمائیں گے اور آپ ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔

---

[1] ۶ انعام: ۵۴ [2] ۸۹ فجر: ۲۷ [3] ۳۹ زمر: ۶ [4] ۵ مائدۃ: ۳۲

۲۔ وَالۡخَیۡرِ: بھلائی کے ذریعے آزمائش میں مال و اولاد، عزت و مقام اور حکومت و کرسی وغیرہ شامل ہیں۔ ان دونوں آزمائشوں میں آسائش کے ذریعے ہونے والا امتحان بہت مشکل ہے۔ مثلاً دولت نہ ملنے پر صبر کرنا آسان ہے مگر مال و دولت ملنے پر شکر کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی ظالم کے ظلم پر صبر کرنا آسان ہے لیکن اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر عدل و انصاف دینا اور ظلم نہ کرنا مشکل ہے۔

اہم نکات

۱۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس امتحان کے دونوں پرچوں میں پاس ہو جاتے ہیں۔

۲۔ جو مال و دولت اور اقتدار و کرسی پر شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا اسے مال و دولت نہ دینا اللہ کی طرف سے عظیم احسان ہے۔

وَ اِذَا رَاٰکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّتَّخِذُوۡنَکَ اِلَّا ہُزُوًا ؕ اَہٰذَا الَّذِیۡ یَذۡکُرُ اٰلِہَتَکُمۡ ۚ وَ ہُمۡ بِذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور کافر جب بھی آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا بس استہزاء کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کیا یہ وہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا (برے الفاظ میں) ذکر کرتا ہے؟ حالانکہ وہ خود رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا رَاٰکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا: مکی زندگی میں رسول اللہ ﷺ جن حالات سے دوچار تھے ان کا ذکر ہے کہ کفار جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے ان کا استہزا کرتے تھے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کے لیے پوری فضا ناسازگار تھی۔

۲۔ اَہٰذَا الَّذِیۡ یَذۡکُرُ اٰلِہَتَکُمۡ: از راہ تمسخر آپس میں کہتے: کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے معبودوں کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک اس تمسخر کے لیے جواز یہ ہے کہ یہ بے حس بتوں کو معبود نہیں بناتا جب کہ یہ خود معبود حقیقی کو مسترد کرتے ہیں۔

۳۔ وَ ہُمۡ بِذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ: یہ مشرکین خود ایسے مذہب کو اختیار کیے ہوئے ہیں جو لائق تمسخر ہے۔ وہ معبود حقیقی رحمٰن کی بندگی کو چھوڑ کر بے حس و بے شعور چیزوں کی بندگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ رحمٰن کو یہ خود رب الارباب مانتے ہیں اس کے باوجود جمادات کی بندگی کر رہے ہیں۔

خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ[1] سَاُورِیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۳۷﴾	۳۷۔انسان عجلت پسند خلق ہوا ہے،عنقریب میں تمہیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا پس تم جلد بازی نہ کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ: انسان اس حد تک عجلت پسند ہے کہ گویا اس کو عجلت کے مواد سے بنایا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے انسان کے تخلیقی عناصر عجلت پسندی سے عبارت ہوں۔ جیسے کہا جاتا ہے: خلق زید من الشجاعۃ۔زید شجاعت سے بنایا گیا ہے۔بعض کہتے ہیں:عجل، گِل (مٹی) کو کہتے ہیں لیکن فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ میں اس کی نفی ہے۔

مشرکین حیات بعد الموت کے قائل نہ تھے۔ لہٰذا کسی عذاب و حساب اور جنت و دوزخ کو نہ مانتے اور تمسخرانہ انداز میں کہتے تھے: اگر کوئی قیامت آنے والی ہے تو وہ کب آئے گی؟ جواب میں فرمایا:

۲۔ سَاُورِیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ: جس چیز کی تمہیں جلدی ہے وہ عنقریب تمہیں دکھا دوں گا یہاں اٰیٰتِیۡ سے مراد جہنم کا عذاب ہے جس کے یہ لوگ منکر تھے اور عجلت بھی کر رہے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

مِنَ الۡخُرقِ الۡعَجلَۃُ قَبۡلَ الۡاِمۡکَانِ وَ الۡاِنَاءۃُ بَعۡدَ اِصَابَۃِ الۡفُرۡصَۃِ۔[1]	امکان سے پہلے جلد بازی کرنا فرصت کے موقع پر تاخیر کرنا دونوں خلاف ورزی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّمَا اَھۡلَکَ النَّاسَ الۡعَجَلَۃُ وَلَوۡ اَنَّ النَّاسَ تَلَبَّثُوا لَمۡ یَھۡلِکۡ اَحَدٌ۔[2]	لوگوں کو جلد بازی نے ہلاکت میں ڈالا ہے اگر لوگ صبر سے کام لیتے تو کوئی ہلاک نہ ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ عجلت پسندی انسان کے لیے ایک ناپسندیدہ خصلت ہے۔

وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۸﴾	۳۸۔اور وہ کہتے ہیں: اگر آپ سچے ہیں تو بتائیں یہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا؟

تفسیر آیات

وَ یَقُوۡلُوۡنَ: مشرکین کا یہ کہنا کہ وہ بات جس سے ہم کو ڈرایا جاتا ہے کب آنے والی ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۲: ۷۳ [2] وسائل الشیعۃ ۱۷: ۱۶۸۔ بحار الانوار۔ ۶۸: ۳۴۰

صرف اس مقصد کے لیے تھا کہ پیغمبرؐ قیامت کو فوری پیش کرنے سے عاجز رہیں گے، اس طرح ہم فضا ان کے خلاف کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کا جواب اگلی آیت میں ہے۔

لَوۡ یَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا حِیۡنَ لَا یَکُفُّوۡنَ عَنۡ وُّجُوۡہِہِمُ النَّارَ وَ لَا عَنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ کاش! کفار کو اس وقت کا علم ہو جاتا جب وہ آتش جہنم کو نہ اپنے چہروں سے اور نہ ہی اپنی پشتوں سے ہٹا سکیں گے اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

بَلۡ تَاۡتِیۡہِمۡ بَغۡتَۃً فَتَبۡہَتُہُمۡ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ رَدَّہَا وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ بلکہ یہ (قیامت کا ہولناک عذاب) ان پر اچانک آئے گا تو انہیں بدحواس کر دے گا پھر انہیں نہ اسے ہٹانے کی استطاعت ہو گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔

تفسیر آیات

۱۔ لَوۡ یَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: یہ عذاب کب آئے گا؟ کہنے والے لوگوں کو کاش اس بات کا علم ہو جاتا کہ وہ عذاب کو روک نہیں سکیں گے کیونکہ یہ عذاب ہر طرف سے آئے گا۔

چہرے اور پشت کا ذکر اس بات کو واضح کرنے کے لیے ہے کہ ہر طرف سے عذاب ان کافروں کو گھیر لے گا۔ آگے بھی آتش پیچھے بھی آتش۔

۲۔ بَلۡ تَاۡتِیۡہِمۡ بَغۡتَۃً: قیامت کا عذاب جب آئے گا، اچانک آئے گا تو کافر مبہوت ہو جائیں گے۔ اپنے کسی ارادے کے مالک نہیں رہیں گے کہ اس سے بچنے کی کوئی سبیل تلاش کریں۔ یہاں تک مہلت بھی نہیں ملے گی۔

وَ لَقَدِ اسۡتُہۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَحَاقَ بِالَّذِیۡنَ سَخِرُوۡا مِنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اور بتحقیق آپ سے پہلے بھی رسولوں کا استہزا ہوتا رہا ہے مگر ان استہزا کرنے والوں کو اسی عذاب نے آ گھیرا جس کا وہ استہزا کیا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

جس عذاب کے بارے میں مشرکین دنیا میں تمسخر کرتے تھے آج وہی عذاب ان کو گھیر لے گا۔

انبیاءؑ کے ساتھ تمسخر، کفر کی ایک مشترکہ خاصیت ہے جو تمام کافر قوموں میں موجود رہی ہے۔

استہزا اور تمسخر ایک غیر انسانی جرم ہے اور احترام آدمیت کے خلاف ہے۔ اس میں دوسرے کی تحقیر اور اپنے تکبر کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کو ایک ایسا دن دیکھنا ہو گا جس میں خود ان کے ساتھ تمسخر اور تحقیر آمیز سلوک کیا جائے گا۔

مزید تشریح کے ملاحظہ ہو انعام آیت ۱۰۔

اہم نکات

۱۔ تمسخر، خفت عقلی کی علامت ہے جب کہ دلیل طلب کرنا معقولیت کی علامت ہے۔

قُلۡ مَنۡ یَّکۡلَؤُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ مِنَ الرَّحۡمٰنِ ؕ بَلۡ ہُمۡ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّہِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ کہد یجیے: رات اور دن میں رحمٰن سے تمہیں کون بچائے گا؟ بلکہ یہ لوگ تو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

تشریح کلمات

یَّکۡلَؤُ: (ک ل ء) حفاظت کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ استفہام انکاری ہے کہ کون ہے جو تمہیں لیل و نہار کے اوقات میں رحمٰن سے بچائے؟ کسی ظالم سے بچنا آسان ہے لیکن اس ذات کے تم مجرم بن رہے ہو جو بذات خود رحمٰن ہے، مصدر رحمت ہے۔ اس رحمت والی ذات سے بڑھ کر کوئی رحمت والا موجود نہیں جو تمہیں پناہ دے۔ رحمٰن کا ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا جرم اس قدر سنگین ہے کہ اللہ کی ذات رحمٰن ہونے کے باوجود تمہیں ایسے عذاب میں مبتلا کر دے گی جس سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔

۲۔ بَلۡ ہُمۡ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّہِمۡ: اپنے رب سے روگردانی کر کے تم ایک موہوم چیز کی امید میں ہو۔

اہم نکات

۱۔ تعجب ہے اس انسان پر کہ جس ہستی کے پاس سب کچھ ہے اس سے بے رخی اور جس کے پاس کچھ بھی نہیں اس سے امیدیں وابستہ کرتا ہے۔

اَمۡ لَهُمۡ اٰلِهَةٌ تَمۡنَعُهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِنَا ؕ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ نَصۡرَ اَنۡفُسِهِمۡ وَ لَا هُمۡ مِّنَّا یُصۡحَبُوۡنَ ﴿۴۳﴾	۴۳۔ کیا ہمارے علاوہ بھی ان کے معبود ہیں جو انہیں بچا لیں؟ وہ تو خود اپنی مدد کی بھی استطاعت نہیں رکھتے اور نہ ہی ہماری طرف سے ان کا ساتھ دیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ لَهُمۡ: کیا ہمارے علاوہ ان کے پاس ایسے معبود ہیں جو ان کو تحفظ دیں؟ اگر ایسا ہے تو ان معبودوں سے اپنا تحفظ حاصل کرو۔

۲۔ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ نَصۡرَ اَنۡفُسِهِمۡ: وہ تمہاری کیا مدد کریں گے، خود اپنا تحفظ نہیں کر سکتے۔

۳۔ وَ لَا هُمۡ مِّنَّا یُصۡحَبُوۡنَ: نہ ہی وہ ہماری طرف سے کچھ حاصل کر سکیں گے۔ تمہارے یہ معبود تمہیں تحفظ دینے کے لیے اپنے پاس کچھ رکھتے ہیں نہ ہم سے تحفظ دلا سکتے ہیں۔

آیت کے اس جملے سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ کوئی ایسا راستہ موجود ہے جس کے ذریعے اللہ سے تحفظ اور شفاعت حاصل کرنا ممکن ہے۔ مثلاً اعمال صالحہ، شفاعت کنندہ ہستیوں کی اتباع وغیرہ۔

اہم نکات

۱۔ انسان اپنے اندر اہلیت پیدا کرے تو مجاز ہستیوں کے ذریعے شفاعت حاصل کر سکتا ہے۔

بَلۡ مَتَّعۡنَا هٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمۡ حَتّٰی طَالَ عَلَیۡهِمُ الۡعُمُرُ ؕ اَفَلَا یَرَوۡنَ اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۴۴﴾	۴۴۔ بلکہ ہم تو انہیں اور ان کے آبا کو سامان زیست دیتے رہے یہاں تک کہ ان پر عرصہ دراز گزر گیا تو کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم عرصہ زمین ہر طرف سے تنگ کر رہے ہیں؟ تو کیا (پھر بھی) یہ لوگ غالب آنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین کو ایک مدت تک اللہ تعالیٰ نے ڈھیل دے رکھی ہے۔ یہ ڈھیل اس لیے نہیں تھی کہ ان مشرکوں کو ہم سے بچانے والے کوئی تھا۔

۲۔ حَتّٰی طَالَ عَلَیۡهِمُ الۡعُمُرُ: اس ڈھیل کی مدت بھی لمبی ہوگئی۔ اس ڈھیل سے انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم کسی کی گرفت میں آنے والے نہیں ہیں۔ اگر کوئی عذاب آنے والا تھا جیسا کہ انبیاء کہتے ہیں تو اس عذاب کو ابھی آنا چاہیے تھا۔

۴۔ اَفَلَا یَرَوۡنَ اَنَّا نَاۡتِی: اب یہ مہلت ختم ہونے کو ہے جس کی علامات ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہیں اور وہ ہیں ان پر زمین تنگ ہو رہی اور ہر طرف سے ان پر دائرہ تنگ ہو رہا ہے۔ یہ تو ہوئے ان کے مغلوب ہونے کے آثار۔

۵۔ الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا: زمین مشرکین کے لیے تنگ ہو رہی ہے۔ زمین تنگ ہونے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ علاقوں پر مسلمانوں کو فتح حاصل ہو رہی ہے اور قریہ قریہ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اسلام کے لیے زمین کشادہ ہو رہی ہے۔ شرک کے لیے زمین تنگ ہو رہی ہے۔ اِذَا ضَاقَتۡ عَلَیۡہِمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ۔[1]

لیکن یہ تفسیر سورہ کے مکی ہونے کے ساتھ سازگار نہیں ہے چونکہ مکی زندگی میں کوئی علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا۔ البتہ الاتقان میں اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے۔ اس صورت میں اس تفسیر پر مذکورہ اعتراض وارد نہ ہوگا اور یہ تفسیر بھی کی جاتی ہے کہ زمین تنگ کرنے سے مراد موت کی وجہ سے مشرکین کی نفری کم ہونا ہے۔ چنانچہ نقص افراد کو زمین کی تنگی سے تعبیر کرنا ایک محاورہ ہے۔

المیزان کی تفسیر پر یہ اعتراض نہیں آتا۔ ان کے نزدیک نقص الۡاَرۡضَ سے گزشتہ قوموں کی ہلاکت مراد ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے گزشتہ قومیں یکے بعد دیگرے مٹتی رہیں تو تم ہمیشہ رہو گے اور غالب آجاؤ گے؟

یہ ساری تفاسیر سیاق آیت سے بہت دور ہیں۔ صرف اس آیت کا مدنی ہونا قرین واقع معلوم ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ظالم اور مجرم کی مہلت دیکھ کر یہ خیال دل میں نہ آئے کہ اس دیس میں اندھیر ہے۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اُنۡذِرُکُمۡ بِالۡوَحۡیِ ۫ۖ وَ لَا یَسۡمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا یُنۡذَرُوۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ کہدیجیے: میں وحی کی بنا پر تمہیں تنبیہ کر رہا ہوں مگر جب بہروں کو تنبیہ کی جائے تو (کسی) پکار کو نہیں سنتے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنَّمَاۤ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم مل رہا ہے کہ آپ کہدیں کہ میرا کام صرف اور صرف تمہاری تنبیہ کرنا ہے کہ تم ہلاکت میں نہ پڑو۔ یہ تنبیہ اپنی طرف سے نہ ہوگی بلکہ وحی کے ذریعے ہوگی۔ بِالۡوَحۡیِ وحی نازل نہ ہونے کی صورت میں حضورؐ انتظار فرماتے تھے۔ کسی سوال کا جواب تک ارشاد نہیں فرماتے تھے۔

---

[1] ۹ توبہ:۱۱۸ (ترجمہ) جب اپنی وسعت کے باوجود زمین ان پر تنگ ہوگئی تھی۔

وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ؕ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۙ﴿۴﴾ [1]　　وہ خواہش سے نہیں بولتا۔ یہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو (اس پر) نازل کی جاتی ہے۔

واضح رہے: رسول اللہ ﷺ کو اجتہاد کی ضرورت پیش نہیں آتی، چونکہ یہ بات سب کے ہاں متفقہ ہے کہ جہاں صریح نص ہو وہاں اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ رسولؐ کے لیے کوئی دلیل مبہم نہیں ہوتی کہ اجتہاد کرنا پڑے۔ رسولؐ کے لیے سب احکام صریح منصوص ہوتے ہیں۔

۲۔ وَلَا یَسۡمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ: رسولؐ کی تنبیہ ان لوگوں کے لیے بے اثر ہوتی ہے جن میں حق کو قبول کرنے کے لیے صلاحیت اور ظرفیت نہیں ہوتی۔ تنبیہ میں کوئی خامی نہیں۔ جن لوگوں نے تنبیہ سننا تھی ان میں خامی ہے۔ آواز میں خامی نہیں، سننے والے کانوں میں خامی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی طرف سے انذار ہوتا ہے، اجبار نہیں ہوتا۔

۲۔ رسولؐ تابع وحی ہیں، تابع اجتہاد نہیں ہیں۔

۳۔ اجتہاد دلیل کو سمجھنے کے لیے ہوتا ہے، خود دلیل کو اجتہاد نہیں کہتے۔

وَ لَئِنۡ مَّسَّتۡہُمۡ نَفۡحَۃٌ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّکَ لَیَقُوۡلُنَّ یٰوَیۡلَنَاۤ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۴۶﴾　　۴۶۔ اور اگر انہیں آپ کے پروردگار کا تھوڑا سا عذاب بھی چھو جائے تو وہ ضرور کہنے لگ جائیں گے: ہائے ہماری تباہی! ہم یقیناً ظالم تھے۔

تشریح کلمات

نفحۃ: (ن ف ح) نفحۃ عذاب کا ایک حصہ۔

تفسیر آیات

ان مشرکین کے لیے ہمدردانہ تنبیہ اثر نہیں کرتی البتہ تھوڑا سا عذاب چھو لے تو اس وقت قبول کرتے ہیں کہ ہم ظالم ہی تھے۔ اپنے آپ پر ظلم کیا اور یہ دن دیکھنا پڑا۔

اہم نکات

۱۔ ان مشرکوں کو کوئی بات سمجھانی ہو تو عقل و فکر سے نہیں، حواس کے ذریعہ داغ دیا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ یہ کام جبر ہے اور دنیا میں جبر نہیں ہوتا چونکہ دنیا دار امتحان ہے۔ آخرت

----

[1] ۵۳ نجم: ۳۔۴

میں ان کو عذاب سے واسطہ پڑے گا تو بات سمجھ میں آ جائے گی مگر اس کا فائدہ نہ ہوگا۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔اور ہم قیامت کے دن عدل کا ترازو قائم کریں گے پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا اور اگر رائی کے دانے برابر بھی (کسی کا عمل) ہوا تو ہم اسے اس کے لیے حاضر کر دیں گے اور حساب کرنے کے لیے ہم ہی کافی ہیں۔

تشریح کلمات

مِثْقَالَ: (ث ق ل) المثقال: ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے۔

خَرْدَلٍ: (خ ر د ل) رائی کے دانے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ: میزان اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے چیزوں کو پرکھا جائے۔ قیامت کے دن عدل کا میزان لگ جائے گا۔ یہ ترازو عدل و انصاف کا ترازو ہوگا۔ یہ ترازو کس قسم کا ہوگا، اس پر بحث و تحقیق کا فائدہ نہیں۔ صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ قیامت کے روز انسان کے اعمال پرکھ لیے جائیں گے۔ اعمال میں سے نیک اعمال کا وزن ہوگا اور برے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ مزید وضاحت کے لیے سورہ اعراف: ۸ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا: یہ عدل و انساف کا ترازو ہوگا۔ یہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرنے اور عدل و انصاف دینے کا آلہ ہے۔

۳۔ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ: خواہ وہ عمل ایک رائی کے دانے کے برابر ہی کیوں نہ ہو ہم اسے سامنے لائیں گے۔ خواہ نیکی ہو یا برائی۔ چنانچہ سورہ الزلزال میں آیا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ [1] اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

۴۔ اَتَيْنَا بِهَا: ہم اسے سامنے لائیں گے۔ آیت کے اس جملے میں صراحت ہے کہ خود عمل حاضر کیا جائے گا۔ یہاں اتینا بجزائھا ہم اس عمل کی جزا پیش کریں گے کی تاویل درست نہ ہوگی چونکہ جزا کے لیے

---

[1] ۹۹ زلزال: ۷۔ ۸

اٰتَیۡنَا استعمال نہیں ہوتا۔

۵۔ وَکَفٰی بِنَا حٰسِبِیۡنَ: حساب کے لیے ہم کافی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا میزان اور حساب دو چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ ترازو، ترازوئے حساب ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ ہر شخص کو اللہ کے سامنے حساب دینا ہو گا۔

۲۔ اللہ کے سامنے جانے کے لیے اپنے عمل میں وزن پیدا کرنا چاہیے۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ الۡفُرۡقَانَ وَ ضِیَآءً وَّ ذِکۡرًا لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور بتحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور ایک روشنی اور ان متقین کے لیے نصیحت عطا کی۔

الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَیۡبِ وَ ہُمۡ مِّنَ السَّاعَۃِ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے رہے اور قیامت سے بھی خوف کھاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت ہارون علیہ السلام چونکہ شریک نبوت تھے اس لیے دونوں کا ایک ساتھ ذکر فرمایا۔

۲۔ الۡفُرۡقَانَ: یہ توریت کا وصف ہے۔ حق و باطل کو واضح کرنے والی کتاب ہے۔

۳۔ وَ ضِیَآءً: یہ بھی توریت کی صفت ہے کہ توریت حق تک رسائی کے لیے ایک نور ہے۔

۴۔ وَّ ذِکۡرًا: یہ بھی توریت کا وصف ہے کہ توریت ایک انسان ساز مکتب ہے جس میں متقین، اپنے آپ کو ہلاکت و ضلالت سے بچانے کی فکر میں رہنے والوں کے لیے دنیا و آخرت کے لیے نصیحتیں ہیں۔

۵۔ لِّلۡمُتَّقِیۡنَ: توریت میں موجود نصیحتوں سے وہ لوگ استفادہ کریں گے جو بچنا چاہتے ہوں۔ یعنی اہل تقویٰ:

الف: یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ: اور وہ لوگ اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے جو خوف خدا دل میں رکھتے ہیں۔

ب: ہُمۡ مِّنَ السَّاعَۃِ مُشۡفِقُوۡنَ: جو قیامت کا خوف دل میں رکھتے ہیں جس میں ہر بات کا حساب دینا ہے۔

اہم نکات

۱۔ بیدار دل ہی خطرات سے بچنے کا شعور رکھتا ہے۔

۲۔ تقویٰ والے ہی بیدار دل والے ہوتے ہیں۔

وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝۵۰

۵۰۔اور یہ (قرآن) ایک مبارک ذکر ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، کیا تم اس کے بھی منکر ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ وَ هٰذَا: کا اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ یہ قرآن توریت کی طرح صرف ذِكْرٌ نہیں بلکہ مُّبٰرَكٌ بھی ہے۔اس کی تعلیمات، اس کی نصیحتوں میں حقائق کی طرف راہنمائی اور ہدایت کی برکتیں ہیں کہ اس کتاب کے ماننے والوں نے دنیا کو تہذیب سکھائی، تمدن دیا، انسانی قدروں کا احیا کیا اور انسان کو اپنی کھوئی ہوئی انسانیت واپس دی۔

۲۔ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ: کیا تم ایسی مبارک کتاب کے منکر ہو جس میں صرف تمہاری سعادت مضمر ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن یقیناً مبارک ہے ان لوگوں کے لیے جو اس کی تعلیمات کو اپنا لیں۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝۵۱

۵۱۔اور بتحقیق ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے کامل عقل عطا کی اور ہم اس کے حال سے باخبر تھے۔

تشریح کلمات

رُشْدَ: (ر ش د) واقع بینی کو رشد کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

ہم نے ابراہیم کو رشد دیا۔حقائق تک رسائی کا ذوق اور سلیقہ دیا، جو علم کی دوسری تعبیر ہے۔ ابراہیم کو ہم نے اس حقیقی علم سے نوازا جس کے بعد ابراہیم میں ایک طاقت آ گئی۔ نگاہ حقیقت ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑی سی بڑی طاقت کو اعتنا میں نہیں لایا جاتا ہے۔ اسی الٰہی طاقت کی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام بت شکن بن گئے اور کسی غیر اللہ کو اعتنا میں نہیں لاتے تھے۔

وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ: ابراہیم علیہ السلام کو رشد عنایت کرنے کی وجہ وہ علم ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی استعداد اور

قابلیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو حاصل تھا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ تکویناً درجہ دیتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی فضیلت اس میں ہے کہ وہ اللہ کی خصوصی عنایت کے اہل ثابت ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حقائق کا ادراک انسان کو غیر حقیقی موہوم چیزوں سے نجات دلاتا ہے۔

۲۔ اللہ کسی کو بلا استحقاق کوئی مقام نہیں دیتا، اہلیت کی بنیاد پر دیتا ہے۔

اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡهِ وَ قَوۡمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیۡلُ الَّتِیۡۤ اَنۡتُمۡ لَهَا عٰکِفُوۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ جب انہوں نے اپنے باپ (چچا) اور اپنی قوم سے کہا: یہ مورتیاں کیا ہیں جن کے گرد تم جمے رہتے ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیۡلُ: یہ تصویریں یہ بت کیا چیز ہیں؟ ان کی حقیقت سے سوال ہے کہ ان بتوں کی تم جب پوجا کرتے ہو تو ان کو کیا سمجھ کر پوجا کرتے ہو؟ تم وحی اور نبوت کے قائل نہیں ہو، تمہیں کس نے بتایا کہ ان بتوں کو اللہ نے تدبیر کا اختیار دیا ہے؟

قَالُوۡا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ کہنے لگے: ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پوجا کرتے پایا ہے۔

تفسیر آیات

ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے بتوں کی حقیقت بیان کرنے کی جگہ ان کی پوجا کرنے کی وجہ بتائی۔ وہ صرف یہ تھی کہ ہمارے باپ دادا ایسا کرتے آئے ہیں۔ اندھی تقلید ہی ان کا مدرک تھا۔

قَالَ لَقَدۡ کُنۡتُمۡ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ ابراہیم نے کہا: یقیناً تم خود اور تمہارے باپ دادا بھی واضح گمراہی میں مبتلا ہیں۔

تفسیر آیات

تمہارے باپ دادا کے پاس خود تمہاری طرح دلیل نہیں تھی۔ وہ گمراہ تھے۔ تم گمراہ لوگوں کی پیروی کرتے ہو۔

قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا بِالۡحَقِّ اَمۡ اَنۡتَ مِنَ اللّٰعِبِیۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ ہمارے پاس حق لے کر آئے ہیں یا بیہودہ گوئی کر رہے ہیں؟

تفسیر آیات

وہ کہنے لگے: ابراہیم! آپ یہ باتیں اپنے دل سے کر رہے ہیں یا مذاق ہے؟ لوگ اپنے مسلمات کے خلاف بات کرنے والے کو بیوقوف سمجھتے ہیں یا سنجیدہ نہیں سمجھتے تھے۔

قَالَ بَلۡ رَّبُّکُمۡ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الَّذِیۡ فَطَرَہُنَّ ۫ۖ وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِکُمۡ مِّنَ الشّٰہِدِیۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ ابراہیم نے کہا: بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور میں اس بات کے گواہوں میں سے ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے جواب میں سنجیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تمہارا رب وہ ہے جو کل کائنات کا رب ہے۔

۲۔ الَّذِیۡ فَطَرَہُنَّ: تمہارا رب وہ ہے جس نے کل کائنات کو خلق فرمایا۔ رب کائنات کا یہ مطلب ہے کہ وہ کائنات کی تدبیر فرما رہا ہے۔

۳۔ وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِکُمۡ مِّنَ الشّٰہِدِیۡنَ: اللہ تعالیٰ کے کل کائنات کے رب ہونے پر بہت سے شواہد موجود ہیں اور اس بات پر میں بھی گواہی دے سکتا ہوں۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اولو العزم رسول ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے براہ راست مَلَکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ دکھایا۔ انہوں نے اپنی بصیرت اور بصارت دونوں سے اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ کل کائنات کا مالک و مدبر اللہ تعالیٰ جل شانہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو کائنات کا خالق ہے وہی رب ہے: رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ....

۲۔ رب وہی ہوتا ہے جو خالق ہے: الَّذِیۡ فَطَرَہُنَّ ....

وَ تَاللّٰہِ لَاَکِیۡدَنَّ اَصۡنَامَکُمۡ بَعۡدَ اَنۡ تُوَلُّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اور اللہ کی قسم! جب تم یہاں سے پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے ان بتوں کی خبر لینے کی تدبیر ضرور سوچوں گا۔

تفسیر آیات

۱۔ کَیۡدَ: پوشیدہ تدبیر کو کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ کہنا کہ میں تمہارے بتوں کی خبر لوں گا، عزم و ارادہ کی بات ہے، دوسروں سے اظہار کی بات نہیں ہے۔

۲۔ وہ کسی تہوار اور میلے پر نکلنے والے تھے۔ اس وقت بتوں کو پاش پاش کرنے کا عزم کر لیا۔

فَجَعَلَهُمۡ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيۡرًا لَّهُمۡ لَعَلَّهُمۡ اِلَيۡهِ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ چنانچہ ابراہیم نے ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا سوائے ان کے بڑے (بت) کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

تشریح کلمات

جُذٰذًا: (ج ذ ذ) الجذ کے معنی توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَجَعَلَهُمۡ جُذٰذًا: ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ تاریخ کی پہلی بت شکنی عمل میں آ گئی۔ جرات و شجاعت کی عظیم مثال قائم ہو گئی۔ غیر اللہ کی پوجا کرنے والوں کی موہوم امیدیں زمین بوس ہو گئیں۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں پر تکیہ کرنے والوں کا وہی سہارا پاش پاش ہو گیا۔ انسان کو پہلی بار یہ درس ملا کہ ایک شخص کے ہاتھوں پاش پاش ہونے والی چیز کائنات کی تدبیر میں حصہ دار نہیں ہو سکتی۔ غیر اللہ کی پناہ میں جانے والوں کی بے بسی سامنے آ گئی۔

۲۔ اِلَّا كَبِيۡرًا لَّهُمۡ: بڑے بت کو چھوڑ کر دعوت فکر دی کہ یہ بت اپنے چھوٹے بتوں کو نہیں بچا سکا اور اس کے سامنے پاش پاش ہو گئے۔

۳۔ لَعَلَّهُمۡ اِلَيۡهِ يَرۡجِعُوۡنَ: وہ اس بڑے بت کی طرف رجوع کریں اور پوچھ لیں کہ ان چھوٹے بتوں کو کس نے توڑا؟ تم نے ان کو کیوں نہیں بچایا۔ ہم نے تو تمہیں اپنے لیے سہارا سمجھا تھا تم تو بے بس ثابت ہوئے کہ اپنے بتوں کو بھی نہیں بچا سکے۔

بہ یک قدم اور ایک ہی وار میں بت پرستوں کے جذبات کو جھنجوڑا اور ان کی عقل کو بھی۔ بتوں کو پاش پاش کر کے ان کے جذبات کو جھنجوڑا اور بڑے بت کو سالم چھوڑ کر ان کی عقل کو بھی سوچنے کی دعوت دی۔ یہ ہے رشد ابراہیمی کہ آنے والی نسلوں کو دعوت فکر دی اور بت پرستی کے خلاف سوچنے کا سلیقہ دیا، ورنہ آج ساری دنیا پر بت پرستی حاکم ہوتی۔

اہم نکات

۱۔ جو اللہ کے لیے قیام کرتا ہے وہ رسوا نہیں ہوتا۔

۲۔ غیر اللہ پر بھروسہ رکھنے والے رسوا ہوتے ہیں۔

قَالُوۡا مَنۡ فَعَلَ ہٰذَا بِاٰلِہَتِنَاۤ اِنَّہٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ وہ کہنے لگے: جس نے ہمارے معبودوں کا یہ حال کیا ہے یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے۔

قَالُوۡا سَمِعۡنَا فَتًی یَّذۡکُرُہُمۡ یُقَالُ لَہٗۤ اِبۡرٰہِیۡمُ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ کچھ نے کہا: ہم نے ایک جوان کو ان بتوں کا (برے الفاظ میں) ذکر کرتے ہوئے سنا ہے جسے ابراہیم کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بت پرست کہنے لگے: کس نے یہ جرات کی؟ جو کام کسی کے لیے قابل تصور نہیں تھا، وہ عمل میں کیسے آ گیا؟ یہ مسئلہ اختلافی بھی نہ تھا۔ ہم اس کی ذمہ داری مخالفین پر ڈالتے۔

پورے معاشرے میں ان معبودوں کے خلاف کوئی شخص موجود نہیں۔

اِنَّہٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ: ہمارے معبودوں کے خلاف اتنی جسارت کون کر سکتا ہے؟

۲۔ قَالُوۡا سَمِعۡنَا فَتًی: کہا: ایک مخالف کے وجود کا پتہ چلا ہے۔ صرف ایک فرد جس کی عمر بھی زیادہ نہیں۔ اس نے فَتًی جوانی کے مرحلہ میں تازہ قدم رکھا ہے۔ ابراہیم نام کا ایک فرد ان بتوں کے خلاف بات کر رہا تھا۔ وہ بات جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آذر سے کہی تھی، اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

قَالُوۡا فَاۡتُوۡا بِہٖ عَلٰۤی اَعۡیُنِ النَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡہَدُوۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ کہنے لگے: اسے سب کے سامنے پیش کرو تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں۔

تفسیر آیات

حکم ہوا: اس شخص کو حاضر کرو اور سب لوگوں کے سامنے لے آؤ تاکہ سب کے سامنے مسئلہ پیش ہو گا تو اس بات پر گواہ بھی مل جائیں گے کہ اسی نے بتوں کے خلاف جسارت کی تھی۔

یَشۡہَدُوۡنَ: کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے جرم کی گواہی دینے والے گواہی دیں کہ ہمارے بتوں کے خلاف بات کرنے والا یہی شخص تھا۔

قَالُوۡۤا ءَاَنۡتَ فَعَلۡتَ ہٰذَا بِاٰلِہَتِنَا یٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ ﴿ؕ۶۲﴾

۶۲۔ کہا: اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کا یہ حال تم نے کیا ہے؟

قَالَ بَلۡ فَعَلَہٗ ٭ۖ کَبِیۡرُہُمۡ ہٰذَا فَسۡـَٔلُوۡہُمۡ اِنۡ کَانُوۡا یَنۡطِقُوۡنَ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ ابراہیم نے کہا: بلکہ ان کے اس بڑے (بت) نے ایسا کیا ہے سو ان سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ ابراہیم علیہ السلام کو حاضر کیا جاتا ہے۔ روئے زمین پر موجود واحد مؤحد کو دنیائے شرک کی مرکزی سلطنت میں بلایا جاتا ہے۔ پھر سوال کرتے ہیں: اے ابراہیم کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کیا؟ بعض روایات کی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت ۱۶ سال تھی۔[۱]

۲۔ قَالَ بَلۡ فَعَلَہٗ ٭ۖ کَبِیۡرُہُمۡ: ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اگر یہ بت بول سکتے ہیں تو ان سے پوچھ لو کہ ان میں سے بڑے بت نے یہ کام کیا ہے۔ ترتیب کلام بعض مفسرین کے نزدیک یہ ہے: بل فعلہ کبیرھم ان کانوا ینطقون فسئلوھم۔

ان بتوں کی بے بسی کو ظاہر اور بت پرستی کو باطل ثابت کرنے کے لیے دلیل کے طور پر ایک مفروضہ سامنے رکھا: ان چھوٹے بتوں کو بڑے بت نے توڑا ہے، اگر یہ بولتے ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جھوٹ نہیں بول رہے تھے بلکہ ایک مفروضہ قائم کر رہے تھے: تمہارے معبود سے اگر کوئی کام بن سکتا ہے تو دوسرے بتوں کو اسی نے توڑا ہے، خود ان سے پوچھ لو اگر یہ بول سکتے ہیں۔ یہ نہ بول سکتے ہیں اور نہ توڑ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ یہ بے بس معبود نہ کچھ بگاڑ سکتے ہیں، نہ کچھ فائدہ دے سکتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مشروط بات کی۔ جیسا کہ فرمایا:

قُلۡ اِنۡ کَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ٭ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِیۡنَ ﴿﴾[۲]

کہدیجیے: اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا۔

وَلَد نہیں، بندگی نہیں۔ بت بات نہیں کر سکتے تو توڑ بھی نہیں سکتے۔ جو کسی نفع و ضرر کے قابل نہیں، اس جامد چیز کی پوجا کرتے ہو۔

فَرَجَعُوۡۤا اِلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ فَقَالُوۡۤا اِنَّکُمۡ اَنۡتُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ (یہ سن کر) وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور کہنے لگے: حقیقتاً تم خود ہی ظالم ہو۔

---

[۱] مجمع البیان ذیل آیت [۲] ۴۳ زخرف: ۸۱

تفسیر آیات

اس طرز استدلال سے ان کے ضمیر اور عقل کو ایک جھٹکا لگا۔ پہلے یہ بات کبھی نہیں سوچی، نہ کسی نے اس قسم کی بات کی۔ ایک جامد بے جان چیز کو اپنی زندگی کا مدبر سمجھ کر اس کے سامنے جھکنا واقعاً بڑی زیادتی ہے۔ آپس میں اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔ بت پرستی پہلی بار موضوع بحث بن گئی۔

اہم نکات

۱۔ حق ایک بار انسانوں کے عقل و ضمیر میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ پھر مؤمن اسے اپنا لیتا اور کافر اس کو دبا دیتا ہے۔

ثُمَّ نُكِسُوۡا عَلٰی رُءُوۡسِهِمۡ ۚ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنۡطِقُوۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ پھر وہ اپنے سروں کے بل اوندھے ہو گئے اور (ابراہیم سے کہا): تم جانتے ہو یہ نہیں بولتے۔

تفسیر آیات

۱۔ پھر یہ اپنے سروں کے بل اوندھے ہو گئے۔ پہلے کچھ دیر کے لیے یہ اپنے عقل و خرد کی طرف پلٹے، پھر منقلب ہو گئے۔ نہ عقل، نہ غور و فکر۔ پہلے ان کے اپنے ضمیر نے تسلیم کیا کہ ابراہیم علیہ السلام سچے ہیں اور ہم ظالم ہیں۔ بعد میں اوندھے ہو گئے اور کہنا شروع کیا: ہم سچے ہیں ابراہیم علیہ السلام ظالم ہیں۔ اپنے ضمیر اور وجدان کے خلاف ہو گئے:

وَ جَحَدُوۡا بِهَا وَ اسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ...[1] وہ ان نشانیوں کے منکر ہوئے حالانکہ ان کے دلوں کو یقین آ گیا تھا۔

۲۔ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنۡطِقُوۡنَ: اپنے ضمیر کی آواز کے برعکس ان لوگوں نے الٹا سوچنا شروع کیا۔ ابراہیم علیہ السلام کو مجرم قرار دیا اور کہنے لگے: ابراہیم! تجھے خود علم ہے یہ نہیں بول سکتے لہٰذا تم نے ہی توڑے ہیں۔

قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡـًٔا وَّ لَا يَضُرُّكُمۡ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمۡ وَ لِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۶۔ ابراہیم نے کہا: تو پھر تم اللہ کو چھوڑ کر انہیں کیوں پوجتے ہو جو تمہیں نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان؟

۶۷۔ تف ہو تم پر اور ان (معبودوں) پر جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟

---

[1] ۲۷ نمل: ۱۴

تفسیر آیات

۱۔ کسی کی بندگی کے چند عوامل ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ ہیں: کمال، احتیاج، احسان اور خوف۔ ان بتوں میں نہ کوئی کمال ہے جس کے سامنے بے ساختہ جھکا جائے، نہ کوئی شخص ان بتوں کا محتاج ہے۔ نہ ہی ان بتوں کی طرف سے کوئی احسان ہے اور نہ ان جامد بتوں سے کوئی خوف ہے۔ لہٰذا یہ بت کسی لحاظ سے بھی معبود نہیں بن سکتے۔

۲۔ اُفٍّ لَّکُمۡ : یہ ایک نفرت اور برائت ہے ان بتوں اور بت پرستوں سے۔

اہم نکات

۱۔ بندگی اس ذات کی ہو سکتی ہے جس میں معبود ہونے کی تمام باتیں موجود ہوں۔

۲۔ عقل کا تقاضا ہے کہ وہم پرستی سے دور رہا جائے۔

قَالُوۡا حَرِّقُوۡہُ وَ انۡصُرُوۡۤا اٰلِہَتَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ وہ کہنے لگے: اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی نصرت کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ جابر کا ہمیشہ یہی مزاج رہا ہے کہ جب اس کے پاس کوئی منطق نہیں رہتی ہے تو وہ طاقت استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ جابر لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے وہ سزا تجویز کی جو سب سے زیادہ شدید عذاب ہے۔ یعنی جلانے کا حکم ہوا۔

۲۔ وَ انۡصُرُوۡۤا اٰلِہَتَکُمۡ : اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ ان کے معبود اپنے بندوں کی نصرت کے محتاج ہیں۔ اگر احتیاج کی بنیاد پر بندگی درست ہے تو بتوں کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی پوجا کریں۔ جن کے یہ محتاج ہیں۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق پر آویزاں کیا گیا۔ ہیبت ناک شعلوں کی طرف بڑھائے جا رہے تھے، اس وقت جبرئیل نازل ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا: الك حاجة؟ آپ کی کوئی حاجت ہے؟ فرمایا: اما الیك فلا۔ آپ سے کوئی حاجت نہیں ہے۔[1] چنانچہ ساری کائنات سے بے نیاز اپنے رب کی نیاز مندی میں پورے سکون کے ساتھ آتش میں اتر گئے۔

قُلۡنَا یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی

۶۹۔ ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم

---

[1] مستدرک الوسائل۔ ۳: ۳۰۳۔ بحار الانوار۔ ۱۱: ۶۲

اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾　　کے لیے سلامتی بن جا۔

تفسیر آیات

ہم نے کہا: آتش ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم کے لیے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو وجود دیا اور ان میں مختلف خاصیتیں ودیعت فرمائیں۔ اس ذات کی قدرت میں ہے کہ ان چیزوں سے ان کی خاصیتیں سلب کر لے۔ آتش کو سوزش دینا اور اس سے اس سوزش کو سلب کرنا آتش کے خالق کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آتش کے وجود کا خالق اللہ ہو اور اس کی سوزش کا کنٹرول اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں نہ ہو۔

جس ذات کے ایک لفظ کُن سے ایک لامحدود کائنات وجود میں آ سکتی ہے اور اسی کُن سے آتش سرد ہونے کے بارے میں سوال نہیں اُٹھایا جا سکتا:

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۝ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِــُٔوْنَ ۝[1]　　یہ تو بتاؤ کہ جو آگ تم سلگاتے ہو، اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟

معجزے کے بارے میں ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ معجزے بلا علت و اسباب رونما نہیں ہوتے۔ البتہ جو علت و سبب معجزے کے پیچھے ہوتا ہے وہ ہمارے لیے قابل تسخیر نہیں ہے۔

۲۔ وَّسَلٰمًا: آگ کے لیے حکم تکوینی ہے کہ نہ صرف ٹھنڈی ہو جا، سامان سلامتی بھی فراہم کر۔ چنانچہ بعض روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: آتش میں جو دن میں نے گزارے، میری زندگی کے آرام ترین دن تھے۔[2]

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾　　۷۰۔ اور انہوں نے ابراہیم کے ساتھ اپنا حربہ استعمال کیا اور ہم نے خود انہیں ناکام بنا دیا۔

تفسیر آیات

کفار نے جو انتہائی حربہ استعمال کیا تھا۔ ایک سلطنت، پوری ایک ریاست، سب نے مل کر ایک لڑکے کے خلاف حربہ استعمال کیا اور اسے ہم نے ناکارہ بنا دیا۔ ابراہیم علیہ السلام بھی بچے رہے۔ ان کی دعوت بھی زندہ رہی۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ　　۷۱۔ اور ہم ابراہیم اور لوط کو بچا کر اس سرزمین کی

---

[1] ۵۶ واقعہ: ۷۱۔۷۲　[2] تفسیر قرطبی ذیل آیہ

الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا لِلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۱﴾

طرف لے گئے جسے ہم نے عالمین کے لیے بابرکت بنایا ہے۔

تفسیر آیات

بابرکت سرزمین سے مراد شام کی سرزمین ہے۔ فلسطین، لبنان، اردن اور سوریہ، شام کی سرزمین شمار ہوتی ہے۔ ان علاقوں میں بہت سے انبیاء مبعوث ہوئے۔ شریعتیں اس سرزمین میں نازل ہوئیں اور زمین کی شادابی کی وجہ سے یہاں کے لوگ خوشحال رہتے تھے۔ قبلہ اول، پہلا حرم اسی سرزمین پر موجود ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں بس گئے اور حضرت لوط علیہ السلام ارض سدوم میں۔ عراق کی سرزمین پر صرف حضرت لوط علیہ السلام داخل ایمان ہوئے اور آپ کے ساتھ ہجرت فرمائی۔

اہم نکات

۱۔ جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے اسے دنیا و آخرت میں آسائش مل جاتی ہے۔

وَ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ ؕ وَ یَعۡقُوۡبَ نَافِلَۃً ؕ وَ کُلًّا جَعَلۡنَا صٰلِحِیۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب بطور عطیہ دیے اور ہم نے ہر ایک کو صالح بنایا۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام اولاد کے لیے دعا کرتے تھے: رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ [1] نَافِلَۃ عطیہ کو کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ایک ذاتی خواہش نہ تھی کہ اولاد دیکھ کر خوش رہیں بلکہ ادیان سماوی کے لیے جو قیادت آپ کے ذمے تھی اس کے تسلسل، تحریک توحید کو آگے بڑھانے، آنے والی تمام نسلوں کی ہدایت و امامت کے لیے اولاد کی خواہش کی۔ جب حضرت ابرہیم علیہ السلام ۹۹ سال کو پہنچ گئے تو اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور ایک سو بارہ سال کی عمر میں حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔

وَ جَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّۃً یَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَ اِیۡتَآءَ الزَّکٰوۃِ ۚ وَ کَانُوۡا لَنَا عٰبِدِیۡنَ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے نیک عمل کی انجام دہی اور قیام نماز اور ادائیگی زکوۃ کے لیے ان کی طرف وحی کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

---

[1] ۳۷ صافات: ۱۰۰

تفسیر آیات

۱۔ وَجَعَلۡنٰہُمۡ: نسل ابراہیمی میں سلسلہ امامت کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ابراہیم کی اولاد کو ہم نے امامت کے مقام پر فائز کیا۔ امامت ایک منصب ہے جس کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

۲۔ یَّہۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا: وہ ائمہ ایسے ہیں جو امر خدا کے عین مطابق ہدایت دیتے ہیں۔ خود اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتے۔

۳۔ وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡہِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ: فعل خیرات کے حکم کی وحی ہوئی یا خود فعل خیرات کی وحی ہوئی۔ اگر حکم، وحی کے ذریعہ آیا ہے تو یہ وحی، تشریعی ہو گی اور خود عمل خیرات، وحی کے ذریعے آیا ہے تو یہ وحی، تکوینی ہو گی۔ المیزان کے نزدیک یہ وحی، تکوینی ہے اور مقام امامت سے مربوط ہے جو مرحلہ نفاذ سے متعلق ہے۔ چنانچہ یَّہۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا میں امر تکوینی مراد لیتے ہیں۔ اس صورت میں ائمہ کی یہ تعریف نکلتی ہے کہ: ائمہ وہ ہیں جن کی سیرت و کردار یعنی فعل الخیرات، اقامہ نماز و ادائے زکوٰۃ عملی طور پر نازل ہوتے ہیں۔ حکم کی جگہ عمل کی وحی کو سمجھنے کے لیے اس حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں جو ابن عربی نے اپنی تفسیر میں اسی آیت کے ذیل میں ذکر کی ہے:

قال النبی علیہ السلام کنت انا و علی نورین نسبح اللّٰہ تعالیٰ و نحمدہ و نہللّٰہ و سبحتہ الملائکۃ بتسبیحنا و حمدتہ بتحمیدنا وھللتہ فلما خلق آدم علیہ السلام انتقلنا الی جبھتہ و من جبھتہ الی صلبہ ثم الی شیث ...الی آخر۔

رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا: میں اور علی دو نور تھے۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد بیان کرتے تھے اور لا الہ الا اللّٰہ کی تہلیل کرتے تھے۔ ہماری تسبیح سے فرشتوں نے بھی تسبیح شروع کر دی اور ہماری حمد سے فرشتوں نے بھی حمد شروع کی اور تہلیل کی اور جب آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو ہم ان کی پیشانی کی طرف منتقل ہو گئے اور ان کی پیشانی سے ان کے صلب کی طرف پھر حضرت شیث کی طرف منتقل ہوئے....

۴۔ وَکَانُوۡا لَنَا عٰبِدِیۡنَ: اس وضاحت کے بعد آیت کا یہ جملہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ امامت نفاذ امر کے مرحلے میں قیادت کا نام ہے۔

وَ لُوۡطًا اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا وَّ ۷۴۔ اور لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا اور

نَجَّیۡنٰہُ مِنَ الۡقَرۡیَۃِ الَّتِیۡ کَانَتۡ تَّعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فٰسِقِیۡنَ ﴿۷۴﴾

ہم نے انہیں اس بستی کے شر سے نجات دی جہاں کے لوگ بے حیائی کا ارتکاب کرتے تھے، یقیناً وہ برائی والے اور بدکار قوم تھی۔

تفسیر آیات

۱۔ اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا: حکم سے مراد قوت فیصلہ ہو سکتا ہے اور ممکن ہے حکم سے مراد حکمت ہو جو حقائق کے ادراک سے عبارت ہے۔ علم سے مراد اللہ کی طرف سے ان منکشف حقائق اور واقعات کے لیے معینہ قانون کا علم ہو۔

۲۔ وَّ نَجَّیۡنٰہُ مِنَ الۡقَرۡیَۃِ: بستی سے مراد سدوم کی بستی ہے جو تباہ ہو گئی۔

۳۔ تَّعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ: سے مراد ہم جنس بازی ہے جو قوم لوط کا شیوہ تھا۔

وَ اَدۡخَلۡنٰہُ فِیۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّہٗ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ اور ہم نے انہیں (لوط کو) اپنی رحمت میں داخل کیا وہ یقیناً صالحین میں سے تھے۔

تفسیر آیات

جو بندہ، صالح کے رتبے پر فائز ہو گا اسے اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ نے علم و حکمت سے نوازا تو وہ اس فضل الٰہی کے اہل ثابت ہوئے۔

وَ نُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ فَنَجَّیۡنٰہُ وَ اَہۡلَہٗ مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ اور نوح کو بھی (ہم نے نوزا) جب انہوں نے ابراہیم سے پہلے (ہمیں) پکارا تو ہم نے ان کی دعا قبول کی، پس انہیں اور ان کے گھر والوں کو بڑی پریشانی سے نجات دی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ نُوۡحًا اِذۡ نَادٰی: صدیوں کی تبلیغ کے بعد اپنی قوم سے مایوس ہو کر نوح علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی:

رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ پروردگارا! روئے زمین پر بسنے والے کفار میں سے

دَیَّارًا ○ [1] ایک کو بھی باقی نہ چھوڑ۔

۲۔ مِنۡ قَبۡلُ: حضرت ابراہیم و لوط علیہما السلام سے پہلے۔

۳۔ فَنَجَّیۡنٰہُ: اللہ نے انہیں عظیم مصیبت سے نجات دی جس کا ذکر سورہ ہود میں آ گیا ہے۔

وَ نَصَرۡنٰہُ مِنَ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فَاَغۡرَقۡنٰہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ اور اس قوم کے مقابلے میں ان کی مدد کی جو ہماری نشانیوں کی تکذیب کرتی تھی، یقیناً وہ برے لوگ تھے چنانچہ ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ اِذۡ یَحۡکُمٰنِ فِی الۡحَرۡثِ اِذۡ نَفَشَتۡ فِیۡہِ غَنَمُ الۡقَوۡمِ ۚ وَ کُنَّا لِحُکۡمِہِمۡ شٰہِدِیۡنَ ﴿٪۷۸﴾

۷۸۔ اور داؤد و سلیمان کو بھی (نوازا) جب وہ دونوں ایک کھیت کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت لوگوں کی بکریاں بکھر گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

فَفَہَّمۡنٰہَا سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ کُلًّا اٰتَیۡنَا حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ۫ وَّ سَخَّرۡنَا مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ یُسَبِّحۡنَ وَ الطَّیۡرَ ؕ وَ کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ تو ہم نے سلیمان کو اس کا فیصلہ سمجھا دیا اور ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا کیا اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کے لیے مسخر کیا جو ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور ایسا کرنے والے ہم ہی تھے۔

تشریح کلمات

الۡحَرۡثِ: (ح ر ث) الحَرث کے معنی زمین میں بیج ڈالنے اور اسے زراعت کے لیے تیار کرنے کے ہیں اور کھیتی کو بھی حرث کہا جاتا ہے۔

نَفَشَتۡ: (ن ف ش) نفش الغنم رات کے وقت بکریوں کا بغیر چرواہے کے منتشر ہونا۔

تفسیر آیات

اس آیت کے شان نزول میں روایت ہے کہ ایک شخص کے کھیت میں دوسرے شخص کی بکریاں گھس گئی تھیں۔ حضرت داود علیہ السلام نے فیصلہ دیا کہ بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فیصلہ دیا کہ بکریوں سے کھیت والا اس وقت تک فائدہ اٹھائے جب تک بکریوں والا اس کھیت کو اسی حالت میں تیار کر کے نہ دے۔ مجمع البیان اور کشاف کی روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام اس وقت گیارہ

---

[1] ۷۱ نوح: ۲۶

سال کی عمر میں تھے۔ ممکن ہے اس مسئلہ میں دو نظریے سامنے آئے ہوں۔ ایک حضرت داؤد علیہ السلام کا، دوسرا حضرت سلیمان علیہ السلام کا۔ آخر میں فیصلہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے موقف کے مطابق ہوا ہو۔ اس قصے کو بیان کرنے کا مقصد ممکن ہے یہ ہو کہ عدالتی فیصلوں میں نظر ثانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگرچہ پہلا حکم بھی حکم خدا کے مخالف نہ تھا تاہم بہتر فیصلے کی گنجائش رہتی ہے۔

المیزان کے نزدیک یَحۡکُمٰنِ کا مطلب یتشاوران ہے کہ فیصلے سے پہلے باہمی مشورے میں دو نظریے سامنے آئے ہیں ورنہ ایک واقعہ کے دو فیصلے معقول نہیں ہیں۔

۱۔ فَفَهَّمۡنٰهَا سُلَيۡمٰنَ: "ہم نے سلیمان کو سمجھایا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ اللہ کی طرف سے تھا۔ رہا حضرت داود علیہ السلام کا فیصلہ، اس بارے میں بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت داود علیہ السلام کا اپنا اجتہاد تھا جو صائب نہ تھا۔ یہاں سے ان حضرات نے یہ موقف بنا لیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے اجتہاد جائز ہے۔

امامیہ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے لیے اجتہاد جائز نہیں بلکہ اس کی نوبت نہیں آتی کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے لیے حکم واقع وحی کے ذریعہ حاصل کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اجتہاد یعنی اپنی ذاتی رائے پر عمل کرنا کیسے ممکن ہے۔ امامیہ کے نزدیک اجتہاد (بمعنی ذاتی رائے) پر عمل کرنا امت کے لیے بھی جائز نہیں۔[1]

۲۔ وَكُلًّا اٰتَيۡنَا حُكۡمًا وَّعِلۡمًا: ہم نے ان سب کو حکمت اور علم عطا کیا ہے۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ حکمت اور علم کے منافی نہیں تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قسم کا ایک فیصلہ کیا جس میں حکم دیا:

علی اہل الاموال حفظھا بالنھار و علی اہل الماشیۃ حفظھا باللیل۔۔۔[2]	مویشوں کے مالک کو چاہیے کہ وہ رات کو مویشیوں کو اپنے کنٹرول میں رکھے اور کھیت والا دن میں اپنے کھیت کو بچائے۔

۳۔ وَسَخَّرۡنَا مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ يُسَبِّحۡنَ وَالطَّيۡرَ: حضرت داؤد علیہ السلام کی خوش الحانی کا یہ عالم تھا کہ پہاڑ بھی وجد میں آ جاتے اور ساتھ تسبیح کرتے تھے اور پرندے بھی اس خوش الحانی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں قرآن کا صریح لفظوں میں اعلان ہے:

وَاِنۡ مِّنۡ شَيۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ ۔۔۔[3]	اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

قرآن کی طرف سے لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ کی صراحت کے باوجود کچھ حضرات اس تسبیح کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خوش الحانی کی وجہ سے پہاڑوں میں ان کی آواز گونجتی

---

[1] طوسی التبیان۔ ذیل آیہ۔ [2] مجمع البیان ذیل آیت [3] ۱۷ بنی اسرائیل: ۴۴

تھی حالانکہ پہاڑوں میں تو ہر اونچی آواز گونجتی ہے، صرف داؤد علیہ السلام کی نہیں۔ دوسری بات اس گونجنے کو تسخیر نہیں کہا جاتا۔ اگر پہاڑوں کی تسبیح کی ''گونجنے'' سے توجیہ وتاویل کرتے ہیں تو پرندوں کے لیے کیا تاویل کریں گے؟

وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ: پہاڑوں اور پرندوں کو تسخیر میں دینے والا اللہ ہے۔ اللہ کی قدرت کاملہ کے بارے میں کسی قسم کی تاویل قابل قبول نہیں ہے۔ بعض اہل تحقیق کے مطابق سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ میں لفظ مَعَ سے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ پہاڑ حضرت کے لیے مسخر نہیں تھے بلکہ تسبیح کے لیے مسخر تھے ورنہ سخرنا لداؤد فرماتے۔

اہم نکات

۱۔ تسبیح اگر قلب سے نکلے تو قلب فطرت کو مسخر کرتی ہے۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿٨٠﴾	۸۰۔ اور ہم نے تمہارے لیے انہیں زرہ سازی کی صنعت سکھائی تاکہ تمہاری لڑائی میں وہ تمہارا بچاؤ کرے تو کیا تم شکر گزار ہو؟

تفسیر آیات

سورہ سبا میں بھی زرہ سازی کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے:

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۙ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ...[1]	اور ہم نے لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا کہ تم زرہیں بناؤ اور ان کے حلقوں کو باہم مناسب رکھو۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے ہی دور میں لوہے کا انکشاف ہوا۔ لوہے کا انکشاف انسان کے لیے نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ پھر اسے پگھلا کر اپنے مقصد کی شکل میں لانا ایک اہم ترین صنعت تھی۔ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ہم نے داؤد علیہ السلام کے لیے لوہے کو نرم کیا سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوہے کی تسخیر حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی تھی۔

لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ: آپس کی لڑائیوں میں تمہارا بچاؤ کرے۔

آیت کے اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حربی اوزار جو زمانے میں رائج ہیں، دینداروں کے دست رس میں ہونے چاہئیں اور تمام حربی سامان جو دشمن کے پاس ہے، دینداروں کے پاس بھی ہونا چاہیے کیونکہ حق کو ہمیشہ باطل سے نبرد آزما ہونا ہے۔

فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ: کیا تم شکر کرنے والے ہو؟ دشمن کے مقابلے میں اپنے تحفظ کا سامان فراہم

---

[1] ۳۴ سباء: ۱۰۔ ۱۱

ہونا امن و سلامتی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔ اس قسم کا تحفظ حاصل ہونا مقام شکر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اپنے تحفظ کا سامان حرب حاصل کرنا امن کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے پاس ہر معاصر صنعت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَۃً تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖۤ اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا ؕ وَ کُنَّا بِکُلِّ شَیۡءٍ عٰلِمِیۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ اور سلیمان کے لیے تیز ہوا کو (مسخر کیا) جو ان کے حکم سے اس سرزمین تک چلتی تھی جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا اور ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ: تیز ہوا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کیا تھا۔ اس کی دو طرح کی تشریح ہو سکتی ہے۔ پہلی تشریح یہ کہ بحری جہازوں کی آمد و رفت کے لیے موافق ہوائیں چلائی ہوں۔ چنانچہ اس زمانے میں جہاز رانی کے لیے ہوا واحد ذریعہ تھی۔ فلسطین سے دیگر ممالک کی طرف اور بحر روم سے مغربی ممالک کی طرف تجارتی جہاز ہوا ہی کے ذریعے سفر کرتے تھے۔ تسخیر کا یہ مطلب لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تجارتی جہاز جو مغربی اور جنوبی مشرقی علاقوں میں چلتے تھے ان کے لیے موافق ہوا ملا کرتی تھی، یہ تشریح قابل ترجیح نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ ہوا صرف سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر نہ تھی، عام قدرتی بات ہو گی۔ دوسری تشریح یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو براہ راست حضرت سلیمان علیہ السلام کی تسخیر میں دیا تھا اور ہوا پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا حکم چلتا تھا۔ اس تشریح کے لیے بِاَمۡرِہٖۤ قرینہ بن جاتا ہے۔ اگر ضمیر سلیمان علیہ السلام کی طرف پلٹتی ہے تو اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے:

۲۔ تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖۤ: یہ ہوا سلیمان کے حکم سے چلتی تھی۔ شیخ طوسی علیہ الرحمۃ کے نزدیک ضمیر سلیمان علیہ السلام کی طرف ہے اور سلیمان علیہ السلام کے حکم سے چلتی تھی۔

۳۔ عَاصِفَۃً: تیز ہوا۔ کشتی چلانے کے لیے جس قوت کی ضرورت تھی وہ اس ہوا میں موجود تھی اور ساتھ ساتھ آرام سے چلتی تھی جیسا کہ سورۂ ص آیت ۳۶ میں فرمایا:

تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖ رُخَآءً حَیۡثُ اَصَابَ ۝

جدھر وہ جانا چاہتے ان کے حکم سے نرمی کے ساتھ اسی طرف چل پڑتی تھی۔

یہ ہوا تیز تھی اور اس تیزی میں نرمی بھی تھی جو کشتی رانی کے لیے مساعد ہوتی ہے۔ ہوا کی تیزی میں طلاطم نہیں تھا اور نرمی میں جمود نہیں تھا۔

۴۔ اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا: وہ مبارک سرزمین شام کی سرزمین ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کا دارالخلافہ ہے۔ الٰی کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ تسخیر ہوا کی منزل ارض شام ہے۔

۵۔ وَ کُنَّا بِکُلِّ شَیۡءٍ عٰلِمِیۡنَ: اللہ اپنے احاطہ علمی کے مطابق تدبیر عالم کا عمل انجام دیتا ہے۔ ایک چھوٹی سی چھوٹی حرکت اس کے نظام تدبیر اور احاطہ علمی سے خارج نہیں ہے۔

وَ مِنَ الشَّیٰطِیۡنِ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَہٗ وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِکَ ۚ وَ کُنَّا لَہُمۡ حٰفِظِیۡنَ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ اور شیاطین میں سے کچھ (کو مسخر بنایا) جو ان کے لیے غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دیگر کام بھی کرتے تھے اور ہم ان سب کی نگہبانی کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مِنَ الشَّیٰطِیۡنِ: شیاطین سے مراد جنات ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر تھے۔ کچھ جدید مفسرین محسوس پرستی میں مبتلا ہیں کہ جو چیز ان کے لیے محسوس نہیں ہے وہ ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ جہاں ان کی حس نہیں پہنچتی وہاں ان کے نزدیک اللہ کی قدرت بھی نہیں پہنچتی۔ کہتے ہیں یہاں شیاطین (جنات) سے مراد گرد و پیش کے قبائلی لوگ ہیں۔ یہ واضح سی بات ہے کہ اگر یہ جنات نہیں، انسان تھے تو ان کو شیاطین سے تعبیر کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ ثانیاً انسان تو دیگر بہت سے بادشاہوں سرمایہ داروں کے لیے مسخر ہوتے ہیں۔ فرعون کے لیے بہت سے لوگ مسخر تھے کہ اہرام بنوایا۔ اس میں سلیمانؑ کے لیے کون سی خصوصیت ہے کہ اس اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کیا جائے۔

۲۔ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَہٗ: سلیمانؑ کے لیے غوطے لگاتے اور موتیاں نکال لاتے تھے۔

۳۔ وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِکَ: غوطے کے علاوہ دیگر کام بھی ان سے لیا جاتا تھا۔ جیسے بلند و بالا عمارتوں کی تعمیر۔ دُوۡنَ ذٰلِکَ کے معنی "اس سے کمتر" بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی سمندری جواہر نکالنے سے کمتر کام بھی ان سے لیا جاتا تھا۔

۴۔ وَ کُنَّا لَہُمۡ حٰفِظِیۡنَ: جنات کے ہر کام کی ہم نظارت کرتے تھے کہ وہ کسی خلاف ورزی اور شرارت کے مرتکب نہ ہوں کہ ان کو چھوڑنا اور بند کرنا ہمارے قبضے میں ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ ان جنات کو قابو میں رکھنے کے بارے میں فرمایا:

وَّ اٰخَرِیۡنَ مُقَرَّنِیۡنَ فِی الۡاَصۡفَادِ ۝[۱]　　اور دوسروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

۱؎ ۳۴ ص: ۳۸

وَ اَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۸۳﴾

۸۳۔اور ایوب کو بھی (اپنی رحمت سے نوازا) جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا: مجھے (بیماری سے) تکلیف ہو رہی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں اختلاف ہے کہ آپؑ کس زمانے کے نبی تھے اور کس قوم میں مبعوث ہوئے۔ قدیم صحائف کے حوالے سے بعض اہل قلم اندازہ لگاتے ہیں کہ آپؑ نویں صدی قبل مسیح یا اس سے پہلے مبعوث ہوئے تھے۔

تفسیر طبری میں وھب بن منبہ یمانی کی ایک روایت میں کہا ہے: کان رجلا من الروم اور بعض نے اسی وھب کے حوالے سے لکھا ہے: حضرت ایوب، حضرت اسحاق علیہما السلام کی نسل سے ہیں۔

۲۔ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ: اس نے اپنے رب کو پکارا مجھے (بیماری کی) تکلیف ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مال و اولاد ہاتھ سے جانے اور اٹھارہ سال تک کی بیماری کے ساتھ آزمایا۔ ہر سمت اور ہر سو سے آنے والی اس آزمائش پر صابر و شاکر رہنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا دی۔ مال و اولاد واپس دی۔

فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ فَکَشَفۡنَا مَا بِہٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّ اٰتَیۡنٰہُ اَہۡلَہٗ وَ مِثۡلَہُمۡ مَّعَہُمۡ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَ ذِکۡرٰی لِلۡعٰبِدِیۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔تو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کی تکلیف ان سے دور کر دی اور انہیں ان کے اہل و عیال عطا کیے اور اپنی رحمت سے ان کے ساتھ اتنے مزید بھی جو عبادت گزاروں کے لیے ایک نصیحت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ دعا کی استجابت ہوئی اور بیماری دور ہو گئی۔

۲۔ وَّ اٰتَیۡنٰہُ اَہۡلَہٗ: اہل و عیال اولاد واپس دے دیے۔ صرف یہی نہیں بلکہ

۳۔ وَ مِثۡلَہُمۡ مَّعَہُمۡ: اتنے مزید اہل و عیال، مال و اولاد دیے۔

۴۔ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِنَا: اس صبر و تحمل کے عوض میں اللہ کی رحمت کے تقاضوں کے مطابق۔

۵۔ وَ ذِکۡرٰی لِلۡعٰبِدِیۡنَ: یہ انعام و اکرام اس لیے کیا تاکہ عبادت گزاروں کے لیے ایک تذکر اور

درس ہو کہ اگر کوئی عبادت گزار کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ سمجھے یہ اللہ کی طرف سے امتحان ہے، انتقام نہیں۔ اللہ کی توجہ ہے، نفرت نہیں۔ بندگی کا لازمہ ہے، بیگانگی نہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنے خاص بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔

۲۔ بندہ اگر کسی بھی قسم کی آزمائش نہ پڑے تو فکر مند ہونا چاہیے۔

وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِدۡرِیۡسَ وَ ذَا الۡکِفۡلِ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو بھی (اپنی رحمت سے نوازا) یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔

تفسیر آیات

صبر و تحمل میں صف اول کی شخصیت حضرت ایوب علیہ السلام کے بعد دیگر صابرین کا ذکر ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مرضی رب کے لیے اپنے ذبح ہونے پر صبر کیا اور بے آب و گیاہ جگہ پر زندگی کو اختیار کیا۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا پہلے بھی ذکر ہوا ہے۔ آپؑ نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی۔ ان کی قوم نے ان کی دعوت کو ٹھکرا دیا تو وہ ہلاک ہوگئی اور اللہ نے ادریس علیہ السلام کو آسمان میں اٹھایا۔ ذا الکفل بھی انبیاء میں سے ایک نبی ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ ذاالکفل انبیاء میں سے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح لوگوں میں فیصلے کرتے تھے۔ صرف برائے خدا غصہ کرتے تھے۔ ان کا نام عدویا بن ادارین ہے۔[1]

وَ اَدۡخَلۡنٰہُمۡ فِیۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّہُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ اور ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کیا، یقیناً یہ صالحین میں سے تھے۔

تفسیر آیات

رحمت الٰہی میں داخل ہونے کے بعد نبوت کے درجے پر فائز ہوتے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان ذیل آیت

وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ۖ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۸۷﴾	۸۷۔ اور ذوالنون کو بھی (اپنی رحمت سے نوازا) جب وہ غصے میں چل دیے اور خیال کرنے لگے کہ ہم ان پر سختی نہیں کریں گے، چنانچہ وہ اندھیروں میں پکارنے لگے: تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ہی زیادتی کرنے والوں میں سے ہوں۔
فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـنۡجِى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۸۸﴾	۸۸۔ پھر ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ہم نے انہیں غم سے نجات دی اور ایمان والوں کو ہم اسی طرح نجات دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَذَاالنُّوۡنِ: النُّوۡنِ مچھلی کو کہتے ہیں۔ ان کو صاحب الحوت بھی کہتے ہیں۔ مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔

۲۔ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا: جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گیا محاسن التاویل میں لکھا ہے اکثر مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ یونس اللہ سے ناراض ہو کر چلے گئے تھے حالانکہ اللہ سے ناراض ہونا کفر ہے اور اللہ کو عاجز سمجھنے والا بھی مومن نہیں رہتا چہ جائیکہ اللہ کے ایک برگزیدہ نبی سے اس قسم کی لغزش سرزد ہو جائے۔

۳۔ فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ: اس نے گمان کیا کہ ہم ان پر سختی نہیں کریں گے۔ قدر سختی کرنے کے معنی میں ہے۔ جیسے فرمایا:

وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ ۝ ۱؎	اور جب اسے آزمالیتا ہے اور اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے میری توہین کی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کو یہ گمان تھا کہ اپنی قوم کو چھوڑ کر نکل جانے سے اللہ انہیں گرفت میں نہیں لے گا۔ ان کا اپنی قوم کو چھوڑ کر نکل جانا باذن خدا نہیں تھا۔ لہٰذا اسے قلت صبر پر حمل کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضورؐ سے فرمایا:

فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنۡ كَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ ... ۲؎	پس اپنے رب کے حکم تک صبر کریں اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو جائیں....

اس آیت سے ظاہر ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے کم صبری کی کوتاہی ہوئی تھی۔

حضرت یونس بن متی علیہ السلام عراق کے اہل نینویٰ کی طرف آٹھویں صدی قبل مسیح میں مبعوث ہوئے۔

۱؎ ۸۹ فجر: ۱۶ ۲؎ ۶۸ قلم: ۴۸

نینویٰ آشوری سلطنت کا دار الحکومت تھا۔ اس قوم نے حضرت یونس علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کیا۔ قوم سے مایوس ہو کر یہاں سے نکل گئے اور ایک دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتی پر سوار ہوئے۔ کشتی میں طلاطم آیا یا زائد لوگ بیٹھ گئے تھے، غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہوا۔ ایک روایت کے مطابق طے پایا کہ ایک آدمی کی قربانی دی جائے تا کہ سب لوگ غرق نہ ہوں۔ قرعہ اندازی کا فیصلہ ہوا۔ قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا۔ انہیں دریا میں پھینک دیا۔ ایک بڑی مچھلی نے انہیں نگل لیا۔

۴۔ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ: یہاں دریا کی تاریکی، مچھلی کے پیٹ کی تاریکی مراد ہو سکتی ہے۔ اس تاریکی میں حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا: اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَکَ ۔ پہلے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا جیسا کہ آداب دعا یہی ہے کہ اپنا مدعیٰ پیش کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی حمد و ثنا بجا لائی جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی آتش نمرود میں جاتے ہوئے دعا میں کہا تھا: یا واحد یا احد یا صمد یا من لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفواً احد۔

۵۔ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ: پھر اپنا مدعا پیش کرنے سے پہلے اپنی کوتاہی اپنی تقصیر کا اقرار کیا۔ حضرت یونس علیہ السلام سے صبر کے سلسلے میں جو ترک اولیٰ ہوا تھا، اسی کو انبیاء علیہم السلام اپنی تقصیر اور کوتاہی سمجھتے ہیں

۶۔ فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ: ہم نے یونس علیہ السلام کی دعا قبول کی اور انہیں غم و اندوہ سے نجات دی۔ چنانچہ تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے بعد مچھلی نے انہیں ساحل پر پھینک دیا۔ چنانچہ حضرت علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے حکم ملا کہ وہ دوبارہ نینویٰ جائیں اور اپنی دعوت جاری رکھیں۔

اہل نینویٰ بنا بقولے عذاب کی علامتیں دیکھ کر ایمان لے آئے۔ اس طرح نینویٰ وہ واحد بستی ہے جس کے تمام لوگ اپنے رسول پر ایمان لے آئے۔ چنانچہ سورہ یونس آیت ۹۸ میں آیا:

فَلَوۡ لَا کَانَتۡ قَرۡیَۃٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَہَاۤ اِیۡمَانُہَاۤ اِلَّا قَوۡمَ یُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا کَشَفۡنَا عَنۡہُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡیِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ مَتَّعۡنٰہُمۡ اِلٰی حِیۡنٍ ○	کیا کوئی بستی ایسی ہے کہ (بروقت) ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے سودمند ثابت ہوا ہو سوائے قوم یونس کے؟ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ان سے ٹال دیا اور ایک مدت تک انہیں (زندگی سے) بہرہ مند رکھا۔

بعض لوگ مچھلی کے پیٹ میں ایک انسان کا تین دن تک زندہ سلامت رہنا ناممکن تصور کرتے ہیں حالانکہ معجزہ سے ہٹ کر عام حالات میں اس قسم کے واقعات ہمارے زمانے میں پیش آتے ہیں۔ چنانچہ ۲۰۰۶ء میں ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک شخص چند روز بعد نہنگ (مگرمچھ) کے پیٹ سے سالم نکل آیا تھا۔

وَکَذٰلِکَ نُـۨجِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: اسی طرح مؤمنین کو بھی ہم نجات بخشتے ہیں۔ سچے مؤمن، سچے دل سے، صرف زبانی نہیں، اپنے پورے وجود کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں دعا کریں تو قبولیت دعا کا وعدہ ہے۔ یہ

بات صرف یونس علیہ السلام کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ جس مؤمن سے لغزش ہو جائے پھر وہ اپنی تقصیر کا اعتراف کر کے اللہ سے نجات مانگے۔ اللہ اسے نجات دے گا۔

اہم نکات

۱۔ اپنی تقصیر اور گناہ کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔

۲۔ تقصیر کے بعد اللہ ہی کو پکارنا چاہیے۔

وَ زَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾

۸۹۔ اور زکریا کو بھی (رحمتوں سے نوازا) جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا: میرے پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑ اور تو بہترین وارث ہے۔

تفسیر آیات

حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر ڈھل گئی ہے اور ابھی تک اولاد سے محروم ہیں۔ ان کی زوجہ بھی بانجھ ہیں۔ چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا کی: اے میرے رب مجھے تنہا نہ چھوڑ، میرا کوئی وارث ہو، اگرچہ تو بہترین وارث ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

۹۰۔ پس ہم نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں یحییٰ عطا کیا اور ان کی بیوی کو ان کے لیے نیک بنا دیا، یہ لوگ کارہائے خیر میں سبقت کرتے تھے اور شوق و خوف (دونوں حالتوں) میں ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے لیے خشوع کرنے والے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فرزند عطا فرمایا۔ اس فرزند کا نام یحییٰ رکھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ مریم کی ابتدائی آیات اور آل عمران۔

۲۔ وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ: اصلاح کا مطلب بانجھ پن کو دور کرنا اور حمل کے لائق بنانا ہے۔

۳۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ: قبولیت دعا کے لیے لازم شرائط موجود ہونے کی طرف اشارہ ہے:

i۔ یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ: وہ کار خیر میں سبقت لے جانے والے تھے۔
ii۔ وَیَدۡعُوۡنَنَا: شوق اور خوف دونوں حالتوں میں پکارتے تھے۔
رَغَبًا: وہ رضائے رب، قبولیت دعا اور ثواب کے بارے میں شوق وجذبے کے ساتھ دعا کرتے تھے۔
رَهَبًا: اللہ کے غضب سے خوف کی وجہ سے ہمیں پکارتے ہیں۔ وہ اچھے دنوں میں رغبۃً پکارتے ہیں تو ہم برے دنوں میں دعا قبول کرتے ہیں۔
iii۔ وَکَانُوۡا لَنَا خٰشِعِیۡنَ: تیسری خصوصیت جس کی وجہ سے دعا قبول ہوئی، خشوع ہے۔ ٹوٹے دلوں سے پکارا جائے تو دعا سنی جاتی ہے۔ صرف زبان ہلانے کو دعا اور پکار نہیں کہتے۔

اہم نکات

۱۔ قبولیت دعا کے لیے نیکی میں سبقت لے جانا، اچھی بری دونوں حالتوں میں اللہ کو پکارنا اور خشوع سے دعا کرنا شرط ہے۔
۲۔ اللہ کی خوشنودی کا شوق اور ناراضگی کا خوف، خوف و امید کے درمیان دعا کی جاتی ہے۔

وَالَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَہَا فَنَفَخۡنَا فِیۡہَا مِنۡ رُّوۡحِنَا وَجَعَلۡنٰہَا وَابۡنَہَاۤ اٰیَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ اور اس خاتون کو بھی (نوازا) جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی اس لیے ہم نے ان میں اپنی روح پھونک دی اور انہیں اور ان کے بیٹے (عیسیٰ) کو تمام اہل عالم کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ: اس خاتون کا بھی ذکر ہے جس نے اپنی عفت اور پاکدامنی کی پاسداری کی۔
۲۔ فَنَفَخۡنَا فِیۡہَا مِنۡ رُّوۡحِنَا: ہم نے ان میں اپنی روح پھونک دی۔ اس روح کو اپنی طرف نسبت تشریف و تفضیل کے لیے دی ہے ورنہ ساری روحیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ جیسا کہ بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ جب کہ ساری کائنات اللہ کی ملکیت میں ہے صرف ایک بیت نہیں ہے۔
روایات صحیح السند کے مطابق انسان کی روح دو ہزار سال پہلے خلق ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو اللہ نے ایک خصوصیت کے ساتھ خلق فرمایا۔
۳۔ وَجَعَلۡنٰہَا وَابۡنَہَاۤ اٰیَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ: مریم و عیسیٰ علیہما السلام کی شخصیت پیہم معجزات سے عبارت ہے۔ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے معجزات میں غیر موسمی پھل آنا، خشک کھجور کے درخت کا پھل دینا اور چشمہ جاری ہونا شامل ہیں۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں ان کا گھوارے میں بات کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، جذام کے

مریضوں کو شفا دینا، گھروں میں کیا کیا ذخیرہ کر رکھا ہے، اسے بتا دینا وغیرہ شامل ہیں۔

اہم نکات

۱۔ پاکدامنی میں نبوت پالی جاتی ہے۔

۲۔ ایک خاتون بھی اللہ کی بڑی نشانیوں میں ہو جاتی ہے: اٰیَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۫ۖ وَّ اَنَا رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۹۲﴾

۹۲۔ یہ تمہاری امت یقیناً امت واحدہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں لہٰذا تم صرف میری عبادت کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ تمام انسانوں کا رب ایک ہے تو لازماً سب انسان ایک ہی امت ہیں۔ سب اللہ کی بندگی میں ایک جیسے ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام اسی ایک رب کی طرف بلانے آئے ہیں۔

اُمَّۃً ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو ایک رشتے میں باہم منسلک ہوں۔

کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ...[1] تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کیے گئے ہو تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

وَ مِمَّنۡ خَلَقۡنَاۤ اُمَّۃٌ یَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ...[2] اور جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایک جماعت ایسی ہے جو حق کے مطابق ہدایت کرتی ہے۔

تمام انسان، انسانیت میں ایک ہیں۔ مخلوقیت میں ایک ہیں، بندگی میں ایک ہیں، سب کا رب ایک ہے، سب کا مدبر ایک ہے، سب کا رازق ایک ہے اور سب کی فطرت ایک ہے۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخۡتَلَفُوۡا...[3] اور سب انسان ایک ہی امت تھے پھر اختلاف رونما ہوا۔

۲۔ وَّ اَنَا رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ: میں تمہارا رب ہوں پس میری عبادت کرو۔ آیت کے اس جملے سے عبادت کی تعریف نکل آتی ہے کہ عبادت صرف رب کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی آیت میں "میری عبادت کرو" کے لیے اَنَا رَبُّکُمۡ کو بنیاد بنایا کہ چونکہ میں تمہارا رب ہوں لہٰذا صرف میری عبادت کرو۔ لہٰذا عبادت کی تعریف یہ ہے کہ کسی ذات کو رب یا خالق سمجھ کر اس کی تعظیم کرنا عبادت ہے۔ ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔

وَ تَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَیۡنَهُمۡ ؕ کُلٌّ

۹۳۔ لیکن انہوں نے اپنے (دینی) معاملات میں

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۱۰ [2] ۷ الاعراف: ۱۸۱ [3] ۱۰ یونس: ۱۹

اِلَیۡنَا رٰجِعُوۡنَ ﴿۹۳﴾

تفرقہ ڈال دیا، آخرکار سب نے ہماری طرف رجوع کرنا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے تفرقہ ڈالا۔ یعنی یہود و نصاریٰ۔ یہود ہو یا نصاریٰ سب کو ایک ہی امت کے پرچم تلے جمع ہونا تھا۔ اس ایک رب کی طرف سے آنے والے نبیؐ کی ہدایت پر چلنا چاہیے تھا مگر جب بھی کوئی رسول، اللہ کی طرف سے آیا اسے مسترد کر دیا گیا۔ اس کی وجہ سے فرقے وجود میں آتے گئے۔

کُلٌّ اِلَیۡنَا رٰجِعُوۡنَ: ان تمام فرقہ بازوں کو ہمارے پاس آنا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا کُفۡرَانَ لِسَعۡیِہٖ ۚ وَ اِنَّا لَہٗ کٰتِبُوۡنَ ﴿۹۴﴾

۹۴۔ پس جو نیک اعمال بجا لائے اور وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہو گی اور ہم (اس کے اعمال) اس کے لیے لکھ رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ: کُلٌّ اِلَیۡنَا رٰجِعُوۡنَ کی تفصیل ہے۔ جب یہ لوگ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم اس شخص کا عمل ضائع نہیں کریں گے بلکہ ان میں سے جو عمل صالحات میں سے کچھ صالح عمل بجا لایا ہے۔ مِنۡ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اعمال صالحہ میں سے کچھ عمل بجا لانے والا ہو۔

۲۔ وَ ہُوَ مُؤۡمِنٌ: اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو۔ اس عمل صالح کا محرک ایمان ہو تو اس صورت میں عمل صالح کی قیمت لگتی ہے۔

۳۔ فَلَا کُفۡرَانَ لِسَعۡیِہٖ: اس محنت کی ناقدری نہ ہو گی بلکہ صرف عمل کا ثواب نہیں، مزید ثواب دے دیا جائے گا۔

۴۔ وَ اِنَّا لَہٗ کٰتِبُوۡنَ: نیک مؤمن کا عمل صفحہ کائنات پر ثبت ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہم نے کئی بار لکھی ہے کہ انسان کا عمل ایک بار وجود میں آنے کے بعد نابود نہیں ہوتا مگر اینکہ حبط یا عفو ہو جائے۔ قیامت کے دن حساب کے لیے خود عمل سامنے آئے گا اور پورا اجر مل جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کے بغیر عمل حبط ہو جاتا ہے۔

۲۔ ایمان کے ساتھ کچھ عمل صالح ہو تو بھی نجات ہے: مِنَ الصّٰلِحٰتِ ....

وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَاۤ اَنَّہُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۹۵﴾

۹۵۔ اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا ہے اس کے (مکینوں) کے لیے ممکن نہیں کہ وہ (دوبارہ) لوٹ کر آئیں۔

تفسیر آیات

کہ وہ واپس آ کر اعمال صالحہ بجا لائیں اور جن جرائم کا وہ ارتکاب کرتے رہے ہیں ان کا تدارک کریں، جن نبیوں کو ان لوگوں نے جھٹلایا ہے ان کی تصدیق کریں، جن پر ظلم کیا ہے اس کا بھی تدارک کریں۔ اس سفر میں رجوع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ دنیا سے واپس ماں کے پیٹ میں جا سکتا ہے، نہ ماں کے پیٹ سے صلب پدر میں جا سکتا ہے۔ اسی طرح عالم برزخ سے عالم دنیا میں واپس نہیں آ سکتا۔

یہاں قَرۡیَۃٍ ہر آبادی اور بستی کو شامل کرتا ہے اور اَہۡلَکۡنٰہَاۤ میں ہر مرنے والا شامل ہے۔ اس طرح یہ ایک حکم عام ہے۔ لہٰذا اس سے یہ مفہوم نہیں لیا جائے گا کہ یہ بات صرف ان بستیوں سے مربوط ہے جنہیں اللہ نے عذاب کے طور پر تباہ کیا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَ مَاۡجُوۡجُ وَہُمۡ مِّنۡ کُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ ﴿۹۶﴾

۹۶۔ یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج (کا راستہ) کھول دیا جائے گا تو وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے۔

تشریح کلمات

حَدَبٍ: (ح د ب) بلند اور سخت زمین کے معنوں میں ہے۔

یَّنۡسِلُوۡنَ: (ن س ل) النسل کے معنی کسی چیز کے الگ ہونے کے ہیں۔ اولاد کو بھی النسل کہتے ہیں چونکہ وہ اپنے باپ سے جدا ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

اس دار الامتحان کے لیے جو قانون ہم نے وضع کیا ہے اس کے تحت ایمان و عمل کا ایک معیار قائم ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا، یاجوج اور ماجوج کی یلغار تک۔

۱۔ فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ: کھول دیا جائے گا سے مراد ان کے لیے راستہ ہموار ہو جائے گا۔ حالات

ان کے لیے فضا سازگار بنا رہے ہوں گے۔ یاجوج ماجوج ایک خاص قوم کا نام ہے یا یہ ہر ایسے جنگجو لشکر کا نام ہے جو غارت گری کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتا۔ اس موقف کے مطابق آخری زمان کے یہ یاجوج ماجوج وہ نہیں جن کے لیے ذوالقرنین نے سد بنایا تھا نیز یاجوج ایک قوم ہے، ماجوج دوسری قوم ہے۔ ہوسکتا ہے یہ دونوں مل کر دیگر اقوام پر حملہ کریں یا یہ خود آپس میں لڑیں۔

۲۔ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ: وہ ہر بلند جگہوں سے نکل پڑیں گے۔ ایک بھرپور یورش ہو گی۔ بلند جگہوں سے مراد پہاڑ بھی ہو سکتے ہیں، فضائی حملہ بھی ہوسکتا ہے۔ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یعنی چاروں طرف سے فضائی حملہ ہو گا۔ بہرحال بلند جگہوں سے جو بھی مراد ہو، یہ ایک عالمی جنگ کی طرف اشارہ ہے کہ جب قیامت قریب ہو گی تو ایک غارت گر قوم کی طرف سے ایک یورش ہو گی۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۹۷	۹۷۔اور برحق وعدہ قریب آنے لگے گا تو کفار کی آنکھیں یکا یک کھلی رہ جائیں گی،(وہ کہیں گے) ہائے ہماری تباہی! ہم واقعی اس سے غافل تھے، بلکہ ہم تو ظالم تھے۔

تشریح کلمات

شَاخِصَةٌ : (ش خ ص) الشخص: کھڑے انسان کو کہتے ہیں۔ شخص بصرہ اس کی آنکھیں پتھرا گئی۔

تفسیر آیات

۲۷۹

ا۔ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ: وعدہ حق سے مراد قیامت ہے یعنی قیامت کے قریب وقوع پذیر ہونے والے حالات ایسے ہوں گے جن کو دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا [1]	اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت کے دن سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب میں مبتلا نہ کریں، یہ بات کتاب (تقدیر) میں لکھی جا چکی ہے۔

حدیث رسولؐ میں آیا ہے:

> قیامت سے پہلے دس علامات ظاہر ہوں گی۔ سورج کا مغرب سے طلوع کرنا، دجال اور دابۃ الارض کا ظہور، تین جگہوں پر زمین کا دھنس جانا، ایک مغرب میں، ایک مشرق میں، ایک جزیرۃ العرب میں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خروج اور یاجوج و ماجوج کا خروج۔[2]

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۵۸   [2] بحار الانوار ۶: ۳۰۴ و صحیح مسلم

۲۔ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ: قیامت کے قریب رونما ہونے والے حوادث کو دیکھ کر کافر کی آنکھیں دہشت زدہ ہو کر پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

۳۔ یٰوَیۡلَنَا قَدۡ کُنَّا فِیۡ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ هٰذَا: دنیا میں تو غافل رہے، جب عذاب سامنے آیا ہے تو بیدار ہو گئے۔ فرصت کے دنوں میں ان باتوں کو اعتنا میں نہیں لاتے تھے۔ آج ہوش میں آ گئے ہیں۔

۴۔ بَلۡ کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ: غفلت ہی نہیں بلکہ جان بوجھ کر قیامت کے تصور کو ذہن سے دور پھینک دیتے تھے۔ آج دیکھا کہ اپنے اوپر کس قدر ظلم کر رکھا ہے۔

اہم نکات

۱۔ فرصت ہاتھ سے جانے سے پہلے قیامت کی تیاری کرنی چاہیے۔

۲۔ غفلت اور ظلم سے بچنا ہی تیاری ہے۔

اِنَّکُمۡ وَ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ ؕ اَنۡتُمۡ لَہَا وٰرِدُوۡنَ ﴿۹۸﴾

۹۸۔ بتحقیق تم اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے تھے جہنم کا ایندھن ہیں جہاں تمہیں داخل ہونا ہے۔

تشریح کلمات

حَصَبُ: (ح ص ب) الحصب: ایندھن کے معنوں میں ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت پر عبد اللہ بن الزبعری جو مکہ کے مشرکین میں سے تھا، نے اعتراض کیا: مسیح اور عزیر اور ملائکہ بھی جہنم جائیں گے کیونکہ ان کو بھی لوگوں نے معبود بنایا ہے۔ اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے:

ہاں ہر وہ شخص جہنم جائے گا جس نے پسند کیا ہو کہ اللہ کو چھوڑ کر اس کی بندگی کی جائے۔

دوسرا جواب یہ ہے:

اِنَّکُمۡ کا خطاب اہل مکہ سے ہے۔ وہ شیاطین اور اصنام کی بندگی کرتے تھے۔

تیسرا جواب یہ ہے:

آیت مَا تَعۡبُدُوۡنَ ہے۔ مَا غیر عاقل کے لیے ہوتا ہے۔

اَنۡتُمۡ لَہَا وٰرِدُوۡنَ: جس جہنم میں تم مشرکین نے جانا ہے اسی میں تمہارے معبود بھی جائیں گے۔ جامد چیز کو جہنم میں ڈالنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہ ہے: مشرکین کی حسرت اور ندامت میں اضافے کے لیے یا ممکن ہے مشرکین کے لیے

بطور ایندھن یہ بت جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ جیسا کہ فرمایا: وَقُوۡدُہَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَۃُ ....[1]

لَوۡ کَانَ ہٰۤؤُلَآءِ اٰلِـہَۃً مَّا وَرَدُوۡہَا ؕ وَ کُلٌّ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۹۹﴾

۹۹۔ اگر یہ معبود ہوتے تو جہنم میں داخل نہ ہوتے اور اب سب کو اسی میں ہمیشہ رہنا ہے۔

لَہُمۡ فِیۡہَا زَفِیۡرٌ وَّ ہُمۡ فِیۡہَا لَا یَسۡمَعُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔ جہنم میں ان کا شور ہوگا اور وہ اس میں کچھ نہ سن سکیں گے۔

تشریح کلمات

زَفِیۡرٌ: (ز ف ر) الزفیر کے اصل معنی سانس کے اس قدر تیزی سے آمد و رفت کے ہیں کہ جس سے سینہ پھول جائے۔

تفسیر آیات

اگر یہ اصنام و شیاطین معبود ہوتے تو جہنم نہ جاتے۔

وَ کُلٌّ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ: یہ عابد اور معبود دونوں آتش جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں آتش کی پھنکاروں کے شور میں اور کوئی آواز سنائی نہیں دے گی۔ نہ کسی کو پکار سکیں گے، نہ ہی کسی کی آواز ان تک پہنچ سکے گی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتۡ لَہُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰۤی ۙ اُولٰٓئِکَ عَنۡہَا مُبۡعَدُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾ۙ

۱۰۱۔ جن کے حق میں ہماری طرف سے پہلے ہی (جنت کی) خوشخبری مل چکی ہے وہ اس آتش سے دور ہوں گے۔

لَا یَسۡمَعُوۡنَ حَسِیۡسَہَا ۚ وَ ہُمۡ فِیۡ مَا اشۡتَہَتۡ اَنۡفُسُہُمۡ خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ جہاں وہ اس کی آہٹ تک نہ سنیں گے اور وہ ہمیشہ ان چیزوں میں رہیں گے جو ان کی خواہشات کے مطابق ہوں گی۔

تشریح کلمات

حیس: (ح س س) اور الحس حرکت، رہٹ کو بھی کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتۡ لَہُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰۤی: مجمع البیان میں آیا ہے کہ عبد اللہ بن الزبعری کے

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۴ (ترجمہ) جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں

جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ان معبودوں میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح جنہیں پہلے جنت کی خوشخبری مل چکی ہوگی وہ جہنم کی آہٹ تک نہیں سنیں گے۔

اَلۡحُسۡنٰۤی: وعدہ جنت یا سعادت، یہ احسن کی تانیث ہے۔ اصل میں الموعدۃ الحسنیٰ ہے۔ جس کا ہم نے خوشخبری سے ترجمہ کیا ہے۔

۲۔ اُولٰٓئِکَ عَنۡہَا مُبۡعَدُوۡنَ: جن کو پہلے ہی خوشخبری دی جا چکی ہے وہ آتش سے دور رہیں گے۔

۳۔ لَا یَسۡمَعُوۡنَ حَسِیۡسَہَا: وہ جہنم کی آگ کی آہٹ تک نہیں سنیں گے۔ اگرچہ سب کو جہنم سے ہی گزارا جائے گا۔

وَ اِنۡ مِّنۡکُمۡ اِلَّا وَارِدُہَا ۚ کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتۡمًا مَّقۡضِیًّا ﴿۷۱﴾[1]　　اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہوگا جو جہنم پر وارد نہ ہو، یہ حتمی فیصلہ آپ کے رب کے ذمے ہے۔

۴۔ وَ ہُمۡ فِیۡ مَا اشۡتَہَتۡ اَنۡفُسُہُمۡ: جنت کی نعمتوں کے وصف و بیان کے لیے ممکنہ تعبیر یہی ہو سکتی ہے جو جامع بھی ہے اور دنیاوی مفاہیم کے تحت قابل فہم ہے۔ ”ہر خواہش پوری ہو گی“ کی فضا میں ہمیشہ رہیں گے۔

شواھد التنزیل میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا علی فیکم نزلت ھذہ الایۃ۔　　اے علی! آپ لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

لَا یَحۡزُنُہُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ وَ تَتَلَقّٰہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ؕ ہٰذَا یَوۡمُکُمُ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾　　۱۰۳۔ انہیں قیامت کے بڑے خوفناک حالات بھی خوفزدہ نہیں کریں گے اور فرشتے انہیں لینے آئیں گے (اور کہیں گے) یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا یَحۡزُنُہُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ: اَلۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ ”انتہائی گھبراہٹ“ سے مراد صور پھونکنے کے موقع پر ہوگی۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ فَفَزِعَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ....[2]　　اور جس روز صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات خوفزدہ ہو جائیں گی....

---

[1] ۱۹ مریم: ۷۱　　[2] ۲۷ نمل: ۸۷

یا قیامت کے دن کو فزع اکبر کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک آتش جہنم کی طرف لے جانا فزع اکبر ہے۔ جن لوگوں کو پہلے سے نجات و سعادت کی خوشخبری دے دی گئی ہے، فزع اکبر بڑی گھبراہٹ اور پریشانی انہیں فکر مند نہیں کرے گی۔

شواهد التنزیل اور دیگر شیعہ مصادر میں یہ روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یاعلی فیکم نزلت لَا یَحۡزُنُهُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ (انت و شیعتك)... [1]	اے علی! آیہ لَا یَحۡزُنُهُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ ان کو بڑی گھبراہٹ پریشان نہیں کرے گی۔ آپ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور آپ کے شیعوں کے بارے میں۔

۲۔ تَتَلَقّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِکَةُ: فرشتے ان کو لینے آئیں گے۔ ان کا استقبال ہو گا۔

۳۔ هٰذَا یَوۡمُکُمُ: اور بشارت دیں گے آج یہ دن تمہارا دن ہے۔ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ بڑے سعادت مند ہیں وہ لوگ جن کو فزع اکبر پریشان نہ کرے۔

۲۔ اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے خوشخبری لے کر آئیں۔

یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُهٗ ؕ وَعۡدًا عَلَیۡنَا ؕ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴۔ اس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق لپیٹتے ہیں، جس طرح ہم نے خلقت کی ابتدا کی تھی، اسے ہم پھر دہرائیں گے، یہ وعدہ ہمارے ذمے ہے جسے ہم ہی پورا کرنے والے ہیں۔

تشریح کلمات

السِّجِلِّ: (س ج ل) السجل کے اصل معنی اس پتھر کے ہیں جس پر لکھا جاتا تھا۔ بعد میں ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے سجل کہنے لگے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ: قیامت کے موقع پر یہ آسمان لپیٹ لیا جائے گا۔ خزانہ غیب میں چلا جائے

---

[1] شواهد التنزیل ۱: ۵۰۰۔ ذیل آیہ

گا۔ انسان کے لیے مانوس اس کائنات کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس کی جگہ ایک نئی کائنات وجود میں آئے گی۔

یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوۡا لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ الۡقَہَّارِ ○ [1]

یہ (انتقام) اس دن ہو گا جب یہ زمین کسی اور زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور سب خدائے واحد و قہار کے سامنے پیش ہوں گے۔

۲۔ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ: یہ کائنات اپنی ابتدا کی حالت میں واپس جائے گی اور لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡکُوۡرًا ...[2] ہو جائے گی۔ پھر نُّعِیۡدُہٗ نئے سرے سے دوبارہ ایک جدید کائنات تعمیر ہو گی۔ بنابر قولے یہ جملہ انسان کے بارے میں ہے کہ انسان کو اس طرح دوبارہ خلق کریں گے جس طرح شروع میں خلق کیا تھا۔ لیکن یہ سیاق آیت کے خلاف ہے۔

۳۔ وَعۡدًا عَلَیۡنَا ؕ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیۡنَ: یہ وعدۂ الٰہی ہے کہ یہ کائنات صرف دار التکلیف میں منحصر نہیں نہیں ہے۔ اس کے بعد دار الجزاء آئے گا۔ اگر دار الجزاء نہ آیا تو یہ کائنات بے مقصد ہو جائے گی۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے بعد جس عالم میں ہم ہوں گے اس کا زمان و مکان، ہماری اس دنیا سے مختلف ہو گا۔

۲۔ قیامت آنا وعدۂ الٰہی کے مطابق ضروری اور حتمی ہے۔

وَ لَقَدۡ کَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّکۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُہَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔

تشریح کلمات

الزَّبُوۡرِ: (ز ب ر) زبرت الکتاب۔ میں نے کتاب کو موٹے خط میں لکھا اور ہر وہ کتاب جو جلی حرف میں لکھی ہوئی ہو اسے زبور کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ کَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ: زبور وہ صحیفہ ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوا۔ چنانچہ فرمایا:

وَ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۚ [3]

اور داؤد کو ہم نے زبور دی۔

۲۔ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّکۡرِ: ذکر سے مراد توریت ہے یا قرآن یا لوح محفوظ۔ کسی ایک پر آیت میں

---

[1] ۱۴ ابراہیم: ۴۸ [2] ۷۶ انسان: ۱ [3] ۴ نساء: ۱۶۳

کوئی قرینہ نہیں ہے۔ اگرچہ قرآن اور توریت کو قرآن میں ذکر کے نام سے یاد کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں الذکر سے ذکر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہے جو صحف انبیاء میں موجود تھا۔

۳۔ اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُھَا: اس زمین سے مراد کون سی زمین ہے جس کے صالح بندے وارث ہوں گے؟ بعض مفسرین دنیوی زمین اور اقتدار مراد لیتے ہیں کہ اللہ اپنے صالح بندوں کو اقتدار دیتا ہے۔ حالانکہ عملاً ایسا دیکھنے میں نہیں آتا۔ اکثر اقتدار غیر صالح لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔ ایک توجیہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ اس آیت کا مصداق ابھی وجود میں نہیں آیا۔ یہ ایک پیشگوئی اور خوشخبری ظہور مہدی عجل اللہ فرجہ کے بعد کی دنیا کے بارے میں ہے کہ اس وقت ہی صالح بندے اس زمین کے وارث بنیں گے۔ اس نظریے کی تائید میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ ...[۱]

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجا لائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں زمین میں اس طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو جانشین بنایا اور جس دین کو اللہ نے ان کے لیے پسندیدہ بنایا ہے اسے پائدار ضرور بنائے گا...

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے متواتر احادیث اس موضوع پر موجود ہیں جن میں صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ، قائم آل محمد علیہ السلام اور ان کے اصحاب ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لَو لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا يَوْمٌ لَطَوَّلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ حَتّٰى يبعث الله رجل منى يَمْلَاَهَا قِسْطاً وَ عَدْلاً كَمَا مُلِئَتْ ظُلْماً وَ جَوْراً ...[۲]

اگر دنیا کی عمر میں صرف ایک دن رہ گیا ہو تو بھی اللہ اس دن کو اس قدر طویل بنا دے گا تاکہ ایک شخص کو اٹھائے جو مجھ سے ہو، جو زمین کو عدل و انصاف سے ایسے پر کرے گا جیسے ظلم و جور سے پر ہو گئی ہو گی۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ یہ جنت کی سرزمین کا ذکر ہے جس کے وارث اللہ کے صالح بندے ہوں گے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ صَدَقَنَا وَعۡدَہٗ وَ اَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّۃِ حَیۡثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ۝[۳]

اور وہ کہیں گے: ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہمیں اس سرزمین کا وارث بنایا کہ جنت میں ہم جہاں چاہیں جگہ بنا سکیں، پس عمل کرنے والوں کا اجر کتنا اچھا ہے۔

---

[۱] ۲۴ نور: ۵۵　[۲] غیبۃ الطوسی ص ۸۶ ح: ۱۷۷　[۳] ۳۹ زمر: ۷۴

اس نظریے پر سیاق آیات سے استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ آیت بھی عالم آخرت سے مربوط آیات کے ساتھ مربوط ہے لیکن سیاق کے ظہور پر آیت کی تفسیر میں وارد روایات کی صراحت مقدم ہے۔ لتقدم النص علی الظاھر نیز الۡاَرۡضَ سے مراد ارض جنت ہونے پر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے جس طرح سورہ زمر کی آیت میں موجود ہے۔

اِنَّ فِیۡ ہٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوۡمٍ عٰبِدِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ ۱۰۶۔ اس (بات) میں بندگی کرنے والوں کے لیے یقیناً ایک آگاہی ہے۔

تفسیر آیات

اس سورہ میں جو مضامین آئے ہیں ان میں عبادت گزاروں کے لیے ایک پیغام ہے۔ وہ مضامین یہ ہیں: تمام انسانوں کا ایک ہی رب ایک معبود ہے۔ نبوت برحق ہے۔ یوم الحساب آنے والا ہے جس میں مؤمن کو ثواب اور کافر کو عذاب ملے گا۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۷﴾ ۱۰۷۔ اور (اے رسول) ہم نے آپ کو بس عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تفسیر آیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا وجود، آپؐ کی ذات، آپؐ کا پیغام، آپؐ کی نبوت، تمام عالمین کے لیے رحمت ہے۔ آپؐ کے رحمت ہونے کی اساس آپؐ کی دعوت الی التوحید ہے جو حق و حقیقت تک رسائی کے لیے بہت بڑی نعمت اور رحمت ہے ورنہ جاہلیت میں لوگ حقیقت اور حق سے دور موہومات میں گم تھے۔

i۔ آپؐ نے حق و باطل میں تمیز کرنے کا سلیقہ دیا۔

ii۔ انسان کو احترام آدمیت کا شعور ملا۔

iii۔ انسان کو انسانی حقوق میسر آئے۔

iv۔ عدل و انصاف اور ناانصافی کی میزان عنایت فرمائی۔

v۔ ایک جامع نظام حیات عنایت فرمایا۔

vi۔ خواب غفلت اور جہالت میں پڑی انسانیت کو جگایا۔

vii۔ دنیا میں باعزت زندہ رہنے کے لیے آداب زیست سکھائے۔

viii۔ زندگی کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جس کے لیے آداب اور قانون عطا نہ کیا ہو۔

ix۔ آپؐ کے مبعوث ہونے کے بعد ہی انسانیت نے تہذیب و تمدن کی طرف ایک جست لگائی۔

x۔ تاریخ انسانیت میں پہلی مرتبہ آپؐ نے غیر طبقاتی معاشرہ متعارف کرایا۔

ذیل میں ہم آپؐ کے رحمة للعالمین ہونے سے متعلق آیات و احادیث کے چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کریں گے:

i۔ لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡہِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿﴾ [1]

تحقیق تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے تمہیں تکلیف میں دیکھنا ان پر شاق گزرتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کا نہایت خواہاں ہے اور مومنین کے لیے نہایت شفیق، مہربان ہے۔

ii۔ وَ یَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ۔۔۔۔ [2]

اور ان پر لدے ہوئے بوجھ اور (گلے کے) طوق اتارتے ہیں۔

ا۔ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انما انا رحمة مهداة ۔۔۔۔ [3]

میں (اللہ کی طرف سے) ہدیہ شدہ رحمت ہوں۔

۲۔ روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے جبرئیل سے فرمایا: کیا اس رحمت کا کچھ حصہ آپ تک بھی پہنچا ہے تو جبرئیل نے کہا: ہاں میں اپنی عاقبت کے بارے میں فکر مند تھا۔ آپؐ کی وجہ سے مجھے اطمینان ملا۔ جب اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں فرمایا:

ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ ﴿ۙ﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ﴿ؕ﴾ [4]

جو قوت کا مالک ہے، صاحب عرش کے ہاں بلند مقام رکھتا ہے۔ وہاں ان کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہ امین ہیں۔

روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

حِیَاتِی خَیْرٌ لَکُمْ وَ مَمَاتِی خَیْرٌ لَکُمْ قَالُوا یَا رَسُولَ اللّٰہِ وَ کَیْفَ ذٰلِكَ فَقَالَ ص اَمَّا حِیَاتِی فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ یَقُولُ: وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ وَ اَنۡتَ فِیۡہِمۡ وَ اَمَّا مُفَارَقَتِی اِیَّاکُمْ فَاِنَّ اَعْمَالَکُمْ تُعْرَضُ عَلَیَّ کُلَّ یَوْمٍ فَمَا کَانَ مِنْ حَسَنٍ اسْتَزَدْتُ اللّٰہَ لَکُمْ وَمَا کَانَ مِنْ قَبِیْحٍ اسْتَغْفَرْتُ اللّٰہَ لَکُمْ ۔۔۔۔ [5]

میری زندگی تمہارے لیے خیر ہے اور میری جدائی بھی۔ عرض کیا وہ کیسے؟ فرمایا: میری زندگی اس لیے خیر ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ ان کو عذاب نہیں دے گا جب تک آپؐ ان میں موجود ہیں۔ میری جدائی اس لیے خیر ہے کہ تمہارے اعمال روزانہ میرے سامنے پیش ہوتے ہیں اگر نیکی ہے تو اللہ سے مزید مانگتا ہوں اور برائی ہے تو مغفرت طلب کرتا ہوں۔

۴۔ حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] ۹ توبہ: ۱۲۸　[2] ۷ اعراف: ۱۵۷　[3] بحار الانوار۔ ۱۶: ۱۱۵　[4] ۸۱ تکویر: ۲۰، ۲۱، بحار الانوار ۱۶: ۳۰۶　[5] الفقیہ ۱: ۱۹۱

مَا مِنْ شَیْءٍ یُقَرِّبُکُمْ مِنَ الْجَنَّةِ وَ یُبَعِدُکُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّا وَ قَدْ اَمَرْتُکُمْ بِهِ وَ مَا مِنْ شَیْءٍ یُقَرِّبُکُمْ مِنَ النَّارِ وَ یُبَعِدُکُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا وَ قَدْ نَهَیْتُکُمْ عَنْهُ ....[1]

کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو تمہیں جنت سے نزدیک اور آتش سے دور کر دے میں نے تمہیں اس کے بجا لانے کا حکم دیا اور کوئی ایسی چیز بھی میں نے نہیں چھوڑی جو تمہیں آتش جہنم کے نزدیک اور جنت سے دور کر دے میں نے تمہیں اسے ترک کرنے کا حکم دیا۔

جس جگہ سے رحمت کا یہ چشمہ پھوٹا ہے اس جگہ کے بارے میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّداً صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نَذِیراً لِلْعَالَمِینَ وَ اَمِیناً عَلَی التَّنْزِیلِ وَاَنْتُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلَی شَرِّ دِینٍ وَفِی شَرِّ دَارٍ مُنِیخُونَ بَیْنَ حِجَارَةٍ خُشْنٍ وَ حَیَّاتٍ صُمٍّ تَشْرَبُونَ الْکَدِرَ وَ تَاْکُلُونَ الْجَشِبَ... .[2]

اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالمین کے لیے تنبیہ کرنے والا اور تنزیل کا امین بنا کر اس وقت مبعوث فرمایا جب تم عرب بدترین دین پر اور بدترین علاقے میں رہنے والے تھے۔ ناہموار پتھروں اور زہریلے سانپوں کے درمیان بود و باش رکھتے تھے۔ گندا لعفن کا پانی پیتے تھے اور غلیظ ترین غذا کھاتے تھے۔

روز قیامت کی شفاعت: روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَخْبَرَنِی الرُّوحُ الْاَمِینُ... فَمَا خَلَقَ اللّٰهُ عَبْداً مِنْ عِبَادِهِ مَلَكٍ وَ لَا نَبِیٍّ اِلَّا وَ یُنَادِی یَا رَبِّ نَفْسِی نَفْسِی وَ اَنْتَ تَقُولُ یَا رَبِّ اُمَّتِی اُمَّتِی.... [3]

جبرائیل نے مجھ سے کہا:...(روز قیامت) تمام مخلوق خدا، خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی، نفسی نفسی پکاریں گے اور آپؐ امتی امتی پکاریں گے۔

رہا یہ سوال کہ آپؐ عالمین کے لیے رحمت ہیں تو کافروں کے لیے بھی رحمت ہونا چاہیے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ جنگوں میں ان کو قتل کیا جاتا ہے۔ آخرت میں جہنم میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ رسولؐ کے رحمة للعالمین ہونے سے بالاتر اللہ ارحم الراحمین ہے۔ اگر کوئی شخص اس رحمت کو قبول کرنے کے لیے ظرفیت اور اہلیت نہیں رکھتا اور اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقابلے میں کھڑا ہوتا ہے تو رحمت کے دشمن ناسور کو کاٹ کر پھینک دینا چاہیے اور اسے سزا بھی ملنی چاہیے ورنہ رحمت الٰہی میں سب کے لیے گنجائش موجود ہے: وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ...[4]

اہم نکات

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت اس کے اہل کو پہنچتی ہے۔

---

[1] الکافی ۲: ۷۴ [2] نہج البلاغہ خطبہ: ۲۶ [3] الکافی ۸: ۳۱۲ [4] ۷ اعراف: ۱۵۶

قُلۡ اِنَّمَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ کہد یجیے: میرے پاس وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے، تو کیا تم تسلیم کرتے ہو؟

تفسیر آیات

رسول اللہ ﷺ کی طرف رحمت کا اساس رحمت کا دروازہ یہی توحید پرستی کی طرف راہنمائی ہے تمام دنیا و آخرت کی رحمتوں کی کنجی توحید پرستی ہے۔

فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ: کلمہ توحید کی طرف دعوت ہے کہ ابتداء میں صرف تسلیم کا مطالبہ ہے کہ ذوق توحید ایک مرتبہ چکھ لے بعد میں دوسرے مراحل آسان ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی گزر جاتے ہیں۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُکُمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ وَ اِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ اَمۡ بَعِیۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹۔ پھر اگر انہوں نے منہ موڑ لیا تو کہ دیجیے: ہم نے تمہیں یکساں طور پر آگاہ کر دیا ہے اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا دور، یہ میں نہیں جانتا۔

تفسیر آیات

رحمت للعالمین کا یہی تقاضا ہے کہ رحمت کا پیغام سب تک یکساں طریقے سے پہنچایا جائے اور اسے قبول نہ کرنے کی صورت میں اس کا برا نتیجہ بھی سب تک یکساں طریقے سے پہنچایا جائے۔

وَ اِنۡ اَدۡرِیۡۤ: یہ معلوم نہیں ہے کہ جس عذاب سے تمہیں دوچار ہونا ہے وہ قریب ہے یا دور لیکن بہرحال وہ دن تمہیں دیکھنا ہے۔

مَّا تُوۡعَدُوۡنَ: سے مراد قیامت ہو سکتی ہے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

اِنَّہٗ یَعۡلَمُ الۡجَہۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَ یَعۡلَمُ مَا تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

۱۱۰۔ اور وہ بلند آواز سے کہی جانے والی باتوں کو بھی یقیناً جانتا ہے اور انہیں بھی جانتا ہے جنہیں تم پوشیدہ رکھتے ہو۔

وَ اِنۡ اَدۡرِیۡ لَعَلَّہٗ فِتۡنَۃٌ لَّکُمۡ وَ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ اور میں نہیں جانتا شاید اس (عذاب کی تاخیر) میں تمہاری آزمائش ہے اور ایک مدت تک سامان زیست ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کو علم ہے مشرکین اسلام کے بارے میں جس موقف کا اظہار اور استہزاء کرتے ہیں اور ان خفیہ تدبیروں کا بھی علم ہے جو وہ اسلام کے خلاف کرتے رہتے ہیں۔

وَاِنۡ اَدۡرِیۡ: رسول اللہؐ کا کلام جاری ہے کہ مجھے بھی معلوم نہیں کہ اعلان کرنے کا مجھے جو حکم ملا ہے وہ تمہاری آزمائش کے لیے ہے کہ تمہیں ایک وقت تک بطور امتحان مہلت دے دی جائے۔ اگر لَعَلَّہٗ کی ضمیر اٰذَنۡتُکُمۡ میں مضمر اذان کی طرف ہے لیکن اگر لَعَلَّہٗ کی ضمیر مَّا تُوۡعَدُوۡنَ یعنی تاخیر عذاب کی طرف ہے تو آیت کا مطلب یہ ہو جائے گا: مجھے علم نہیں ہے کہ عذاب کی تاخیر شاید تمہاری آزمائش کے لیے ہو۔

قٰلَ رَبِّ احۡکُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ وَ رَبُّنَا الرَّحۡمٰنُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

۱۱۲۔ رسول نے کہا: میرے پروردگار تو ہی حق کا فیصلہ فرما اور تم جو باتیں بناتے ہو اس کے مقابلے میں ہمارے مہربان رب سے ہی مدد مانگی جاتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قٰلَ رَبِّ احۡکُمۡ: قٰلَ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ سے عرض کیا کہ یہ لوگ میری دعوت کو مسترد کرتے ہیں۔ میں تیری درگاہ میں رجوع کرتا ہوں کہ میرے اور ان کے درمیان تو وہی فیصلہ فرما جو مبنی برحق ہے۔ بِالۡحَقِّ وہ حق جسے تو نے پہنچوایا ہے۔

۲۔ وَرَبُّنَا الرَّحۡمٰنُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ: تم جو باطل باتیں بناتے ہو ان کے خلاف ہماری مدد کرنے کے لیے وہ مہربان رب ہی مددگار ہے۔ اس دعائیہ جملے میں رسول اللہؐ اپنی قوم کے خلاف بددعا نہیں کرتے بلکہ حق کا فیصلہ مانگتے ہیں، خواہ اس حق کے تحمل میں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں۔

صلوات اللّٰہ و سلامہ علیك یا رسول الرحمۃ، الرحمۃ المهداۃ۔

سُورَةُ الحج

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الحج اس لیے ہوا کہ اس سورۃ میں حج کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ یہ سورۃ مبارکہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس امکان کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ سورۃ ہجرت کے بعد اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ بعض اہل نظر یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سورۃ ممکن ہے ہجرت اور جنگ بدر کے درمیانی وقفے میں نازل ہوئی ہو۔

یہ سورۂ مبارکہ درج ذیل مضامین پر مشتمل ہے:

معاد۔ مشرکین کے خلاف جہاد۔ گذشتہ اقوام کی سرنوشت سے عبرت حاصل کرنا۔ حج کی تاریخ، قربانی اور طواف کے مسائل

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

من قرأ سورة الحج اعطی من الأجر کحج حجها وعمرة اعتمرها بعدد من حج واعتمر فیما مضی وفیما بقی۔[1]

جو سورۃ الحج کی تلاوت کرے گا اس کو گزشتہ اور آئندہ حج اور عمرہ کرنے والوں کی تعداد کے برابر حج اور عمرہ کا ثواب ملے گا۔

---

[1] مجمع البیان

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
بنام خدائے رحمٰن رحیم

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱﴾

۱۔ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو کیونکہ قیامت کا زلزلہ بڑی (خوفناک) چیز ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا: پورے بنی نوع انسان سے خطاب ہے کہ مؤمن، مولا کی مخالفت نہ کر کے اور کافر، ایمان کے دائرے میں داخل ہو کر اپنے آپ کو غضب الٰہی سے بچا سکتا ہے۔

۲۔ اِنَّ زَلۡزَلَۃَ السَّاعَۃِ: قیامت کا زلزلہ ایک عظیم واقعہ ہو گا۔ قیامت کے آنے سے پہلے جو زلزلہ آئے گا وہ عظیم ہے اور خود قیامت کی بات تو اور عظیم ہے۔

یَوۡمَ تَرَوۡنَہَا تَذۡہَلُ کُلُّ مُرۡضِعَۃٍ عَمَّاۤ اَرۡضَعَتۡ وَ تَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَہَا وَ تَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَ مَا ہُمۡ بِسُکٰرٰی وَ لٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیۡدٌ ﴿۲﴾

۲۔ جس دن تم اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی (ماں) اپنے شیرخوار کو بھول جائے گی اور تمام حاملہ عورتیں اپنا حمل گرا بیٹھیں گی اور تم لوگوں کو نشے کی حالت میں دیکھو گے، حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب بڑا شدید ہو گا۔

تشریح کلمات

تَذۡہَلُ: (ذ ہ ل) الذہول ایسی مشغولیت جو غم و نسیان کی موجب ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ یَوۡمَ تَرَوۡنَہَا تَذۡہَلُ: وہ زلزلہ اس قدر خوفناک ہو گا کہ ماں سے اس کی ممتا بھی چھن جائے گی۔

وہ ماں جو جان سے بھی زیادہ عزیز لاڈلے بچے کو دودھ پلا رہی ہوگی، اس بچے سے بھی غافل ہو جائے گی۔

۲۔ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَهَا: اور تمام حاملہ عورتیں اپنا حمل گرا بیٹھیں گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ قیامت سے قبل دنیوی زندگی میں آئے گا۔ چونکہ دودھ پلانا اور حمل دنیوی امور ہیں۔ قیامت کے روز دودھ پلانے اور حمل کا تصور ہی نہ ہوگا۔

۳۔وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى: لوگ اپنے حواس کھو بیٹھیں گے جیسے وہ نشے میں ہیں۔ یہ سب واقعہ صور پھونکنے سے پہلے کا ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيۡطٰنٍ مَّرِيۡدٍ ۝۳

۳۔اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو لاعلمی کے باوجود اللہ کے بارے میں کج بحثیاں کرتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ: یہ لوگ اللہ کی وحدانیت ، ربوبیت، حاکمیت، تدبیر کائنات اور بے ہمتائی کے بارے میں ایسے توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں جن کے پیچھے علم ہے اور نہ کوئی سند ہے۔

۲۔ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيۡطٰنٍ مَّرِيۡدٍ: ان کے پاس اگر کوئی سند ہے تو وہ شیطان ہے اور اگر کوئی رہنمائی کرنے والا ہے تو وہ شیطان ہے جس کی خباثت سے یہ لوگ اپنی خباثت میں اضافہ ہی کر لیتے ہیں۔

كُتِبَ عَلَيۡهِ اَنَّهٗ مَنۡ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهۡدِيۡهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيۡرِ ۝۴

۴۔جب کہ اس شیطان کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ جو اسے دوست بنائے گا اسے وہ گمراہ کرے گا اور جہنم کے عذاب کی طرف اس کی رہنمائی کرے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ كُتِبَ عَلَيۡهِ اَنَّهٗ مَنۡ تَوَلَّاهُ: اس بات کا فیصلہ حتمی ہے کہ جو بھی شیطان سے دوستی کرے گا وہ اسے گمراہ کرے گا۔شیطان سے گمراہی کے علاوہ کسی اور چیز کا تصور نہیں ہو سکتا ہے چونکہ وہ گمراہی کے لیے ہی بیٹھا ہوتا ہے۔

۲۔وَ يَهۡدِيۡهِ اِلٰى عَذَابِ: اگر وہ کوئی رہنمائی کرتا ہے تو آتش جہنم کی طرف رہنمائی کرے گا۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۵

۵۔ اے لوگو! اگر تمہیں موت کے بعد زندگی کے بارے میں شبہ ہے تو سوچو ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی تخلیق شدہ اور غیر تخلیق شدہ بوٹی سے تا کہ ہم (اس حقیقت کو) تم پر واضح کریں اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک مقررہ وقت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تمہیں ایک طفل کی شکل میں نکال لاتے ہیں تا کہ پھر تم جوانی کو پہنچ جاؤ اور تم میں سے کوئی فوت ہو جاتا ہے اور کوئی تم میں سے نکمی عمر کو پہنچا دیا جاتا ہے تا کہ وہ جاننے کے بعد بھی کچھ نہ جانے اور تم دیکھتے ہو کہ زمین خشک ہوتی ہے لیکن جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو یہ جنبش میں آ جاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے اور مختلف اقسام کی پر رونق چیزیں اگاتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ: اللہ تعالیٰ نے نشاۃ آخرت کے امکان پر نشاۃ اولی سے قرآن میں جابجا استدلال فرمایا ہے۔ کفار نے جب کہا: مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ ۔[۱] ''ان ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کرے گا؟'' جواب میں فرمایا:

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ...[۲]　کہدیجیے: انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔

اس آیت میں نشاۃ اولی کے مراحل کا ذکر ہے۔ جن سے اس حیات کو عدم سے وجود میں لایا، ارتقائی مراحل سے گزارا اور بالآخر دوبارہ مٹی کی طرف واپس کیا جاتا ہے۔

---

[۱] ۳۶ یس: ۷۸　[۲] ۳۶ یس: ۷۹

۲۔ فَاِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ: اس میں زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان کی ساخت و بافت میں جتنے عناصر کارفرما ہیں وہ ارضی عناصر ہیں۔

۳۔ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ: انسان کے جسم میں موجود جسمانی خلیے کا مرکزہ ۴۶ کروموسوم پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک مستقل سیل (Cell) ہے لیکن جنسی سیل کے مرکزہ میں ۲۳ کروموسومز ہوتے ہیں جو جسمانی خلیہ کا نصف ہے۔ چنانچہ انسانی تخلیق کے لیے ایک مستقل سیل (نطفہ) تشکیل دینے کے لیے مرد و زن میں سے ہر ایک ۲۳ کروموسومز فراہم کرتے ہیں۔ یعنی جرثومہ پدر میں ۲۳ کروموسومز ہوتے ہیں اور تخم مادر میں ۲۳ کروموسومز ہوتے ہیں۔ یہ دونوں مل کر ایک کامل سیل تشکیل دیتے ہیں جسے قرآن نے نُّطۡفَۃٍ اَمۡشَاجٍ [۱] (مخلوط نطفہ) کہا ہے۔

۴۔ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَۃٍ: نطفہ ٹھہرنے کے بعد اس کی نشو و نما کا مرحلہ آتا ہے۔ ابتدائی سیل اپنی تکمیل کے بعد اپنے آپ کو تقسیم کرتا ہے۔ دو، چار، آٹھ، سولہ، بتیس۔ بعض سائنسدانوں کے مطابق بتیس اور بعض دیگر سائنسدانوں کے مطابق ۱۲۵ تک یہ تقسیم جاری رہتی ہے۔ اگر ان ۳۲ یا ۱۲۵ سیلز کو جدا جدا سازگار فضا فراہم کی جائے تو ۳۲ جڑواں بچے وجود میں آ سکتے ہیں۔ اس وقت یہ خون کے لوتھڑے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

۵۔ ثُمَّ مِنۡ مُّضۡغَۃٍ: سیلز کی تعداد ۱۲۵ سے زائد ہونے کی صورت میں یہ سیلز آپس میں تقسیم کار کرتے ہیں۔ اس تقسیم کار کے بعد ہر سیل اپنے حصے میں آنے والے تخلیقی امور کا ذمے دار ہوتا ہے اب ہر سیل سے ایک مکمل انسان کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر اس سیل کے ذمے مغز بنانا آیا ہے تو اب یہ صرف مغز بناتا ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ سیلز تقسیم کے مرحلے سے پہلے تمام تر خاصیت میں ایک جیسے ہیں لیکن تقسیم کار عمل میں آتی ہے تو یہی سیلز صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ کی خاصیت کے ہوتے ہیں۔ اب یہ سیلز دوسرے سیلز سے اپنی خاصیت میں مختلف ہوتے ہیں۔

مثلاً مغز بنانے والے سیلز اپنی خاصیت اور کارکردگی میں ہڈی بنانے والے سیلز سے مختلف ہوتے ہیں حالانکہ یہ دونوں قسم کے سیلز اس تقسیم سے پہلے ایک ہی خاصیت کے تھے۔ اگر سیلز میں شعور و ارادہ نہ ہوتا تو وہ مغز بنانے کے حکم کے تابع فرمان نہ ہوتے۔ تمام سیلز کا رشتہ ایک ہے، سب ایک قسم کا کام کرتے۔

۶۔ مُّخَلَّقَۃٍ وَّ غَیۡرِ مُخَلَّقَۃٍ: مفسرین، مترجمین نے مُّخَلَّقَۃٍ کا ترجمہ ''پوری'' اور غَیۡرِ مُخَلَّقَۃٍ کا ترجمہ ''ادھوری'' سے کیا ہے جو بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کی مُّضۡغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بچے کے اعضاء بنائے جب کہ غَیۡرِ مُخَلَّقَۃٍ کا کام یہ ہے کہ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے اور اس کے لیے غذا کا انتظام کرے۔ چنانچہ ظلمات ثلاث میں بند اس نازک مخلوق

---

[۱] ۷۶ انسان: ۲

کے لیے شش جہت سے غذا بہم پہنچائی جاتی ہے۔

۶۔ لِّنُبَيِّنَ لَكُمۡ : اپنی خلاقیت کو تم پر واضح کرنے کے لیے کہ ہم خاک سے انسان بنا سکتے ہیں تو معاد بھی یہی ہے کہ اسی خاک سے اسی انسان کو دوبارہ بنانا ہے جو پہلے بنا چکے ہیں۔

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَۃَ الۡاُوۡلٰی فَلَوۡلَا تَذَکَّرُوۡنَ ۝[1]

اور بتحقیق پہلی پیدائش کو تم جان چکے ہو، پھر تم عبرت حاصل کیوں نہیں کرتے؟

۷۔ وَنُقِرُّ فِی الۡاَرۡحَامِ: پھر جسے چاہتے ہیں ایک معین مدت تک رحم میں رکھتے ہیں تا کہ جنین کی تکمیل ہو جائے۔ زیادہ مدت نہیں، نو سے دس ماہ کے ایک مختصر وقفے میں ایک معجزہ کی تکمیل ہو جاتی ہے کہ خاک کے ذرات اب ایک مستقل چلتی پھرتی کائنات میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

۸۔ ثُمَّ نُخۡرِجُکُمۡ طِفۡلًا: پھر ہم تمہیں ایک طفل کی صورت میں ماں کے پیٹ سے نکالتے ہیں۔ ناتواں، بے بس، نافہم۔

وَاللّٰہُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّہٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا ...[2]

اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔

۹۔ ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّکُمۡ : تا کہ تم جوانی کو پہنچ جاؤ۔ یہ ناتواں طفل گھٹنوں کے بل چلنا شروع کرتا ہے پھر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ چلتا پھرتا ہے۔ پھر یہ ایک دن اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے۔ کہاں خاک کے ذرات، کہاں ایک بوند، کہاں یہ رشید جواں۔

۱۰۔ وَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّتَوَفّٰی: تم میں سے کوئی فوت ہو جاتا ہے۔ تم میں سے کچھ بڑھاپے کو پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو جاتے، کم عمر پاتے ہیں۔ کتنی مدت اس دنیا میں زندہ رہنا ہے، وہ بھی تمہارے بس میں نہیں ہے۔ عین عالم شباب میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہو۔

۱۱۔ وَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرۡذَلِ: اَشُدَّ کے بعد اَرۡذَلِ۔ جوانی کے بعد رذیل اور ابتر زندگی۔ جوانی کی رعنائی کے بعد بڑھاپے کی ناتوانی۔ جس طرح مُّضۡغَۃٍ حیات کے دروازے پر کھڑا تھا اسی طرح بڑھاپا موت کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے۔

۱۲۔ لِکَیۡلَا یَعۡلَمَ مِنۡۢ بَعۡدِ عِلۡمٍ شَیۡئًا: بڑھاپے میں آنے کے بعد ساری قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں۔ بینائی، شنوائی میں کمی آ جاتی ہے۔ حافظہ کمزور، دماغ میں معلومات حفظ کرنے کی صلاحیت ختم اور عالم طفولیت میں لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا کے مرحلے میں واپس قدم رکھتا ہے۔ وہ طفولیت کی ابتدا میں مردہ زندہ تھا۔ اب زندہ مردہ ہے۔ معری نے خوب کہا:

و کالنار الحیاة فمن رماد
اواخرها و اولها دخان

---

[1] ۵۶ واقعہ: ۶۲　[2] ۱۶ نحل: ۷۸

زندگی بھی آتش کی طرح ہے جس کی
ابتدا دھواں اور آخر خاکستر ہے۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫ تحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا،
ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ[1] پھر ہم نے اسے پست ترین حالت کی طرف پلٹا دیا۔

۱۳۔ وَتَرَی الۡاَرۡضَ هَامِدَةً: همود۔ خاموشی کے معنوں میں ہے۔ زمین بذات خود خاموش اور مردہ ہوتی ہے۔ اس میں جنبش و حرکت اور نمو نہیں ہے۔ زمین میں صلاحیت اور استعداد ہے مگر فی الحال اس میں حیات و زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔

۱۴۔ فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهَا الۡمَآءَ: اور جب اس پر پانی برسایا جاتا ہے تو:

الف: اهۡتَزَّتۡ: خاک میں جنبش آ جاتی ہے۔ پانی سے خاک کی صلاحیتیں جاگ جاتی ہیں۔ آج کی سائنس سے صدیوں پہلے قرآن نے اس حقیقت کو واضح کیا۔

ب: وَرَبَتۡ: زمین کی بیداری کے بعد وہ اٹھنا شروع کر دیتی ہے تاکہ جو ڈیوٹی اس کے ذمے لگی ہے اسے انجام دے۔ ربا: اوپر آنا۔ اونچی جگہ کو ربوۃ کہتے ہیں۔

ج: وَاَنۡۢبَتَتۡ: وہ ڈیوٹی اگانا ہے۔ یہ خاموش اور مردہ زمین اب سبزہ اگانا شروع کر دیتی ہے۔

د: مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۭ بَهِيۡجٍ: ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگاتی ہے اور بنجر زمین کو سرسبز و شاداب کر دیتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ مردہ زمین سے نباتی و انسانی حیات کا منظر انسان روز مشاہدہ کرتا ہے پھر بھی اس انسان کو شک ہے کہ اللہ مردہ زمین سے حیات کیسے پیدا کرے گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحۡيِ الۡمَوۡتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۙ﴿۶﴾ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبۡعَثُ مَنۡ فِى الۡقُبُوۡرِ ﴿۷﴾

۶۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اللہ ہی برحق ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔
۷۔ اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے جس میں کوئی شک نہیں اور یہ کہ اللہ ان سب کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكَ: مردہ زمین سے انسان و نبات کو زندگی دینے کا معجزہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ:

---

[1] ۹۵ تین: ۴۔۵

۲۔ بِاَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡحَقُّ : اللہ ہی حق و حقیقت ہے اور ہر حق کی بنیاد اللہ کی حقانیت ہے۔ اگر کسی چیز میں حق کا شائبہ ہے تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ سے ہٹ کر کسی شیٔ کے حق حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کائنات میں جہاں بھی حق ہے اس کا مصدر اللہ کی حقانیت ہے۔

۳۔ وَ اَنَّہٗ یُحۡیِ الۡمَوۡتٰی : مردے کو زندگی دینے کا منظر یہ انسان ہر روز دیکھتا ہے جو ایک بار مردے کو زندہ کر سکتا ہے وہ دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے۔

۴۔ وَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ : انسان کی تخلیق و تدبیر پر بھی وہ قادر ہے، پہلی بار ہو یا دوسری بار۔

۵۔ وَّ اَنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ : کائنات کی تخلیق کو عبث سے نکالنے اور اللہ تعالیٰ کے حق ہونے کا لازمہ قیامت کی آمد ہے۔

۶۔ لَّا رَیۡبَ فِیۡہَا : اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کسی کو شبہ لاحق ہے تو یہ اس کی ذہنی کوتاہی ہے۔ قیامت کا آنا قابل ریب نہیں ہے۔

۷۔ وَ اَنَّ اللّٰہَ یَبۡعَثُ مَنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ : قبر یا تو اعم اغلب کی بنیاد پر ہے یا پوشیدہ کے معنوں میں ہے جو زمین میں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے ذرات کی شکل میں پوشیدہ ہے۔ ان کو اٹھایا جائے گا چونکہ سب مردے قبروں میں نہیں ہوتے۔ ہندو مردوں کو جلا دیتے ہیں اور کچھ قومیں درندوں کو کھلاتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حق کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

۲۔ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کو حساب دینا حق ہے۔

۳۰۱

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّ لَا ہُدًی وَّ لَا کِتٰبٍ مُّنِیۡرٍ ۙ﴿۸﴾

۸۔ اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم اور ہدایت اور روشن کتاب کے کج بحثیاں کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ : ایسے بے مایہ لوگ بھی ہیں جو اس کائنات کے اہم ترین مسئلہ (اللہ تعالیٰ) کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ فِی اللّٰہِ : اللہ کے وجود، اللہ کی قدرت، اللہ کے مقام تدبیر، اللہ کی حاکمیت اعلیٰ، اللہ کی وحدانیت کے بارے میں۔ مختصراً یہ کہ اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ جس کے لیے درج ذیل اسناد میں سے ایک سند ہونی چاہیے تھی:

الف: عِلۡمٍ۔ خود بحث کرنے والے کو ذاتی طور پر علم ہو۔ ظاہراً یہ علم کائنات میں کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اس کی ذات و صفات کا بیان وہی ہے جو اس نے خود کیا ہے۔

ب: ھُدًی: اگر اللہ کے کسی نمائندے کو تسلیم کرتے تو اس کی طرف سے ملنے والی ہدایت سند بن سکتی ہے۔ یہ کسی اللہ کے نمائندے کو تسلیم نہیں کرتے۔

ج: کِتٰبٍ: اگر یہ شخص خود اللہ کا نمائندہ ہے تو اللہ کی طرف سے ملنے والی کتاب اس کے لیے سند ہو سکتی ہے۔

ان تینوں اسناد کے بغیر اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں بحث کرنا کس قدر نامعقول ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی بھی بحث کے لیے کوئی نہ کوئی سند ہونی چاہیے۔ ذاتی رائے سند نہیں ہے۔

ثَانِیَ عِطۡفِہٖ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ لَہٗ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّ نُذِیۡقُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۹﴾

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتۡ یَدٰکَ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۱۰﴾

۹۔ تاکہ متکبرانہ انداز میں لوگوں کو راہ خدا سے گمراہ کریں، اس کے لیے دنیا میں خواری ہے اور قیامت کے روز ہم اسے آگ کا عذاب چکھائیں گے۔

۱۰۔ یہ سب تیرے اپنے دونوں ہاتھوں سے آگے بھیجے ہوئے کی وجہ سے ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

تشریح کلمات

ثَانِیَ: (ث ن ی) الثنی کسی چیز کو موڑنا، دوہرا کرنا۔ تکبر سے گردن موڑنا۔

عِطۡفِہٖ: (ع ط ف) العطف پہلو کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

یہ کج بحثی کرنے والا متکبرانہ انداز میں پہلو پھیرتا ہے۔ اس کی کج بحثی اور اس کا تکبر اس مقصد کے لیے ہے کہ راہ خدا میں روڑے اٹکائے۔ لوگ آیات الٰہی سے متاثر نہ ہوں۔ ایسے متکبر، کج بحثوں کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب ہے۔

ذٰلِکَ: یہ عذاب خود تمہارے جرائم کا قدرتی نتیجہ ہے۔ یہ عذاب خود تم نے اپنے سر لیا ہے۔ کسی اور کا کیا دھرا نہیں ہے کہ کسی کی طرف سے ظلم و ناانصافی شمار ہو جائے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّعۡبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرۡفٍ ۚ فَاِنۡ اَصَابَہٗ خَیۡرُۨ اطۡمَاَنَّ بِہٖ ۚ وَاِنۡ اَصَابَتۡہُ فِتۡنَۃُۨ انۡقَلَبَ عَلٰی وَجۡہِہٖ ۟ۚ خَسِرَ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃَ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۱﴾	۱۱۔ اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی یکطرفہ بندگی کرتا ہے، اگر اسے کوئی فائدہ پہنچے تو مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو منہ کے بل الٹ جاتا ہے، اس نے دنیا میں بھی خسارہ اٹھایا اور آخرت میں بھی، یہی کھلا نقصان ہے۔

تشریح کلمات

حَرۡفٍ: (ح ر ف) کے معنی کسی چیز کے کنارے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ یَّعۡبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرۡفٍ: لوگوں میں ایسا بھی ہے جو یک طرفہ دینداری کرتا ہے کہ ایک پاؤں دین کے پلڑے میں رکھتا ہے۔ صرف ایک صورت میں دین کو ترجیح دیتا ہے کہ اس کا دین اس کے مفاد کے تابع ہو۔ وہ دین، دنیا کے لیے اختیار کرتا ہے۔ ہر صورت اور ہر حالت میں دین نہیں چاہتا۔ اس کا دین بازار کی اجناس کی طرح ہے یا ایسے کنارے پر بیٹھا ہے کہ معمولی ٹھوکر سے کھائی میں گر جاتا ہے۔

۲۔ فَاِنۡ اَصَابَہٗ خَیۡرُۨ اطۡمَاَنَّ بِہٖ: اگر مفاد حاصل ہو گیا اور دوہنے کا موقع ہاتھ آ گیا تو دونوں قدم دین کی طرف رکھ دیتا اور بڑھ چڑھ کر دیندار بن جاتا ہے۔

۳۔ وَاِنۡ اَصَابَتۡہُ فِتۡنَۃُۨ انۡقَلَبَ عَلٰی وَجۡہِہٖ: اگر کسی آزمائش سے دوچار ہو جائے تو یکسر بدل جاتا ہے۔ وہ نہایت کنارے پر کھڑا تھا، معمولی جنبش سے اتھاہ گہرائی میں منہ کے بل گر جاتا ہے۔

۴۔ خَسِرَ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃَ: جس حادثے سے دوچار ہوا تھا اس سے اس کی دنیا بھی چلی گئی اور دین سے لاتعلق ہونے کی وجہ سے آخرت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ دونوں جہاں میں گھاٹا، نہایت خسارہ اٹھانے والا ہے جو ہر شخص کو محسوس ہو گا۔

لکمؤمن کی زندگی میں عقیدہ چٹان کی طرح مضبوط ہوتا ہے کہ تند و تیز آندھی سے بھی اس میں جنبش نہیں آتی اور دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے یہ اپنے موقف سے ذرہ برابر نہیں ہٹتا۔

مؤمن کے عقیدے کی جڑیں دنیوی مفادات میں نہیں پھیلتیں بلکہ وہ دنیوی مفادات کو دین کی جڑیں مضبوط کرنے پر لگا دیتا ہے۔ وہ دین کے لیے دنیا آباد کرتا ہے۔ اس کے لیے دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

الدينا مزرعة الآخرة۔[1]

اہم نکات

۱۔ دینداری برائے دنیا داری دونوں جہاں میں خسارے کا باعث ہے۔

يَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ یہ اللہ کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے جو اسے نہ ضرر دے سکتی ہے اور نہ اسے فائدہ دے سکتی ہے، یہی تو بڑی کھلی گمراہی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ يَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: جس غیر اللہ کو بعنوان رب پکارے وہ بت ہو یا کوئی شخص یا فرشتے وہ خود سراپا اللہ کے محتاج ہیں۔ اس کے اختیار میں نفع وضرر نہیں ہے۔ وہ اس کو جتنا پکارے گا اس کی گمراہی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور حقیقی ہدایت سے دور ہوتا جائے گا۔ درست ہے وہ غیر اللہ نہ اس کو فائدہ دے سکتا ہے نہ ضرر لیکن اس کو پکارنا خود ہی ضرر ہے ایک بے سود کوشش اور ایک بے نتیجہ انتظار، ضلال مبین ہے۔

يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ وہ ایسی چیز کو پکارتا ہے جس کا ضرر اس کے فائدے سے زیادہ قریب ہے، کتنا برا ہے اس کا سرپرست اور اس کا رفیق بھی کتنا برا ہے۔

تفسیر آیات

یہ شخص جو اپنے سے ضرر کو دور کرنے کے لیے اس غیر اللہ کو پکارتا ہے، اس نادان کو نہیں معلوم کہ اس کو اسی سے ضرر پہنچ سکتا ہے فائدے کا تو اس کے پاس وجود نہیں ہے۔ ایک موہوم چیز سے امیدیں وابستہ کرنے سے واقع سے دور ہو جاتا ہے۔ جس کو پکارنے سے واقع اور حق سے دور ہو جائے اس سے بدتر آقا اور بدتر رفیق کون ہوسکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ کو پکارنے والے ہیچ کو پکارتے ہیں۔

---

[1] حدیث۔ عوالی اللآلی ۱: ۲۶۷۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُدۡخِلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اللہ ایمان لانے والوں اور نیک اعمال بجالانے والوں کو یقیناً ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، اللہ جس چیز کا ارادہ کر لیتا ہے اسے یقیناً کر گزرتا ہے۔

تفسیر آیات

گمراہ لوگوں کے ذکر کے بعد نجات پانے والوں کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عمل ان کے ایمان کا ثبوت پیش کرے گا۔ وہ لوگ جنت میں جائیں گے جن کا ایمان پر عمل ہو اور عمل پر ایمان ہو۔

اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ: اللہ قادر مطلق ہے۔ بتوں کی طرح بے بس نہیں ہے۔ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو لوگ ایمان اور عمل میں سے صرف ایک کو اختیار کرتے ہیں وہ جنتی نہیں ہیں۔

مَنۡ کَانَ یَظُنُّ اَنۡ لَّنۡ یَّنۡصُرَہُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ فَلۡیَمۡدُدۡ بِسَبَبٍ اِلَی السَّمَآءِ ثُمَّ لۡیَقۡطَعۡ فَلۡیَنۡظُرۡ ہَلۡ یُذۡہِبَنَّ کَیۡدُہٗ مَا یَغِیۡظُ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ جو یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ دنیا و آخرت میں رسول کی مدد نہیں کرے گا (اب رسول کی کامیابی سے تنگ ہے) تو اسے چاہیے کہ ایک رسی اوپر کی طرف باندھے پھر اپنا گلا گھونٹ لے پھر دیکھے کہ کیا اس کا یہ حربہ اس کے غصے کو دور کر دیتا ہے؟

تفسیر آیات

جو شخص یہ گمان کرتا تھا کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا لیکن اس رسول کی کامیابیاں دیکھ کر اگر اس کے لیے زندگی اجیرن بن گئی ہے تو اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی کر لے۔

آیت میں بِسَبَبٍ سے مراد رسّی ہے۔ اِلَی السَّمَآءِ میں سماء سے مراد بلندی ہے۔ جیسے چھت یا درخت کی شاخ۔ یقطع سے مراد اپنا گلا کاٹنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابیاں اس سے دیکھی نہیں جاتیں اور ناقابل تحمل ہیں تو اپنے آپ کو رسّے سے آویزاں کر کے خودکشی کر لے۔ دیکھے اس طرح اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے؟

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور اسی طرح ہم نے قرآن کو واضح آیات کی صورت میں نازل کیا اور اللہ جس کے لیے ارادہ کرتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ نے اس قرآن کو توحید و شریعت کے بارے میں واضح دلائل کے ساتھ نازل فرمایا ہے تاہم ہر کوئی اس سے ہدایت نہیں لیتا۔

۲۔ وَّ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ: اللہ اہل کو ہدایت دیتا ہے اور جسے ہدایت نہیں چاہیے اس پر ہدایت جبراً مسلط نہیں کرتا چونکہ جو چیز جبراً مسلط کی گئی ہو وہ ہدایت نہیں ہے۔ وہ جبر اور طاقت کا ایک قہری اور غیر اختیاری نتیجہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کبھی جبر نہیں کرتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـِٔيْنَ وَ النَّصٰرٰى وَ الْمَجُوْسَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ یقیناً ایمان لانے والوں، یہودیوں، صابیوں، نصرانیوں، مجوسیوں اور مشرکوں کے درمیان اللہ قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، یقیناً اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

تفسیر آیات

لوگوں کا مذہبی رشتہ خواہ کسی بھی مذہب سے ہو۔ یہود، صابئی، نصاریٰ ہو یا مجوس، حتیٰ خود مشرکین میں سے ہی کیوں نہ ہو، ان کے درمیان انتہائی فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ اگرچہ دنیا میں بھی اللہ نے فیصلہ سنا دیا ہے لیکن اس دنیوی فیصلے کو یہ لوگ تسلیم نہیں کرتے۔ آخرت میں جو فیصلہ ہوگا اس میں تسلیم، عدم تسلیم کا سوال نہیں اٹھے گا۔

صابئی: حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو کہتے ہیں جو مسیحی مذہب کی ایک شاخ ہے۔ اس لیے صابئی کو بھی اہل کتاب سمجھا جاتا ہے۔

الْمَجُوْسَ: قرآن میں صرف ایک بار مذکور ہے۔ مجوس کو بھی اہل کتاب میں شمار کیا گیا ہے اور مشرکین میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے مجوسی مذہب بھی ایک توحیدی مذہب تھا۔ بعد میں انحرافات کی وجہ سے دو خدا، یزدان و اھریمن اور آتش پرستی اس مذہب میں داخل ہوئی ہے۔ شروع میں اس

کا توحیدی مذہب ہونا یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے مجوس سے بھی جزیہ لیا ہے اور جزیہ توحیدی مذاہب سے لیا جاتا ہے۔ اس مذہب کا پیشوا زرتشت ہے اور ان کی مقدس کتاب کا نام اوستا ہے۔ کہتے ہیں اسکندر کے حملے میں اوستا نابود ہوگئی تھی، بعد میں ساسانیوں کے زمانے میں دوبارہ لکھی گئی، جیسے توریت کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا۔ اصل توریت تلف ہونے کے ایک مدت بعد دوبارہ لکھی گئی۔ لہٰذا اصل مذہب کا چہرہ ان کتابوں سے پہچانا نہیں جاتا۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَ الۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ کَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡہِ الۡعَذَابُ ؕ وَ مَنۡ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ﴿ؕ۱۸﴾

۱۸۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے نیز سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے انسان اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ جن پر عذاب حتمی ہو گیا ہے اور جسے اللہ خوار کرے اسے عزت دینے والا کوئی نہیں، یقیناً اللہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَ: کیا آپ نے نہیں دیکھا۔ یہاں روئیت سے مراد روئیت علمی ہے۔ کیا آپ کو نہیں معلوم۔

۲۔ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ: یہاں مختلف موجودات کے سجدے کا ذکر ہے اور سب کے لیے ایک بار لفظ سجدہ کا ذکر ہے۔ لہٰذا ایک بار سے ایک ہی معنی مراد لیا جا سکتا ہے اور کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ " بہت سے انسان" قرینہ بنتا ہے کہ اس سجدہ سے مراد سجدہ تشریعی ہے۔

قرآنی صریح تعلیمات کے مطابق یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ کائنات کی ہر شیٔ اپنی حیثیت کے مطابق شعور رکھتی ہے۔ فرمایا:

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ ...[1]

اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو....

لہٰذا اس آیت میں مذکور تمام اشیاء ارادۂ اللہ کے لیے سجدہ کرتی ہیں۔ البتہ ان کے سجدوں کی نوعیت

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۴۴

کا ہمیں علم نہیں ہے۔ جس طرح ان اشیاء کی تسبیح کا ہمیں فہم نہیں ہے۔

۳۔ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ: کائنات کی ہر شئ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے سر بہ سجود ہے۔ سوائے اس سرکش اور نادان انسان کے جو نہ صرف یہ کہ سجدہ گزاروں کی صف میں اکڑا ہوا ہے بلکہ اس سجدے کے خلاف جنگ کرتا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔[1] چونکہ یہ انسان اپنے ارادے کا مالک ہے اس لیے صرف انسان ایک صنف ایسی آئی جس کے لیے عذاب ثابت ہو گیا۔

۴۔ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ: جو لوگ سجدہ نہیں کرتے وہ ذلت و خواری سے دوچار ہوں گے بلکہ سجدہ نہ کرنا خود ایک ذلت اور مہانت ہے کیونکہ کمال کا اعتراف نہ کرنا اور کمال کے سامنے نہ جھکنا خود اپنی جگہ ایک مہانت ہے۔ تحف العقول میں ایک روایت ہے:

لو يعلم المصلی ما يغشاه من رحمة الله ما انفتل ولا سره ان يرفع رأسه من السجدة۔[2]	اگر نماز گزار کو علم ہو جاتا جو اللہ کی رحمت اس پر چھائی ہوئی ہے وہ سجدے سے سر اٹھانے کو پسند ہی نہ کرتا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

السُّجُودُ مُنْتَهَى الْعِبَادَةِ مَنْ بَنِي آدَمَ.[3]	سجدہ اولاد آدم کی طرف سے انتہائی عبادت ہے۔
اَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ هُوَ سَاجِدٌ ....۔[4]	بندہ سجدے کی حالت میں اللہ سے قریب تر ہوتا ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کی: میرے لیے کوئی نصیحت فرمائیں تو فرمایا:

أُوصِيكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَ الْوَرَعِ وَ الْعِبَادَةِ وَ طُولِ السُّجُودِ ....۔[5]	میں تجھے نصیحت کرتا ہوں خوف خدا، پرہیز گاری، عبادت اور سجدے کو طول دینے کی۔

کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اپنے رب کے پاس ہمارے لیے جنت کی ضمانت دیں تو آپؐ نے فرمایا:

عَلَى اَنْ تُعِينُونِي بِطُولِ السُّجُودِ.[6]	اس شرط پر کہ سجدے کو طول دے کر (اس ضمانت پر) میری مدد کرو گے۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ ۱۹۔ ان دونوں فریقوں نے اپنے رب کے بارے

١۔ ۳۳ احزاب: ۷۲ ٢۔ تحف العقول ص ۱۲۲۔ غرر الحکم: ۱۷۵
٣۔ مستدرک ۴: ۴۷۲ ٤۔ الکافی ۲: ۵۵۶ ٥۔ وسائل الشیعة ۱۲: ۸ ٦۔ مستدرک الوسائل ۴: ۴۷۱

رَبِّهِمۡ ۫ فَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِيَابٌ مِّنۡ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِيۡمُ ۚ﴿۱۹﴾

میں اختلاف کیا ہے، پس جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آتشیں لباس آمادہ ہے، ان کے سروں کے اوپر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔

يُصۡهَرُ بِهٖ مَا فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ وَالۡجُلُوۡدُ ؕ﴿۲۰﴾

۲۰۔ جس سے ان کے پیٹ میں جو کچھ ہے اور کھالیں گل جائیں گے۔

وَلَهُمۡ مَّقَامِعُ مِنۡ حَدِيۡدٍ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اوران (کو مارنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔

كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا مِنۡ غَمٍّ اُعِيۡدُوۡا فِيۡهَا ۗ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ جب وہ رنج کی وجہ سے جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے تو پھراسی میں پلٹا دیے جائیں گے اور (کہا جائے گا) جلنے کا عذاب چکھو۔

تفسیر آیات

۱۔ هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ: دو فریقوں کا آپس میں نزاع ہے۔ موضوع نزاع فِىۡ رَبِّهِمۡ ان کا اپنا رب ہے۔

ایک فریق کا موقف یہ ہے کہ اس کا رب وہی ہے جو اس کا خالق ہے۔ وہ کائنات کا جیسے خالق ہے ویسے رب بھی ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ یہ فریق مؤمنین پر مشتمل ہے۔

دوسرے فریق کا موقف یہ ہے کہ خالق اور ہے رب اور ہے۔ رب ایک نہیں کئی ایک ہیں۔ اس کی اولاد یعنی بیٹیاں ہیں۔ یہ فریق کافروں پر مشتمل ہے۔

تقریباً تمام مفسرین کے مطابق یہ آیت یوم بدر میں حضرت حمزہؓ، حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عبیدہؓ کی شان میں نازل ہوئی جب یہ حضرات عتبہ، شیبہ اور ولید کے مقابلے میں لڑ رہے تھے۔

جب یہ آیت نازل ہو رہی تھی تو مؤمنین کی نمائندگی حضرت حمزہؓ، حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عبیدۃ بن حارث رضوان اللہ علیہ کر رہے تھے۔ میدان جنگ میں کھڑے تھے۔ ان کے مقابلے میں کافروں کی طرف سے شیبہ، عتبہ اور ولید نمائندگی کرتے ہوئے میدان جنگ میں کھڑے تھے۔ چنانچہ عبیدہؓ کے مقابلے میں عتبہ آیا، حمزہؓ کے مقابلے میں شیبہ آیا اور حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے میں ولید آیا۔ چنانچہ حمزہؓ نے شیبہ کو موقع ہی نہیں دیا اور اسے قتل کر دیا، حضرت علی علیہ السلام نے ولید کو مہلت نہ دی اور قتل کر دیا مگر عبیدہ اور عتبہ میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا۔ اتنے میں حمزہؓ اور علی علیہ السلام نے بھی عتبہ پر حملہ کر دیا اور اسے فی النار کر دیا۔

اس آیت کے حضرت علی علیہ السلام، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کی شان میں نازل ہونے پر دلالت کرنے والی روایت تقریباً تمام مصادر میں ہے۔ الدرالمنثور میں آیت کے ذیل لکھا ہے: اس روایت کو مسلم، بخاری، ترمذی، ابن ماجه، ابن جریر، ابن المنذر، ابوحاتم، ابن مردویه اور بیہقی نے حضرت ابوذرؓ سے نقل کیا ہے۔

خصومت علی علیہ السلام: حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ بہت سے لوگوں کو خصومت رہی ہے۔ رسالتمابؐ کے عہد میں مشرکین کے ساتھ خصومت میں آپؑ سب سے آگے تھے اور عہد رسالت کے بعد بھی آپ کی زندگی پر از خصومت تھی خصوصاً اپنے عہد خلافت میں۔ مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

الدَّهْرُ اَنْزَلَنِي حَتَّى يُقَالُ عِلِّي وَ مُعَاوِيَةُ.[1]	زمانے نے مجھے اس قدر گرایا یہاں تک کہا کہ جانے لگا علی اور معاویہ۔

روایت ہے کہ انہی خصومتوں کی وجہ سے آپؑ نے فرمایا:

انا اول من یجثو بین یدی الرحمن للخصومة یوم القیمة۔[2]	قیامت کے روز سب سے پہلے مقدمہ پیش کرنے کے لیے میں اللہ کے سامنے دو زانو ہوں گا۔

۲۔ فَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَہُمۡ ثِیَابٌ مِّنۡ نَّارٍ: فریق کفر کے انجام کا ذکر ہے کہ ان کو جہنم میں آتشیں لباس پہنایا جائے گا۔ ان پر آتش کا اس طرح احاطہ ہوگا جس طرح لباس کا احاطہ ہوتا ہے۔

۳۔ یُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِہِمُ الۡحَمِیۡمُ: کھولتا ہوا پانی ان کے سروں پر ڈالا جائے گا جس سے ان کی کھال اور پیٹ میں موجود اعضا سمیت ہر چیز گل جائے گی۔

۴۔ وَ لَہُمۡ مَّقَامِعُ مِنۡ حَدِیۡدٍ: لوہے کے گرز سے بھی انہیں عذاب دیا جائے گا۔ ہر قسم، ہر صورت کا عذاب ان کے لیے ہوگا۔

۵۔ کُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا: یہ بات بھی عذاب میں شامل ہوگی کہ انہیں یہ واہمہ لگا رہے گا کہ ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں لہٰذا وہ نکلنے کی کوشش کریں گے۔ پھر جب ان کو دوبارہ آتش میں واپس کر دیا جائے گا تو ان کی امیدوں پر پانی پھر جائے گا ورنہ اگر نکلنے کی کوئی امید نہ ہوتی تو نکلنے کی کوشش کرتے نہ ان کی امیدیں ٹوٹ جاتیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُدۡخِلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ۲۳۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے

---

[1] مفتاح السعادة فی شرح نهج البلاغة محمد تقی النقوی الخراسانی ج ۳: ۵۲۲۔ الامثال و الحکم المستخرجة من نهج البلاغة محمد الغروی ص ۵۴۳

[2] ملاحظہ ہو صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۶۲۶۔ شواهد التنزیل ۱: ۵۰۳۔ دیگر مصادر کے لیے ملاحظہ ہو الدرالمنثور اسی آیت کے ذیل میں۔

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ یُحَلَّوۡنَ فِیۡہَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَہَبٍ وَّ لُؤۡلُؤًا ؕ وَ لِبَاسُہُمۡ فِیۡہَا حَرِیۡرٌ ﴿۲۳﴾

ہیں اللہ یقیناً انہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے ان کی آرائش کی جائے گی اور ان جنتوں میں ان کے لباس ریشم کے ہوں گے۔

تشریح کلمات

اَسَاوِرَ : کنگن۔ کہا جاتا ہے یہ دستوارہ کا معرب ہے۔ شاہانہ زندگی کی طرف اشارہ ہے۔

تفسیر آیات

دوسرے فریق، اہل ایمان کے انجام کا ذکر ہے جن کے لیے جنت میں جو شاہانہ زندگی اور نعمتیں ملیں گی ان کا ذکر ہے۔ واضح رہے کہ جنت کی زندگی اور نعمتوں کا ہم دنیوی زندگی میں تصور نہیں کر سکتے لہٰذا اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کے ذکر کے لیے ہمیں مانوس چیزوں کے ذریعے سمجھانا چاہتا ہے۔

یہ آیت بھی حضرت علی علیہ السلام، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کی شان میں ہے۔ مصادر کے لیے ملاحظہ ہو شواھد التنزیل متن اور حاشیہ ذیل آیہ۔

وَ ہُدُوۡۤا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الۡقَوۡلِ ۚۖ وَ ہُدُوۡۤا اِلٰی صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اور انہیں پاکیزہ گفتار کی طرف ہدایت دی گئی اور انہیں لائق ستائش (خدا) کی راہ دکھائی گئی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جنت میں ان کی پاکیزہ گفتار کی طرف رہنمائی کی جائے گی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

تَحِیَّتُہُمۡ فِیۡہَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعۡوٰىہُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؑ[1]

وہاں ان کی تحیت سلام ہو گی اور ان کی دعا کا خاتمہ الحمد للہ رب العالمین ہو گا۔

۲۔ وَ ہُدُوۡۤا اِلٰی صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ: جنت میں ان سے قابل ستائش اعمال ہی صادر ہوں گے۔ الۡحَمِیۡدِ، اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ

۲۵۔ جو لوگ کافر ہوئے اور راہ خدا میں رکاوٹ ڈال

----

[1] ۱۰ یونس: ۱۰

سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَۨ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ ؕ وَ مَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۵﴾

رہے ہیں اور اس مسجد الحرام کی راہ میں بھی جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے اور جس میں مقامی لوگ اور باہر سے آنے والے سب برابر ہیں اور جو اس میں زیادتی کے ساتھ کجروی کا ارادہ کرے اسے ہم ایک دردناک عذاب چکھائیں گے۔

تشریح کلمات

الۡعَاکِفُ: (ع ک ف) تعظیما کسی چیز پر متوجہ ہونا۔ مسجد میں بیٹھے رہنا اور باہر نہ نکلنا اعتکاف ہے۔ آیت میں مقامی کو عاکف کہا ہے۔

الۡبَادِ: (ب ی د) البیداء کے معنی لق ودق صحرا کے ہیں۔ آیت میں بادِ باہر سے آنے والے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: مشرکین مکہ ہی مراد ہیں۔ ان لوگوں نے کفر اختیار کیا، لوگوں کو راہ اسلام سے روکا اور مؤمنین کو طواف کے لیے مسجد الحرام میں داخل ہونے سے بھی روکتے تھے۔

۲۔ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ: مسجد حرام کسی قوم و قبیلے کی ملکیت نہیں ہے، نہ کسی حکومت کی ملکیت ہے، یہ سب لوگوں کے لیے ہے۔ اس میں عبادت کے لیے جانے کا ہر کسی کو حق حاصل ہے۔

۳۔ سَوَآءَۨ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ: اس مسجد الحرام میں عبادت کرنے کے لیے مقامی اور غیر مقامی، ملکی و غیر ملکی کا تصور نہیں ہے۔ سب اس میں عبادت کرنے کا یکساں حق رکھتے ہیں۔

۴۔ وَ مَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍ: اگر کوئی اللہ کے دکھائے ہوئے راستے سے ہٹ کر ظلم کا راستہ اختیار کرے گا، اسے ظلم کا نتیجہ بھگتنا ہوگا جو عذاب الیم ہے۔

اہم نکات

۱۔ مسجد الحرام میں عبادت بجا لانے کے لیے امت کے تمام افراد یکساں حق رکھتے ہیں۔

وَ اِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰہِیۡمَ مَکَانَ الۡبَیۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِکۡ بِیۡ شَیۡئًا وَّ

۲۶۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کو مستقر بنایا (اور آگاہ کیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور میرے گھر کو

طَهِّرۡ بَيۡتِيَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡقَآئِمِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۲۶﴾

طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

تشریح کلمات

بَوَّاۡنَا: (ب و ء) البواء کے اصل معنی کسی جگہ کے اجزا مساوی (ہموار) ہونے کے ہیں۔ بوأت له مکانا میں نے اس کے لیے جگہ کو ہموار کیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِيۡمَ: جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کو آمادہ کیا۔ ممکن ہے آمادگی سے مراد، تعمیر نو کے لیے اس گھر کی نشاندہی کرنا ہو یا یہ کہ اسے عبادت کے لیے مرکز و مرجع کے طور پر تیار کیا۔ کہا جاتا ہے: بؤکم فی الارض تمہیں زمین میں بسا دیا۔

۲۔ اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِيۡ شَيۡـًٔا: اس گھر کو ابراہیم علیہ السلام کے لیے اس لیے آمادہ کیا کہ اس گھر میں صرف میری عبادت ہو اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ اس گھر کو نفی شرک کی ایک عظیم تحریک کے لیے مرکز بنائے۔

۳۔ وَّطَهِّرۡ بَيۡتِيَ: میرے اس گھر کو طواف کرنے، عبادت کے لیے کھڑے رہنے اور رکوع و سجود بجالانے والوں کے لیے پاک رکھو۔ پاک رکھو شرک و بت پرستی کی آلودگی سے۔

۴۔ وَالۡقَآئِمِيۡنَ: نماز کے تین ارکان کا ذکر ہے: قیام، رکوع اور سجود۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اسلام کا طریقۂ عبادت ابراہیمی ہے۔

اہم نکات

۱۔ عبادت کے لیے شرک سے پاک فضا ضروری ہے۔

۲۔ عبادت کے اہم ارکان قیام، رکوع اور سجود ہیں۔

وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کرو کہ لوگ آپ کے پاس دور دراز راستوں سے پیدل چل کر اور کمزور اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں۔

تشریح کلمات

رِجَالًا: (ر ج ل) راجل۔ پیدل چلنے والا۔ اس کی جمع رجال آتی ہے۔

ضَامِرٍ : (ض م ر) الضامر۔ ضمر لاغر ہونے کے معنوں میں ہے۔
فَجٍّ : (ف ج ج) الفج دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی کو کہتے ہیں۔ بعد میں وسیع راستہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ: یہ جملہ بھی طَہِّرۡ کے ساتھ مربوط ہے۔ اے ابراہیم لوگوں میں حج کا اعلان کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اعلان پوری فطرت کی گہرائیوں، جبلت کے کانوں، آنے والی نسلوں اور آفاق عالم میں گونج رہا ہے۔ اس کی صدائے بازگشت قیامت تک آتی رہے گی: لبیك اللّٰھم لبیك۔ لبیك لا شریك لك لبیك۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو حج کے اعلان کا حکم آیا تو عرض کیا:

یَا رَبِّ وَ مَا یَبْلُغُ صَوْتِی۔ اے مالک! میری آواز نہیں پہنچے گی۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَذِّنْ عَلَیْكَ الْاَذَانُ وَ عَلَیَّ الْاِبْلَاغُ۔[1] اعلان کیجیے۔ اعلان کرنا آپ کے ذمے اور پہنچانا ہمارے ذمے ہے۔

چنانچہ اسی آیت میں اللہ نے وعدہ فرمایا:

۲۔ یَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ: چنانچہ اس اعلان کے بعد لوگ آپ کے پاس پیدل چل کر اور کمزور اونٹوں پر سوار ہو کر دور دراز راستوں سے آئیں گے۔ ضامر نحیف کمزور اونٹ کو کہتے ہیں۔ راستہ دور ہونے اور زاد راہ کی قلت کی وجہ سے ان کی سواریاں نحیف ہوں گی پھر بھی اس اعلان کے نتیجے میں وہ اس گھر کے حج کے لیے آتے رہیں گے۔

۳۔ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ: لفظ یَّاۡتِیۡنَ معنی کے اعتبار سے كُلِّ ضَامِرٍ کی صفت ہے یعنی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ۔ وہ کمزور، نحیف سواریوں پر ہوں گے جو دور دراز راستوں سے آتی ہیں۔ راستے پُرمشقت ہوں گے پھر بھی اس اعلان کا یہ اثر ہوگا کہ وہ شدید مشقت بھی برداشت کر لیں گے۔

اہم نکات

۱۔ جو قدم برائے خدا ہو اسے دوام ملتا ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توحید پرستی میں یکسوئیت ہے جس کی وجہ سے وہ تمام ادیان کے لیے سند بن گئی۔

---

[1] مستدرك الوسائل ۹: ۱۹۵

لِّیَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ وَ یَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِیۡمَۃِ الۡاَنۡعَامِ ۚ فَکُلُوۡا مِنۡهَا وَ اَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِیۡرَ ﴿۲۸﴾	۲۸۔ تاکہ وہ ان فوائد کا مشاہدہ کریں جو انہیں حاصل ہیں اور خاص دنوں میں اللہ کا نام لو ان جانوروں پر جو اللہ نے انہیں عنایت کیے ہیں، پس ان سے تم لوگ خود بھی کھاؤ اور مفلوک الحال ضرورتمندوں کو بھی کھلاؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ لِّیَشۡهَدُوۡا: یعنی لیحضروا تاکہ وہ حاضر ہو جائیں اپنی منفعتوں کے لیے جو دینی اور دنیوی منفعتوں پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ یہاں منافع دنیا مراد ہیں یا منافع آخرت؟ تو فرمایا: الکل۔[1] سب مراد ہیں۔

حدیث میں آیا ہے:

من حج ثلاث حج لم یصبه فقر ابداً۔[2] جو تین حج بجا لاتا ہے وہ کبھی بھی تنگدست نہ ہوگا۔

ثواب آخرت کے بارے میں حدیث ہے:

سواری پر جانے والوں کے لیے ہر قدم پر ستر نیکیاں اور پیدل چلنے والوں کے لیے ہر قدم پر سات سو ایسی نیکیوں کا ثواب ہے جو حرم کی نیکیوں کا ہے۔ پوچھا گیا حرم کی نیکی کیا ہے؟ فرمایا: ایک نیکی ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہے۔[3]

۲۔ وَ یَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ: اللہ تعالیٰ نے جو جانور عطا کیے ہیں ان پر اللہ کا نام لیں۔ مِّنۡۢ بَهِیۡمَۃِ الۡاَنۡعَامِ: چوپاؤں میں اونٹ، گائے اور بھیڑ، بکری شامل ہیں۔ ان کے ذبح کے موقع پر اللہ کا نام لینا مراد ہے۔

۳۔ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ: اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ سے مراد ائمہ علیہم السلام کی روایات کے مطابق ایام تشریق ہیں۔ دسویں، گیارہوں، بارہویں اور تیرہوں ذی الحجہ کے ایام مراد ہیں۔

۴۔ فَکُلُوۡا مِنۡهَا: ان جانوروں کا گوشت خود تم بھی کھاؤ۔ یہ امر نہیں ہے بلکہ جواز کے لیے ہے کہ اس قربانی کا گوشت تم بھی کھا سکتے ہو۔ یہ ایسے ہے جیسے سورہ جمعہ میں فرمایا:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانۡتَشِرُوۡا...[4] پھر جب نماز ختم ہو جائے تو (اپنے کاموں کی طرف) زمین میں بکھر جاؤ۔

۵۔ وَ اَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِیۡرَ: اور مفلوک الحال فقیروں کو بھی کھلا دو۔ الۡبَآئِسَ اس شخص کو کہتے

---

[1] الکافی ۴: ۴۲۲ [2] الفقیہ ۲: ۲۱۶ [3] مجمع البیان ذیل آیہ [4] ۶۲ جمعہ: ۱۰

ہیں جو شدید ضرورت مند ہو۔

ثُمَّ لۡیَقۡضُوۡا تَفَثَہُمۡ وَ لۡیُوۡفُوۡا نُذُوۡرَہُمۡ وَ لۡیَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَیۡتِ الۡعَتِیۡقِ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ پھر وہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اللہ کے قدیم گھر کا طواف کریں۔

تشریح کلمات

لۡیَقۡضُوۡا: (ق ض ی) کے معنی ازالہ کے ہیں۔ اصل میں قضاء قطع اور جدا کرنے کو کہتے ہیں۔

تَفَثَہُمۡ: (ت ف ث) التفث کے اصل معنی ناخن وغیرہ کی میل کچیل کے ہیں، جسے بدن سے دور کیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ثُمَّ لۡیَقۡضُوۡا تَفَثَہُمۡ: میل کچیل دور کریں۔ نہائیں، دھوئیں، حجامت کرائیں، ناخن کاٹیں، قربانی کرنے کے بعد حاجی احرام سے نکل آتا ہے اور عورتوں کے علاوہ وہ سب چیزیں حلال ہو جاتی ہیں جو احرام سے حرام ہو گئی تھیں۔

۲۔ وَ لۡیُوۡفُوۡا نُذُوۡرَہُمۡ: اپنی نذریں پوری کریں۔ اگر دوران حج کوئی ایسی نذر مانی ہے جس کا احرام کی حالت میں بجا لانا ممکن نہیں تو اسے قربانی کے بعد پوری کریں۔

۳۔ وَ لۡیَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَیۡتِ الۡعَتِیۡقِ: عتیق کا لفظ قدیم، آزاد اور معزز کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ تینوں باتیں خانہ کعبہ پر صادق آتی ہیں۔ اس قدیم گھر کا طواف کرو۔ اس سے مراد بعض کے نزدیک طواف افاضہ ہے جسے طواف زیارت کہتے ہیں جو سب کے نزدیک حج کا رکن ہے۔

امامیہ کے نزدیک اس طواف سے مراد طواف نسآء ہے جو طواف زیارت کے بعد بجا لایا جاتا ہے جس کے بعد عورتیں بھی حلال ہو جاتی ہیں اور حجر اسماعیل (بیت) میں شامل ہے۔ لہٰذا حجر کو بھی طواف میں شامل کرنا چاہیے۔

طواف نسآء: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ اس آیت میں طواف سے مراد طواف نساء ہے۔[۱] حضرت امام رضا علیہ السلام سے بھی یہی روایت ہے۔[۲] اس طواف کو طواف نسآء اس لیے کہتے ہیں کہ اس طواف کے بعد عورتیں حلال ہو جاتی ہیں جو حج کے احرام میں حرام ہو گئی تھیں۔

---

۱ الوسائل۔ ۹:۲۹۰ ۲ مصدر سابق

اہل سنت اسی طواف کو طواف وداع اور طواف الصدر کہتے ہیں۔ یہ طواف مالکی مذہب میں مستحب اور جمہور اہل سنت کے نزدیک واجب ہے۔[1] اس طواف کے واجب ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا ینفر احد حتی یکون آخر عھدہ بالبیت۔[2]　کوئی شخص روانہ نہ ہو جب تک خانہ کعبہ کا آخری دیدار (طواف) نہ کر لے۔

عمر بن ابی سلمہ کہتے ہیں: میں نے زہیر سے پوچھا کہ اس طواف سے کون سا طواف مراد ہے۔ انہوں نے کہا: طواف وداع مراد ہے۔[3] یعنی وہی جو امامیہ کا موقف ہے اور شافعی کا ایک قول یہی ہے کہ یہ طواف واجب ہے۔[4]

ذٰلِكَ ۤ وَ مَنۡ یُّعَظِّمۡ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتۡ لَكُمُ الۡاَنۡعَامُ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡكُمۡ فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ وَ اجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ بات یہ ہے کہ جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کی عظمت کا پاس کرے تو اس کے رب کے نزدیک اس میں اس کی بہتری ہے اور تم لوگوں کے لیے مویشی حلال کر دیے گئے ہیں سوائے ان کے جن کے بارے میں تمہیں بتایا جائے گا، پس تم لوگ بتوں کی پلیدی سے اجتناب کرو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكَ: یہ ہے مناسک حج بجالانے کا طریقہ ہے۔

۲۔ وَ مَنۡ یُّعَظِّمۡ حُرُمٰتِ اللّٰهِ: حرمات اللہ وہ امور ہیں جن کے ارتکاب کو اللہ نے ممنوع قرار دیا ہے۔ ان کی تعظیم کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ارتکاب سے اجتناب کیا جائے۔ اللہ کی طرف سے آنے والے احکام کو عظیم خیال کریں۔ ان پر عمل نہ کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے اسے عظیم نہیں سمجھا اور حکم خدا کی اہانت کی۔

۳۔ وَ اُحِلَّتۡ لَكُمُ الۡاَنۡعَامُ: اونٹ، گائے، بھیڑ، بکریاں حلال ہیں۔ یہ سورہ مکی ہے جس میں حلّیت کا حکم اور حرام چیزوں سے اجتناب کا حکم آیا۔

۴۔ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡكُمۡ: چوپاؤں میں سے وہ حرام ہیں جنہیں آیندہ بیان کیا جائے گا۔ آیندہ

---

[1] التفسیر المنیر ۱۷: ۲۰۳　[2] صحیح الترمذی، مسند احمد　[3] تفسیر طبری ذیل آیہ ۱۷: ۱۱۱　[4] تفسیر قرطبی ذیل آیہ ۱۲: ۵۲

سے مراد سورہ ہائے نحل، بقرہ اور مائدہ میں نازل ہونے والے احکام ہیں جو ان چوپاؤں کے حرام ہونے پر مشتمل ہیں۔ جیسے مردار، خون، خنزیر، غیر اللہ کے نام کے ذبیحے وغیرہ۔

۵۔ فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ: انعام اور اوثان۔ چوپاؤں کو ذبح کرنا اور بت پرستی حج کے دنوں میں مشرکین کے بنیادی اعمال میں شامل تھی۔ چوپائے اپنے دیوتاؤں کے نام پر ذبح ہوتے تھے۔ حج میں کعبہ، صفا و مروہ اور دیگر مقامات پر بت نصب تھے۔ اس لیے فرمایا: خاص کر حج کے دنوں میں بت پرستی سے اجتناب کرو کیونکہ یہ بت ناپاک ہیں جو پاکیزہ عبادت کے لیے مانع ہیں۔

۶۔ وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ: جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو۔ یعنی اللہ کی طرف ان باتوں کی نسبت دینا جن سے اللہ بری ہے۔ قول زور سے بعض کے نزدیک مشرکین کی تلبیہ یہ ہے جس میں وہ کہتے تھے: لبیك لا شريك لك الا شريكا۔ هو لك تملكه و ما ملك۔ اس میں نفی شرک کے ساتھ وجود شرک کا اقرار ہے جو باطل ہے۔

تاہم اس آیت کے اطلاق میں ہر باطل بات شامل ہے۔ چنانچہ حدیث میں اس آیت کے مصادیق کے بارے میں آیا ہے:

عَدَلَتۡ شَهَادَةُ الزُّوۡرِ الشِّرۡكَ بِاللّٰهِ۔[1] جھوٹی گواہی اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب حکم خدا کی توہین ہے۔

۲۔ قول زور کو بت پرستی کے برابر جرم قرار دیا گیا ہے۔

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيۡرَ مُشۡرِكِيۡنَ بِهٖ ؕ وَ مَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِيۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِيۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ صرف (ایک) اللہ کی طرف یکسو ہو کر، کسی کو اس کا شریک بنائے بغیر اور جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے تو وہ ایسا ہے گویا آسمان سے گر گیا پھر یا تو اسے پرندے اچک لیں یا اسے ہوا اڑا کر کسی دور جگہ پھینک دے۔

تشریح کلمات

حُنَفَآءَ: (ح ن ف) حنیف کی جمع۔ یکسوئی کے معنوں میں ہے۔

فَتَخۡطَفُهُ: (خ ط ف) الخطف کسی چیز کو سرعت سے اچک لینا۔

---

[1] مستدرك الوسائل ١٧: ٤١٦

سَحِيْقٍ: (س ح ق) السحق ریزہ ریزہ کرنے کے معنوں میں ہے اور دور کر دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ: بت پرستی اور باطل گفتار سے اجتناب کرو۔ صرف اللہ کی طرف یکسوئی اختیار کرو۔ ایک ہی معبود، ایک ہی رب اختیار کرو۔ اس میں خود انسان کی اپنی قدر و منزلت کا تحفظ ہے۔ اس ذات کی بارگاہ کی طرف یکسوئی اختیار کرنا جو کمال مطلق کی مالک ہے، انسان کے لیے بھی ایک قسم کا کمال ہے۔

۲۔ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ: جب کہ شرک اختیار کرنا خود انسانی مقام و منزلت کی اہانت ہے۔ جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم میں بنایا وہ ایک جامد پتھر کے سامنے جھک جائے۔ جو انسان اس کائنات میں اللہ کا عظیم معجزہ ہے وہ ایک بے شعور چیز کی بندگی کرے۔ یہ ایسا تنزل اور انحطاط ہے جیسے کوئی آسمان سے گر کر زمین بوس ہو جاتا ہے اور اس کا جسم پاش پاش ہو جاتا ہے۔ انسانی شکل و صورت تک برقرار نہیں رہتی اور درندوں کا لقمہ بن جاتا ہے۔

۳۔ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ: یا خس و خاشاک کی طرح بے حیثیت ہو جاتا ہے اور ہوا اسے اڑا کر دور جگہ، کسی کھائی میں پھینک دیتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ کی طرف یکسوئی سے حدود اللہ کا احترام ہوسکتا ہے۔

۲۔ شرک باللہ خود انسان کی اپنی قدروں کے منافی ہے۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ بات یہ ہے کہ جو شعائر اللہ کا احترام کرتا ہے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے۔

تشریح کلمات

شَعَآئِرَ: (ش ع ر) شعیرة کی جمع ہے۔ لڑائی میں فوجی اشارے کو شعار کہا جاتا ہے۔ حج کی رسوم ادا کرنے کی جگہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ: شعائر وہ علامتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے لیے نصب کی

ہیں۔ حرمات اللہ کی تعظیم کے ذکر کے بعد اس موضوع کو وسعت دیتے ہوئے فرمایا: جملہ شَعَآئِرَ اللّٰهِ کی تعظیم، قلوب کا تقویٰ ہے۔ حرمات اللہ کی تعظیم کے بارے میں بتایا کہ یہاں تعظیم سے مراد حدود کی پاسداری کرنا اور کوئی حکم حرام ہے تو اس سے باز رہنا ہے۔ اسی طرح شعائر اللہ کی تعظیم بھی، ان کے متعلق احکام کی پابندی کرنا ہے۔

شَعَآئِرَ اللّٰهِ کیا ہیں؟: شَعَآئِرَ اللّٰهِ وہ علامتیں ہیں جو اللہ نے اپنی اطاعت کے لیے نصب فرمائی ہیں۔ حج کے اعمال چونکہ محسوس اماکن کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جیسے کعبہ، صفا و مروہ، میدان عرفات، مزدلفہ، منیٰ اور قربانی کے جانور۔ یہ سب اس امت کے بانی حضرت خلیل علیہ الصلوۃ والسلام کی اطاعت الٰہی میں یکسوئی اور فنا فی اللّٰہ کی علامات پر مشتمل ہیں۔

سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ ...[1] اے ایمان والو! تم اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔

اس آیت میں شعائر اللہ سے حدود اللہ مراد لی گئی ہیں جو امر و نہی اور احکام و فرائض سے عبارت ہیں۔ لہٰذا اس آیت میں شعائر اللہ سے مراد اگرچہ حج سے متعلق اماکن و اعمال ہیں تاہم یہ شعائر اللہ کی تطبیق ہے، انحصار نہیں ہے۔

۲۔ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ: تقویٰ کی نسبت دلوں کی طرف اس لیے دی ہے کہ اصل تقویٰ کا محرک دل ہیں۔ دل میں اگر صدق نیت نہ ہو، اللہ کے ساتھ خلوص اور اللہ کی طرف یکسوئی نہ ہو تو پھر تقویٰ کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے۔ دل وہ مرکزی محور ہے جس پر انسان کے تمام کردار کا انحصار ہے۔

اہم نکات

۱۔ شعائر اللہ کا تعین احکام کے تعین کی طرح امر خدا ہے۔

۲۔ تعظیم احکام، تقوائے قلب کے ساتھ مربوط ہے۔

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اس (قربانی کے جانور) سے ایک معین مدت تک فائدہ اٹھانا تمہارے لیے (جائز) ہے، پھر اس کا (ذبح ہونے کا) مقام قدیم خانہ کعبہ کے پاس ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ: تمہارے لیے ان شعائر میں فوائد ہیں۔ یہاں شعائر سے قربانی کے جانور

---

[1] ۵ مائدہ: ۲

مراد ہونے کی صورت میں فوائد سے مراد ان پر سوار ہونا، ان کا دودھ اور ان کے بال اون وغیرہ ہے۔

۲۔ اِلٰۤی اَجَلٍ: سے مراد قربانی ذبح کرنے تک یہ منافع موجود ہیں۔

۳۔ ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ: پھر قربانی ذبح کرنے کی جگہ حرم ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان قربانیوں سے ذبح کرنے تک تم فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ قربانی کے لیے نامزد ہونے کے بعد لوگ ان پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ آیت میں فرمایا: تم سوار ہو سکتے ہو۔ اس کے دودھ کو بھی استعمال میں لا سکتے ہو چونکہ زمان جاہلیت میں مشرکین ان جانوروں سے استفادہ نہیں کرتے تھے جو وہ اپنے دیوتاؤں اور جعلی معبودوں کے نام کرتے تھے۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص اپنے قربانی کے اونٹ کو چلا رہا تھا اور خود مشقت کے ساتھ چل رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: ارکبھا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ یہ تو قربانی کے لیے ہے۔ فرمایا: ویلك ارکبھا۔ افسوس ہو تم پر۔ سوار ہو جاؤ۔[1]

اہم نکات

۱۔ کسی جانور کے کسی دینی مقصد کے لیے مقرر ہونے کی وجہ سے اس سے استفادہ نہ کرنا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک دستور مقرر کیا ہے تاکہ وہ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں عطا کیے ہیں، پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے پس اسی کے آگے سر تسلیم خم کرو اور (اے رسول) عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔

تشریح کلمات

منسک: (ن س ك) جائے نسك، عبادت کی جگہ۔ قربانی کو نسك کہتے ہیں۔ شاید یہاں قربانی مراد ہے۔

المخبت: (خ ب ت) الخبت نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں۔ اسی سے اخبت نرمی اور تواضع کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

---

[1] تفسیر رازی ذیل آیت

تفسیر آیات

۱۔ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا: ہر امت کے لیے عبادت اور اطاعت الٰہی کے لیے ایک جائے عبادت منسک قرار دیا ہے جہاں جا کر قربانی پیش کی جاتی ہے اور عبادت کرتے ہیں۔ جیسے کعبہ، عرفات، منیٰ قرب الٰہی حاصل کرنے کے مقامات ہیں جو اس امت کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ یہاں منسک سے مراد قربانی ہو سکتی ہے چونکہ آیت کا اگلا حصہ اس پر قرینہ ہے۔

۲۔ لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ: اللہ نے ان قربانیوں کو اللہ کے نام کرنے کا حکم دیا چونکہ مشرکین اپنی قربانیوں کو اپنے جعلی معبودوں کے نام کرتے تھے۔

۳۔ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ: سے معلوم ہوا یہ قربانی چوپائے قسم کے جانوروں کی ہو سکتی ہے۔

۴۔ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا: خطاب اس امت سے ہے کہ تمہارا معبود تو ایک ہی معبود ہے۔ اسی کے نام ذبح کرو اور اپنی قربانیوں کو غیر اللہ کے نام نہ کرو۔

۵۔ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ: اللہ کے سامنے تواضع کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔ یہ تواضع کرنے والے کن اوصاف کے مالک ہیں، اگلی آیت میں اس کا ذکر ہے۔

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳۵	۳۵۔ جن کا یہ حال ہے کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپنے لگتے ہیں اور وہ مصیبت پر صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

وَجِلَتْ: (و ج ل) الوجل، خوف کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ: جن کے دلوں میں غیر اللہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ وہ محبّ اور مخلص ہوتے ہیں۔ یاد خدا سے ان کے دل لرز جاتے ہیں۔ اس شعور کی وجہ سے کہ اللہ کی بندگی کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس معرفت کی وجہ سے جس سے عظمت خالق ان کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ اس قرب کی وجہ سے جو انہیں اللہ کے ساتھ حاصل ہے۔ جس قدر قرب زیادہ ہوگا عظمت کا ادراک زیادہ ہوگا۔ اس ایمان کی وجہ سے جس کے کمال پر فائز ہونے سے حقائق کا مشاہدہ ہوتا ہے اور حقیقت حال کا مشاہدہ کرنے والے

خائف ہوتے ہیں۔ غافل کی طرح بے پرواہ نہیں ہوتے۔

۲۔ وَ الصّٰبِرِیۡنَ عَلٰی مَاۤ اَصَابَہُمۡ: زندگی مشکلات و مسائل کے ساتھ تصادم کا نام ہے اور مؤمن زیادہ آزمائش میں مبتلا رہتا ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اللہ کے لیے مخلص ہے تو یہ اخلاص صبر لاتا ہے۔ ''صابرین کی جہاں بینی'' ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۱۵۶ کے ذیل میں۔

۳۔ وَ الۡمُقِیۡمِی الصَّلٰوۃِ: اقامہ نماز اور انفاق در راہ خدا کا تعلق بھی اخلاص سے ہے جو واضح ہے۔

اہم نکات

۱۔ دل میں اگر صرف خدا ہو تو اللہ کی عظمت سے خائف رہتا ہے۔

۲۔ خوف خدا، صبر، اقامہ نماز اور انفاق خلوص دل کی علامتیں ہیں۔

وَ الۡبُدۡنَ جَعَلۡنٰہَا لَکُمۡ مِّنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ لَکُمۡ فِیۡہَا خَیۡرٌ ٭ۖ فَاذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰہِ عَلَیۡہَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتۡ جُنُوۡبُہَا فَکُلُوۡا مِنۡہَا وَ اَطۡعِمُوا الۡقَانِعَ وَ الۡمُعۡتَرَّ ؕ کَذٰلِکَ سَخَّرۡنٰہَا لَکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور قربانی کے اونٹ جنہیں ہم نے تم لوگوں کے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے اس میں تمہارے لیے بھلائی ہے، پس اسے کھڑا کر کے اس پر اللہ کا نام لو پھر جب یہ پہلو پر گر پڑے تو اس میں سے خود بھی کھاؤ اور سوال کرنے والے اور سوال نہ کرنے والے فقیر کو کھلاؤ، یوں ہم نے انہیں تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکر کرو۔

تشریح کلمات

صَوَآفَّ: (ص و ف) صواف کھڑے ہونے کی حالت کو کہتے ہیں چونکہ اونٹ کھڑے ہونے کی حالت میں نحر کیے جاتے ہیں۔

وَجَبَتۡ: (و ج ب) یہ جبت الشمس سے ہے۔ سورج گرنے یعنی غروب ہونے کے معنی میں ہے۔

الۡمُعۡتَرَّ: (ع ت ر) مانگنے والا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الۡبُدۡنَ جَعَلۡنٰہَا لَکُمۡ مِّنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ: قربانی کے اونٹ شعائر اللّٰہ میں سے ہیں کیونکہ اللہ نے انہیں شعائر میں سے قرار دیا ہے۔ جَعَلۡنٰہَا: لہٰذا کسی چیز کے شعائر اللّٰہ میں سے ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعین ضروری ہے۔

۲۔ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ: اسے شعائر اللّٰہ میں قرار دیا ہے کہ تم اس چیز کو راہ خدا میں قربان کرو جس میں تمہارے لیے بھلائی اور خیر ہے جس کی وجہ سے اونٹ کی قربانی میں زیادہ ایثار کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی ایثار کی بنیاد پر شاید اسے شعائر اللّٰہ میں سے قرار دیا گیا ہے تاکہ انسان میں ایثار کا جذبہ موجزن رہے۔

۳۔ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ: انہیں ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لو جو اس ذبح کے عبادت ہونے کی بنیادی شرط ہے۔

۴۔ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا: واضح رہے اونٹ کو باندھ کر کھڑا کیا جاتا ہے پھر اس کے حلقوم میں نیزہ مارا جاتا ہے۔ جب زمین پر گر جاتا ہے، اس کی روح نکل جاتی ہے تو خود بھی کھاؤ اور محتاج کو بھی دو۔

۵۔ وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ: اس کا گوشت قانع اور معتر کو کھلاؤ۔ قانع: وہ شخص ہے جو، جو کچھ آپ نے اسے دیا ہے اس پر راضی ہوتا ہے اظہار ناراضی نہیں کرتا۔ اَلْمُعْتَرَّ: وہ شخص ہے جو دست سوال دراز کرتا ہے۔[1]

۶۔ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ: ان اونٹوں کو اللہ نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ ان سے اپنی دنیوی زندگی کے لیے استفادہ کرو اور قربانی کر کے قرب الٰہی بھی حاصل کرو۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ نہ اس کا گوشت اللہ کو پہنچتا ہے اور نہ اس کا خون بلکہ اس تک تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے، اسی طرح اللہ نے انہیں تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ اللہ کی عطا کردہ ہدایت پر تم اس کی بڑائی کا اظہار کرو اور (اے رسول) آپ نیکی کرنے والوں کو بشارت دیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا: جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ وہ قربانی کے گوشت کو کعبہ کے پاس لا کر رکھتے اور قربانی کے خون کو کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے۔ اس طرح وہ خیال کرتے تھے کہ ایسا کرنے سے یہ گوشت اور خون اللہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اس جاہلانہ توہم کو دور کرتے ہوئے فرمایا: ان جانوروں کا گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہنچتا، نہ اللہ ان چیزوں کا محتاج ہے۔

۲۔ وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى: بایں معنی کہ تقویٰ کے ساتھ انجام پانے والے اعمال اللہ تک پہنچتے

---

[1] الکافی ۳: ۵۶۵

ہیں اور اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ قربانی پیش کرنے کا اصل محرک ایثار ہے اور ایثار تقویٰ ہے۔ اللہ کے پاس وہ عمل پہنچتا ہے جو تقویٰ و پرہیزگاری کے ساتھ انجام پایا ہو۔ تقویٰ یعنی جو عمل محرمات سے بچا کر بجا لایا جاتا ہے وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے، اسے اللہ وصول یعنی قبول فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ اللہ صرف تقویٰ والوں کا عمل قبول فرماتا ہے۔ تقویٰ کے بغیر کا مطلب یہ ہوگا کہ اس عمل کی انجام دہی میں تقویٰ یعنی محرمات سے بچاؤ اور پرہیز نہیں ہے۔

۳۔ کَذٰلِکَ سَخَّرَہَا لَکُمۡ: یہ قربانی تمہارے اختیار میں دی گئی تھی۔ اس الٰہی اکرام کے شکرانے میں قربانی پیش کرنا تقویٰ ہے۔

۴۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰىکُمۡ: تاکہ تم اس تسخیر کے شکرانے اور اس ہدایت کی قدردانی کے طور پر اللہ کی کبریائی کا اظہار کرو۔

۵۔ وَ بَشِّرِ الۡمُحۡسِنِیۡنَ: تقویٰ کا مالک ہی نیکی کے درجے پر فائز ہوسکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قربانی تقویٰ کی بنیاد پر قبول ہوتی ہے۔

۲۔ قربانی دیتے ہوئے اللہ کی کبریائی کا اظہار ہونا چاہیے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوۡرٍ ﴿۳۸﴾	۳۸۔ اللہ ایمان والوں کا یقیناً دفاع کرتا ہے اور اللہ کسی قسم کے خیانت کار ناشکرے کو یقیناً پسند نہیں کرتا۔
اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ ﴿۳۹﴾	۳۹۔ جن لوگوں پر جنگ مسلط کی جائے انہیں (جنگ کی) اجازت دی گئی ہے کیونکہ وہ مظلوم واقع ہوئے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

پہلی بار اذن جہاد کی طرف اشارہ اور تمہیدی جملہ ہے۔ مؤمنین مشرکین کے مظالم سے تنگ آ گئے تھے اور ان مظالم سے نبرد آزمائی کے لیے انتظار میں تھے۔ ایسی صبر آزما، پرتشدد اور دم گھٹنے والی فضا میں پہلی بار امید افزا آواز آتی ہے:

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ: اہل ایمان کا دفاع خود اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ دفاع کرنے والی ذات وہ ہے جس کے قبضہ قدرت میں ساری کائنات ہے۔

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوۡرٍ: ساتھ یہ نوید بھی سنائی کہ وہ مشرکین جو خیانت کار اور کافر

ہیں، اللہ انہیں پسند نہیں فرماتا۔ کہیں مظلوم مسلمان یہ تصور نہ کریں کہ مشرکین ایک مدت سے ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں اور انہیں کوئی جواب نہیں دیا جا سکا، آخر اللہ کی نصرت کب آئے گی؟

واضح رہے کہ اللہ ظالموں کو ڈھیل دے کر ان کے اپنے جرم اور مؤمنین کو صبر و تحمل کا موقع دے کر ان کے درجات میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔

۳۔ اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ: اذن جہاد ان لوگوں کو دیا گیا ہے جن کے خلاف جنگ کی جائے۔ یُقٰتَلُوۡنَ "جنگ کی جاتی ہے" سے معلوم ہوا کہ اذن جہاد اس وقت کے لیے ہے جب ان مؤمنین کے خلاف لڑائی کی جائے۔ لہٰذا علماء اذن جہاد اور حکم جہاد میں فرق کے قائل ہو گئے ہیں۔

چنانچہ حکم جہاد سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۰ میں آیا:

وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا....	اور تم راہ خدا میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو۔

اور اس کے بعد کی آیات میں مشرکین کی طرف سے جنگ مسلط کرنے کی صورت میں اذن کا اعلان ہوا اور جب جنگ مسلط ہو گئی تو حکم جہاد ہوا۔

ان دو آیتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی جنگیں دفاعی تھیں۔ جنگ میں پہل کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا مظلوم واقع ہونے کی صورت میں جنگ کا جواز آ گیا اور جنگ مسلط ہونے کے بعد جنگ کا حکم آ گیا: "جو تم سے لڑتے ہیں ان سے لڑو" اور ساتھ آداب جنگ بھی بتائے وَ لَا تَعۡتَدُوۡا حد سے تجاوز نہ کرو۔ اسلام میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ جنگ میں ہر کام جائز ہے۔

۳۲۶

الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ بِغَیۡرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ لَّہُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذۡکَرُ فِیۡہَا اسۡمُ اللّٰہِ کَثِیۡرًا ؕ وَ لَیَنۡصُرَنَّ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے ہیں، محض اس جرم میں کہ وہ یہ کہتے تھے: ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے روکے نہ رکھتا تو راہبوں کی کوٹھریوں اور گرجوں اور عبادت گاہوں اور مساجد کو جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے منہدم کر دیا جاتا اور اللہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کرے گا، اللہ یقیناً بڑا طاقتور اور بڑا غالب آنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ : ان مظلوم لوگوں کو اذن جہاد دیا جاتا ہے جنہیں اپنے گھروں سے نکالا گیا ہے۔ اس جملے سے واضح ہوتا ہے کہ اذن جہاد سے متعلق آیات مدنی ہیں۔ یوں بھی مکہ کی زندگی میں اذن جہاد کا کوئی امکان نہیں تھا۔

۲۔ اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ : ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اللہ ہی کو اپنا رب کہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں فی الواقع سب سے بڑا جرم شرک باللہ ہے۔ ان مجرموں کے نزدیک سب سے بڑا جرم صرف اللہ کو رب کہنا ہے۔ یعنی شرک جیسے قبیح جرم کا ارتکاب نہ ہونا جرم ہے۔

۳۔ وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ : اگر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی فطرت میں اپنے تحفظ کا شعور ودیعت نہ فرمایا ہوتا تو کوئی معاشرہ امن کے ساتھ نہ رہ سکتا۔ خصوصاً مذہبی مراکز۔

صَوَامِعُ : صومعۃ کی جمع ہے۔ اس جگہ کو کہتے ہیں جسے نادار، تارک الدنیا عبادت کے لیے مخصوص کرتے ہیں۔

بِیَعٌ : بیعۃ عیسائیوں کی عبادت کی جگہ کو کہتے ہیں۔

صَلَوٰتٌ : یہودیوں کی عبادت گاہ کو صلوتا کہتے ہیں۔ یہاں سے ہم نے یہ موقف اختیار کیا کہ لفظ صلوٰۃ عصر ابراہیمی سے نماز کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ بعد میں دعا میں زیادہ استعمال ہونے لگا۔ اسلام نے اس لفظ کو اپنے حقیقی معنی میں دوبارہ واپس کیا ہے۔

دفاع انسانی حقوق میں سے ہے اور فطرۃً ہر ذی روح اس کا شعور رکھتا اور اسے استعمال کرتا ہے۔ ہر ذی روح اپنے دشمن کو پہچانتا اور اس سے بچنے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ یہ شعور اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح میں رکھا ہے تو انسان اس کا بہتر شعور رکھتا ہے۔ اگر اپنی عزت و کرامت، اپنے مال و جان، خصوصی طور پر مذہبی مقامات کے تحفظ کا شعور اور مذہبی جذبات موجود نہ ہوتے تو یہ عبادت گاہیں منہدم ہو جاتیں۔

اگرچہ اس شعور کے نہ ہونے کی صورت میں اجتماعی زندگی بھی ناممکن ہوتی لیکن مذہب کے بارے میں لوگوں کے تعصّبات زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسانوں میں مذہبی بنیاد پر زیادہ خون خرابہ ہوا ہے۔

ہمارے زمانے میں پاکستان میں سیاسی، اقتصادی، قبائلی، نسلی اور زبانی تعصّبات کی بنیاد پر خودکش حملے نہیں دیکھے گئے لیکن مذہبی بنیاد پر، نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا میں بہت سے خودکش حملے ہو رہے ہیں۔

یہ اسلامی و انسانی قدروں سے محروم لوگ نہیں جانتے کہ اس قسم کا قتل جائز نہیں ہے خواہ قتل ہونے والا کافر ہی کیوں نہ ہو۔ امام مالک فرماتے ہیں:

”کافر کے بدلے مسلم قتل نہیں ہوتا مگر یہ کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو بے خبری میں قتل

کرے القتل غیلۃ تو اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔“ ملاحظہ ہو موطا امام مالک باب دیۃ اھل الذمۃ۔

صحیح بخاری کتاب الدیات باب اذا اصاب قوم میں آیا ہے:

ان غلاماً قتل غیلۃ فقال عمر لواشترك فیھا اھل صنعاء لقتلتھم۔	ایک لڑکے کو بے خبری میں قتل کیا گیا تو حضرت عمر نے فرمایا: اگر پورے شہر صنعا والے اس قتل میں شریک ہوتے تو میں سب کو قتل کر دیتا۔

۴۔ وَلَیَنۡصُرَنَّ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ: اللہ اس کی نصرت ضرور کرے گا جو اللہ کی نصرت کرے۔ یہاں اللہ کی نصرت کو تاکیدی لفظوں میں بیان فرمایا ہے: وَلَیَنۡصُرَنَّ۔ جب کہ بندے کی نصرت کو سادہ لفظوں میں بیان کیا ہے: یَّنۡصُرُہٗ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بندہ اللہ کے دین کی نصرت کرتا ہے تو اسے اللہ کی نصرت ملنا لازمی ہے۔ البتہ بندے کو پہل کرنا ہوگی جس سے وہ اس نصرت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ ...[1] تیسری جگہ فرمایا: فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ ...[2] ان سب میں یہی بات ہے کہ پہل بندے کو کرنا ہے۔ راہ خدا میں جہاد کرنا اللہ کی نصرت ہے۔

اہم نکات

۱۔ دہشت گردوں کو یہ علم ہونا چاہیے کہ عبادت گزاروں اور عبادت گاہوں کو اللہ تحفظ دیتا ہے۔

۲۔ بعض مفسدوں کی نظر میں جرم نہ ہونا جرم ہوتا ہے: اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ....

۳۔ مجاہد کے لیے اللہ کی نصرت لازمی ہے: وَلَیَنۡصُرَنَّ اللّٰہُ ....

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۱﴾	۴۱۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوۃ ادا کریں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام امور کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ: ان لوگوں کے اوصاف کا بیان ہے جو ایمان خالص رکھتے ہیں۔ ان کو اگر زمین میں اقتدار حاصل ہو جائے اور شعائر دینی کے قیام کے لیے کوئی رکاوٹ سامنے نہ آئے

---

[1] ۴۷ محمد: ۷　[2] بقرۃ: ۱۵۲

تو وہ اپنے دین کے ارکان قائم رکھتے ہیں:

الف: سب سے پہلا قدم وہ اقامہ نماز کے لیے اٹھاتے اور نمازی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔

چنانچہ جب مدینہ میں اسلامی معاشرہ قائم ہونے لگا سب سے پہلے اقامہ صلوٰۃ کے لیے مسجد کی بنیاد رکھی اور فاسد معاشرے کی پہلی علامت یہ ہے کہ وہ نماز کو اہمیت نہیں دیتا:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ ...[1]	پھر ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا...

ب: وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ: اس معاشرے کا دوسرا رکن اقتصادی ہو گا کہ ادائے زکوٰۃ کے ساتھ جہاد سے لے کر غریب پروری تک کے مسائل حل کرتے ہیں۔

ج: وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ: تیسرا رکن اصلاحی تحریک ہو گی۔ تعمیری باتوں کو رواج دینا اور تخریبی حرکتوں کا راستہ روکنا ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی معاشرے کا قیام تین ارکان پر مشتمل ہے: اقامه الصلوۃ، ادائے زکوۃ اور اصلاح عمل۔

وَ اِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ فَقَدۡ کَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوۡدُ ﴿۴۲﴾	۴۲۔ اگر لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو ان سے پہلے بھی تکذیب کی قوم نوح نے اور قوم عاد اور ثمود نے،
وَ قَوۡمُ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ قَوۡمُ لُوۡطٍ ﴿۴۳﴾	۴۳۔ اور قوم ابراہیم اور قوم لوط نے،
وَّ اَصۡحٰبُ مَدۡیَنَ ۚ وَ کُذِّبَ مُوۡسٰی فَاَمۡلَیۡتُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ ۚ فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ ﴿۴۴﴾	۴۴۔ اور مدین والوں نے بھی اور موسیٰ کی بھی تکذیب کی گئی ہے پس میں نے کفار کو پہلے مہلت دی پھر میں نے انہیں گرفت میں لے لیا پھر (دیکھ لو) میرا عذاب کیسا سخت ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ: تاریخ انبیاء علیہم السلام میں تکذیب کا عمل ہمیشہ رہا ہے۔ ہر تعمیر کے ساتھ تخریبی عناصر ساتھ ہوا کرتے ہیں۔ ہر اصلاح کے پہلو میں فسادی قوتیں فعال رہتی ہیں۔ ہر مثبت عمل کے سامنے ایک منفی رکاوٹ کھڑی رہتی ہے۔ ہر الٰہی تحریک کے مقابلے میں ایک شیطانی تحریک کھڑی ہو جاتی ہے۔

لہٰذا اے رسول! آپ کی اس الٰہی تحریک کے مقابلے میں شیطانی تحریک کا وجود کوئی انوکھی بات ہے نہ آپ کے اس ملکوتی پیغام کے مقابلے میں شیطانی وساوس نئی بات ہے۔

---

[1] ۱۹ مریم: ۵۹

اس بات پر قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم، لوط، مدین والے اور موسیٰ علیہم السلام کی تکذیب شاہد ہے۔

۲۔ فَاَمۡلَیۡتُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ: اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ ایسے تکذیبی عناصر کو مہلت دی جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا صبر دیکھا جاتا ہے۔ ظالم کو ڈھیل دی جاتی ہے۔ مظلوم کی آزمائش کی جاتی ہے۔ اس آزمائش کو وَظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا کی منزل تک لے جایا جاتا ہے۔

۳۔ ثُمَّ اَخَذۡتُہُمۡ: پھر ان تکذیبی عناصر کو گرفت میں لیا جاتا ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی ہے اور آخر میں کامیابی کی نوید بھی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر خدائی تحریک کے مقابلے میں شیطانی تحریک ہوا کرتی ہے۔

۲۔ اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے اور مظلوم کو آزمائش میں ڈال کر کامیابی کے کنارے تک لے جاتا ہے۔

فَکَاَیِّنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا وَ ہِیَ ظَالِمَۃٌ فَہِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوۡشِہَا وَ بِئۡرٍ مُّعَطَّلَۃٍ وَّ قَصۡرٍ مَّشِیۡدٍ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ پھر (قابل فکر ہے) کتنی ہی بستیاں ان کے ظلم کی وجہ سے ہم نے تباہ کیں اور وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں اور کتنے کنویں اور اونچے قصر بیکار پڑے ہیں۔

تفسیر آیات

فَکَاَیِّنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ: امتوں میں اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ اور اصول کلیہ کا ذکر ہے کہ کتنی ایسی ظالم بستیاں ہیں جن کو ایک مدت ڈھیل دینے کے بعد ہم نے تباہ کر دیا اور کتنے ایسے کنویں ہیں جن پر کبھی رونق لگی رہتی تھی۔ آج نہ کوئی اس طرف جاتا ہے نہ آتا ہے اور کتنے ایسے قصر تھے جن میں کسی زمانے میں لوگ پوری رعونت کے ساتھ رہتے تھے آج وہ سنسان ہیں۔

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِہَا ۚ فَاِنَّہَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَ لٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ کیا یہ لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہو جاتے؟ حقیقتاً آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا: کیا یہ مشرکین اور تکذیبی عناصر زمین میں چل پھر کر گزشتہ امتوں کی سرگزشت کا مشاہدہ نہیں کرتے؟ اگر وہ ایسا کرتے تو تکذیب کاروں کا انجام دیکھتے اور اپنی عقل و فکر کی طرف رجوع کرتے۔

اگر وہ خود بطور استقلال اپنی عقل و فکر سے کام لینے کے اہل نہیں ہیں تو کسی ہادی و رہبر کی بات سمجھتے اور ناصح کی آواز سننے اور سمجھنے کی صلاحیت آ جاتی۔

۲۔ فَاِنَّہَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ: یہ لوگ بے بصارت نہیں ہوں گے بلکہ بے بصیرت ہوں گے۔ ان کے قلب میں بینائی نہیں ہو گی۔ واضح رہے کہ بینائی اور تعقل کا قلب کی طرف اور پھر قلب کا سینہ کی طرف نسبت دینا ایک محاورہ ہے۔ ہم اپنے محاوروں میں عقل و فکر اور محبت و عداوت وغیرہ کی نسبت دل کی طرف دیتے ہیں۔ البتہ سائنس اور فلسفہ کے اعتبار سے یہ دماغ اور روح و نفس کا کام ہے۔ دل کا کام تو خون پمپ کرنا ہے۔ البتہ ایک نظریہ ہے کہ دل خود اپنی جگہ ایک شعور رکھتا ہے۔

وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ وَ لَنۡ یُّخۡلِفَ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ ؕ وَ اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۴۷﴾	۴۷۔اور یہ لوگ آپ سے عذاب جلدی طلب کر رہے ہیں اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف ہرگز نہیں کرتا اور آپ کے پروردگار کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے مطابق یقیناً ہزار برس کی طرح ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ: مشرکین تمسخر کرتے تھے کہ وہ عذاب کب آئے گا جس سے آپؐ ہمیں ڈراتے رہتے ہیں۔ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ہم آپؐ کی تکذیب کرتے ہیں، آپ کی توہین و تحقیر کرتے ہیں لیکن کوئی عذاب نہیں آ رہا۔

۲۔ وَ لَنۡ یُّخۡلِفَ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ: جواب دیا گیا: اللہ نے وعدہ کیا ہے۔ اللہ کے وعدے کے مطابق وہ عذاب آنے ہی والا ہے۔ ممکن ہے یہ عذاب جنگ بدر کا عذاب ہو۔

۳۔ وَ اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ: یہ تمہارے اپنے حساب اور زمان کے اعتبار سے ہے کہ عذاب آنے میں تاخیر ہے۔ اللہ کسی زمان و مکان کا محتاج نہیں ہے کہ ایک دن، مختصر اور ہزار سال طویل ہو جائے۔ وہ حلیم و بردبار ہے۔ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے پھر عذاب شدید میں مبتلا کرتا ہے۔

وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَمۡلَيۡتُ لَهَا وَ هِىَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذۡتُهَا ۚ وَ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور بہت سی بستیاں ایسی ہیں جنہیں مہلت دیتا رہا ہوں جب کہ وہ ظلم کرنے والی تھیں، پھر میں نے انہیں گرفت میں لیا اور میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

تفسیر آیات

ظالم کو ڈھیل دینا اللہ تعالیٰ کا قانون کلی ہے۔ اللہ تعالیٰ عذاب کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیتا کہ جرم سرزد ہوتے ہی بلا فاصلہ عذاب نازل ہو جائے بلکہ مہلت دی جاتی ہے جس سے مؤمن کے امتحان سے اس کے درجات میں اضافہ ہوتا ہے اور ظالم اپنے جرم میں اضافہ کرتا ہے۔ پھر اللہ ظالم کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔

قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَـكُمۡ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۚ﴿۴۹﴾

۴۹۔ کہدیجیے: اے لوگو! میں تو تمہارے لیے صرف صریح تنبیہ کرنے والا ہوں۔

فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ پس جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں ان کے لیے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔

وَ الَّذِيۡنَ سَعَوۡا فِىۡۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيۡنَ اُولٰۤئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اور جو لوگ ہماری آیات کے خلاف سعی کرتے ہیں کہ (ہم کو) مغلوب کریں وہ اہل جہنم ہیں۔

تفسیر آیات

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ اپنی رسالت اور اللہ کی طرف سے جو ذمے داری آپؐ پر ڈالی گئی ہے اس کا اعلان کریں اور کہہ دیں: میں لگی لپٹی باتوں سے نہیں، واضح لفظوں میں تمہاری تنبیہ کرنے والا ہوں، نذیر مبین ہوں۔ اس تنبیہ کے آنے کے بعد آگے دو راستے ہیں: ایک ایمان و عمل صالح کا، دوسرا اس ابدی سعادت کے خلاف کھڑا ہونے کا۔ ان دونوں کے نتائج کا بھی اعلان کرتا ہوں۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى

۵۲۔ اور (اے رسول) آپ سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ نبی مگر جب اس نے

اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۵۲

(کامیابی کی) تمنا کی تو شیطان نے اس کی آرزو میں خلل اندازی کی لیکن اللہ شیطان کے خلل کو نابود کرتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے اور اللہ بڑا دانا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ: ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات کے مطابق رسول اور نبی میں فرق یہ ہے:

رسول وہ ہے جس پر فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے۔ نبی وہ ہے جس پر خواب میں وحی نازل ہوتی ہے۔[1]

۲۔ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ: تَمَنّٰى دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک معنی یہی تمنا یعنی آرزو کے ہیں۔ دوسرے معنی تلاوت کرنے کے ہیں۔۔ آرزو کے معنی کے اعتبار سے آیت کے یہ معنی ہوں گے:

جب بھی کسی رسول یا نبی نے اپنے مشن کی کامیابی کی آرزو کی تو شیطان نے اس میں خلل اندازی کی۔ اللہ نے اس خلل اندازی کو بے اثر اور اپنی آیات کو محکم کر دیا۔

تلاوت کے معنی کے اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوں گے:

جب بھی کسی نبی یا رسول نے آیت کی تلاوت کی تو شیطان نے اس میں شبہ ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے شبہ کو باطل قرار دیا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝۵۳

۵۳۔ تاکہ شیطان کی خلل اندازی کو ان لوگوں کے لیے آزمائش قرار دے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل جامد ہیں اور ظالم لوگ یقیناً بہت گہرے عناد میں مبتلا ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً: شیطان کی دخل اندازی اور اس کے ڈالے ہوئے شبہ کو ایک

---

[1] الکافی ۱: ۱۷۶

آزمائش قرار دیا ہے۔ دل کے مریض اسی شبہ کو اپنی گمراہی کے لیے سند بناتے ہیں۔ جن کے دلوں میں فسادات ہیں اور ہدایت اثر نہیں کرتی، ان کے لیے بھی شیطان کا ڈالا ہوا شبہ بہانہ بن جائے۔

لِّیَجۡعَلَ: ان شیطانی دخل اندازیوں اور وسوسوں کو اللہ تعالیٰ ہونے دیتا ہے اور ایسی چیزوں کا راستہ نہیں روکتا۔ جیسے کہ خود شیطان کا راستہ نہیں روکتا تا کہ یہ منفی طاقت ان لوگوں کے لیے امتحان بن جائے جو ایسے وسوسوں سے استفادہ کے لیے ہمہ تن آمادہ ہیں۔

وَّ لِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَیُؤۡمِنُوۡا بِہٖ فَتُخۡبِتَ لَہٗ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَہَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اور اس لیے بھی ہے کہ جنہیں علم دیا گیا ہے وہ جان لیں کہ یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے، پس وہ اس پر ایمان لے آئیں اور اللہ کے سامنے ان کے دل نرم ہو جائیں اور اللہ ایمان والوں کو یقیناً راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ شیطانی دخل اندازی کو بے اثر کر دیتا اور اپنی آیات کو محکم بنا دیتا ہے تا کہ اہل علم کو پتہ چلے کہ اس دخل اندازی کے باوجود کامیابی حاصل کرنے والی بات حق پر مبنی ہے۔ اس راز کے ادراک کے بعد یہ ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل اللہ کے آگے جھک جاتے ہیں۔ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ میں اَنَّہُ کی ضمیر تمنا کی طرف پلٹتی ہے۔

اس طرح شیطان کی دخل اندازی کو اللہ نے آزمائش کا ایک ذریعہ بنایا جس سے کھرے اور کھوٹے الگ ہو جاتے ہیں۔ دلوں کی بیماری میں مبتلا لوگ اسی سے غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ جب کہ اہل کے لیے شیطان کی ناکامی آرزوئے رسول و نبی کی حقانیت کے لیے دلیل بن جاتی ہے۔

ان آیات سے یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریک ایسے مرحلے میں تھی۔ چشم ظاہر بین کو اس تحریک کی کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ اللہ کے رسولؐ ہیں، ہر قسم کی اہانت سے دوچار ہیں۔ ان کے ماننے والے ہر قسم کے مظالم سے دوچار ہیں: ما اوذی نبی مثل ما اوذیت۔[1] کسی نبی کی اتنی اذیت نہیں دی گئی جتنی اذیت مجھے دی گئی ہے۔ شعب ابی طالب میں تین سال تک سوشل بائیکاٹ کی زندگی میں ناقابل تصور اذیتیں اٹھاتے ہیں۔ دشمن یہ طعنہ دیتے ہیں: کہاں ہے اللہ کی

---
[1] کشف الغمۃ ۲: ۵۳۷

نصرت؟ وہ عذاب کیوں نہیں آتا جس سے ہم کو ڈراتے ہو؟

ایسے حالات میں یہ آیت نازل ہوتی ہے اور تاریخ انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کو بیان کیا گیا ہے کہ اللہ عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ مہلت دیتا ہے اور اپنے وقت پر ان ظالموں کو گرفت میں لیتا ہے۔ ساتھ یہ فلسفہ بھی بیان فرمایا: شیطان کو دخل اندازی کرنے سے روکا نہیں جاتا چونکہ اس سے کھرے کھوٹے الگ ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ مفہوم جو ان آیات سے صاف اور واضح طور پر سامنے آتا ہے۔

قصہ غرانیق: غیر شیعہ مصادر میں اس جگہ ایک داستان بڑی آب و تاب کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ مفسرین و محدثین نے اس کہانی کو کھلے دل سے اپنی تصانیف میں نمایاں جگہ دی ہے اور قد آور محدثین نے اپنی محدثانہ مہارت کے مطابق اسے صحیح قرار دیا ہے بلکہ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ قصہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے معیار پر اترتا ہے۔ (علی شرط الصحیحین)

ہم اس کہانی کو تفسیر طبری سے نقل کرتے ہیں:

> رسول کریم (ص) مشرکین مکہ کے ساتھ کعبہ کے پاس بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہ کاش قرآن میں کوئی ایسا مطلب نازل ہو جائے جس سے قوم میرے نزدیک آ جائے۔ چونکہ رسول اللہ (ص) کو اپنی قوم سے قطع تعلقات پر دکھ تھا اور چاہتے تھے کہ قربت کی کوئی صورت نکل آئے۔ اتنے میں سورہ نجم نازل ہوئی۔ آپ (ص) اسے تلاوت فرمانے لگے۔ جب یہاں پہنچے:
>
> اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَ الۡعُزّٰی ۙ﴿﴾ وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی ﴿﴾ شیطان نے دو جملے آپ کے ذہن میں ڈال دیے۔ تلك الغرانیق[1] العلی وان شفاعتھنّ لترجی (یہ بلند مرتبہ بت ہیں جن کی شفاعت کی ضرور امید کی جاتی ہے۔) آپؐ نے یہ جملے بھی پڑھ کر سنا دیے۔ پھر پورے سورے کی تلاوت فرمائی۔ آخر میں آپؐ نے سجدہ کیا اور پوری قوم نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ ولید بن مغیرہ نے ایک مٹی اٹھائی اور اس پر سجدہ کیا جب کہ وہ بوڑھا ہو گیا تھا، سجدہ نہیں کر سکتا تھا۔ مشرکین ان دو جملوں سے بہت خوش ہوئے اور کہا:
>
> > اللہ ہی زندہ کرتا ہے، مارتا ہے۔ وہی خلق کرتا ہے، روزی دیتا ہے مگر ہمارے یہ معبود اللہ کے ہاں شفاعت کرتے ہیں۔ اگر آپ نے بھی ان بتوں کے بارے میں کچھ حصہ اعتراف کیا تو ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔

---

[1] الغرانیق، غرنوقه کی جمع ہے۔ سفید پرندے کو کہتے ہیں۔ (العین) وہ اپنے بتوں کو ان سفید پرندوں سے تشبیہ دیتے تھے جو فضا میں پرواز کرتے ہیں۔

شام کو جبرئیل نازل ہوئے اور کہا: یہ آپؐ نے کیا کہدیا؟ یہ دونوں فقرے میں تو نہیں لایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: کیا میں نے اللہ پر افترا باندھا ہے؟ میں نے ایسی بات کی اللہ کی طرف نسبت دی جو اللہ نے نہیں کہی۔ اس پر اللہ نے وحی بھیجی: وَاِنۡ کَادُوۡا لَیَفۡتِنُوۡنَکَ عَنِ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ لِتَفۡتَرِیَ عَلَیۡنَا غَیۡرَہٗ ٭ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوۡکَ خَلِیۡلًا ۝ [1] ''اور (اے رسول) یہ لوگ آپ کو وحی سے منحرف کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے تاکہ آپ (وحی سے ہٹ کر) کوئی اور بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کریں۔ اس صورت میں وہ ضرور آپ کو دوست بنا لیتے۔'' اس آیت کے نزول سے آپؐ بڑے مغموم رہے تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ... آخر الآیۃ۔ جو لوگ حبشہ ہجرت کر گئے تھے ان کو خبر ملی کہ سب اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے تو وہ اپنے اپنے قوم قبیلوں کی طرف واپس آ گئے۔

اس قصے کو تقریباً تمام مفسرین اور اکثر محدثین نے نقل کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے اس قصے کو من گھڑت قرار دیا ہے جیسے ابن کثیر، بیھقی، قرطبی، قاضی عیاض، امام رازی وغیرہ۔

دوسری طرف بہت سی قدآور تفسیری اور حدیثی شخصیتوں نے اسے صحیح تسلیم کیا ہے۔ جیسے طبری جو فقہ و تفسیر اور تاریخ کے امام مانے جاتے ہیں، ابوبکر جصاص، زمخشری، ابن حجر وغیرہ۔

ان میں ابن حجر کا استدلال سب سے زیادہ قابل توجہ ہے جو درج ذیل ہے:

لکن کثرۃ الطرق تدل علی ان للقصۃ اصلاً۔	لیکن طریق ہائے روایت کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ضرور ہے۔

آگے کہتے ہیں:

اس قصے کے دو طریق روایت اور بھی ہیں جو دونوں صحیح السند ہیں (اگرچہ) مرسل ہیں لیکن ان دونوں کے راوی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے معیار پر اترتے ہیں۔ (رجالها علی شرط الصحیحین)۔

ملاحظہ ہو فتح الباری۔

اس قصے کی صحت و بطلان کے بارے میں مختصر یہ ہے کہ منها علیها شواهد ۔ اس کے من گھڑت ہونے پر خود اسی قصے میں کئی شواہد موجود ہیں:

i۔ پہلا شاہد تو یہ ہے کہ اس قصے کے ہجرت حبشہ کے ساتھ مربوط ہونے کی بنا پر سورہ نجم ۵ سنہ نبوی میں نازل ہوا ہے۔ آیت میں شیطان کی طرف سے آمیزش پر عتاب سورہ بنی اسرائیل میں

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل:۷۳

اس واقعے کے چھ سال بعد آتا ہے چونکہ سورہ بنی اسرائیل معراج کے بعد نازل ہوا اور معراج سنہ ۱۱ نبوی میں ہوئی ہے۔ شیطانی آمیزش کو منسوخ کرنے کا اعلان سورہ حج میں ہوتا ہے جو سال اول ہجرت یا آواخر نبوی میں نازل ہوا ہے یعنی شیطان کی طرف سے آمیزش کے ۹ سال بعد۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ۹ سال تک شیطان کی آمیزش کو برقرار رکھا گیا ہو؟

ii۔ دوسرا شاہد خود سورہ نجم کا سیاق و سباق ہے کہ بتوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے: یہ بت صرف نام ہیں جو تم اور تمہارے آباء و اجداد نے گھڑ لیے ہیں۔ اللہ نے اس کی کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ یہ لوگ (بتوں کو معبود بنا کر) صرف گمان اور خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کلام کے اثنا میں اس جملے کا کوئی ربط بنتا ہے؟: ''یہ بلند پایہ بت ہیں جن سے شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔''

بھلا جو بت من گھڑت اور بے حقیقت اور صرف نام ہیں انہیں اسی عبارت میں بلند پایہ اور شفاعت کے اہل قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس تضاد بیانی پر مشرکین خوش ہو سکتے ہیں؟

iii۔ یہ قصہ خود آیات کے سیاق و سباق کے خلاف ہے۔ آیات کا سیاق یہ ہے: شیطان تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی تمنا اور آرزو میں دخل اندازی کرتا رہا ہے اور اللہ اس دخل اندازی کو بے اثر کرتا رہا۔ شیطان کی طرف سے یہ دخل اندازی مریض اور سخت دل لوگوں کے لیے آزمائش بھی رہی اور اہل علم کے لیے شیطان کی یہی دخل اندازی حق کی دلیل ثابت ہوئی یعنی شیطان کا یہ عمل کھرے اور کھوٹے کو جدا کرنے کا سبب بھی رہا۔

آیت کی تعبیر اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِہٖ ''شیطان نے نبی اور رسول کی تمنا میں دخل اندازی کی ہے۔'' القی الشیطان فی کلماتہ فی کلامہ۔ نبی یا رسول کے کلام اور بیان احکام میں دخل اندازی کا ذکر نہیں ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے چونکہ قرآن رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا معجزہ ہے اور معجزہ میں شیطان کی دخل اندازی قابل تصور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو کوئی ایسا معجزہ دے جو خود محفوظ رہنے میں عاجز ہو۔ چنانچہ ہم نے عدم تحریف پر اسی بات سے استدلال کیا ہے کہ قرآن معجزہ ہے اور معجزہ میں تحریف ناممکن ہے۔

iv۔ یہ قصہ قرآن کریم کی دیگر آیات سے بھی متصادم ہے۔ سورۃ الحاقۃ آیت ۴۴ میں فرمایا:

وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَیۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِیۡلِ ﴿ۙ﴾ لَاَخَذۡنَا مِنۡہُ بِالۡیَمِیۡنِ ﴿ۙ﴾ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡہُ الۡوَتِیۡنَ ﴿۫﴾

اور اگر اس (نبی) نے کوئی تھوڑی بات بھی گھڑ کر ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے، پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔

سورہ حجر آیت ۴۲ سورہ نحل آیت ۹۹ اور سورہ بنی اسرائیل آیت ۶۵ میں فرمایا کہ شیطان

کو اللہ کے خاص بندوں پر بالا دستی نہیں ہے۔

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ جو میرے بندے ہیں ان پر یقیناً تیری بالا دستی نہ ہو گی

اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ﴿﴾ سوائے ان بہکے ہوئے لوگوں کے جو تیری پیروی کریں۔

و دیگر آیات کی تصریح ہے کہ رسول کریم ﷺ کی بات ہی اور ہے اللہ کے دیگر خاص بندوں پر شیطان کا تسلط نہیں ہوتا ہے۔

وَ لَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡہُ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ السَّاعَۃُ بَغۡتَۃً اَوۡ یَاۡتِیَہُمۡ عَذَابُ یَوۡمٍ عَقِیۡمٍ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اور کافر لوگ تو اس کی طرف سے ہمیشہ اسی شک میں مبتلا رہیں گے یہاں تک کہ ان پر یکایک قیامت آ جائے گی یا نامراد دن کا عذاب ان پر آ جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ قریش کے سرکردہ مشرکین کے بارے میں ہے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ جیسا کہ سورہ بقرہ: ۶ میں فرمایا:

سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ﴿﴾ آپ انہیں متنبہ کریں یا نہ کریں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۲۔ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ السَّاعَۃُ بَغۡتَۃً: قیامت دفعتہً اور اچانک آنے والی ہے۔ اس تک یہ لوگ اپنے کفر پر ڈٹے رہیں گے۔

۳۔ اَوۡ یَاۡتِیَہُمۡ عَذَابُ یَوۡمٍ عَقِیۡمٍ: یا اس قسم کا عذاب آ جائے کہ ان کو عقیم بنا دے اور اس کفر کا سلسلہ ختم کر دے۔ عقیم بانجھ کو کہتے ہیں جس کا سلسلہ اولاد منقطع ہو جائے۔ اس عذاب سے مراد جنگ بدر ہو سکتی ہے جس میں قریش کے بڑے لوگوں کا سلسلہ کفر منقطع ہو گیا۔

اَلۡمُلۡکُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ ؕ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ اس روز بادشاہی صرف اللہ ہی کی ہو گی، وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا، لہٰذا جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک اعمال بجا لائے وہ نعمتوں والی جنتوں میں ہوں گے۔

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا فَاُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اور جو کافر ہوئے اور ہماری آیات کی تکذیب کرتے رہے پس ان کے لیے ذلت آمیز عذاب ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡمُلۡکُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ: قیامت کے دن اللہ کی بادشاہی ہو گی۔ سوال یہ ہو سکتا ہے کہ بادشاہی تو آج بھی ساری کائنات میں اللہ ہی کی ہے۔ جواب یہ ہے کہ ایک بادشاہی ایسی ہے جو بذات خود نہیں، کسی سے ملی ہوئی بادشاہی ہے جو ناپائیدار ہے۔ یہ اس سے سلب ہو سکتی ہے اور مرنے کے بعد تو ہر صورت میں سلب ہو جاتی ہے۔ دنیا میں اس قسم کی جزئی بادشاہی دوسروں کے پاس بھی ہو سکتی ہے۔

وہ بادشاہی جو بذات خود حاصل ہے اور کسی صورت میں اس کی ذات سے جدا نہیں ہو سکتی، وہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی ہے۔ دنیا میں تو دوسروں کو ڈھیل دی جاتی ہے، آخرت میں بادشاہی اس ذات کی ہو گی جس کے پاس بذات خود بادشاہی ہے۔

۲۔ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ: دنیا میں تو دوسروں کے فیصلے بھی چلتے رہے ہیں لیکن قیامت کے دن صرف اللہ ہی کا فیصلہ چلے گا۔

۴۔ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اس فیصلے کا ایک اہم جز یہ ہو گا کہ ایمان اور عمل صالح والوں کو نعمتوں بھری جنت میں داخل کرے گا اور آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کو واصل جہنم کرے گا۔

وَ الَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ثُمَّ قُتِلُوۡۤا اَوۡ مَاتُوۡا لَیَرۡزُقَنَّہُمُ اللّٰہُ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَہُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ اور جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت اختیار کی پھر وہ مارے گئے یا مر گئے انہیں اللہ یقیناً اچھی روزی سے ضرور نوازے گا اور رزق دینے والوں میں یقیناً اللہ ہی بہترین ہے۔

تفسیر آیات

جو لوگ راہ خدا میں وطن چھوڑ کر ہجرت کرتے اور پردیس میں دنیا سے چلے جاتے ہیں، ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ موت واقع ہونے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ پردیس میں راہ خدا میں قتل ہو جاتے ہیں۔ دوسری صورت یہ کہ پردیس میں فوت ہو جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ ان کو مرنے کے بعد رزق حسن عنایت فرمائے گا۔ وہ رزق جسے اللہ حسن کہدے کس قدر حسن ہو گا۔ چنانچہ شہیدوں کے بارے میں فرمایا ہے: اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ﴿﴾[1] یہ ایسا رزق ہو گا جو ان کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھے گا۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۶۹

لَيُدۡخِلَنَّهُمۡ مُّدۡخَلًا يَّرۡضَوۡنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيۡمٌ حَلِيۡمٌ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ وہ ایسی جگہ میں انہیں ضرور داخل فرمائے گا جسے وہ پسند کریں گے اور اللہ یقیناً بڑا دانا، بڑا بردبار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ راہ خدا میں قتل یا راہ خدا میں پردیس میں فوت ہو جانے والوں کو دوسری اہمیت یہ دی جائے گی کہ انہیں جنت میں داخل کرتے ہوئے ان کی پسند اور رضایت کو مدنظر رکھا جائے گا۔ اس نعمت کا ہم اپنی دنیاوی مادی قدروں سے اندازہ نہیں کر سکتے

۲۔ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيۡمٌ حَلِيۡمٌ: کہ اپنے علم کی بنیاد پر ثواب دیتا ہے اور حلم و بردباری کی بنیاد پر معاف فرماتا ہے۔

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنۡ عَاقَبَ بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيۡهِ لَيَنۡصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن اگر کوئی شخص اتنا ہی بدلہ لے جتنا سخت برتاؤ اس کے ساتھ کیا گیا تھا پھر اس پر زیادتی بھی کی جائے تو اللہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا، بتحقیق اللہ بڑا درگزر کرنے والا معاف کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكَ: یہ تو تھی ان لوگوں کی بات جو راہ خدا میں ہجرت کرتے ہیں۔

۲۔ وَ مَنۡ عَاقَبَ بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبَ بِهٖ: اگر کوئی اتنا بدلہ لے جتنا اس کے ساتھ ظلم کیا گیا تھا چونکہ جیسا اس پر ظلم ہوا ہے اسی مقدار کا قصاص لینا جائز ہے:

وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا ...۔[۱] اور برائی کا بدلہ اسی طرح کی برائی سے لینا (جائز) ہے،

دوسری جگہ فرمایا:

فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ...[۲] لہٰذا جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اسی طرح کی زیادتی کرو جس طرح اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔

۳۔ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيۡهِ: یہ قید ہے مَا عُوۡقِبَ بِهٖ کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ بمثل ما عوقب به بعد ما بغی علیه۔ جسے اذیت دی گئی ہے وہ اذیت بلا جواز و باغیانہ ہو تو اتنا ہی بدلہ لے سکتا ہے جتنی

---

[۱] ۴۲ شوری: ۴۰ [۲] ۲ بقرہ: ۱۹۴

اس نے اذیت دی ہے۔ لہٰذا اکثر مفسرین کا یہ موقف درست نہیں ہے کہ ثُمَّ بُغِیَ عَلَیۡہِ سے مراد پھر دوبارہ باغیانہ اذیت دے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دوبارہ بغاوت نہ ہو تو بدلہ لینے کا حق نہیں ہے۔ قرآنی دیگر آیات کی روشنی میں کسی قسم کے دوبارہ کی قید نہیں ہے۔ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ ...[1] اور دیگر متعدد آیات میں ایسی کسی قید کا ذکر نہیں ہے لہٰذا المیزان کا یہ موقف درست ہے کہ ثُمَّ بُغِیَ عَلَیۡہِ قید ہے بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبَ بِہٖ کے لیے۔

۴۔ لَیَنۡصُرَنَّہُ اللّٰہُ: اللہ اس کی مدد کرے گا۔ اس بُغِیَ کو روکنے میں تکوینی مدد کرے گا یا تشریعاً اپنا دفاع کرنے کا حق دے گا جیسا کہ وَ مَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِیِّہٖ سُلۡطٰنًا...[2] کی طرح قانونی تحفظ دیا ہے۔

۵۔ اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ: انتقام خود اپنی جگہ پسندیدہ عمل نہیں ہے تاہم مظلوم واقع ہونے کی وجہ سے اللہ اس سے درگزر فرمائے گا۔

اہم نکات

۱۔ دفاع ایک انسانی حق ہے۔ اس کے استعمال کی وجہ سے انتقام نہیں لینا چاہیے۔

۲۔ مظلوم کو اللہ کی مدد حاصل رہتی ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَ یُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ وَ اَنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ ایسا اس لیے ہے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور یہ کہ اللہ بڑا سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِکَ: مظلوم کی نصرت کرنا، ظالم کا ہاتھ پکڑنا، آخر میں اسے تباہ کر دینا، کافر کو عذاب، مؤمن کو ثواب دینا یہ سب اس لیے ہے:

۲۔ بِاَنَّ اللّٰہَ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ: اللہ رات کو دن میں داخل فرماتا ہے اور....

الف: بِاَنَّ اللّٰہَ: اللہ کل کائنات پر حاکم ہے۔ جو اللہ رات کی تاریکی کو دن کی روشنی میں بدل دیتا اور رات کی تاریکی پر روشنی مسلط کر دیتا ہے۔ وہی اللہ ظالم کی ناک رگڑاتا اور اقتدار کے نشے میں بدمست لوگوں کو زمین بوس کر دیتا ہے۔ ظالم کو ذلیل اور مظلوم کو عزیز بنا دیتا ہے۔

ب: وَ اَنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ: اللہ مظلوم کی آہ کو سنتا ہے اور ظالم کے ظلم کو دیکھتا ہے۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۱۹۴ [2] ۱۷ اسراء: ۳۳

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾	۶۲۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی برحق ہے اور اس کے سوا جنہیں یہ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں اور یہ کہ اللہ بڑا برتر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكَ: کائنات پر اللہ کی بالا دستی اس لیے ہے:

۲۔ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ: حق اور حقیقت اللہ ہے۔ اس لیے کائنات پر اسی کی حاکمیت ہے، اس کے ماننے والے بالا دست ہوں گے اور دوسرے معبود ایک واہمہ کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔ ان کے ماننے والے نامراد ہوں گے۔

۳۔ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ: اسی حق و حقیقت کی بنیاد پر وہی بالادست ہے اور بزرگواری بھی اسی کو حاصل ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کا حاکم اور حق کے مالک کو ماننے والے نامراد اور باطل معبودوں کے ماننے والے کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾	۶۳۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا تو (اس سے) زمین سرسبز ہو جاتی ہے؟ اللہ یقیناً بڑا مہربان، بڑا باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جو ذات بنجر اور خشک زمین کو سرسبز و شاداب بنا سکتی ہے وہ ان مظلوموں کو زمین میں آباد کر سکتی ہے اور انہیں زمین کا وارث بنا سکتی ہے۔

۲۔ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ: وہ لطیف ہے۔ اس کی رحمتیں پوشیدہ طریقے سے بندوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ وہ خبیر ہے کہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔

اہم نکات

۱۔ غیر محسوس طریقے سے اللہ اپنے بندوں پر مہربانی فرماتا ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝٦٤

۶۴۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے اور اللہ ہی بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان سب کا مالک حقیقی اللہ ہے۔ اگر کسی دوسرے کی ملکیت میں کوئی چیز ہے تو وہ اس کا حقیقی مالک نہیں ہے کیونکہ ایک وقت ایسا تھا کہ وہ اس کا مالک نہیں تھا اور ایسا وقت بھی آئے گا وہ اس کا مالک نہیں رہے گا۔

۲۔ الْغَنِيُّ: اللہ اگر کسی چیز کو خلق کرتا ہے یا مالک بن جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ اس چیز کا محتاج ہے۔ مالک ہے لیکن اس مملوک کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کے خلق کرنے اور اس کے مالک رہنے پر اللہ کی حمد و ستائش ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اس کا محتاج بھی نہیں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝٦٥

۶۵۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لیے زمین کی ہر چیز کو مسخر کر دیا ہے اور وہ کشتی بھی جو سمندر میں بحکم خدا چلتی ہے اور اسی نے آسمان کو تھام رکھا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر وہ زمین پر گرنے نہ پائے، یقیناً اللہ لوگوں پر بڑا مہربان، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ: اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو البقرۃ: ۲۹۔

۲۔ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ: سمندروں میں چلنے والی کشتیاں اگرچہ انسانی صنعت و حرفت کا نتیجہ ہیں لیکن پانی کا مزاج جو اپنے سے کم وزن چیزوں کو اپنی پشت پر اٹھا لیتا ہے اور ہوا کی جنبش جو اس کشتی کو اپنے مقصد کی طرف چلا لیتی ہے یہ سب اللہ کے تخلیقی کرشمے ہیں لہٰذا کشتی امر خدا سے چلتی ہے۔

۳۔ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ: السَّمَآءَ سے اجرام ہی مراد ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان اجرام کو ایک ایسے نظام سے منسلک کر دیا ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مدار میں محو گردش ہے۔ ایک

دوسرے کے دائرہ مدار سے دور رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ اس قانون کی وجہ سے ہے جو اس کے خالق نے ان کو منظم رکھنے کے لیے وضع کیا ہے۔ لوگ کائنات پر حاکم اس قانون کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن مقنن کی طرف ان کی توجہ نہیں جاتی کہ کس نے اجرام فلکی کو کشش یا کسی اور طاقت کے ذریعے اس بیکراں فضا میں سرگرداں کیے بغیر ایک معین اور منظم سمت کی طرف چلا رکھا ہے کہ اربوں سال میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں آتا۔

جس خالق نے اجرام کو بغیر ستون کے اٹھا رکھا ہے بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا[1] وہی اس آسمان کو بغیر ستون کے مربوط رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بغیر قابل دید ستون کے اٹھا رکھا ہے۔ اسی غیر مرئی ستون سے تھامے رکھتا ہے۔

۴۔ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ: ایک دن ایسا آئے گا کہ اللہ کی طرف سے ان اجرام کو اذن ہو جائے گا کہ وہ اس نظام کو چھوڑ دیں اور اس نامرئی ستون کو ہٹا دیا جائے گا۔ تو یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ ...[2] نیز اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ ۙ﴿۲﴾[3] کا وقت آجائے گا۔

۵۔ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ: اللہ کی مہربانی ہے کہ دن رات میں گرنے والے لاکھوں آسمانی پتھروں سے اہل ارض کو اپنے حفظ و امان میں رکھا ہے۔

یہ سب تدبیر کائنات سے مربوط ہیں جو صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے کسی غیر اللہ کا اس میں دخل نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ نے خشکی اور سمندر (بر و بحر) کو انسان کے لیے مسخر فرمایا ہے۔

۲۔ آسمانوں کو اللہ نے اپنے دست قدرت سے تھامے رکھا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اَحۡیَاکُمۡ ۫ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَکَفُوۡرٌ ﴿۶۶﴾	۶۶۔ اور اسی نے تمہیں حیات عطا کی پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا، انسان تو یقیناً بڑا ہی ناشکرا ہے۔

تفسیر آیات

خلق، تدبیر، موت و حیات، خواہ دنیوی حیات ہو یا اخروی سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے باوجود یہ ناشکرا انسان اپنے حقیقی مدبر کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جس کے پاس سب کچھ

---

[1] ۱۳ رعد: ۲　[2] ۱۴ ابراھیم: ۴۸　[3] ۸۲ انفطار: ۱۔۲

ہے اسے چھوڑ کر ایسوں کے پاس جاتا ہے جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ مسئلہ حیات کے بارے میں ملاحظہ ہو البقرۃ آیت ۲۸۔

اہم نکات

۱۔ یہ ناشکرا انسان اس ذات سے وابستہ رہنے کے لیے آمادہ نہیں جس کے قبضے میں اس کی جان ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک دستور مقرر کیا ہے جس پر وہ چلتی ہے لہٰذا وہ اس معاملے میں آپ سے جھگڑا نہ کریں اور آپ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیں، آپ یقیناً راہ راست پر ہیں۔

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اور اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑا کریں تو کہد یجیے: جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ اللہ بروز قیامت تمہارے درمیان ان چیزوں کا فیصلہ کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ ہر امت کے لیے عبادت اور قربانی طریقہ مختلف رکھا گیا ہے۔ ہر امت سے مراد ہر صاحب شریعت رسول کی امت ہے۔ جیسا کہ ہر صاحب شریعت رسول کے لیے ایک جدا شریعت دی گئی ہے۔ اسی کا لازمہ ہے کہ طریقہ عبادت بھی ہر امت کا جدا ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام سے شریعت کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس ابتدائی شریعت میں جو طریقہ عبادت دیا گیا تھا وہ آخری شریعت کے طریقہ عبادت سے مختلف ہے۔ اسی طرح دیگر شریعتوں میں بھی ہے۔

۲۔ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ: کافر لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ آپؐ کے طریقہ عبادت میں آپ سے بحث و نزاع کریں کہ آپؐ کی شریعت کا طریقہ عبادت مختلف کیوں ہے؟

روایت میں آیا ہے کہ بدیل بن ورقا کے ساتھ خزاعہ کے چند کافروں نے مسلمانوں سے کہا:

کیا بات ہے کہ جس جانور کو خود تم مارتے ہو (ذبیحہ) اسے کھاتے ہو اور جسے اللہ مارتا ہے (مردار) اسے نہیں کھاتے ہو۔ (جمع الجوامع)

۳۔ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ: آپؐ ان کے نزاع و مخاصمت کی پرواہ کیے بغیر اپنی شریعت اور توحید کی

طرف انہیں دعوت دیں۔

۴۔ اِنَّكَ لَعَلٰی هُدًی مُّسْتَقِيْمٍ: راہ حق پر اور حقیقت کے ساتھ ہونا سب سے بڑی طاقت ہے۔ جس کے پاس حق کی طاقت موجود ہو وہ کسی ناحق سے نہیں گھبراتا۔

۵۔ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ: اگر یہ لوگ اختلاف شریعت اور اختلاف طریق عبادت کے بارے میں آپؐ سے کج بحثی کریں۔

۶۔ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: تو آپؐ ان سے کہدیں تمہارے افعال و اعمال کا علم اللہ کو ہے کہ کس وقت کون سا عمل بجا لانا چاہیے یا یہ کہ جو کج بحثی تم آج میرے ساتھ کر رہے ہو اس کا نتیجہ تمہیں قیامت کے دن نظر آئے گا۔

اہم نکات

۱۔ دعوت الی الحق کے لیے سب سے بڑا سہارا اور طاقت خود حق ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

۷۰۔ کیا آپ کو علم نہیں کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اللہ ان سب کو جانتا ہے؟ یہ سب یقیناً ایک کتاب میں درج ہیں، یہ اللہ کے لیے یقیناً نہایت آسان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جو کچھ یہ مشرکین کرتے ہیں اس کا علم ہونا ایک ضمنی بات ہے۔ اللہ تو پورے آسمان و زمین کی موجودات کا علم رکھتا ہے۔ اللہ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے:

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ...[1] اور زمین اور آسمان کی ذرہ برابر اور اس سے چھوٹی یا بڑی کوئی چیز ایسی نہیں جو آپ کے رب سے پوشیدہ ہو۔

۲۔ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ: کائنات کی تمام اشیاء کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ایک کتاب میں محفوظ ہے جسے کتاب مبین، امام مبین اور لوح محفوظ کہتے ہیں۔

۳۔ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ: ہر چیز کا علم رکھنا اللہ کے لیے آسان ہے۔ واضح رہے کہ آسان اور مشکل کا تصور اس کے لیے ہوتا ہے جو علل و اسباب کے توسط سے کام انجام دیتا ہے۔ اگر علل کم ہیں تو آسان، زیادہ ہیں تو مشکل۔ اللہ تعالیٰ کسی علت کا محتاج نہیں ہے۔ وہ خود علت العلل ہے لہٰذا آسان و مشکل

---

[1] ۱۰ یونس: ۶۱

اللہ کے لیے یکساں ہے۔ صرف انسان کے تصورات کے مطابق آسان کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کی ہر شیٔ کا احاطہ اللہ کی اس کتاب میں کیا ہوا ہے جو صرف اسی کے پاس ہے۔

وَ یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ سُلۡطٰنًا وَّ مَا لَیۡسَ لَہُمۡ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ نَّصِیۡرٍ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ اور یہ لوگ اللہ کے علاوہ ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جن کی نہ اس نے کوئی دلیل نازل کی ہے نہ اس کے بارے میں یہ کوئی علم رکھتے ہیں اور ظالموں کا تو کوئی مددگار نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جن غیر اللہ کو یہ مشرکین پکارتے ہیں وہ اس بنیاد پر پکارتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنا شریک بنایا ہے حالانکہ ان کے پاس کوئی برہان اور دلیل موجود نہیں ہے کہ اللہ نے انہیں اپنا شریک یا سفارشی بنایا ہے۔ جو باتیں دلیل بن سکتی ہیں ان کے یہ لوگ قائل ہی نہیں ہیں۔ وحی کے قائل ہیں نہ رسالت و نبوت کے۔ لہٰذا ان مشرکوں کو نہ صرف یہ کہ علم نہیں ہے بلکہ علم کے ذرائع کے منکر ہیں۔ یہاں سلطان سے مراد دلیل و برہان ہے۔

۲۔ وَّ مَا لَیۡسَ لَہُمۡ بِہٖ عِلۡمٌ: چونکہ یہ لوگ علم کے ذرائع کے منکر ہیں لہٰذا ان کے پاس علم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، صرف اندھی تقلید پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

۳۔ لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ نَّصِیۡرٍ: چونکہ دلیل اور علم بہترین سہارا ہیں، جس کے پاس دلیل و علم نہ ہو اس کے لیے کوئی سہارا نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ دلیل اور علم کا سہارا توحید پرستوں کے پاس ہے۔

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعۡرِفُ فِیۡ وُجُوۡہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡمُنۡکَرَ ؕ یَکَادُوۡنَ یَسۡطُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا ؕ قُلۡ

۷۲۔ اور جب انہیں ہماری صریح آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو آپ کافروں کے چہروں پر انکار کے آثار دیکھتے ہیں اور جو لوگ ہماری آیات پڑھ کر انہیں سناتے ہیں یہ ان پر حملہ کرنے کے قریب

اَفَاُنَبِّئُکُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِکُمۡ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۷۲﴾

ہوتے ہیں، کہد یجیے: کیا میں تمہیں اس سے بھی بری چیز کی خبر دوں؟ وہ آگ ہے جس کا اللہ نے کفار سے وعدہ کر رکھا ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ: جب کافروں کو آیات الٰہی سنائی جاتی ہیں تو ان کے چہرے فق ہو جاتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان آیات کا انکار کر رہے ہیں۔

۲۔ یَکَادُوۡنَ یَسۡطُوۡنَ: قریب ہے کہ وہ ان پر حملہ کر دیں اور بھرے غصے سے ان پر ٹوٹ پڑیں۔

۳۔ قُلۡ اَفَاُنَبِّئُکُمۡ: آپ کہد یجیے اگر تمہیں آیات الٰہی کا سننا اس قدر ناگوار گزر رہا ہے تو میں تمہیں اس سے زیادہ ناگوار چیز کی خبر دوں جو تمہارے انتظار میں ہے۔ وہ ہے آتش جہنم جس میں تمہیں جانا ہے۔ آج آیات الٰہی سن کر تم جس عصبیت کی آگ میں جل رہے ہو جہنم کی آگ اس سے بدتر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اہل باطل جہنم کی آگ سے پہلے عصبیت کی آگ میں جلتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ ؕ وَ اِنۡ یَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَیۡـًٔا لَّا یَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الۡمَطۡلُوۡبُ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اے لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، اسے سنو: اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بنانے پر بھی ہرگز قادر نہیں ہیں خواہ اس کام کے لیے وہ سب جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس سے اسے چھڑا بھی نہیں سکتے، طالب اور مطلوب دونوں ناتواں ہیں۔

شان نزول: روایات میں آیا ہے:

کَانَتۡ قُرَیۡشٌ تَلۡطَخُ الۡاَصۡنَامَ الَّتِی کَانَتۡ حَوۡلَ الۡکَعۡبَةِ بِالۡمِسۡكِ وَ الۡعَنۡبَرِ ... فَبَعَثَ اللّٰهُ ذُبَاباً اَخۡضَرَ لَهٗ اَرۡبَعَةُ اَجۡنِحَة فَلَمۡ یَبۡقَ مِنۡ ذٰلِكَ الۡمِسۡكِ وَ الۡعَنۡبَرِ شَیۡئًا اِلَّا اَکَلَهٗ وَ اَنۡزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی .[1]

قریش اپنے معبود بتوں پر مشک وعنبر ملتے تھے... اللہ نے سبز رنگ کی مکھیاں ان بتوں پر مسلط فرمائیں جن کے چار پر تھے۔ یہ مکھیاں بتوں کے مشک وعنبر کو کھا گئیں جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

[1] الکافی ۴: ۵۴۲

تفسیر آیات

۱۔ جن غیر اللہ کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کی کمزوری اور بے بسی کے لیے ایک مثال پیش کی جا رہی ہے کہ یہ غیر اللہ سب مل کر ایک مکھی خلق کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ ان کو اس کائنات کے خالق کے برابر لاتے ہو۔ واضح رہے مکھی ایک زندہ مخلوق ہے اگرچہ حقیر مخلوق ہے تاہم اس کا خلق کرنا حیات خلق کرنے پر موقوف ہے۔ لہٰذا اصل تخلیق حیات سے متعلق ہے جو ان کے لیے ممکن نہیں ہے تاہم ایک حیات کو ایک حقیر مخلوق مکھی جیسی چیز میں بھی نہیں پیدا کر سکتے تو انہیں خالق ارض و سما سے کیا نسبت۔

۲۔ وَ اِنۡ یَّسۡلُبۡہُمُ الذُّبَابُ: اس سے بدتر صورت یہ ہے کہ ان معبودوں کو مکھی کے مقابلے میں رکھا جائے۔ یہ مکھی سے زیادہ بے بس اور کمزور ہیں کہ مکھی اگر ان بے حس معبودوں سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔

۳۔ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الۡمَطۡلُوۡبُ: مکھی کی خلقت پر جو قادر نہیں ہے وہ بھی ضعیف اور خود مکھی بھی ضعیف!! لیکن بت عملاً زیادہ ضعیف بے جان ہیں، مکھی پھر بھی جاندار ہے، بتوں سے مشک و عنبر چھین سکتی ہے۔ اس طرح مکھی غالب اور بت مغلوب ہیں۔

مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ لوگوں نے اللہ کی ویسی قدر نہیں کی جیسی قدر کرنی چاہیے تھی، اللہ یقیناً بڑا طاقت رکھنے والا، غالب آنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ان لوگوں نے اللہ کی کیا قدر کی جو بے جان جامد چیزوں کو جو ایک مکھی کے مقابلے میں بے بس ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تدبیر کائنات میں شریک بنایا اور ان کی عبادت کی۔

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ: اس اللہ کے ساتھ شریک بنایا جو کائنات میں قوت اور مطلق بالا دستی کا مالک ہے: اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ...[1]

اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿ۚ۷۵﴾

۷۵۔ اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کرتا ہے اللہ یقیناً خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۶۵

يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اسے سب کا علم ہے اور سب معاملات کی برگشت اللہ ہی کی طرف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰهُ يَصۡطَفِيۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ: یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی بالادستی اور تدبیر و تقدیر کا لازمہ ہے جس کے تحت اللہ فرشتوں اور لوگوں میں سے اپنے پیامبر انتخاب فرماتا ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام لوگوں کو اللہ ہی کی عبادت کی طرف بلاتے ہیں۔ انہیں کے ذریعے لوگ اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنے کا حق حاصل نہیں: ءَاُنۡزِلَ عَلَيۡهِ الذِّكۡرُ مِنۡۢ بَيۡنِنَا ...[1]

اللہ تک رسائی کے لیے بتوں کو وسیلہ بنا کر بتوں کی پوجا کرنے کی جگہ رسولوں کو وسیلہ بنا کر ان کی اطاعت کرو اور اللہ کی بندگی کرو۔

۲۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ: اللہ تمہاری آوازیں سنتا اور تمہارے اعمال دیکھتا ہے کہ تم ہمارے رسولوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔

۳۔ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ: ہر طرف سے تم پر اللہ تعالیٰ کو علمی احاطہ حاصل ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کرنے والے ہو سب اللہ کے سامنے ہے۔

۴۔ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ: کائنات کی تدبیر سے متعلق تمام امور اللہ کے ساتھ مربوط ہیں۔ اللہ سے سوال نہ ہوگا وہ مالک حقیقی ہے۔ تم سے سوال ہوگا تم اللہ کے سامنے جوابدہ ہو۔

اہم نکات

۱۔ جامد چیزوں کی بندگی کرنے والوں نے اللہ کی ناقدری کی۔

۲۔ بتوں کی پوجا کی جگہ اللہ کے رسولوں کی اطاعت کرنی چاہیے تھی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ارۡكَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿ۚ۷۷﴾

۷۷۔ اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو نیز نیک عمل انجام دو، امید ہے کہ (اس طرح) تم فلاح پا جاؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا: بتوں کی کھوکھلی حقیقت بتانے کے بعد اہل ایمان کے لیے سعادت و افتخار کی

---

[1] ۳۸ ص: ۸

نوید کے طور پر حکم ارشاد فرماتا ہے: اے اہل ایمان تم رکوع کرو اور سجدہ کرو۔ جہاں سجود و رکوع دونوں کا بہ یک وقت ذکر ہو تو نماز مراد ہے۔ غیر اللہ سے ناطہ توڑنے کے بعد اپنے حقیقی مالک کے دربار میں آؤ تو پہلا قدم اقامہ صلوۃ ہوگا۔

۲۔ وَاعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ: اپنے رب کی عبادت کرو۔ یعنی جو کچھ اللہ کی طرف سے اس کے رسولؐ نے پیش کیا ہے اس کی اطاعت کرو۔ یہی بندگی ہے۔ وَاعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ عبادت رب کی ہوتی ہے۔ جس ذات کو تم نے اپنا رب تسلیم کیا ہے اس کی بندگی کرو۔

۳۔ وَافۡعَلُوا الۡخَیۡرَ: نماز سے عبادت کا مفہوم زیادہ وسیع ہے اور فعل الخیر کا مفہوم عبادت سے بھی وسیع تر ہے۔ جس طرح وَاعۡبُدُوۡا میں نماز بھی شامل ہے اسی طرح فعل الخیر میں عبادت بھی شامل ہے۔ وَافۡعَلُوا الۡخَیۡرَ میں صلہ ارحام، مساکین اور محروم لوگوں کی مدد، ہسپتال قائم کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

۴۔ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ: تاکہ تم کامیاب رہو۔ وہ رضائے رب ہے جس سے جنت اور اس سے بھی بڑی نعمتیں میسر آتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کے بعد نماز، عبادت، نیکی کرنا ذریعہ نجات ہیں۔

وَجَاهِدُوۡا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِی الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَفِیۡ هٰذَا لِيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوۡلٰىكُمۡ ۚ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰى وَنِعۡمَ النَّصِيۡرُ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ اور راہ خدا میں ایسے جہاد کرو جیسے جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور دین کے معاملے میں تمہیں کسی مشکل سے دوچار نہیں کیا، یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔ اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا اس (قرآن) سے پہلے اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ یہ رسول تم پر گواہ رہے اور تم لوگوں پر گواہ رہو، لہٰذا نماز قائم کرو اور زکوۃ دیا کرو اور اللہ کے ساتھ متمسک رہو، وہی تمہارا مولا ہے سو وہ بہترین مولا اور بہترین مددگار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِهَادِهٖ: راہ خدا میں جہاد کا حق ادا کرو۔ ایسا جہاد کرو جس سے بالاتر جہاد کا تصور نہ ہو۔ یہ وہ جہاد ہے جس میں اخلاص ہو اور جہاد کے مقصد میں غیر اللہ کا شائبہ تک نہ ہو۔

جہاد: اسلامی اصطلاح میں دشمن کے مقابلے میں انتہائی سعی اور کوشش کرنے کو کہتے ہیں لیکن یہ لفظ ہر شر کے مقابلے میں مقاومت کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ خواہشات نفسانی کی مخالفت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد اکبر فرمایا۔ آیت میں جہاد سے مراد ہر شر کی مخالفت میں سعی کرنا ہے۔ جیسا کہ آیت:

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ....[1]	اور جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنے راستے کی ہدایت کریں گے....

میں جہاد سے مراد یہی معنی ہے۔

۲۔ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ: اللہ نے تمہیں اس مقصد (جہاد یا اس دین) کے لیے منتخب کیا ہے۔ اگر اللہ کا احسان نہ ہوتا تو تم اس درجہ پر فائز نہ ہوتے۔

۳۔ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ: دین پر عمل کرنے کے بارے میں تمہیں کسی قسم کی مشقت سے دوچار نہیں کیا۔ تمہیں ایک ایسی شریعت عنایت ہوئی ہے جس میں آسائش اور آسانی ہے۔ اس آیت اور قرآن کریم کی دیگر آیات سے ایک قاعدۂ کلیہ کا استخراج و استنباط ہوتا ہے اور وہ ہے "قاعدہ نفی الحرج"۔ اس کے تحت ہر وہ حکم اٹھ جاتا ہے جس کے بجا لانے میں ناقابل تحمل مشقت برداشت کرنا پڑتی ہو۔ مثلاً وضو اور غسل کے لیے پانی مضر ہو تو وضو اور غسل کا حکم اٹھ جاتا ہے۔ عمر رسیدہ کے لیے روزہ رکھنے میں مشقت ہو تو روزہ رکھنے کا حکم اٹھ جاتا ہے۔ اس طرح ادلہ نفی حرج، ادلہ اولیہ پر حاکم ہیں۔ یعنی "رمضان میں روزہ رکھنا واجب ہے" کے حکم پر "مشقت کا روزہ واجب نہیں ہے" مقدم ہے۔ اس قاعدہ کلیہ پر اس آیت کے علاوہ درج ذیل آیات بھی دلالت کرتی ہیں:

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ....[2]	اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔
لَا یُكَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ....[3]	اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔

۴۔ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ: ... ای اتبعوا ملة ابیکم۔ دین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، دین ابراہیم علیہ السلام کا تسلسل

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۶۹		[2] ۲ بقرہ: ۱۸۵		[3] ۲ بقرہ: ۲۸۶

ہے۔ اَبِیۡکُمۡ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امت کے باپ ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباواجداد میں سے ہیں۔ لہٰذا اَبِیۡکُمۡ کے مخاطب اول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور امت بالعرض والتبع مخاطب ہے چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باپ ہیں اور رسول اللہؐ اس امت کے باپ ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

انا و علی ابوا هذه الامة۔[1]　　میں اور علی اس امت کے باپ ہیں۔

۵۔ هُوَ سَمّٰىكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ: جیسا کہ یہ ملت، ابراہیمی ملت ہے۔ دین بھی ابراہیمی ہے۔ اس دین کے قبول کرنے والوں کا نام مسلمین بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھا ہے۔ جیسے اللہ سے ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں اس بات کا ذکر آیا ہے:

وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ ...[2]　　اور ہماری ذریت سے اپنی ایک فرمانبردار امت پیدا کر۔

جملہ مِلَّةَ اَبِیۡکُمۡ شاہد ہے کہ ھو کی ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہے۔

۶۔ مِنۡ قَبۡلُ وَفِیۡ هٰذَا: مِنۡ قَبۡلُ یعنی اس قرآن کے نازل ہونے سے پہلے ابراہیمی ملت میں داخل ہونے والوں کا نام مسلم ہے۔ وَفِیۡ هٰذَا: اس قرآن کے نزول کے بعد بھی یہی نام ہے۔ یعنی عصر ابراہیمی سے لے کر آج تک تمہارا نام اور تمہاری شناخت ایک ہی ہے۔

۷۔ لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ: اس آیت کی تشریح سورہ بقرہ آیت ۱۴۲ میں ہو گئی ہے۔

تفسیر مجمع البیان میں اس جملے کی اس طرح تفسیر کی گئی ہے: تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم پر گواہ ہو جائیں کہ تم نے اطاعت کی ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی کی وجہ سے تم اس قابل ہو جاؤ کہ تم سابقہ امتوں کے بارے میں گواہی دو کہ رسولوں نے اللہ کا پیغام پہنچایا تھا مگر لوگوں نے تسلیم نہیں کیا۔ پھر تمہاری گواہی کی وجہ سے کافر جہنمی اور مؤمن جنتی ہو جائیں۔

۸۔ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: اللہ تعالیٰ کی مذکور رحمتوں کے نتیجے کے طور پر فرمایا: پھر تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو۔ جب تمہیں اس دین یا جہاد کے لیے برگزیدہ کیا ہے، تمہیں ابدی سعادت کے مقابلے میں ایک آسان شریعت عنایت ہوئی ہے، ابراہیم علیہ السلام جیسے پدر کی رہنمائی میں اس دین میں داخل ہو کر مسلم ہونے کا شرف بھی تم نے حاصل کیا ہے، پھر تمہارے اعمال پر رسولؐ اور اس کے خاص بندے گواہ بھی ہوں گے، ان سب باتوں کے بعد تمہیں نماز قائم کرنا چاہیے۔ اقامہ نماز سے ہی یہ تمام مقاصد پورے ہوتے ہیں۔

۹۔ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوۡلٰىكُمۡ: اللہ ہی تمہارا وارث ہے۔ اسی سے متمسک رہو۔ اللہ کے تمام اوامر ونواہی کی پابندی کرو۔ حدود اللہ کی پاسداری کرو۔ اپنے مولا و آقا کی نافرمانی نہ کرو۔ اس کے بندوں کے حقوق کی پاسداری کرو۔ اپنے آقا و مولا سے ناطہ نہ توڑو۔ اسی کی حمایت، نصرت اور اطاعت میں رہو۔

---

[1] کمال الدین ۱:۲۶۱۔ مفردات راغب مادہ اب　[2] بقرہ: ۱۲۸

۱۰۔ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَنِعۡمَ النَّصِیۡرُ: وہ آقا ہے تو اپنے عبد پر ظلم وزیادتی نہیں کرتا بلکہ وہ مہربان ہے۔ بندے کی زیادتی سے درگزر فرماتا ہے۔ وہ بہترین ناصر ہے۔ وہ اس وقت اپنے بندے کی نصرت فرماتا ہے جب دنیا میں کوئی اس کا حامی و ناصر نہیں ہوتا۔

اس آیت مبارکہ میں چند ایک تعبیریں قابل توجہ ہیں:

☆☆هُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا ہے۔

☆☆مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ: تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت۔

☆☆وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ: تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو۔

ان جملوں میں اگرچہ تعبیر عام ہے لیکن مراد عام نہیں ہوسکتا۔ مثلاً سب لوگ، سب لوگوں پر گواہ نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا ان جملوں سے مراد امت کی چند ایک ہستیاں ہیں، اگرچہ خطاب سب سے ہے۔ جیسے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا: وَجَعَلَكُمۡ مُّلُوۡكًا ...[1] سب کو بادشاہ نہیں بنایا۔ چنانچہ شیعہ مصادر میں متعدد روایات موجود ہیں کہ مراد ائمہ اہل بیت علیہم السلام ہیں۔ ملاحظہ ہو الکافی ۱: ۱۹۱۔

اہم نکات

۱۔ امتوں میں یہ امت اللہ کی برگزیدہ امت ہے۔

۲۔ اللہ نے اس شریعت کو آسان بنا دیا۔ مشقت کی صورت میں اس حکم کو اٹھا دیا ہے جو اس امت پر اللہ کی خاص رحمت ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ....

۳۔ مسلمان دین ابراہیم علیہ السلام پر قائم ہے۔ اس امت کی اسم گزاری بھی ابراہیم علیہ السلام نے کی ہے۔ مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ ....

۴۔ جن ہستیوں کو برگزیدہ کیا ہے وہی ہمارے اعمال کی شاہد ہوں گی: هُوَ سَمّٰىكُمُ ....

---

[1] ۵ مائدہ: ۲۰

سُورَۃُ المُؤمِنُون

خالی

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

یہ سورۃ مبارکہ مکہ میں نازل ہوئی بعض کا خیال ہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے چونکہ اس میں زکوٰۃ کا ذکر ہے اور زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا ہے۔ جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ بمعنی انفاق ہے جس کا ذکر دیگر مکی سورتوں میں موجود ہے۔ بعض یہ جواب دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کا حکم مکہ میں نازل ہوا تھا۔ بعض محققین کا اندازہ ہے کہ یہ سورۃ بعثت کے آٹھواں سال میں نازل ہوئی ہے۔ سورۃ میں آیات کی تعداد کوفی قرائت کے مطابق ایک سو اٹھارہ آیات ہیں۔ یہ قرائت معتبر ہے چونکہ اس قرائت کا مصدر حضرت مولائے متقیان علی علیہ السلام ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ کی ابتداء مؤمنین کے اوصاف سے ہوئی ہے اس لیے اس کا نام (سورۃ المؤمنون) ہوگیا اس میں وہ اوصاف بیان ہوئے جن کے حامل مؤمنین ہی فلاح پائیں گے۔ فلاح پانے کے ضامن اوصاف کی ابتداء نماز میں خشوع سے ہوتی ہے اور نماز کی حفاظت پر ختم ہوتے ہیں۔

اس کے بعد انسان کی خلقت کے مراحل کا ذکر ہے۔ پھر تدبیر حیات کے سلسلے میں زمین سے روئیدگی کا ذکر ہے اس سورۃ مبارکہ میں برزخ کا ذکر ہے جو موت سے لے کر قیام قیامت کا وقفہ ہے۔

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ بنام خدائے رحمن رحیم

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ ا۔ وہ ایمان والے یقیناً فلاح پا گئے۔

تفسیر آیات

ا۔ قبولیت اعمال کے لیے سب سے پہلی شرط ایمان ہے۔ اگر دل میں ایمان کا محرک موجود نہ ہو تو انسان کے اعضاء سے عمل کا ثبوت پیش نہیں ہو سکتا، بالکل اسی طرح اگر عمل کی دلیل پیش نہ کی جائے تو ایمان کا ثبوت نہیں ملتا۔

الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ ۲۔ جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں،

تفسیر آیات

وہ مؤمن کامیاب و کامران ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا: وہ مؤمن جو نماز پڑھتے ہیں چونکہ نماز پڑھنا مؤمن کے لیے شرط اول ہے، آگے کامیابی کے لیے خشوع کا ذکر ہے۔

خشوع کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں: قلب کا خشوع اور اعضاء کا خشوع۔ قلب کا خشوع یہ ہے کہ دل اللہ کی عظمت کے سامنے جھک جائے۔

اعضاء کا خشوع یہ ہے کہ نماز کے میں اگر حالت قیام میں ہو تو سجدہ کی جگہ پر نظر رکھے۔ رکوع کی حالت میں دونوں پاؤں کے درمیان نظر رکھے۔ بیٹھا ہوا ہو تو اپنے دامن پر نظر مرکوز رکھے اور سجدے کی حالت میں نگاہ ناک کی طرف رکھے نیز ہر قسم کی ایسی حرکت اور جنبش سے اجتناب کرے جو نماز کے منافی ہو۔

واضح رہے اعضاء کا خشوع، دل کے خشوع سے وجود میں آ سکتا ہے۔ مروی ہے کہ ایک شخص نماز میں اپنی داڑھی چھیڑ رہا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے دیکھ کر فرمایا:

اما لو خشع قلبه لخشعت جوارحه۔[1] اگر اس کے دل نے خشوع کیا ہوتا تو اس کے اعضا بھی خشوع کرتے۔

اگر دل میں نماز نہیں ہے، صرف اعضا کو نماز پڑھنی پڑ رہی ہے تو یہ اعضاء اور دل دونوں پر بڑا بوجھ ہوگا۔ اسی مطلب کو قرآن نے فرمایا:

وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ[2] یہ (نماز) بارگراں ہے، مگر خشوع رکھنے والوں پر نہیں۔

واضح رہے نماز اگر قبول ہو جائے تو ثواب ہے۔ اگر نماز پڑھی جائے، قبول نہ ہوئی تو ثواب نہیں ملے گا مگر نماز نہ پڑھنے کا عذاب بھی نہ ہوگا چونکہ نماز پڑھ لی گئی ہے۔ لہٰذا اس نماز کی بھی اہمیت ہے جو قبول نہیں ہوتی۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ ۳۔ اور جو لغویات سے منہ موڑنے والے ہیں،

تشریح کلمات

اللَّغْوِ: (ل غ و) ما لا يعتد به بغیر سوچ و فکر کے نکلنے والی آواز کو لغو باتیں کہتے ہیں اور جس کا کوئی فائدہ نہ ہو اس عمل کو لغو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مؤمن کی جہان بینی کے تحت اپنی زندگی کے کسی بھی حصے کو لغویات میں گزارنا غیر معقول ہے۔ مؤمن کی جہاں بینی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہنے کے لیے آیا ہے:

انما خلقتم للبقاء لا للفناء[3] تم ہمیشہ رہنے کے لیے خلق کیے گئے ہو، نابود ہونے کے لیے نہیں۔

دنیا کی چند روزہ زندگی ابدی زندگی کے لیے تقدیر ساز ہے۔ جس مختصر اور پرآشوب زندگی سے ابدی زندگی سنورتی ہو وہ مؤمن کے لیے بہت قیمتی ہے۔ جس زندگی کے ہر لمحے سے ابدی زندگی کے اربوں سال کی سعادت کمائی جاسکتی ہے، مؤمن ان لحات کو لغویات میں نہیں گزارتا۔ (پوری توجہ کا طالب ہوں۔)

---

[1] مجمع البیان ذیل آیہ [2] بقرہ۔ ۴۵ [3] حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ملاحظہ ہو امالی الصدوق: ۲۱۶

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوۡنَ ۝ ۴۔ اور جو زکوٰۃ کا عمل انجام دینے والے ہیں،

تفسیر آیات

مالی انفاق کا عمل انجام دیتے ہیں۔ یہاں اس آیت میں زکوٰۃ سے مراد، ادا کیا جانے والا مال نہیں ہے چونکہ وہ متعلق فعل ہے، خود فعل نہیں ہے۔ بعض نے اسے تزکیہ نفس پر حمل کیا ہے چونکہ مالی زکوٰۃ کا حکم تو مدینہ میں نازل ہوا تھا، یہ سورہ مکی ہے۔ زکوٰۃ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: ایک وہ مال جو دیا جاتا ہے اور دوسرا تزکیہ نفس۔ جیسے قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىهَا ....[1]

جواب یہ ہے کہ نصاب والی زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا تھا۔ یہاں وہ زکوٰۃ مراد نہیں ہے بلکہ مطلق انفاق مراد ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۝ ۵۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں،

تفسیر آیات

فلاح و کامیابی کے لیے ایک شرط جنسی خواہشات کا کنٹرول ہے۔ جنسی مسائل میں باعفت اور پاکدامن رہنا، جس سے نسلیں اختلاط سے محفوظ رہتی ہیں، روح کی طہارت، گھر کا ماحول پاکیزہ اور انسان خاندانی مسائل میں الجھاؤ سے دور رہتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں نسلیں محفوظ نہیں رہتیں، گھر کی چار دیواری محفوظ نہیں رہتی اور خاندان کی حرمت غارت ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اب مغربی ممالک میں فارموں میں ولدیت کے خانہ کی ضرورت ختم ہو رہی ہے۔

اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۝ ۶۔ سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت ہوتی ہیں کیونکہ ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔

تفسیر آیات

جنسی خواہشات کو جائز طریقے سے پورا کرنے میں کوئی ملامت نہیں ہے بلکہ عقد نکاح کی تاکید ہے۔

وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ ؕ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا　اور تم میں سے جو لوگ بے نکاح ہوں اور تمہارے غلاموں اور کنیزوں میں سے جو صالح ہوں ان کا نکاح

---

[1] ۹۱ شمس: ۹

فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ [1]
کر دو، اگر وہ نادار ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا علم والا ہے۔

حدیث میں آیا ہے:

مَا بُنِيَ بِنَاءٌ فِي الْإِسْلَامِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى مِنَ التَّزْوِيجِ۔ [2]
اسلام میں ازدواج سے زیادہ اللہ کی پسندیدہ کوئی بنیاد نہیں ڈالی گئی۔

ایک انوکھا استدلال: ستم ظریفی ہے کہ اکثر لوگوں نے اسی آیت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ متعہ کی عورت ازواج میں شامل نہیں ہے لہٰذا اس آیت سے متعہ کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ جبکہ اس آیت سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ متعہ کی عورت ازواج میں شامل ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے:

i۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ سورہ " المؤمنون" مکی ہے۔

ii۔ اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ مکی دور میں متعہ رائج تھا۔

iii۔ یہ بات بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ متعہ کی عورت مملوکہ کنیز نہیں ہے۔

لہٰذا یقینی طور پر متعہ کی عورت اَزْوَاجِهِمْ میں شامل ہے۔

واضح رہے کہ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے متعۃ النسآء کو ممنوع قرار دیا [3] جب کہ صحیح مسلم کی دوسری روایت اس سے متصادم ہے جو جابر بن عبد اللہ انصاری نے روایت کی ہے:

ہم رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر و عمر کے عہد میں متعہ کیا کرتے تھے۔

انہی کی دوسری روایت میں آیا ہے:

حتی نهی عنه عمر۔ حضرت عمر کی طرف سے ممنوع ہونے تک۔ [4]

اس اندھے استدلال کا یہ کہنا ہے کہ اولاً فتح مکہ تک، ورنہ عہد عمر تک رائج متعہ بہت پہلے مکی آیت سے منسوخ ہو چکا تھا۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۔ [5]

نکاح متعہ کے بارے میں تفصیل سورۃ النسآء: ۲۴ میں ملاحظہ فرمائیں۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝
۷۔ لہٰذا جو ان کے علاوہ اوروں کے طالب ہو جائیں تو وہ زیادتی کرنے والے ہوں گے۔

---

[1] ۲۴ نور: ۳۲ [2] الفقیه ۳: ۳۸۳ باب فضل التزویج

[3] و [4] صحیح مسلم کتاب النکاح باب نکاح المتعۃ [5] ۱۸ کهف: ۵

تفسیر آیات

مذکورہ دونوں صورتوں یعنی ازواج اور مملوکہ کے علاوہ ہر قسم کی جنسی آمیزش اور جنسی عمل تجاوز شمار ہو گا۔ اس حد سے تجاوز شمار ہو گا جو فلاح و کامیابی کے لیے متعین کی گئی ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَ عَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ﴿۸﴾	۸۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھنے والے ہیں،

تفسیر آیات

امانات: جمع ہے امانۃ کی۔ اس میں تمام امانتیں شامل ہیں۔ اللہ کی طرف سے سپرد شدہ ہوں یا انسان کی طرف سے۔ اللہ کی طرف سے سپرد شدہ امانتوں میں فطرت کی امانت ہے جس کے تحت انسان کو مکلّف بنایا گیا۔ اس امانت کی سپردگی کے لیے انسان کو عقل سے نوازا:

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَ حَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا ﴿ۙ۷۲﴾ [1]	ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو ان سب نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اسے اٹھا لیا، انسان یقیناً بڑا ظالم اور نادان ہے۔

عقل و شعور والے انسان کے علاوہ باقی چیزیں اس امانت یعنی ارادہ، معرفت، خود مختاری کو تحمل نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے انسان کے علاوہ باقی سب چیزوں کو یک طرفہ بنا دیا۔ اربوں سال سے سورج اسی مقررہ وقت پر طلوع اور غروب کرتا ہے، ذرہ برابر انحراف نہیں کرتا لیکن یہ انسان کس قدر ظالم و جہول ہے کہ انحراف، زیادتی کرتا ہے۔

٣٦٣

انسان اگر کوئی امانت کسی اور انسان کے سپرد یا کوئی انسان کسی اور کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے تو اس امانت کا واپس اور اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے۔ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے، خواہ صاحب امانت مسلمان ہو یا کافر، جس کے ساتھ معاہدہ ہوا ہے وہ مسلمان ہو یا کافر۔ حدیث میں آیا ہے:

ثَلَاثٌ لَمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ لِاَحَدٍ فِیْہِنَّ رُخْصَۃً. اَدَاءُ الْاَمَانَۃِ اِلَی الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ وَالْوَفَاءُ بِالْعَھْدِ لِلْبَرِّ وَالْفَاجِرِ	تین چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے کسی کو چھوٹ نہیں دی ہے۔ امانت کی ادائیگی میں خواہ یہ نیک انسان کی ہو یا فاجر کی۔ معاہدہ کو پورا کرنے میں خواہ نیک انسان

---

[1] ۳۳ احزاب: ۷۲

وَ بِرُّ الْوَالِدَیْنِ بَرَّیْنِ کَانَا اَوْ فَاجِرَیْنِ۔[1] — کے ساتھ ہو یا فاجر کے ساتھ۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنے کے بارے میں خواہ والدین نیک ہوں یا فاجر۔

دوسری حدیث میں ہے:

لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَ لَا دِینَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ الْخَبَرَ۔[2] — جو امانتداری نہیں کرتا اس کا ایمان نہیں۔ جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا اس کا دین نہیں۔

وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۘ﴿۹﴾ — ۹۔ اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

نماز کی محافظت میں درج ذیل امور شامل ہیں:

۱۔ پانچ نمازوں میں سے کوئی نماز ترک نہ ہو۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

مَا بَیْنَ الْکُفْرِ وَ الْاِیْمَانِ اِلَّا تَرْکُ الصَّلٰوۃِ۔[3] — کفر اور ایمان کے درمیان جو فرق ہے وہ ترک نماز ہے۔

لَاحَظَّ فِی الْاِسْلَامِ لِمَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃِ۔[4] — جو نماز کو ترک کرتا ہے اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

۲۔ نماز اول وقت میں ادا کی جائے۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَوَّلُ الْوَقْتِ رِضْوَانُ اللّٰہِ وَ آخِرُہٗ عَفْوُ اللّٰہِ۔ وَ الْعَفْوُ لَا یَکُوْنُ اِلَّا عَنْ ذَنْبٍ۔[5] — اول وقت اللہ کی خوشنودی ہے آخر وقت اللہ کی طرف سے عفو ہے اور عفو گناہ سے ہوتا ہے۔

حدیث نبوی میں آیا ہے:

لَا تَنَالُ شَفَاعَتِی غَداً مِنْ اَخَّرَ الصَّلٰوۃَ الْمَفْرُوضَۃَ بَعْدَ وَقْتِھَا۔[6] — کل (قیامت کے دن) میری شفاعت اس شخص کو نصیب نہ ہو گی جو فرض نماز کی تاخیر اس کے وقت کے بعد تک کرے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ فَضْلَ الْوَقْتِ الْاَوَّلِ عَلَی الْآخِرِ کَفَضْلِ الْآخِرَۃِ عَلَی الدُّنْیَا۔[7] — اول وقت کی نماز کو آخر وقت کی نماز پر وہی فضیلت حاصل ہے جو آخرت کو دنیا پر ہے۔

۱۔ الکافی ۲: ۱۶۲ ۲۔ مستدرک الوسائل ۱۱: ۹۶ ۳۔ الوسائل الشیعۃ ۴: ۴۳ ۴۔ مستدرک الوسائل ۳: ۴۵
۵۔ وسائل الشیعۃ ۴: ۱۲۳ ۶۔ مستدرک الوسائل ۳: ۹۷ ۷۔ الکافی ۳: ۲۷۴

۳۔ نماز کے اذکار و قرائت، رکوع و سجود، ارکان اور واجبات میں سے کسی ایک میں کوئی خلل نہ ہو، خصوصاً طمانینہ یعنی سجدہ اور رکوع میں جانے کے بعد ذکر رکوع، رکوع کی اور ذکر سجدہ سجدے کی حالت میں مکمل کیا جائے۔ مثلاً پیشانی سجدہ گاہ پر رکھنے کے بعد ذکر شروع کیا جائے اور ذکر مکمل طور پر ختم کرنے کے بعد سجدے سے سر اٹھایا جائے۔

حدیث میں آیا ہے:

وَ لَاتَنْقُرْہُ کَنَقْرَۃِ الدِّیکِ۔[1] | مرغی کے چونچ مارنے کی طرح سجدہ نہ کرو۔

حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے:

اَنَّ اَسْرَقَ السُّرَّاقِ مَنْ سَرَقَ صَلَاتَہُ قِیلَ: یَا رَسُولَ اللّٰہِ کَیْفَ یَسْرِقُ صَلَاتَہُ؟ قَالَ: لَایُتِمُّ رُکُوعَھَا وَ سُجُودَھَا۔[2]

چوروں میں سب سے بڑا چور وہ ہے جو اپنی نماز کی چوری کرتا ہے، کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ نماز کی چوری کیسے ہوتی ہے؟ فرمایا: جو نماز کے رکوع اور سجدے کو پورا نہ کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا رکوع کے بغیر اور سجدے کو پرندے کے چونچ مارنے کے طرح نماز پڑھ رہا تھا تو فرمایا:

لَوْ مَاتَ علی ھذا لَمَاتَ عَلَی غَیْرِ مِلَّۃِ مُحَمَّدٍ ص۔[3]

اگر یہ شخص اسی حالت میں مرا تو ملت محمدیہ پر نہیں مرے گا۔

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۱۰﴾ | ۱۰۔ یہی لوگ وارث ہوں گے،

الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾ | ۱۱۔ جو (جنت) فردوس کی میراث پائیں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تشریح کلمات

اَلۡفِرۡدَوۡسَ: جنت کے باغات میں سے ایک باغ کا نام ہے۔

تفسیر آیات

ان اوصاف کے مالک مؤمنین جنت فردوس کے وارث ہوں گے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

وارث اسے کہتے ہیں کہ کسی کا مال بلا زحمت اس کے حصے میں آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے:

---

[1] الوسائل الشیعۃ ۵: ۴۷۲ [2] مستدرک الوسائل ۸: ۱۵۰ [3] مستدرک الوسائل ۳: ۳۹

تم میں سے ہر شخص کے لیے ایک گھر جنت میں ہے ایک جہنم میں۔ کوئی مرجاتا ہے اور جہنم جاتا ہے تو اس کا جنت میں گھر اہل جنت وراثت میں لیں گے۔[1]

اہم نکات

۱۔ اوصاف مؤمن کی ابتدا اور انتہا نماز ہے۔ نماز میں خشوع سے شروع ہوئے اور نمازوں کی محافظت پر ختم ہوئے۔

۲۔ مؤمن (حدیث کے مطابق) رات کے عابد خٰشِعُوْنَ اور دن کے شیر لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ہوتے ہیں۔

۳۔ خواہشات کو دبانا تقدس نہیں، صرف جائز طریقے سے پورا کرنا تقدس ہے: اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ...۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝۱۲

۱۲۔ اور بتحقیق ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے بنایا۔

تشریح کلمات

سُلٰلَةٍ: اصل میں استخراج الشعر من العجین آٹے سے بال نکالنے کو کہتے ہیں۔ (العین) اسی لیے کسی چیز سے اس کا خلاصہ نکالنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

انسان کی تخلیق ارضی عناصر سے ہوئی ہے۔ مٹی پر پانی پڑنے سے نباتات اگتی ہیں۔ انسان ان نباتات کو اپنی غذا بناتے ہیں جن سے انسان کا خون بن جاتا ہے اور خون سے نطفہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح زمین کا خلاصہ نباتات میں اور نباتات کا خلاصہ خون کی شکل میں اور خون کا خلاصہ نطفہ کی شکل میں آتا ہے پھر اس نطفے سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝۱۳

۱۳۔ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ پھر مٹی سے نکالے گئے اس خلاصے کو نطفہ قرار دیا۔ نطفہ امشاج کی تفصیل مقدمہ تفسیر اور سورہ حج آیت ۵ میں بیان ہو چکی ہے۔

---

[1] مجمع البیان ذیل آیہ

۲۔ فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ: قرار یعنی موضع القرار، مستقر ہونے کے معنوں میں ہے۔ مَّکِیۡنٍ ، قَرَارٍ کی صفت ہے۔ ایسا مستقر جو تمکنت یعنی تحفظ دیتا ہے۔ اس سے مراد رحم ہے جہاں اس نطفے کو ہر قسم کی آسائش فراہم ہوتی ہے۔ جب نطفہ رحم کے پرے سے رحم کی طرف سے روانہ ہو جاتا ہے تو رحم، آنے والے مہمان کے لیے قالین بچھاتا ہے۔ جس پر یہ مہمان رونق افروز ہوتا ہے۔ تعجب کا مقام یہ ہے کہ یہی قالین، دسترخوان بھی ہے جس سے مہمان کی ضرورت کی غذا بھی فراہم ہوتی ہے۔ ہمارے لیے قابل تصور نہیں ہے کہ ایک چیز فرش کا کام دے اور ساتھ غذا بھی فراہم کرے۔ ہماری دنیا میں ایسا قرار مکین دیکھنے میں نہیں آیا۔

ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَۃَ مُضۡغَۃً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَۃَ عِظٰمًا فَکَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ٭ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰہُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ پھر ہم نے نطفے کو لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے کو بوٹی کی شکل دی پھر بوٹی سے ہڈیاں بنا دیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا، پس بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین خالق ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَۃَ عَلَقَۃً

۲۔ فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَۃَ مُضۡغَۃً: ان دونوں جملوں کی تشریح سورہ حج آیت ۵ میں گزر چکی ہے۔

۳۔ فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَۃَ عِظٰمًا: اس لوتھڑے سے ہڈیوں کی ساخت کا مرحلہ آتا ہے۔ ہڈیوں کی ساخت کے لیے مواد مضغۃ سے لیا گیا ہے۔ مضغۃ کے خلیے ہڈی کے خلیوں میں بدل جاتے ہیں۔ انسان میں ہڈیوں کے کردار کے بارے میں یہاں ہم کچھ نہیں لکھتے۔ اس موضوع پر بیسیوں کتابیں علم الجنین پر لکھی گئی ہیں۔

۴۔ فَکَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا: تعبیر بدل گئی۔ گزشتہ تعبیروں کی طرح فخلقنا العظام لحماً پھر ہم نے ہڈی سے گوشت بنایا، نہیں فرمایا بلکہ فرمایا: ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، ہڈیوں کو گوشت پہنایا۔ اس جملے سے اشارہ ملتا ہے کہ گوشت کی ساخت کے لیے مواد ہڈیوں سے نہیں لیے جاتے، ہڈی تبدیل ہو کر گوشت نہیں بنتی بلکہ گوشت کی تخلیق کے لیے دیگر ذرائع استعمال ہوتے ہیں۔ عیناً یہی بات ماہرین کے علم میں آ گئی ہے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ انسانی تخلیق نطفہ سے ہڈیوں تک ہے اور تمام راز ہائے

تخلیق ہڈیوں میں پوشیدہ ہیں۔ گوشت، تن کی زیبائش کے لیے ایک لباس ہے۔

۵۔ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰہُ خَلۡقًا اٰخَرَ: اس کے بعد یہ جنین عالم حیات میں قدم رکھتا ہے۔ اس خلق آخر کے ساتھ ایک مختصر کائنات وجود میں آتی ہے۔ اس کائنات کا پراسرار ترین راز، حیات وجود میں آتی ہے۔ حیات، اللہ کا عظیم معجزہ، قدرت کی حیرت انگیز کرشمہ سازی ہے۔ کائنات کے ذرہ ذرہ سے بے ساختہ یہ آواز، یہ نعرہ بلند ہوتا ہے۔ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ۔

۶۔ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ: خلق کے لغوی معنی تقدیر کے ہیں۔ یہاں سے خلق کے دو معنی بنتے ہیں: خلق تقدیری اور خلق ابداعی۔ خلق ابداعی صرف اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے چونکہ ابداع کے معنی عدم سے وجود میں لانے کے ہیں: بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ...[1] جبکہ خلق تقدیری کا اطلاق غیر اللہ پر بھی ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہوا: وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ بِاِذۡنِیۡ ....[2] تاہم اللہ کی تخلیق اور اللہ کے علاوہ دوسروں کی تخلیق میں اساسی فرق ہے۔ اللہ عدم سے وجود میں لاتا ہے اور غیر اللہ، اللہ کی خلق کردہ چیز کو جوڑتا ہے۔ جیسے گِل سے پرندے کی شکل بنانا۔ اللہ تعالیٰ کو یہاں خلق تقدیری کے معنوں میں اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ کہا گیا ہے۔

ثُمَّ اِنَّکُمۡ بَعۡدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوۡنَ ﴿۱۵﴾	۱۵۔ پھر اس کے بعد تم بلاشبہ مر جاتے ہو۔

تفسیر آیات

خاک سے اٹھنے کے بعد دوبارہ اسی خاک میں جانے والے ہو۔ جہاں تمہاری زندگی کا ایک اہم اور تقدیر ساز دور ختم ہو جاتا ہے اور اپنے اچھے برے کیے کا نتیجہ دیکھنے کے لیے پھر خاک کے پردے میں جاتے ہو۔ خاک کے اس پردے میں جانے کے بعد سارے پردے ہٹ جاتے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ تُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۶﴾	۱۶۔ پھر تمہیں قیامت کے دن یقیناً اٹھایا جائے گا۔

تفسیر آیات

پھر اپنی زندگی کا آخری نتیجہ دیکھنے کے لیے قیامت کے دن تمہیں اٹھایا جائے گا۔ یہ تمہارے لیے آخری مرحلہ ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی تخلیق ارضی عناصر سے ہوئی ہے۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۱۷ (ترجمہ) وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔	[2] ۵ مائدہ: ۱۱۰ (ترجمہ) اور جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندے کا پتلا بناتے تھے۔

۲۔ راز تخلیق ہڈیوں میں ودیعت ہے چونکہ تخلیقی ارتقا کی انتہا ہڈی ہے۔

وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا فَوۡقَکُمۡ سَبۡعَ طَرَآئِقَ ٭ۖ وَ مَا کُنَّا عَنِ الۡخَلۡقِ غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور بتحقیق ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے ہیں اور ہم تخلیقی کارناموں سے غافل نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ سَبۡعَ: سے سات آسمان مراد ہو سکتے ہیں۔ اس پر فَوۡقَکُمۡ قرینہ ہے۔ طَرَآئِقَ سے راستہ مراد لینا قرین واقع معلوم ہوتا ہے چونکہ بعد کا جملہ وَ مَا کُنَّا عَنِ الۡخَلۡقِ غٰفِلِیۡنَ سے ربط اسی صورت میں قائم ہوتا ہے۔ بعض نے طَرَآئِقَ سے دوسرے معانی مراد لیے ہیں جو بعد کے جملے سے مربوط نہیں ہوتے۔

سات آسمانوں کو طَرَآئِقَ (راستے) کہنے کی وجہ ممکن ہے یہ ہو: زمین پر آنے والے تدبیری امور آسمانوں سے آتے ہیں:

یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ...[1]　　وہ آسمان سے زمین تک کے امور کی تدبیر کرتا ہے۔

وَ اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَہَا ...[2]　　اور ہر آسمان میں اس کا حکم پہنچا دیا۔

تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ۚ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ ۟ۙ[3]　　فرشتے اور روح اس شب میں اپنے رب کے اذن سے تمام (تعیین شدہ) حکم لے کر نازل ہوتے ہیں۔

اس سے یہ اشارہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین کی تدبیر کا تعلق ساتوں آسمانوں سے ہے۔ یعنی زمین اور تمام آسمان باہم ایک ہی تدبیر کے ساتھ مربوط ہیں۔ کائناتی شعاعیں، ستاروں کی روشنی، اہم تدبیری امور ہیں۔

۲۔ وَ مَا کُنَّا عَنِ الۡخَلۡقِ غٰفِلِیۡنَ: کائنات کو خلق کر کے اللہ نے اسے اپنے حال پر نہیں چھوڑا بلکہ کائنات وجوداً وبقاً، اللہ کی محتاج ہے۔ کل کائنات کی تدبیر سے اللہ غافل نہیں ہو سکتا۔ انسان کے اعمال و کردار، مخلوقات کی حفاظت اور اس کے لیے روزی کی فراہمی پر اس کی نظر ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہم تخلیقی اور تدبیری عمل سے غافل نہیں ہیں: کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ۔[4] نیز آسمانوں کو راستے کہنے یا ہمارے اوپر سات راستے سے کیا مراد ہے؟ اس کا علم آنے والے نسلوں کے لیے ہو سکتا ہے ممکن ہو، آج کا انسان ابھی اس میدان کا طفل مکتب بھی نہیں ہے۔

وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ　　۱۸۔ اور ہم نے آسمان سے ایک خاص مقدار میں

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۵　[2] ۴۱ فصلت: ۱۲　[3] ۹۷ قدر: ۴　[4] ۵۵ رحمٰن: ۲۹

فَاَسۡکَنّٰہُ فِی الۡاَرۡضِ ٭ۖ وَ اِنَّا عَلٰی ذَہَابٍۭ بِہٖ لَقٰدِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾

پانی برسایا پھر اسے زمین میں ہم نے ٹھہرایا اور ہم یقیناً اسے ناپید کرنے پر بھی قادر ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بِقَدَرٍ: اہل ارض کی ضرورت کے مطابق آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے۔ مجموعی ضرورت کے مطابق، اگرچہ بعض اوقات کسی خاص شخص یا علاقے کے لیے بِقَدَرٍ نہیں ہوتا۔

۲۔ فَاَسۡکَنّٰہُ فِی الۡاَرۡضِ: پھر ہم نے اس پانی کو زمین میں ٹھہرا دیا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن نے چودہ سو سال پہلے بتا دیا کہ زیر زمین آبی ذخائر کا تعلق بارشوں سے ہے جب کہ انسان کو اس حقیقت کا علم بہت بعد میں ہوا۔

۳۔ وَ اِنَّا عَلٰی ذَہَابٍۭ بِہٖ لَقٰدِرُوۡنَ: اگر یہ پانی زمین میں ٹھہرایا نہ گیا ہوتا تو زمین خشک ہو جاتی۔ دوسری جگہ فرمایا:

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَصۡبَحَ مَآؤُکُمۡ غَوۡرًا فَمَنۡ یَّاۡتِیۡکُمۡ بِمَآءٍ مَّعِیۡنٍ ۝ [1]

کہدیجیے: بتلاؤ کہ اگر تمہارا یہ پانی زمین میں جذب ہو جائے تو کون ہے جو تمہارے لیے آب رواں لے آئے؟

فَاَنۡشَاۡنَا لَکُمۡ بِہٖ جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ ۘ لَکُمۡ فِیۡہَا فَوَاکِہُ کَثِیۡرَۃٌ وَّ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ پھر ہم نے اس سے تمہارے لیے کھجوروں اور انگور کے باغات پیدا کیے جن میں تمہارے لیے بہت سے پھل ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔

وَ شَجَرَۃً تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَیۡنَآءَ تَنۡۢبُتُ بِالدُّہۡنِ وَ صِبۡغٍ لِّلۡاٰکِلِیۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور اس درخت کو بھی پیدا کیا جو طور سینا سے نکلتا ہے اور کھانے والوں کے لیے تیل اور سالن لے کر اگتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَنۡشَاۡنَا لَکُمۡ بِہٖ: اس پانی سے ہم مردہ زمین سے باغات وجود میں لائے۔ ان باغات کے پھلوں سے تم کھاتے ہو اور اس سے حیات بعد از ممات کا درس نہیں لیتے ہو۔

---

[1] ۶۷ ملک: ۳۰

۲۔ وَشَجَرَةً تَخۡرُجُ: اور طور سینا سے درخت ہم نے نکالا۔ اس سے مراد درخت زیتون ہے۔ اس درخت کا خاص طور پر ذکر اس لیے ہوا ہوگا کہ یہ درخت ہزاروں سال تک پھل دیتا رہتا ہے اور اس کے تیل کا خاص طور پر ذکر اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس تیل میں بہت سی طبی خاصیتیں ہیں۔ وَصِبۡغٍ: اسے سالن بنانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ تیل کسی اور غذا کے ساتھ کھایا جائے تو مفید ہے۔

وَاِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہَا وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ کَثِیۡرَۃٌ وَّ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۲۱﴾

وَ عَلَیۡہَا وَ عَلَی الۡفُلۡکِ تُحۡمَلُوۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۱۔ اور تمہارے لیے جانوروں میں یقیناً ایک درس عبرت ہے، ان کے شکم سے ہم تمہیں (دودھ) پلاتے ہیں اور ان میں تمہارے لیے (دیگر) بہت سے فوائد ہیں اور ان میں سے کچھ کو تم کھاتے بھی ہو۔

۲۲۔ اور ان جانوروں پر اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو۔

تشریح کلمات

لَعِبۡرَۃً: (ع ب ر) ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونے کے معنوں میں ہے۔ اسی سے عبرت ہے جو اس حالت کو کہتے ہیں جس سے ایک محسوس چیز کی معرفت سے غیر محسوس چیز کی معرفت حاصل ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً: ان چوپاؤں کو انسان کے لیے مسخر دیکھ کر تمہیں اس ذات کی معرفت کرنی چاہیے جس نے ان چوپاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔ اسی ذات کو مدبر اور رب تسلیم کرنا چاہیے۔

۲۔ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہَا: ان جانوروں کے شکم سے تمہارے لیے دودھ بناتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ نحل آیت ۶۶۔

۳۔ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ کَثِیۡرَۃٌ: ان جانوروں کے فوائد کس سے پوشیدہ ہیں؟

۴۔ وَعَلَیۡہَا وَعَلَی الۡفُلۡکِ تُحۡمَلُوۡنَ: اس طرح دریا اور خشکی میں تمہارے لیے ذرائع حمل و نقل فراہم کیے۔ ان سب سے یہ درس ملتا ہے کہ انسان کی زندگی کے لیے تمام ضروری چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ لہٰذا اللہ کو چھوڑ کر کسی غیر اللہ (بتوں) کے آستانے پر ماتھا نہیں مارنا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ ہمارے گرد و پیش میں ایسے ہزاروں محسوسات موجود ہیں جن سے ہم بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ

تخلیق کی طرح تدبیر بھی اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَقَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور بتحقیق ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، پس نوح نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے کیا تم بچتے نہیں ہو؟

تفسیر آیات

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں رجوع ہو سورہ ہائے اعراف، یونس، ہود، بنی اسرائیل۔

اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ: کیا تم عذاب سے بچنے کی فکر نہیں کرتے۔

فَقَالَ الۡمَلَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ مَا ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۙ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتَفَضَّلَ عَلَیۡکُمۡ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِکَۃً ۚۖ مَّا سَمِعۡنَا بِہٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ تو ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: یہ تو بس تم جیسا بشر ہے، جو تم پر اپنی بڑائی چاہتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو فرشتے نازل کرتا، ہم نے اپنے پہلے باپ دادا سے یہ بات کبھی نہیں سنی۔

تفسیر آیات

۱۔ فَقَالَ الۡمَلَؤُا: ہمیشہ مراعات یافتہ طبقہ انبیاء علیہم السلام اور دیگر اصلاحی تحریکوں کا مخالف رہا ہے۔

۲۔ مَا ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ: تقریباً سب منکرین رسالت کا یہی موقف رہا ہے کہ بشر، انسان اللہ تعالیٰ کی سفارت کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اللہ کی طرف سے اس مقصد کے لیے کوئی فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو: اعراف: ۶۳، یونس: ۲، ہود: ۲۷ وغیرہ۔

۳۔ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتَفَضَّلَ عَلَیۡکُمۡ: اسی مراعات یافتہ طبقے کو اپنے مفادات کے لیے خطرہ لاحق رہتا ہے کہ یہ شخص اللہ کی طرف سے رسول ہونے کا دعویٰ اس لیے کرتا ہے کہ اسے ہم پر برتری حاصل ہو جائے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے کسی اور شخص یا قبیلے کو ہم پر برتری حاصل رہے۔

۴۔ مَّا سَمِعۡنَا بِہٰذَا: اس توحید کی بات تو صرف تم کر رہے ہو۔ ہمارے باپ دادا تو بہت سے

معبودوں کو مانتے رہے ہیں۔ لہٰذا رسالت کی طرف اشارہ نہیں ہے چونکہ نوح علیہ السلام سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے مگر یہ لوگ انہیں نبی نہیں تسلیم کرتے ہوں گے۔

اِنۡ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوۡا بِهٖ حَتّٰى حِيۡنٍ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ بس یہ ایک ایسا شخص ہے جس پر جنون کا عارضہ ہوا ہے لہٰذا کچھ دیر انتظار کرو۔

تفسیر آیات

وہ ان کو جن زدہ سمجھتے تھے اور انتظار سے مراد یا تو موت کا انتظار کرو ہے یا افاقہ کا انتظار کرو۔

قَالَ رَبِّ انۡصُرۡنِىۡ بِمَا كَذَّبُوۡنِ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ نوح نے کہا: اے میرے پروردگار! انہوں نے جو میری تکذیب کی ہے ان پر تو میری مدد فرما۔

تکذیبی عناصر کی طرف سے مظالم پر صبر کے بعد نصرت مانگی جاتی ہے۔

فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ اَنِ اصۡنَعِ الۡـفُلۡكَ بِاَعۡيُنِنَا وَوَحۡيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ فَاسۡلُكۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ وَاَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ مِنۡهُمۡ‌ ۚ وَلَا تُخَاطِبۡنِىۡ فِى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ پس ہم نے نوح کی طرف وحی کی (اور کہا) ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ، پھر جب ہمارا حکم آ جائے اور تنور ابلنا شروع کر دے تو ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑوں میں سے دو دو سوار کرو اور اپنے گھر والوں کو بھی، ان میں سے سوائے ان لوگوں کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ صادر ہو چکا ہے اور (اے نوح) ان ظالموں کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرنا کہ یہ اب یقیناً غرق ہونے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بِاَعۡيُنِنَا: ہماری نگاہوں کے سامنے یعنی ہماری نگرانی میں کشتی بنائیں۔ اس کی ساخت، اس کا حجم اور اس کی دیگر خصوصیات کا اندازہ کسی ایسے انسان سے نہیں ہو سکتا جسے زندگی میں اس قسم کا کوئی تجربہ نہ ہو۔ نہ اس طوفان کا اندازہ ہے جو آنے والا ہے۔

۲۔ وَوَحۡيِنَا: ہماری تعلیم کے مطابق بنائیں۔ یہ جملہ بِاَعۡيُنِنَا: کے لیے تاکید ہے۔

۳۔ وَفَارَ التَّنُّوۡرُ: تنور کا ابلنا حکم الٰہی کی ایک علامت کے طور پر ہو سکتا ہے کہ جب تنور میں پانی ابلنے لگ جائے تو سمجھ جائیں کہ طوفان آنے والا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تنور کا ابلنا ہی طوفان تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو تنور کے ابلنے کے بعد سب لوگوں اور جانوروں میں سے دو دو جوڑوں کو سوار کرنے کی مہلت کیسے مل جاتی۔ لہٰذا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ کے دیگر معانی کی طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ فَاسۡلُکۡ فِیۡهَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ: سورہ ھود میں اس کی تشریح ہو گئی ہے۔

۵۔ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ: ان لوگوں کو سوار نہ کرو جن کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔

۶۔ وَلَا تُخَاطِبۡنِیۡ: ظالموں کے بارے میں بات تک کرنے سے منع فرمایا چہ جائے کہ ان کی نجات کے لیے دعا کی جائے۔ اس سے اس بات کی تاکید ہو گئی کہ ان کی سفارش کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو لوگ ناقابل اہدایت ہیں انہیں نجات کا ذریعہ فراہم نہیں کیا جاتا: اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ

۲۔ منکرین کے لیے سفارش کی اجازت نہیں ہے: وَلَا تُخَاطِبۡنِیۡ ....

فَاِذَا اسۡتَوَیۡتَ اَنۡتَ وَ مَنۡ مَّعَکَ عَلَی الۡفُلۡکِ فَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ نَجّٰىنَا مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور جب آپ اور آپ کے ساتھی کشتی پر سوار ہو جائیں تو کہیں: ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں ظالموں سے نجات دلا دی۔

تفسیر آیات

۱۔ اَنۡتَ: کشتی پر سوار ہونے والوں میں ایک تو خود حضرت نوح علیہ السلام کی ذات ہے۔

۲۔ وَ مَنۡ مَّعَکَ: اور وہ جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ہیں۔ یہاں معیت سے مراد صرف ساتھ اور ہمراہ ہونا ہے چونکہ ان میں اہل ایمان کے ساتھ جانور بھی شامل ہیں۔

۳۔ فَقُلِ الۡحَمۡدُ: نجات دہندہ کی حمد و ثنا کی تعلیم ہے۔ یہ نجات کا پہلا مرحلہ ہے اور دوسرا مرحلہ اگلی آیت میں مذکور ہے۔

وَ قُلۡ رَّبِّ اَنۡزِلۡنِیۡ مُنۡزَلًا مُّبٰرَکًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اور کہیں: پروردگارا! ہمیں بابرکت جگہ اتارنا اور تو بہترین جگہ دینے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ نجات کا پہلا مرحلہ طے ہونے کے بعد دوسرے مرحلے کے لیے دعا کی تعلیم ہے۔ انسان کو نجات

ملنے کے بعد جو حالات پیش آئیں گے ان کے لیے مستعد رہنا چاہیے۔

۲۔ اَنۡزِلۡنِیۡ مُنۡزَلًا مُّبٰرَکًا: بعض مقامات کی خاک میں تاثیر قابل انکار نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کو اپنی دعا میں شامل کرنے کی تعلیم دی ہے کہ ہم کو ایسی جگہ نازل فرما جہاں برکت ہو۔ تیرے پیغام کے پھلنے پھولنے کے لیے سازگار فضا ہو اور زندگی کے اعتبار سے بھی بابرکت ہو۔

۳۔ وَّاَنۡتَ خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ: تو بہترین مہمان نواز ہے۔ طوفان کے بعد تیری زمین پر اترنا تیری مہمانی میں اترنا ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اس (واقعے) میں یقیناً نشانیاں ہیں اور ہم آزمائش کر گزریں گے۔

تفسیر آیات

نوح علیہ السلام کے قصے میں دو باتیں قابل توجہ قرار دی گئی ہیں:

۱۔ ایک تو یہ ہے کہ اس واقعے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سے معجزوں کا اظہار ہوا۔ طوفان سے پہلے اس کی خبر دینا۔ کشتی بنانے کا حکم دینا۔ طوفان شروع ہونے کی علامتوں کا ذکر کرنا۔ پھر مقررہ وقت پر طوفان آنا۔ اہل ایمان کو کشتی کے ذریعے نجات دلانا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزات ہیں جن سے اللہ کی طرف سے آنے والے رسولوں کا برحق ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری بات آزمائش و امتحان ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو ایک طویل مدت تک ایک سرکش قوم کے ساتھ واسطہ پڑا جو بہت بڑا اور طویل امتحان تھا۔ پھر طوفان کا آنا جہاں معجزہ ہے وہاں منکروں کے لیے عذاب بھی تھا۔

اہم نکات

۱۔ بعض مقامات رسالت الٰہی کے لیے سازگار ہوتے ہیں: مُنۡزَلًا مُّبٰرَکًا....

ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِیۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور قوم کو پیدا کیا۔

تشریح کلمات

قرن: (ق ر ن) قرن سے مراد وہ قومیں ہیں جو ایک زمانے میں آباد تھیں۔

تفسیر آیات

قوم نوح کے بعد اللہ نے دیگر قوموں کو پیدا کیا۔ یہاں ان قوموں سے مراد قوم عاد یا قوم ثمود ہے۔ بظاہر اس قوم سے مراد قوم عاد ہی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ قوم عاد کے بارے میں سورہ اعراف آیت ۶۹ میں فرمایا:

وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ ... یاد کرو جب قوم نوح کے بعد اس نے تمہیں جانشین بنایا۔

یہ صراحت ہے اس بات پر کہ نوح علیہ السلام کے بعد قوم عاد ہے۔ بعض کے نزدیک اس قوم سے مراد قوم ثمود ہے اور اس پر یہ قرینہ قرار دیتے ہیں کہ اس آیت کے آخر میں صیحۃ کے عذاب کا ذکر ہے اور قوم ثمود کو صیحۃ کا عذاب آیا تھا۔

جواب یہ ہے کہ قوم ثمود کے عذاب کے بارے میں جہاں صیحۃ کا ذکر ہے اسی عذاب کو سورۃ الاعراف: ۷۸ میں الرَّجۡفَۃُ کہا ہے اور سورہ حٰم سجدہ: ۱۷ میں صٰعِقَۃُ کہا ہے اور عذاب صیحۃ کا ذکر صرف قوم ثمود کے لیے نہیں دیگر قوموں کے لیے بھی ہے۔ مثلاً قوم شعیب، قوم لوط کے لیے۔ ملاحظہ ہو سورہ حجر:۷۳، سورہ ہود: ۹۴

فَاَرۡسَلۡنَا فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ پھر خود انہی میں سے ایک رسول ان میں مبعوث کیا، (جس کی دعوت یہ تھی کہ لوگو) اللہ کی بندگی کرو تمہارے لیے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے کیا تم بچنا نہیں چاہتے؟

تفسیر آیات

۱۔ فَاَرۡسَلۡنَا فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا: یہ رسول ہمارے نزدیک حضرت ہود علیہ السلام ہیں جیسا کہ ذکر ہو گیا۔

۲۔ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ: اس رسول کی رسالت کا مقصد دعوت توحید اور صرف اللہ کی بندگی کی دعوت تھی اور اس امر واقع کی طرف لوگوں کی راہنمائی تھی کہ واقع اور حقیقت میں تمہارا صرف ایک ہی معبود ہے۔ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ....

وَ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِہِ الَّذِیۡنَ

۳۳۔ اور ان کی قوم کے کافر سرداروں نے جو

كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾	آخرت کی ملاقات کی تکذیب کرتے تھے اور جنہیں ہم نے دنیاوی زندگی میں آسائش فراہم کر رکھی تھی کہا: یہ تو بس تم جیسا بشر ہے، وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ اس قوم کے سرداران نے اس رسول کی تکذیب کی۔ قوم کے ان سرداروں کی دو باتوں کا ذکر ہے:

الف۔ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ: وہ آخرت کے منکر تھے جو ان سرداروں کے مفاد میں نہیں تھی اور حساب و کتاب کا تصور ان کی سرداری کے منافی تھا۔

ب۔ اَتْرَفْنٰهُمْ: وہ مراعات یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عدل و انصاف مراعات یافتہ طبقہ کے حق میں نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ ہر دعوت حق کی مخالفت میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ خوش عیشی، کرسی و اقتدار سے پیمانے بدل جاتے ہیں اور ہر معاشرے میں فساد لانے والا یہی مراعات یافتہ طبقہ ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں اسی طبقہ نے بگاڑ پیدا کیا۔ رسول اسلام ﷺ کے عہد میں یہ مراعات یافتہ طبقہ موجود نہیں تھا۔ بعد میں جیسے اس طبقے نے اپنا وجود پایا، حقوق کی پامالی شروع ہوگئی اور عدل و انصاف ناپید ہو گیا۔

ان سرداروں نے عام لوگوں کو خطاب کر کے کہا: تم ان پر ایمان نہ لاؤ۔

۲۔ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ: انہیں رسول کی بشریت اور انسانیت پر اعتراض تھا اور وہ انسان کو اللہ کی سفارت کے لیے اہل نہیں سمجھتے تھے چونکہ یہ لوگ انسان کے روحانی پہلو سے واقف نہیں تھے۔

۳۔ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ: سرداران قوم کو جب یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ پیغمبری کا دعویٰ کرنے والے کی دعوت کو اگر پذیرائی ملی تو ہماری سرداری خطرے میں پڑ جائے گی، دو باتیں اٹھائیں: ایک یہ کہ پیغمبری کا دعویٰ کرنے والا ہمارے طرح کا انسان ہے۔ اسی گوشت پوست والا آدمی ہے۔ دوسری یہ کہ یہ لوگ وہی چیز کھاتے ہیں جو ہم کھاتے ہیں اور وہی چیز پیتے ہیں جو ہم پیتے ہیں تو ان کو اللہ کی نمائندگی کہاں سے مل گئی؟ اگر یہ لوگ اللہ کے نمائندے ہوتے تو عام انسانوں سے مختلف ہوتے اور ان چیزوں کے محتاج نہ ہوتے جن کے ہم محتاج ہیں۔

اس قسم کے اعتراضات کا جواب سورۃ الانعام آیت ۹ میں دے دیا گیا ہے۔

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور اگر تم نے اپنے جیسے کسی بشر کی اطاعت کی تو بے شک تم خسارے میں رہو گے۔

تفسیر آیات

سرداران قوم کا عامۃ الناس سے خطاب جاری ہے: تم ان رسولوں کے کہنے میں آ جاؤ گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ تمہارے اپنے جیسے بشر سے تمہیں ملنا کیا ہے؟ زندگی صرف یہاں دنیا کی زندگی ہے۔ اس کی خوش عیشی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور تم خاک اور ہڈی ہو جاؤ گے تب تم نکالے جاؤ گے؟

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ جس بات کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے بعید ہی بعید ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ انکار کے لہجے میں یہ مراعات یافتہ لوگ عوام سے کہہ رہے ہیں: یہ وہی لوگ ہیں نا جو تم سے یہ کہہ رہے ہیں کہ خاک ہونے اور صرف ہڈی رہ جانے کے بعد اٹھائے جائیں گے۔ بھلا ایسی نامعقول باتیں کرنے والوں کی بات مانی جاتی ہے؟ باطل پرستوں کا حق کے داعی کے خلاف پروپیگنڈہ ہے۔ اس پروپیگنڈے میں خود عوام کے مسلمات سے استفادہ کیا گیا ہے اور نتیجہ غلط نکالا گیا۔ انبیاء علیہم السلام کا انسان ہونا مسلم ہے اور قیامت کا قائم ہونا بھی مسلم ہے۔ ان دو باتوں سے ان کا جھوٹا ہونا ثابت نہیں ہوتا لیکن سادہ عوام کو قائل کرنے کے لیے وہ ایسی باتیں پھیلاتے ہیں۔

۲۔ هَيْهَاتَ: وہ اپنے پروپیگنڈے میں تکراراً کہتے تھے: بعید ہے اور بعید ہے کہ تم سے جو وعدہ کیا گیا ہے وہ درست ہو۔ قیامت آ جائے۔

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ بس یہی دنیاوی زندگی ہے جس میں ہمیں مرنا اور جینا ہے اور ہم اٹھائے نہیں جائیں گے۔

تفسیر آیات

وہ زندگی کو اسی دنیا کی زندگی میں منحصر سمجھتے تھے۔ آخرت کے تصور کو انبیاء علیہم السلام کی طرف سے استحصالی حربہ کہتے تھے تاکہ لوگ آخرت کی طرف متوجہ ہو کر ان کی سرداری کو بے اعتنائی میں ڈالیں۔

اِنۡ ہُوَ اِلَّا رَجُلُۨ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا وَّ مَا نَحۡنُ لَہٗ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ یہ تو بس ایسا آدمی ہے جو اللہ پر جھوٹی نسبت دیتا ہے اور ہم اس پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

اس سے معلوم ہوتا ہے وہ اللہ کے منکر نہ تھے۔ اللہ کو مانتے تھے اور ساتھ شریکوں کو بھی مانتے تھے۔ صرف رسولوں اور آخرت کو نہیں مانتے تھے۔

قَالَ رَبِّ انۡصُرۡنِیۡ بِمَا کَذَّبُوۡنِ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ عرض کیا: پروردگارا! ان لوگوں کی تکذیب پر میری نصرت فرما۔

قَالَ عَمَّا قَلِیۡلٍ لَّیُصۡبِحُنَّ نٰدِمِیۡنَ ﴿ۚ۴۰﴾

۴۰۔ اللہ نے فرمایا: تھوڑے وقت میں یہ لوگ پشیمان ہو جائیں گے۔

فَاَخَذَتۡہُمُ الصَّیۡحَۃُ بِالۡحَقِّ فَجَعَلۡنٰہُمۡ غُثَآءً ۚ فَبُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ چنانچہ (وعدہ) حق کے مطابق زوردار آواز نے انہیں گرفت میں لے لیا تو ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا کر رکھ دیا، پس (رحمت حق سے) دور ہو یہ ظالم قوم۔

تشریح کلمات

غُثَآءً: (غ ث و) خس و خاشاک کو کہتے ہیں جو سیلاب کے ساتھ بہتا ہو۔

تفسیر آیات

اس تکذیبی قوم کو ایک سخت آواز اور دھماکے نے ہلاک کر دیا۔

ہم نے ان آیات کی ابتدا میں بتا دیا کہ صیحۃ دلیل نہیں بن سکتا کہ اس قوم سے مراد قوم ثمود ہے بلکہ دیگر آیات کی صراحت موجود ہے کہ نوح علیہ السلام کے بعد آباد ہونے والی قوم عاد تھی۔

ثُمَّ اَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ قُرُوۡنًا اٰخَرِيۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ پھر ان کے بعد ہم نے اور قومیں پیدا کیں۔

تفسیر آیات

جیسے قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب۔

مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔کوئی امت اپنے مقررہ وقت سے نہ آگے جا سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح سورہ حجر آیت ۵ کے ذیل میں ہوگئی ہے۔

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوۡلُهَا كَذَّبُوۡهُ فَاَتۡبَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ بَعۡضًا وَّجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ ۚ فَبُعۡدًا لِّقَوۡمٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔پھر ہم نے یکے بعد دیگرے برابر اپنے رسول بھیجے، جب بھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آتا تو وہ اس کی تکذیب کرتی تو ہم بھی ایک کے بعد دوسرے کو ہلاک کرتے رہے اور ہم نے انہیں افسانے بنا دیا، (رحمت حق سے) دور ہوں جو ایمان نہیں لاتے۔

تشریح کلمات

تَتۡرَا: (ت ت ر) پے در پے یکے بعد دیگرے۔ یہ مواترۃ سے مَعۡلٰی کے وزن پر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے قوم عاد کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی امت کو کسی ہادی و رہنما کے بغیر نہیں چھوڑا: اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ۔[1]

۲۔ كُلَّمَا جَآءَ: لیکن ان قوموں نے بھی کسی رسول کو تکذیب کے بغیر نہیں چھوڑا۔

۳۔ فَاَتۡبَعۡنَا: اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو عذاب دیے بغیر نہیں چھوڑا۔

---

[1] ۱۳ رعد: ۷ آپ تو محض تنبیہ کرنے والے ہیں اور ہر قوم کا ایک رہنما ہوا کرتا ہے۔

۴۔ وَّ جَعَلۡنٰہُمۡ اَحَادِیۡثَ: اللہ نے ان کو ایسے نابود کر دیا کہ وہ افسانہ بن کر رہ گئے۔ یعنی ان کا وجود عبرت ناک داستانوں میں ہی رہ گیا۔

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی وَ اَخَاہُ ہٰرُوۡنَ ۬ۙ بِاٰیٰتِنَا وَ سُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو دو قسم کی سندیں دی گئیں: ایک تو معجزات۔ ان معجزات میں نو معجزے سرفہرست ہیں۔ جیسے ید بیضا، عصا، دریا کا شق ہونا وغیرہ۔ دوسری سند وَ سُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ واضح دلیل ہے۔ یہ واضح دلیل عقلی دلیل ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں میں پیش فرمائی۔ چنانچہ فرعون نے پوچھا:

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی ○ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ○[1]

فرعون نے کہا: اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ موسیٰ نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

ان آیات میں ان واضح دلائل کا ذکر ہے جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے پیش فرمایا۔

اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا وَ کَانُوۡا قَوۡمًا عَالِیۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ فرعون اور ان کے درباریوں کی طرف مگر انہوں نے تکبر کیا اور وہ بڑے متکبر لوگ تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں تکبر کیا۔ مصری معاشرے میں قبطی اعلیٰ نسل کے لوگ سمجھے جاتے تھے اور بنی اسرائیل ادنیٰ نسل کے اور مزدور طبقہ سے ان کا تعلق تھا لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو حقارت سے ٹھکرانا فرعونی معاشرے میں واضح سی بات تھی۔

۲۔ وَ کَانُوۡا قَوۡمًا عَالِیۡنَ: فرعون کا تعلق ایک بالادست قوم سے تھا۔ ظلم و جبر کے تحت وہ بالا دست ہی تھے۔ انسانی درجے کے اعتبار سے تو تکبر اور بالادستی طلب کرنے والے پست ترین ہوتے ہیں۔

---

[1] طٰہ: ۴۹۔ ۵۰

فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَ قَوۡمُہُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور کہنے لگے: کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں جب کہ ان کی قوم ہماری تابعدار ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ وہی بشر اور انسان ہونے کے اعتبار سے سفارت الٰہی کے منصب کا اہل نہ ہونے کا قدیم تصور۔

۲۔ وَ قَوۡمُہُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ: عابد۔ عبادت انتہائی تذلل کے اظہار کو کہتے ہیں۔

بنی اسرائیل چونکہ فرعونی معاشرے میں قبطیوں کے نوکر اور مزدور شمار ہوتے تھے اور یہ ان کی ماتحت قوم تھی لہٰذا فرعون نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ماتحت قوم کو اپنا سرتاج بنائیں۔

فَکَذَّبُوۡہُمَا فَکَانُوۡا مِنَ الۡمُہۡلَکِیۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ پھر انہوں نے دونوں کی تکذیب کی، (نتیجے کے طور پر) وہ ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو گئے۔

تفسیر آیات

یہ بتانا مقصود ہے کہ تکذیب کرنے والوں کا انجام ہلاکت ہے۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ لَعَلَّہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور ہم نے موسیٰ کو اس امید پر کتاب دی کہ وہ (لوگ) اس سے رہنمائی حاصل کر لیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ چونکہ توریت فرعون کی ہلاکت کے بعد نازل ہوئی ہے لہٰذا فرعون کی ہلاکت کے ذکر کے بعد نزول توریت کا ذکر آیا ہے۔

۲۔ لَعَلَّہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ: بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے۔

وَ جَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡیَمَ وَ اُمَّہٗۤ اٰیَۃً وَّ اٰوَیۡنٰہُمَاۤ اِلٰی رَبۡوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ

۵۰۔ اور ابن مریم اور ان کی والدہ کو ہم نے ایک نشانی بنایا اور انہیں ہم نے ایک بلند مقام پر جگہ

مَعِیۡنٍ ﴿۵۰﴾ دی جہاں اطمینان تھا اور چشمے پھوٹتے تھے۔

تشریح کلمات

رَبۡوَۃٍ: اونچی اور بلند سطح والی زمین کو کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک جاری چشمے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بغیر باپ کی پیدائش ایک معجزہ ہے۔ اس معجزے کو حضرت مریم (والدہ) اور حضرت عیسیٰ (بیٹا) دونوں مل کر تشکیل دے رہے ہیں۔ اس لیے آیتین (دو معجزے) نہیں فرمایا بلکہ اٰیَۃً ایک معجزہ فرمایا۔

۲۔ یہ سطح مرتفع کون سی جگہ تھی؟ بعض کہتے ہیں یہ جگہ ناصرہ ہے جو شام کا ایک شہر ہے۔ بعض مصر اور دیگر بعض اس سے مراد رملہ لیتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک مقام کے تعین کے لیے شواہد موجود نہیں ہیں۔

۳۔ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیۡنٍ: یہ جگہ ایسی تھی جس میں قرار و اطمینان کا سامان فراہم تھا اور بہتے چشمے بھی موجود تھے۔

یٰۤاَیُّہَا الرُّسُلُ کُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعۡمَلُوۡا صَالِحًا ؕ اِنِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِیۡمٌ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور عمل صالح بجا لاؤ، جو عمل تم کرتے ہو میں اسے خوب جاننے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ کُلُوۡا: خطاب تمام رسولوں سے ہے کہ وہ اپنے طبیعاتی تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے مادی ضروریات سے استفادہ کریں اور جاہلوں کے اعتراضات کی پرواہ نہ کریں جو کہتے ہیں یہ کیسے رسول ہیں جو ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں۔

۲۔ مِنَ الطَّیِّبٰتِ: پاکیزہ چیزیں کھائیں۔ نوعیت اور کسب دونوں اعتبار سے پاکیزہ ہوں۔ پاک اور حلال چیزیں کھائیں۔ ناپاک چیزیں جیسے مردار، خنزیر وغیرہ اور حرام طریقے سے کمائی ہوئی چیزیں نہ ہوں۔

۳۔ وَ اعۡمَلُوۡا صَالِحًا: نیک اعمال بجا لانا اور اللہ کی بندگی کرنا، بدن کی توانائی پر موقوف ہے لہٰذا پہلے اپنی جسمانی طاقت کو بحال رکھو پھر نیک اعمال کے لیے قدم اٹھاؤ۔

اہم نکات

۱۔ پاکیزہ چیزوں کے کھانے اور پاکیزہ عمل میں ربط ہے۔

۲۔ مادی و روحانی دونوں پہلوؤں میں توازن ہونا چاہیے۔ یعنی کُلُوۡا اور وَاعۡمَلُوۡا میں۔

وَ اِنَّ ہٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ اَنَا رَبُّکُمۡ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اور تمہاری یہ امت یقیناً امت واحدہ ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں لہٰذا مجھ ہی سے ڈرو۔

تفسیر آیات

سورۃ الانبیاء آیت ۹۲ میں اس آیت کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ سورۃ الانبیاء میں فَاعۡبُدُوۡنِ ہے اور یہاں فَاتَّقُوۡنِ۔ اس سے معلوم ہوا عبودیت کا تقاضا تقویٰ ہے اور تقویٰ کا تقاضا عبودیت ہے۔

فَتَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَہُمۡ بَیۡنَہُمۡ زُبُرًا ؕ کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ مگر لوگوں نے اپنے (دینی) معاملات میں تفرقہ ڈال کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اب ہر فرقہ اپنے پاس موجود (نظریات) پر خوش ہے۔

تشریح کلمات

زُبُرًا: (ز ب ر) یہ لفظ اگر زُبُر بروزن عُنُق ہے تو یہ زبور کی جمع ہے جو کتب کے معنوں میں ہے اور اگر زُبَر (بضم زا و فتح باء) ہو تو یہ زبرۃ کی جمع ہے جو ٹکڑے کے معنی میں ہے۔ آیت میں یہی معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ایک قرائت میں بضم با ہے تاہم ایک قرائت بفتح با ہے۔ تقطعوا واضح قرینہ ہے کہ زبر سے مراد ٹکڑے ہیں چونکہ تقطع فعل لازم نہیں بلکہ متعدی ہے چونکہ اَمۡرَہُمۡ مفعول ہے۔ یعنی انہوں نے قَطۡعَہ کر دیا اپنے (دینی) امر کو۔

تفسیر آیات

۱۔ فَتَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَہُمۡ: ان لوگوں نے اپنے اپنے رسول کے بعد اپنی امت کی وحدت کو کاٹ دیا اور اس کے بعد یہ امت زُبُرًا ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

۲۔ کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ: امت کے جسم کو پارہ پارہ کرنے کے بعد جو ٹکڑا جس کے ہاتھ میں آیا اس پر وہ خوش ہے۔ کل امت کے جسم کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں۔

کچھ ہمارے معاصر لوگ اپنے نظریے سے تھوڑا اختلاف کرنے والوں کو اسی لیے تہ تیغ کر دیتے ہیں کہ ان کو امت نہیں، اپنی حزب عزیز ہے۔

اہم نکات

۱۔ فرقہ پرستی امت کی نفی ہے۔

فَذَرۡهُمۡ فِیۡ غَمۡرَتِهِمۡ حَتّٰی حِیۡنٍ ﴿۵۴﴾ ۵۴۔ انہیں ایک مدت تک اپنی غفلت میں پڑا رہنے دیجیے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ لوگ اگر آپ کو اذیت پہنچانے اور آپ کی تکذیب سے باز نہیں آتے اور قابل ہدایت نہیں ہیں تو انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیں۔

۲۔ حَتّٰی حِیۡنٍ: ایک مدت تک انہیں اپنی غفلت میں رہنے دیں۔ ایک وقت تک انہیں مہلت دیں۔ وہ دن آئے گا کہ ان کی مہلت ختم ہو جائے گی تو وہ خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں گے لیکن یہ بیداری ہلاکت کی بیداری ہو گی۔

اَیَحۡسَبُوۡنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمۡ بِهٖ مِنۡ مَّالٍ وَّ بَنِیۡنَ ﴿ۙ۵۵﴾ ۵۵۔ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مال اور اولاد سے جو انہیں مالا مال کرتے ہیں،

نُسَارِعُ لَهُمۡ فِی الۡخَیۡرٰتِ ؕ بَلۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾ ۵۶۔ تو ہم انہیں تیزی سے بھلائی پہنچا رہے ہیں؟ نہیں، بلکہ یہ لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

ان دنیا دار کافروں کا یہ خیال کہ اللہ کا ہم پر خاص کرم ہے کہ ہمیں مال و اولاد سے نوازا ہے، ایک غلط فہمی ہے کیونکہ مال و دولت سے انسانوں میں حیوانی خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں، پھر وہ خواہشات سے نہ سیر ہو سکتے ہیں نہ یہ ان پر قابو پا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ دنیا میں ہی اپنے وجود کے اندر ایک دوزخ میں جل رہے ہوتے ہیں۔ سکون عنقا اور نیند حرام ہو جاتی ہے۔

سورہ زخرف آیت ۳۳ تا ۳۵ میں فرمایا:

وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلۡنَا لِمَنۡ یَّکۡفُرُ بِالرَّحۡمٰنِ لِبُیُوۡتِهِمۡ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ (کافر) لوگ سب ایک ہی جماعت (میں مجتمع) ہو جائیں گے تو ہم خدائے

سُقُفًا مِّنۡ فِضَّۃٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَیۡہَا یَظۡہَرُوۡنَ ۙ وَ لِبُیُوۡتِہِمۡ اَبۡوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَیۡہَا یَتَّکِـُٔوۡنَ ۙ وَ زُخۡرُفًا ....

رحمٰن کے منکروں کے گھروں کی چھتوں اور سیڑھیوں کو جن پر وہ چڑھتے ہیں چاندی سے، اور ان کے گھروں کے دروازوں اور ان تختوں کو جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں، (چاندی) اور سونے سے بنا دیتے....

یعنی ہم ان کافروں کو مزید اس جہنم میں دھکیل دیتے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کچھ لوگوں کو دنیا دے کر عذاب دارین میں مبتلا فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مِّنۡ خَشۡیَۃِ رَبِّہِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ ﴿۵۷﴾

وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۸﴾

وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِرَبِّہِمۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۵۹﴾

وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡتُوۡنَ مَاۤ اٰتَوۡا وَّ قُلُوۡبُہُمۡ وَجِلَۃٌ اَنَّہُمۡ اِلٰی رَبِّہِمۡ رٰجِعُوۡنَ ﴿۶۰﴾

اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ وَ ہُمۡ لَہَا سٰبِقُوۡنَ ﴿۶۱﴾

۵۷۔ (حقیقت یہ ہے کہ) جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ہراساں ہیں،

۵۸۔ اور جو اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں،

۵۹۔ اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتے،

۶۰۔ اور جو کچھ وہ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل اس بات سے لرز رہے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

۶۱۔ یہی لوگ ہیں جو نیکی کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں اور یہی لوگ نیکی میں سبقت لے جانے والے ہیں۔

تشریح کلمات

خَشۡیَۃِ : (خ ش ی) خوف یشوبہ التعظیم (راغب) اس خوف کو کہتے ہیں جس میں تعظیم کا شائبہ ہو۔

مُّشۡفِقُوۡنَ : (ش ف ق) العنایۃ المختلطۃ بخوف (راغب) وہ مہربانی جس میں خوف کا عنصر شامل ہو۔ اسی سے ناصح کو شفیق کہتے ہیں کہ وہ منصوح کے بارے میں خائف رہتا ہے۔

وجل: (و ج ل) خوف کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

کفر و سرکشی میں سبقت لے جانے والوں کے ذکر کے بعد نیکیوں کی طرف دوڑ کر سبقت لے جانے والوں کا ذکر ہے۔ ان سبقت لے جانے والوں کی پہلی صفت یہ ہے:

۱۔ وہ خوف خدا کی وجہ سے ڈر رہے ہوتے ہیں۔ ان کا یہ ڈر اس لیے نہیں کہ انہوں نے بڑے جرائم کا ارتکاب کیا ہے بلکہ انہیں اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ ان کا عمل قبول ہوا ہے یا نہیں۔ بندگی کا حق ادا نہیں ہوا۔ اللہ کی عظمت کے مقابلے میں اپنے عمل کو ہیچ سمجھ کر ان پر خوف طاری ہوتا ہے۔

اس خوف کے ایک طرف اللہ کی عظمت ہے دوسری طرف اپنے انجام کا ڈر ہے۔ اس لیے خشیة اور مشفق دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ خوف کے سامنے اللہ کی عظمت ہونے کی وجہ سے خشیة کہا ہے۔ اپنے انجام کے بارے میں بھی خوف کا شکار ہیں لیکن یہ خوف اپنے نفس پر رحم آنے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اس خوف کو مشفق کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشفق ہونے کو خشیة کا نتیجہ قرار دے دیا ہے۔ یہ مؤمنین، اللہ کی عظمت کے سامنے اپنے عمل کو ناچیز سمجھ کر عاقبت کی فکر میں خائف رہتے ہیں۔

۲۔ وہ اپنے رب کی ہر نشانی سے گزرتے ہیں تو اسے معمولی نہیں سمجھتے بلکہ آیات انفس و آفاق میں غور کرتے ہیں۔ اپنے ایمان میں اضافہ کرتے ہیں۔

۳۔ آیات الٰہی میں غور و ایمان کا لازمہ یہ ہے کہ ایسے لوگ شرک میں مبتلا نہیں ہوتے۔ ان نشانیوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کائنات پر حاکم نظام کی وحدت، نظام دہندہ کی وحدت کی دلیل ہے۔

۴۔ وہ جو عمل بھی انجام دیتے ہیں تو اس عمل پر اترانے کی جگہ اس بات پر خائف رہتے ہیں کہ یہ عمل اللہ کی بارگاہ میں قبول ہے؟ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے۔

وَ هُمۡ فِی ذٰلِكَ خَائِفُونَ اَنۡ لَا یَقۡبَلَ مِنۡهُمۡ..[1] وہ اس بات سے خائف ہیں کہ کہیں قبول نہ ہو۔

اہل سنت کے مصادر میں بھی اس مضمون کی روایت موجود ہے۔

۵۔ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡتُوۡنَ مَاۤ اٰتَوۡا: یُؤۡتُوۡنَ مَاۤ اٰتَوۡا کی تفسیر میں چند اقوال ہیں: اس سے مراد یعطون ما اعطوا یعنی زکوۃ واجبہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد تمام نیکیاں ہیں۔ ایک قول ہے یفعلون ما فعلوا مراد ہے۔ یعنی جو کام بھی کرتے ہیں ثواب یا گناہ کا، دل میں خوف رکھتے ہیں۔

ان میں وہ قول مستند ہے جو احادیث پر مبنی ہے۔ یعنی تمام نیکیاں۔

۶۔ اَنَّهُمۡ اِلٰی رَبِّهِمۡ رٰجِعُوۡنَ: اس خوف کا اصل سرچشمہ، عاقبت کا خوف ہے۔ اللہ کے حضور جوابدہی کا خوف ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کو حساب دینا ہے۔

---

[1] الکافی: ۸:۱۲۸

۷۔ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِ: مذکورہ اوصاف کے مالک نیکیوں کی طرف سرعت سے جاتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

من فضیلۃ النفس المسارعۃ الی الطاعۃ۔[1]	نفس کی فضیلت میں سے ہے طاعت کی بجا آوری میں تاخیر نہ کرنا۔

یعنی انتہائی رغبت کے ساتھ نیکی کی انجام دہی کے لیے لپک کر جانا اور کاہلی نہ کرنا افضل ترین بندگی ہے۔

۸۔ وَهُمۡ لَهَا سٰبِقُوۡنَ: وہ دوسروں پر سبقت لے جانے والے اور سب سے پہلے کار خیر کی انجام دہی کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مسارعت فی الخیرات کرنے والے سابقین میں ہوتے ہیں۔

۲۔ بندگی یہ ہے کہ عمل صالح کے بعد دل میں خوف رہے: وَّقُلُوۡبُهُمۡ وَجِلَةٌ ....

۳۔ انسان کو اللہ کی عظمت اور اپنے انجام کے بارے میں خائف رہنا چاہیے۔ مِّنۡ خَشۡيَةِ رَبِّهِمۡ ...۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا وَلَدَيۡنَا كِتٰبٌ يَّنۡطِقُ بِالۡحَـقِّ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۲﴾	۶۲۔ اور ہم کسی شخص پر اس کی قوت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتے اور ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو حقیقت بیان کرتی ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا نُكَلِّفُ: خیرات کی طرف سبقت لے جانے کے لیے جن اعمال کا ذکر ہوا ہے ان کی بجا آوری کے لیے ہم ان بندوں کی طاقت سے زیادہ تکلیف عائد نہیں کرتے۔ اگر اٹھ کر نماز نہیں پڑھ سکتا ہے تو بیٹھ کر پڑھے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے تو آنکھوں کے اشارے سے پڑھے۔

مسلمانوں کا ایک کلامی مذہب یہ ہے کہ ناممکن چیز کی ذمے داری دینا درست ہے۔ کہتے ہیں: ایسا واقع ہوا بھی ہے کہ ابو لہب کو ایمان لانے کا حکم ہے جب کہ علم خدا میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ لہٰذا اس کا ایمان لانا غیر ممکن ہے۔ اس کے باوجود اسے ایمان لانے کا حکم ہے۔

جب کہ علم خدا سے جبر لازم نہیں آتا۔ اللہ کو علم ہے کہ ابو لہب اپنے اختیار سے ایمان نہیں لائے گا۔ ظرف علم یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار سے ایمان نہیں لائے گا۔ اگر ان لوگوں کا مذکورہ استدلال مان لیا جائے

---

[1] غرر الحکم: ۱۸۲

تو تمام شرعی احکام ناممکن ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ کو علم ہے کہ فلاں شخص ایک مؤمن کو قتل کرے گا لہٰذا قتل نہ کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ عمر خیام کی طرف منسوب ہے۔

می خوردن من حق ازل میدانست
گر مئی نخورم علم خدا جهل بود

میرا شراب پینا اللہ تعالیٰ ازل سے جانتا ہے۔ اگر میں شراب نہ پیوں تو علم خدا جہل ہو جائے گا۔

جب کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ شخص اپنے اختیار سے شراب پیئے گا۔ یہ بھی اللہ کے علم میں ہے کہ شراب نہ پینا، قتل نہ کرنا اس کے لیے ممکن تھا۔

یہ بات اس قدر واضح البطلان ہے کہ آج کل کی روشن دنیا میں وہ اس بات کا پرچار نہیں کرتے۔ اس میں وہ اپنی خفت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے مقدمہ میں اس لطیفے کا ذکر کیا ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ حج آیت ۷۸۔

یہ مقولہ بھی مشہور ہے:

العدل والتوحید علویان و الجبر و التشبیه امویان۔　　عدل اور توحید، علوی مکتب ہے۔ جبر اور تشبیہ اموی مکتب ہے۔

۲۔ وَلَدَيۡنَا كِتٰبٌ يَّنۡطِقُ بِالۡحَقِّ: اس کتاب سے مراد نامہ اعمال ہے جس میں ہر عمل ثبت ہوتا ہے اور قیامت کے دن یہ نامہ اعمال ہر اس حقیقت کو بیان کرے گا جو مکلّف سے صادر ہوئی ہے۔

لَدَيۡنَا ''ہمارے پاس'' کی تعبیر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے۔ اس میں کسی قسم کی زیادتی اور نقص کا امکان نہیں ہے۔ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ''ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا'' اس پر تاکید ہے کہ ہر شخص کو اپنے عمل کے مطابق جزا دی جائے گی۔

بَلۡ قُلُوۡبُهُمۡ فِيۡ غَمۡرَةٍ مِّنۡ هٰذَا وَ لَهُمۡ اَعۡمَالٌ مِّنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ هُمۡ لَهَا عٰمِلُوۡنَ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ مگر ان (کافروں) کے دل اس بات سے غافل ہیں اور اس کے علاوہ ان کے دیگر اعمال بھی ہیں جن کے یہ لوگ مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بَلۡ قُلُوۡبُهُمۡ فِيۡ غَمۡرَةٍ مِّنۡ هٰذَا: هٰذَا کا اشارہ اس کتاب کی طرف ہو سکتا ہے کہ کافر لوگ اپنے نامہ اعمال کے بارے میں غافل ہیں۔ وہ کچھ جاننا بھی نہیں چاہتے۔

۲۔ وَ لَهُمۡ اَعۡمَالٌ مِّنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ: یہ صرف غافل نہیں ہیں۔ ان کے اس کے علاوہ دیگر اعمال بد بھی ہیں جن کا یہ ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ دُوۡنِ ذٰلِكَ سے مراد دون الغفلۃ ہے۔غفلت کے علاوہ جرم کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذۡنَا مُتۡرَفِیۡهِمۡ بِالۡعَذَابِ اِذَا هُمۡ یَجۡـَٔرُوۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ حتیٰ کہ جب ہم ان کے عیش پرستوں کو عذاب کے ذریعے گرفت میں لیں گے تو وہ اس وقت چلا اٹھیں گے۔

لَا تَجۡـَٔرُوا الۡیَوۡمَ ۟ اِنَّکُمۡ مِّنَّا لَا تُنۡصَرُوۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ آج مت چلاؤ! تمہیں ہم سے یقیناً کوئی مدد نہیں ملے گی۔

قَدۡ کَانَتۡ اٰیٰتِیۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فَکُنۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ تَنۡکِصُوۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ میری آیات تم پر تلاوت کی جاتی تھیں تو اس وقت تم الٹے پاؤں پھر جاتے تھے۔

مُسۡتَکۡبِرِیۡنَ ٭ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهۡجُرُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ تکبر کرتے ہوئے، افسانہ گوئی کرتے ہوئے، بیہودہ گوئی کرتے تھے۔

تشریح کلمات

سٰمِرًا: (س م ر) السمر۔ رات کی تاریکی کو کہتے ہیں۔ پھر رات کو باتیں کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

یَجۡـَٔرُوۡنَ: (ج ء ر) الجؤار کے معنی زور آواز نکالنے اور چیخنے کے ہیں۔

تَهۡجُرُوۡنَ: (ھ ج ر) الهُجرُ کے معنی ہذیان کے ہیں جس کے برا ہونے کی وجہ سے اسے ترک کر دینا چاہیے۔ حدیث میں ہے: وَ لَا تَقُولُوا هُجراً....[1] "فحش کلامی نہ کرو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری وقت میں قلم اور دوات طلب کیا تو فقالوا ھجر رسول اللّٰہ ص ملاحظہ: صحیح بخاری کتاب الجھاد و السیر۔

تفسیر آیات

۱۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذۡنَا: ان کافروں میں خاص کر عیش پرستوں کا ذکر اس لیے ہو رہا ہے کہ یہ لوگ

[1] مستدرک الوسائل ۲: ۳۶۴

زیادہ غفلت میں ہوتے ہیں، یہی لوگ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور یہی لوگ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ ان عیش و نوش میں زندگی بسر کرنے والوں پر جب عذاب ہو تو وہ چلّاتے بھی دوسروں سے زیادہ ہیں۔

۲۔ لَا تَجۡـَٔرُوا: ان سے تحقیر اور شماتت کے طور پر کہا جائے گا۔ مت چلاؤ! آج صرف اللہ کی طرف سے نصرت آ سکتی ہے لیکن تمہیں اللہ کی طرف سے کوئی نصرت نہیں آئے گی۔

۳۔ قَدۡ كَانَتۡ: دنیوی زندگی میں ہماری آیات سننے کے لیے تم حاضر نہیں تھے۔ آج تمہاری فریاد سننے کے لیے کوئی حاضر نہ ہو گا۔

۴۔ مُسۡتَكۡبِرِيۡنَ ۖۗ بِهٖ: ضمیر قرآن کی طرف ہے چونکہ تلاوت آیات کا پہلے ذکر ہوا ہے۔ تم دنیا میں قرآن کے مقابلے میں تکبر کرتے تھے اور آیات الٰہی سننا تمہارے لیے باعث عار تھا۔

۵۔ سٰمِرًا: سمر رات کو گپیں ہانکنے کو کہتے ہیں۔ جو عموماً دیہی زندگی میں رات کو داستانیں سنایا کرتے تھے۔

۶۔ تَهۡجُرُوۡنَ: آیت میں فرمایا: تم اپنی راتوں کو جب ادھر ادھر کی بیہودہ باتوں میں لگے رہتے تھے اس میں تم ہماری آیات کو موضوع سخن بنایا کرتے تھے اور ان آیات کے بارے میں بیہودہ گوئیاں کرتے تھے آج کس منہ سے ہمیں پکارتے ہو۔

اہم نکات

۱۔ قرآنی تعلیم کے مقابلے میں آج کے عیش پرست بھی تکبر کرتے ہیں۔

۲۔ دنیا کے عیش پرستوں کے لیے عذاب زیادہ سنگین ہو گا۔

اَفَلَمۡ يَدَّبَّرُوا الۡقَوۡلَ اَمۡ جَآءَهُمۡ مَّا لَمۡ يَاۡتِ اٰبَآءَهُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۫﴿۶۸﴾

۶۸۔ کیا انہوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا ان لوگوں کے پاس کوئی ایسی بات آئی ہے جو ان کے پہلے باپ دادا کے پاس نہیں آئی تھی؟

اَمۡ لَمۡ يَعۡرِفُوۡا رَسُوۡلَهُمۡ فَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ ۫﴿۶۹﴾

۶۹۔ یا انہوں نے اپنے رسول کو پہچانا ہی نہیں جس کی وجہ سے وہ اس کے منکر ہو گئے ہیں؟

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلۡ جَآءَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَاَكۡثَرُهُمۡ لِلۡحَقِّ

۷۰۔ یا وہ یہ کہتے ہیں: وہ مجنون ہے؟ نہیں بلکہ وہ ان لوگوں کے پاس حق لے کر آئے ہیں لیکن

كٰرِهُوْنَ ۝ ان میں سے اکثر لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

کفار کی طرف سے اس قرآن کو مسترد کرنے کی چند ایک وجوہ قابل تصور ہیں:

۱۔ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ: مسترد کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآن کو سننے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ ان پر حق آشکار ہو جاتا۔

۲۔ اَمْ جَآءَهُمْ: دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ یہ قرآن اور یہ رسول اس دنیا میں پہلی بار آیا ہے۔ اگر اس سے پہلے کوئی رسول نہ آیا ہوتا تو ان کو یہ کہہ کر مسترد کرنے کا حق پہنچتا تھا کہ اللہ لوگوں کی ہدایت کے لیے رسول بھیجتا تو سب لوگوں کی طرف بھیجتا صرف ہماری طرف کیوں بھیجا ہے۔

۳۔ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ: کیا ان کے پاس جو رسول آیا ہے وہ انجان ہے جس سے یہ پہلے کبھی واقف نہ تھے دفعتاً ان کے درمیان نمودار ہوا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے بلکہ یہ رسول ان کی اپنی برادری کے ہیں:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝[1] اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

وہ ان کو امین کہہ کر پکارتے تھے۔ ان سب کو علم ہے کہ اس رسول نے کبھی کسی انسان کی طرف جھوٹی نسبت نہیں دی جیسا کہ قریش کے بعض سرداروں نے اعتراف کیا تھا۔ لہٰذا یہ عذر بھی درست نہیں ہے۔

۴۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ: یا کیا یہ رسول جن زدہ ہے جس کی وجہ سے ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ یہ عذر بھی قابل اعتنا نہیں ہے بلکہ یہ رسول تو ایک جامع نظام حیات لے کر آیا ہے جسے پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے اور ایک ایسا کلام پیش کرتا ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

۷۱۔ اور اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے مطابق چلتا تو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب تباہ ہو جاتے، بلکہ ہم تو ان کے پاس خود ان کی اپنی نصیحت لائے ہیں اور وہ اپنی نصیحت سے منہ موڑتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ کائنات برحق قائم ہے:

---

[1] ۱۰ یونس: ۱۶

وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ....[1] اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا۔

اگر حق لوگوں کی بے مقصد خواہشات کی پیروی کرے تو کائنات کی معقولیت ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ اگر حق لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں کو اپنی بیہودہ خواہشات میں مگن رہنے کی ترغیب کرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کائنات عبث اور بیہودہ خلق ہوئی ہے۔ کسی کمال و سعادت کے لیے نہیں بلکہ ان بیہودگیوں کے لیے ہی خلق ہوئی ہے۔ اس طرح کل کائنات بے مقصد ہو جائے گی۔ کائنات کی تخلیق کا نتیجہ فاسد ہونے سے خود کائنات بھی فاسد ہو جائے گی۔

شیخ طوسی علیہ الرحمۃ اس جگہ فرماتے ہیں:

> حق نیک افعال اور خواہشات برے افعال کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر حق بھی خواہشات کی پیروی کرے تو حق بھی برے افعال کی دعوت دے اور فساد و دگرگونی کو پسند کرے گا۔ اس صورت میں عالم فاسد ہو جائے گا کیونکہ اگر ایسا ہوا تو دلیل پر اعتماد نہیں رہے گا، ظلم سے محفوظ رہنے کی کوئی ضمانت نہیں رہے گی، امور میں اس طرح بدنظمی آئے گی کہ کسی وعدے پر بھروسہ نہیں رہے گا اور اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں رہے گی کہ عدل الٰہی میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔

واضح رہے حق سے مراد حق وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ آیت میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اگر ہم حق کو نافذ کرنے کے لیے رسول نہ بھیجتے اور لوگوں کو ان کی خواہشات پر عمل کرنے کی تائید کرتے یا رسول آتے اور خواہشات کی تائید و حمایت کرتے تو دونوں صورتوں میں کائنات کا وجود عبث ہو جاتا۔

لہذا یہاں اتباع سے مراد تشریعی ہے، تکوینی اتباع نہیں ہے۔ تکوینی اتباع معقول نہیں ہے کہ کہا جائے کہ اگر اللہ کائنات کو بنانے اور چلانے میں لوگوں کی خواہشات کی اتباع کرتا تو آسمان و زمین فاسد ہو جاتے۔ جیسا کہ بہت سے حضرات کے لیے تکوین و تشریع میں خلط ہو گیا ہے۔

بَلۡ اَتَیۡنٰہُمۡ بِذِکۡرِہِمۡ: ذکر کی دو تفسیریں ہیں: ایک یہ کہ ذکر سے مراد عزت و شرافت ہے۔ دوسری تفسیر نصیحت ہے۔ آیت کا یہ مفہوم بنتا ہے:

> یہ رسول جو حق لے کر آیا ہے وہ تمہاری اندھی خواہشات کی پیروی نہیں کرے گا کہ تم مزید ذلت و خواری کی تاریک تہ میں سرنگون ہو جاؤ بلکہ تمہاری عزت و شرافت کا سامان لے کر آیا ہے۔ تمہیں دنیا کی سرداری دینے آیا ہے۔

---

[1] ۶ انعام: ۷۳

دوسری تفسیر کے مطابق: تمہیں ذلت و خواری سے نکالنے کے لیے نصیحت لے کر آیا ہے کہ تم نوع بشر کی قیادت کے اہل بن جاؤ۔

اہم نکات

۱۔ لوگوں کی خواہشات کی اتباع کائنات کی غرض خلقت کی نفی ہے۔

اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ خَرۡجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيۡرٌ ‌ۖ وَّهُوَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ یا (کیا) آپ ان سے کوئی خراج مانگتے ہیں؟ (ہرگز نہیں کیونکہ) آپ کے رب کا دیا ہوا سب سے بہتر ہے اور وہی بہترین رازق ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور آپ تو انہیں یقیناً صراط مستقیم کی دعوت دیتے ہیں۔

وَاِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یقیناً وہ راستے سے منحرف ہوجاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ تمام انبیاء کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے لوث ہوتے ہیں۔ خصوصاً رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا بے غرض ہونا تو نہایت واضح ہے کہ اپنی رسالت سے پہلے اچھی خاصی تجارت چل رہی تھی۔ اپنی قوم میں امین اور محترم تھے۔ اب غربت کے علاوہ پورا معاشرہ جانی دشمن ہے۔ اپنی قوم میں امن سے زندگی گزار رہے تھے۔ اب ایسی بات لے کر اٹھے ہیں جو پوری قوم کی سرداری کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے۔ خود غرض انسان تو اس چیز کو اٹھاتے ہیں جس میں قوم کی ہمدردی اور حمایت نہ ہو۔

۲۔ فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيۡرٌ: ان مسکینوں کے پاس رکھا بھی کیا ہے کہ آپ ان سے کسی قسم کی مادی توقع رکھیں۔ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا مالک آپ کا رب ہے۔

۳۔ وَاِنَّكَ لَتَدۡعُوۡهُمۡ: بس آپ ان کو راہ راست کی طرف بے غرض ہو کر بلاتے ہیں۔ آپ کی غرض و غایت اور مفاد اگر ہے تو وہ ان کی راہ راست کی طرف ہدایت میں ہے۔

۴۔ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ: جو لوگ آپ کی دعوت پر ایمان نہیں لاتے وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے ہیں۔ وہ خود راہ راست سے منحرف ہو کر اپنے آپ کی کھائی کو طرف لے جا رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ راہ راست کی طرف بلانے والوں کو اللہ کی طرف سے انعام و اکرام ملتا ہے، لوگوں سے نہیں۔

وَلَوۡ رَحِمۡنٰهُمۡ وَكَشَفۡنَا مَا بِهِمۡ مِّنۡ ضُرٍّ لَّلَجُّوۡا فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝۷۵

۷۵۔ اور اگر ہم ان پر رحم کر دیں اور انہیں جو تکلیف لاحق ہے اسے دور کر بھی دیں پھر بھی یہ لوگ اپنی سرکشی میں برابر بھٹکتے جائیں گے۔

تشریح کلمات

لَّلَجُّوۡا: (ل ج ج) اللجاج کے معنی کسی ممنوع کے کرنے میں بڑھتے چلے جانے اور اس پر ضد کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

متعدد آیات میں اس بات کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ مصیبت کے وقت یہ لوگ اللہ کو پکارتے بھی ہیں تو مصیبت کے ٹلنے کے بعد پھر پہلی حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اس آیت میں کسی حادثے کی طرف اشارہ ہے جس میں اہل مکہ مبتلا تھے۔ بعض روایات کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے نتیجے میں اہل مکہ قحط کا شکار ہو گئے۔ حتیٰ گوبر کھانے تک نوبت آ گئی۔ یہ قحط ہجرت سے پہلے واقع ہوا تھا۔ ایک اور قحط ہجرت کے بعد واقع ہوا تھا۔ اس لیے اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ قحط تو ہجرت کے بعد ہوا۔ آیت مکی ہے۔

وَلَقَدۡ اَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡعَذَابِ فَمَا اسۡتَكَانُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَمَا يَتَضَرَّعُوۡنَ ۝۷۶

۷۶۔ اور بتحقیق ہم نے تو انہیں اپنے عذاب کی گرفت میں لے لیا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے رب سے نہ عاجزی کا اظہار کیا نہ زاری کی۔

حَتّٰۤى اِذَا فَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيۡدٍ اِذَا هُمۡ فِيۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ ۝۷۷

۷۷۔ یہاں تک کہ جب ہم نے ان پر شدید عذاب کا ایک دروازہ کھول دیا تو پھر ان کی امیدیں ٹوٹ گئیں۔

تشریح کلمات

اسۡتَكَانُوۡا: (س ك ن) الاستکانۃ۔ عاجزی کا اظہار کرنا۔

مُبۡلِسُوۡنَ: (ب ل س) بلس کے معنی سخت ناامید ہونا کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اَخَذۡنٰهُمۡ: یہ مشرکین تو عذاب آنے پر بھی اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے، نہ تضرع و

زاری کرتے تھے۔ یہ ان لوگوں کی شقاوت قلبی کی انتہا ہے۔

۲۔ حَتّٰۤی اِذَا فَتَحۡنَا: لیکن جب ہم نے شدید عذاب کا دروازہ کھول دیا تو اب یہ مایوس ہونے لگے۔ عذاب شدید سے مراد بعض کے نزدیک عذاب آخرت ہے اور بعض کے نزدیک فتح مکہ ہے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ اور اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے لیکن تم پھر بھی کم شکر گزار ہو۔

تفسیر آیات

قرآنی تعلیمات میں جا بجا اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ تخلیق و تدبیر قابل تفریق نہیں ہیں۔ اس آیت میں یہی واضح فرمایا ہے کہ اللہ ہی نے انسانی زندگی جاری رکھنے کے لیے چند ایک چیزیں فراہم فرمائیں۔

۱۔ السَّمۡعَ: قوت سماعت۔ اس قوت کے ذریعے انسان آوازوں کو درک کرتا ہے۔ اگر یہ قوت نہ ہوتی تو انسان بیرونی دنیا سے ان حقائق کا ادراک نہ کر سکتا جو آوازوں سے مربوط ہیں۔ خواہ ان آوازوں میں الفاظ و معانی ہوں یا صرف آواز ہو، دونوں سے استفادہ کرتا ہے۔ پتھر، لوہا، لکڑی دیگر مختلف چیزوں کے ٹکرانے سے انسان سمجھ سکتا ہے کس چیز کی آواز ہے۔ اسی کے مطابق ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ جانوروں میں بیل، بکری، گھوڑا، گدھا، مرغی دیگر مختلف پرندوں کی آوازوں سے استفادہ ہوتا ہے۔

لیکن وہ آواز جو الفاظ و معانی پر مشتمل ہو انسان کے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے چونکہ اگر یہ آواز اور الفاظ نہ ہوتے تو افہام و تفہیم کا مسئلہ بعض اوقات مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہوتا۔ چنانچہ الفاظ نہ ہونے کی صورت میں کسی معنی کو کسی کے ذہن میں منتقل کرنے کے لیے خود معنی کو پیش کرنا پڑتا۔ مثلاً کسی کو پانی بتانا ہو تو خود پانی کو اس کے سامنے پیش کرنا پڑتا۔ اب ہم لفظ کے ذریعے آسانی سے معنی پیش کرتے ہیں اور بعض معانی کا پیش کرنا ممکن نہ ہوتا۔ مثلاً کعبہ پیش کرنا ممکن ہی نہ ہوتا۔ چنانچہ انسان معنی کو لفظ کے ذریعے اور لفظ کو کتابت کے ذریعہ دوسروں کی طرف منتقل کرتا ہے۔

۲۔ وَ الۡاَبۡصَارَ: اس قوت کے ذریعے انسان رنگوں کا ادراک کرتا ہے۔ قوت بصارت اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کا عظیم اور محیر العقول معجزہ ہے جس سے انسان اپنے وجود سے بیرون اشیاء کا ادراک کرتا ہے۔ ان کا رنگ، حجم اور شکل معلوم کرتا ہے۔ اگر بصارت نہ ہوتی تو انسان کائنات کی رعنائیوں کو نہ سمجھ سکتا۔

۳۔ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ: دل، لغت میں صنوبری شکل کے عضو کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بیرونی دنیا اور عقل کے درمیان حواس خمسہ کے ذریعے روابط قائم کیے ہیں۔ ان میں سرفہرست سماعت اور

بصارت ہے۔ چنانچہ ان رابطوں کے بغیر عقل اشیاء کا ادراک نہیں کر سکتی۔ جس چیز کو انسان نے حواس سے درک نہیں کیا ہے اسے عقل نہیں سمجھ سکتی۔ مثلاً اگر پانی کا وجود نہ ہوتا تو عقل پانی کو سمجھنے سے قاصر ہوتی۔ یہاں سے یہ قول مشہور ہے: من فقد حساً فقد علما جس کے پاس حواس میں سے کوئی ایک حس نہیں اس کے پاس اس سے مربوط علم نہیں ہوتا ہے۔

۴۔ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ: یہ ناشکرا انسان نہ صرف ان نعمتوں کا شکر نہیں کرتا بلکہ ان نعمتوں کے وجود کا احساس تک نہیں کرتا جب تک یہ نعمت چھن نہ جائے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اعْجَبُوا لِهَذَا الْإِنْسَانِ يَنْظُرُ بِشَحْمٍ وَ يَتَكَلَّمُ بِلَحْمٍ وَ يَسْمَعُ بِعَظْمٍ...[1]

یہ انسان تعجب کے قابل ہے وہ چربی سے دیکھتا ہے اور گوشت کے لوتھڑے سے بولتا ہے اور ہڈی سے سنتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کے بیرونی دنیا سے ذرائع روابط (حواس) اللہ کی بڑی نعمت ہے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ ذَرَاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ اور اللہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب کو جمع کیا جانا ہے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ وَ لَہُ اخۡتِلَافُ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ اور وہی ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت بھی اور اسی کے قبضہ قدرت میں شب و روز کا آنا جانا ہے تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

تشریح کلمات

ذَرَاَ: (ذ ر ء) الذرء کے معنی ہیں اللہ نے جس چیز کو ارادہ کیا اسے ظاہر کر دیا، خلق کر دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ ہُوَ الَّذِیۡ ذَرَاَکُمۡ: جس نے تمہیں سماعت اور بصارت عطا کی ہے اسی نے تمہیں زمین میں پیدا کیا پھر اس کی طرف محشور ہوں گے۔ ان تمام امور کا مرجع اللہ کی ذات ہے۔

۲۔ وہ تمہارا رب اور مالک ہے۔ زندہ کرنے اور موت دینے پر قادر ہے اور گردش لیل و نہار اسی کے قبضہ قدرت میں ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمہاری زندگی اور کل کائنات کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں

---

[1] نہج البلاغۃ۔ حکمت: ۸

ہے۔ تم عقل سے کام نہیں لیتے اور غیر اللہ کے آستانے پر ماتھا مارتے ہو۔

بَلۡ قَالُوۡا مِثۡلَ مَا قَالَ الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ لیکن یہ لوگ وہی بات کر رہے ہیں جو ان سے پہلے والے کرتے رہے۔

قَالُوۡۤا ءَاِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ وہ کہتے تھے: کیا جب ہم مر جائیں گے اور ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہڈی (رہ جائے گی) تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے؟

لَقَدۡ وُعِدۡنَا نَحۡنُ وَ اٰبَآؤُنَا ہٰذَا مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۸۳﴾

۸۳۔ یہی وعدہ یقیناً ہم سے اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا سے بھی ہوتا رہا ہے یہ تو صرف قصہ ہائے پارینہ ہیں۔

تفسیر آیات

تدبیر کائنات اور قدرت خدا سے متعلق ان نشانیوں سے استفادہ کرنے کی جگہ یہ نادان اندھی تقلید کو ترجیح دیتے اور وہی بات دہراتے ہیں جو ان کے آبا و اجداد کرتے چلے آرہے ہیں۔

۱۔ یہ بات ان کے ذہنوں میں ناممکن شمار ہوتی رہی ہے کہ انسان جب خاک اور ہڈیوں میں بٹ جاتا ہے تو دوبارہ زندہ ہوسکتا ہے۔ یہ داستان پارینہ کے علاوہ حقیقت سے خالی ہے۔

۲۔ لَقَدۡ وُعِدۡنَا: یہ وعدہ قیامت کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے باپ دادا سے بھی یہی کہتے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی تک اس قیامت کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اس بات سے واقف تھے کہ گزشتہ قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ہیں اور سب نے یہی پیغام دیا ہے کہ قیامت آنے والی ہے۔

قُلۡ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡہَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ کہد یجیے: یہ زمین اور جو اس پر (آباد) ہیں کس کی ہے اور اگر تم جانتے ہو؟ (تو بتاؤ)۔

سَیَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰہِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ وہ کہیں گے: اللہ کی ہے، کہد یجیے: تو پھر تم سوچتے کیوں نہیں ہو؟

تفسیر آیات

قیامت کے منکرین سے کہد یجیے کہ زمین اور اہل زمین کا مالک کون ہے؟ وہ کہیں گے اللہ مالک ہے۔ جب اللہ مالک ہے تو مالک اپنی مملوک پر جیسے چاہتا ہے تصرف کر سکتا ہے۔ چونکہ اللہ کی مالکیت حقیقی

ہے جس میں مملوک کا وجود اور بقا دونوں مالک سے مربوط ہوتے ہیں اور مملوک پر جیسے چاہتا ہے تصرف کر سکتا ہے۔ یہاں مملوک کو کسی قسم کا استقلال نہیں ہے جب کہ غیر حقیقی مالک یعنی غیر اللہ کی مالکیت میں یہ بات نہیں ہوتی۔

مخاطب مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ زمین و اہل زمین کا اللہ ہی خالق ہے اگرچہ وہ زمینی معاملات میں غیر اللہ کو رب مانتے تھے۔ لہٰذا ان کے خلاف استدلال خالقیت کے طریق سے ہے کہ خالق ہی حقیقی مالک ہوتا ہے جس کا مشرکین بھی اعتراف کرتے تھے۔ حقیقی مالک کے ہاتھ میں موت و حیات ہے۔ پہلی بار ہو یا دوسری بار۔

قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ وَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ کہدیجیے: سات آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟

سَیَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰہِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ وہ کہیں گے: اللہ ہے، کہدیجیے: تو پھر تم بچتے کیوں نہیں ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ مخاطب مشرکین سات آسمانوں کا اللہ ہی کو رب مانتے تھے۔ وہ صرف زمین و اہل زمین کے لیے دیگر ارباب کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اگرچہ وثنیت کے بعض دیگر مذاہب نجوم وکواکب سورج اور فرشتوں کو آسمانوں کا رب مانتے تھے۔

یا ممکن ہے اس حوالے سے اللہ کو سات آسمانوں کا رب تسلیم کرتے تھے چونکہ ان کے نزدیک اللہ رب الارباب ہے۔

۲۔ وَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ: رب الارباب ہونے کے اعتبار سے مشرکین اللہ کو عرش عظیم کا رب مانتے تھے ورنہ اگر ہم عرش کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ عرش اللہ تعالیٰ کے مقام تدبیر کا نام ہے تو مشرکین کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اللہ رب العرش بمعنی مدبر کل کائنات ہے۔

اس آیت میں ایک لطیف اشارہ یہ سمجھا گیا ہے کہ سوال یہ ہوا تھا: سات آسمانوں کا رب کون ہے؟ تو جواب ''اللہ ہے'' ہونا چاہیے تھا لیکن جواب میں ''اللہ کے لیے ہے'' کہا گیا۔ یہاں بھی مالکیت کے ساتھ استدلال کیا گیا ہے کہ ان سب کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ لہٰذا موت و حیات اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔

قُلۡ مَنۡۢ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ

۸۸۔ کہدیجیے: وہ کون ہے جس کے قبضے میں ہر

وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾	چیز کی بادشاہی ہے؟ اور وہ کون ہے جو پناہ دیتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا، اگر تم جانتے ہو؟ (تو بتاؤ)۔
سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾	۸۹۔ وہ کہیں گے: اللہ، کہد یجیے: تو پھر تمہاری یہ خبطی کہاں سے ہے؟
بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾	۹۰۔ بلکہ ہم حق کو ان کے سامنے لے آئے ہیں اور یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔

تشریح کلمات

مَلَكُوْتُ: (م ل ك) الملكوت: یہ مَلَك کا مصدر ہے اور رَحْمُوت و رَهْبُوت کی طرح اس میں تاء زائدہ ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی مِلك کے ساتھ مخصوص ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ: اللہ کے ہاتھ ہر شیء کی حاکمیت ہے کہ ہر چیز پر اللہ کا حکم چلتا ہے۔ ملکوت کے صیغہ مبالغہ ہونے کے اعتبار سے معنی یہ بنیں گے: ہر چیز پر اللہ کی حاکمیت اور سلطنت اپنے انتہائی درجے پر ہے۔

اللہ نے اشیاء پر اپنی حاکمیت اس طرح بیان کی ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ...[1]	جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے کہ اسے یہ کہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی سلطنت ہے۔

۲۔ وَّهُوَ يُجِيْرُ: وہ ہر بلا سے پناہ دیتا ہے۔ جب ہر چیز پر اس کی حاکمیت ہے تو کسی چیز کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کی منشاء کے خلاف کسی کو گزند پہنچائے۔ وہ ہر اس کا پناہ دہندہ ہے جس کی کوئی پناہ نہیں۔ یا جار من لا جار له اور جس کو اس نے پناہ دی اس کو کسی پناہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بتاؤ کون ہے پناہ دینے والا؟

۳۔ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ: اللہ کے مقابلے کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ یعنی جسے اللہ پناہ نہ دے اسے

---

[1] ۳۶ یس: ۸۲، ۸۳

کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ جسے اللہ عذاب دینا چاہے کوئی اسے اس کے عذاب سے پناہ نہیں دے سکتا۔ اس کی ملکوت پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ بتاؤ کون ہے اس کے عذاب سے پناہ دینے والا؟

۴۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ: وہ کہیں گے: یہ سب اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ ملکیت اسی کی ہے۔ سلطنت اسی کی قائم ہے۔ ارادہ اسی کا چلتا ہے۔ سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے آگے کسی اور کا کوئی بس نہیں چلتا۔

۵۔ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ: اے رسول! کہدیجیے: پھر تم کدھر فریب کھا کر جا رہے ہو۔ پھر تمہاری مخبوط الحواسی کیا ہے؟ تمہارے عقیدے میں یہ تضاد کیا ہے: یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے اور نہیں بھی ہے بلکہ ان موہوم شریکوں کے پاس ہے؟

۶۔ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ: ہم نے اپنے انبیاء و رسل کے ذریعے جو کچھ پیش کیا ہے وہی حق و حقیقت ہے۔ دوسرے لوگوں کے واہمے باطل اور جھوٹ ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ہر شیٔ پر ہر آن اللہ کی حاکمیت ہے۔ اسی کے زیر تدبیر ہے۔

۲۔ جسے اللہ پناہ نہ دے اسے پناہ دینے والا کوئی نہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ اللہ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوقات کو لے کر جدا ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا، اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ: تشریح کے لیے بقرہ ۱۱۶، الانبیاء: ۲۷ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ وَّ مَا كَانَ .... اِذًا لَّذَهَبَ: اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے تو وہ اس وقت معبود ہو سکتا ہے جب وہ خالق ہو۔ اگر تمہارے سب معبود بھی خالق ہیں تو:

i۔ ہر معبود کی مخلوقات کی تشخیص ہو جاتی یہ کس معبود کی مخلوقات ہیں۔ اس معبود کی خلق دوسرے معبود کی خلق سے جدا ہوتی۔ اس صورت میں ہر معبود اپنا اپنا نظام قائم کرتا اور آپس میں کسی قسم کا ارتباط نہ ہوتا بلکہ ہر ایک کا اپنا اپنا مستقل نظام ہوتا۔

مثلاً ایک معبود سمندر کا نظام اور دوسرا خشکی کا نظام چلا رہا ہوتا تو خشکی کو سمندر سے کوئی ربط نہیں ہونا چاہیے۔ اسے اگر بادل، بارش کی ضرورت ہے تو اس کا انتظام سمندر سے ہٹ کر اپنے پاس ہونا چاہیے۔ دوسرے کے نظام کے بخارات اور بادل و بارش کے انتظار میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ جب کہ موجودہ نظام اس بات کی تائید کرتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز دوسرے سے مربوط ہے:

مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ... [1] تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بدنظمی نہیں دیکھے گا۔

لہٰذا نظام کی وحدت سے خالق اور نظام دہندہ کی وحدت ثابت ہوتی ہے۔

سوال: مشرکین اللہ کو خالق سمجھتے تھے:

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ... [2] اور اگر آپ ان سے پوچھیں: آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔

آیت میں کیسے ان معبودوں کے ساتھ خلق کو فرض کر لیا گیا ہے؟

جواب: اول تو ممکن ہے لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ کا جواب بزبان حال ہو، بزبان مقال نہ ہو۔ ثانیاً مشرکین اگرچہ آسمانوں اور زمین کا خالق اللہ کو تسلیم کرتے تھے تاہم وہ روز مرہ زندگی سے مربوط جزئیات کا خالق اپنے معبودوں کو سمجھتے تھے چونکہ وہ اپنے معبودوں کو مالک و مدبر سمجھتے تھے اور خلق و تدبیر قابل تفریق نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں وہ اپنے معبودوں کو مدبر سمجھتے تھے ان کو خالق بھی سمجھتے تھے۔ اس بات پر یہی آیت گواہ ہے۔ اس آیت کے علاوہ دیگر آیات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں:

وَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ ؀ [3] اور اللہ کو چھوڑ کر جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا ... [4] اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بنانے پر بھی ہرگز قادر نہیں ہیں...۔

صاحب المیزان کہتے ہیں: مشرکین اپنے معبودوں کے خلق افعالی کے قائل تھے۔ خلق ایجادی کو صرف اللہ کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے۔

۲۔ وَ لَعَلَا بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ: ایک مستقل خالق کو اپنے تخلیقی و تدبیری عمل میں جب استقلال حاصل ہے تو وہ کسی دوسرے خالق سے قطع نظر اپنا تخلیقی عمل جاری رکھے گا۔ اسی طرح دوسرا خالق بھی۔ لہٰذا دو مستقل خالقوں کی تخلیق ایک دوسرے کی تخلیق سے ٹکرائے گی اور دونوں کا نظام تخلیق درہم برہم ہو جائے گا۔ اگر نہ ٹکرائے اور اپنی حد میں تخلیقی عمل جاری رکھے تو دو مستقل نظام وجود میں آئیں گے جو ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہوں گے۔ یہ فرض آیت کے پہلے جملے میں باطل ثابت کیا گیا ہے۔ ہمارے اس بیان سے وہ سوال

---

[1] ۶۷ ملک: ۳ [2] ۳۱ لقمان: ۲۵ [3] ۱۶ نحل: ۲۰ [4] ۲۲ حج: ۷۳

پیدا نہیں ہوتا جو عموماً اٹھایا جاتا ہے:

ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ دو حکیم و دانا خالق اپنے اپنے دائرے میں نظام و خلق چلائیں اور ایک دوسرے پر چڑھ نہ دوڑیں؟

اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورہ انبیاء آیت ۲۲۔

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾

۹۲۔ وہ غیب و شہود کا علم رکھتا ہے پس وہ منزہ ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

کل کائنات کا ہر ذرہ اللہ تعالیٰ کے زیر سلطنت، زیر نظر ہے۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لہٰذا اللہ کی ذات ان توہمات سے بالاتر ہے جو مشرکین کرتے ہیں۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ (اے رسول) کہدیجیے: میرے پروردگار! اگر تو وہ عذاب مجھے دکھا دے جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے،

رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

۹۴۔ تو میرے پروردگار! مجھے اس ظالم قوم کے ساتھ شامل نہ کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِمَّا تُرِيَنِّيْ: ان حرف شرط ما زائدہ ہے۔

خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دعا کی تعلیم سے یہ اشارہ مل رہا ہے کہ ان مشرکین پر عذاب نازل ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔

۲۔ فَلَا تَجْعَلْنِيْ: دعا کے اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب اتنا شدید ہو گا کہ بے گناہ کے منہ سے یہ دعا نکلے گی: پروردگارا! ہمیں ان ظالموں کی طرح کسی عذاب میں مبتلا نہ فرما۔

وَاِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾

۹۵۔ اور جس (عذاب) کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے ہم اسے آپ کو دکھانے کی یقیناً طاقت رکھتے ہیں۔

تفسیر آیات

تاخیر صرف اس لیے ہے کہ اللہ کی حکمت میں یہ بات ہمیشہ شامل ہے کہ ظالم کو ایک وقت تک مہلت دی جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس عذاب سے بدر کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَۃَ[1] نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَصِفُوۡنَ ﴿۹۶﴾	۹۶۔ آپ برائی کو احسن برتاؤ کے ذریعے دور کریں، ہم خوب جانتے ہیں جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ رسول کریم ﷺ کے لیے حکم ہے کہ برائی کو اس نیکی کے ذریعہ دفع کریں جو بہترین ہو۔ اگر وہ بدکلامی کرتے ہیں تو اس کا جواب بدکلامی سے نہ دینا خوبی، حَسَن ہے اور اس بدکلامی کے جواب میں اچھا کلام کرنا اَحسن ہے۔ مثلاً کوئی یہ کہہ دے: اے محمدؐ! تو جادوگر ہے تو اس کا جواب نہ دینا حسن ہے اور اس کے جواب میں اس کو دعا دینا کہ خدا تیری ہدایت کرے احسن ہے۔ چنانچہ رسالتمآب ﷺ اپنے دشمنوں کے حق میں یہ دعا دیتے تھے:

اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون...[1]	اے اللہ! میری اس قوم کی ہدایت فرما! چونکہ یہ جانتے نہیں ہیں۔

یہ حکم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مختص ہے۔ دوسروں کے بارے میں فرمایا:

وَ یَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ ...[2]	اور یہ لوگ برائی کو نیکی کے ذریعے دور کر دیتے ہیں۔

یہاں حسنۃ کہا ہے، احسن نہیں کہا۔

مکی زندگی میں دعوت کا یہی اسلوب اختیار کرنے کا حکم تھا۔ بعد میں اسلام کی دعوت میں طاقت آ گئی تو مقابلہ بالمثل بھی جائز ہو گیا۔

۲۔ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَصِفُوۡنَ: آپ کے بارے میں یہ لوگ جو منفی پروپیگنڈا کرتے ہیں اللہ کو اس کا علم ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہوسکتا ہے کہ اللہ خود اس کا جواب دے گا۔ آپ درگزر کریں۔

اہم نکات

۱۔ برائی کے خلاف اخلاق کی مار سب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

---

[1] بحار ۱۱: ۲۹۸ [2] ۲۸ قصص: ۵۴

وَ قُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ ہَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ ﴿۹۷﴾

وَ اَعُوۡذُ بِکَ رَبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ ﴿۹۸﴾

۹۷۔ اور کہد یجیے: اے میرے پروردگار! میں شیطانی وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

۹۸۔اوراے پروردگار! میں ان کے میرے سامنے آنے سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں۔

تشریح کلمات

ہَمَزٰتِ: (ھ م ز) الھمز کے اصل معنی کسی چیز کو دبا کر نچوڑنے کے ہیں۔ غیبت کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسے ھماز۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِکَ: رسول ﷺ سے خطاب کر کے امت کو اس کے جانی دشمن شیطان سے بچنے کی دعا کا سلیقہ بیان ہو رہا ہے۔ شیطان انسان میں موجود کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہمیشہ اس کی تاک میں بیٹھا رہتا ہے۔ مثلاً جب انسان کسی خواہش، خوف اور غصے کی حالت میں ہو تو یہاں تاک میں بیٹھا شیطان مزید دھکا دیتا ہے۔

۲۔ وَ اَعُوۡذُ بِکَ رَبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ: انسان کی ہر کمزوری کے موقع پر شیطان فوراً حاضر ہو جاتا ہے۔ دعا میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطان کے نزدیک ہونے سے بھی اللہ کی پناہ مانگو۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ ﴿۹۹﴾

لَعَلِّیۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَکۡتُ کَلَّا ؕ اِنَّہَا کَلِمَۃٌ ہُوَ قَآئِلُہَا ؕ وَ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

۹۹۔ (یہ غفلت میں پڑے ہیں) یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آلے گی تو وہ کہے گا: اے پروردگار! مجھے واپس دنیا میں بھیج دے،

۱۰۰۔ جس دنیا کو چھوڑ کر آیا ہوں شاید اس میں عمل صالح بجا لاؤں، ہرگز نہیں، یہ تو وہ جملہ ہے جسے وہ کہدے گا اور ان کے پیچھے اٹھائے جانے کے دن تک ایک برزخ حائل ہے۔

تفسیر آیات

اثنائے کلام میں توحید کے دروس کے بعد آمدم برسر مطلب کے طور پر مشرکین کے انجام کا ذکر آیا: یہ مشرکین اپنے شرک پر قائم رہیں گے۔

۱۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ: موت کے سامنے آنے تک۔ موت کے سامنے آنے پر راز کھل جائے گا۔ جو باتیں ضد بازی کی وجہ سے زندگی میں سمجھ میں نہیں آئی تھیں، وہ موت کے سامنے آنے پر سمجھ میں آ جائیں گی جس پر وہ استدعا کریں گے: ہمیں دنیا میں واپس کر کے ایک موقع اور دے دے۔

واضح رہے موت کے سامنے آنے پر مرنے سے پہلے پورا راز کھل جاتا ہے اور مرنے والے کو اپنے انجام کا علم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی روح قبض ہو جاتی ہے۔

۲۔ فِیْمَا تَرَکْتُ: اس جملے سے ایک تو یہ معنی مراد لیا جا سکتا ہے کہ جس دنیا کو میں چھوڑ آیا ہوں اور دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو عمل صالح چھوڑ چکا ہوں اسے بجالاؤں لیکن فِیْمَا کی وجہ سے پہلا معنی زیادہ قرین واقع معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ کَلَّا ؕ اِنَّهَا کَلِمَۃٌ هُوَ قَآئِلُهَا: وہ یہ تو کہدے گا کہ مجھے واپس کرے مگر یہ ایک ناممکن بات ہوگی۔ اس پورے سفر میں واپسی ناممکن ہے۔ پورے سفر سے مراد عالم خاک سے عالم نبات، پھر عالم صلب، عالم جنین، عالم دنیا، عالم برزخ، عالم معاد اور عالم جنت و نار۔ اس پورے سفر میں کسی بھی عالم سے سابقہ عالم کی طرف واپسی ممکن نہیں ہے۔

۴۔ **عالم برزخ:** وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ۔ برزخ، موت کے بعد سے قیامت تک کی درمیانی مدت کو کہتے ہیں جو معلوم نہیں کس قدر طویل ہوگی۔ موت سے قیامت تک کی مدت کیا ہوگی؟ نفخۂ اولی سے نفخۂ ثانیہ کی درمیانی مدت کتنی طویل ہوگی؟ یہ مدت کئی لاکھ بلکہ کئی ارب سال ہو سکتی ہے۔ برزخی حیات کے بارے میں اقوال چند ایک ہیں: حیات برزخی سب کے لیے ہے۔ حیات برزخی صرف قبر کے سوالوں تک ہے۔ حیات برزخی صرف بڑے مومن اور بڑے مجرم لوگوں کے لیے ہے۔ باقی لوگوں کے لیے حیات برزخی صرف قبر کے سوالوں تک محدود ہے۔

بڑے پاکباز مومنین کے لے حیات برزخی قرآنی آیات سے ثابت ہے۔ مثلاً شہداء کی حیات کے بارے میں فرمایا:

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ۙ﴿﴾ ۱	اور جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے ہیں قطعاً انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس سے رزق پا رہے ہیں۔

بڑے مجرموں میں سے فرعون کے بارے میں فرمایا:

اَلنَّارُ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ ۟ اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ ﴿﴾ ۲	وہ لوگ صبح و شام آتش جہنم کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور جس دن قیامت برپا ہوگی (تو حکم ہوگا) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔

۱؎ ۳ آل عمران: ۱۶۹ ۲؎ ۴۰ مومن: ۴۶

لہٰذا ان دونوں کے لیے حیات برزخی بہ نص صریح آیت موجود ہے۔
بعض دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرمین کے لیے حیات برزخی نہیں ہے:

وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ یُقۡسِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۬ۙ مَا لَبِثُوۡا غَیۡرَ سَاعَۃٍ ؕ کَذٰلِکَ کَانُوۡا یُؤۡفَکُوۡنَ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَ الۡاِیۡمَانَ لَقَدۡ لَبِثۡتُمۡ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ اِلٰی یَوۡمِ الۡبَعۡثِ ۫ فَہٰذَا یَوۡمُ الۡبَعۡثِ وَ لٰکِنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿﴾ [1]

اور جس روز قیامت برپا ہو گی مجرمین قسم کھائیں گے کہ وہ (دنیا میں) گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے، وہ اسی طرح الٹے چلتے رہتے تھے۔ اور جنہیں علم اور ایمان دیا گیا تھا وہ کہیں گے: نوشتہ خدا کے مطابق یقیناً تم قیامت تک رہے ہو اور یہی قیامت کا دن ہے لیکن تم جانتے نہیں تھے۔

دوسری آیت میں فرمایا:

قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ٜ ہٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَ صَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿﴾ [2]

کہیں گے: ہائے ہماری تباہی! ہماری خوابگاہوں سے ہمیں کس نے اٹھایا؟ یہ وہی بات ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا کہ قبر میں یہ حالت خواب میں تھے۔
حدیث میں ہے:

من مات فقد قامت قیامته۔ [3]

جسے موت آئے تو اس کے لیے قیامت بھی واقع ہوتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ ابوذرؓ کہا کرتے تھے:

مَا بَیْنَ الْمَوْتِ وَ الْبَعْثِ اِلَّا کَنَوْمَۃٍ نِمْتَھَا ثُمَّ اسْتَیْقَظْتَ مِنْھَا۔۔۔ [4]

موت اور قیامت کے درمیان ایک نیند کا فاصلہ ہے جس میں تو سویا اور جاگ گیا۔

ان دونوں میں جمع اس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ موقف اختیار کیا جائے کہ حیات برزخی مقرب مؤمنین اور بڑے مجرموں کے لیے ہے۔ باقی درمیانی درجہ کے لوگوں کے لیے صرف قبر میں سوال کے لیے حیات برزخی دے دی جائے گی۔ اس پر بعض احادیث کی بھی دلالت ہے۔
ملاحظہ ہو بحار الانوار جلد ششم احوال برزخ و قبر باب ہشتم۔

مؤمنین کے لیے حیات برزخی ہے: متعدد روایات میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ مؤمنین کے لیے حیات برزخی ہے اور ان کی حیات کے بارے میں بعض روایات میں تفصیل بھی موجود ہے۔
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے راوی پوچھتے ہیں: لوگ روایت کرتے ہیں کہ مؤمن کی ارواح سبز پرندوں کے سنگدان میں عرش کے گرد ہوں گی؟ فرمایا:

---

[1] ۳۰ روم: ۵۵-۵۶ [2] یٰس: ۵۲ [3] بحار الانوار ۵۸: ۷ [4] الکافی ۲: ۱۳۴

لَا الْمُؤْمِنُ اَکْرَمُ عَلَی اللّٰہِ مِنْ اَنْ یَجْعَلْ رُوحَہٗ فِی حَوْصَلَۃِ طَیْرٍ وَلَکِنْ فِی اَبْدَانٍ کَاَبْدَانِھِم۔[1]

نہیں، مؤمن اللہ کے ہاں اس بات سے بہتر احترام میں ہے کہ پرندے کے سنگدان میں اس کی روح کو رکھا جائے بلکہ ان کی ارواح ایسے بدنوں میں ہوں گی جو ان کے (دنیاوی) بدنوں کی طرح ہوں گے۔

دوسری حدیث میں آیا ہے:

فاذا قبضه الله عزوجل صیّر تلك الروح فی قالب کقالبه فی الدنیا فیأ کلون و یشربون فاذا قدم علیهم القادم عرفوه بتلك الصورة التی کانت فی الدنیا۔[2]

جب اللہ مؤمن کی روح نکال لیتا ہے تو اسے ایسے قالب میں ڈال دیتا ہے جیسے دنیا میں تھا پھر وہ کھاتی پیتی ہیں جب کوئی ان کے ہاں کوئی وارد ہوتا ہے تو اسی شکل میں اسے پہچان لیتے ہیں جو دنیا میں تھی۔

ضریس الکناسی راوی ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مؤمنین کی ارواح ہر شام اپنی قبروں سے نکلتی ہیں اور اس باغ کی طرف جاتی ہیں جو اللہ نے مغرب کی طرف خلق فرمایا ہے۔ اس کے پھلوں سے کھاتیں، اس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتی اور باہمی ملاقات کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں اور طلوع فجر کے موقع پر اس باغ سے نکل آتی ہیں۔ آسمان و زمین کے درمیان پرواز اور رفت و آمد کرتی ہیں۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اپنی قبروں کا معائنہ کرتی ہیں۔ فضا میں باہم ملاقات کرتی ہیں اور ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔[3]

ایک اور روایت میں آپ علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَیَزُوْرُ اَھْلَہٗ فَیَرَی مَا یُحَبُّ وَ یُسْتَرُ عَنْہُ مَا یَکْرَہُ۔...[4]

مؤمن کی روح اپنے اہل خانہ کو دیکھنے آتی ہے تو جس سے محبت ہے اس کو دیکھ لیتی ہے اور جو ناپسند ہے اسے نہیں دیکھتی۔

متعدد احادیث کے مطابق ارواح کی ایک دوسرے سے ملاقات ان کے درجات کے مطابق ہے۔ بعض لوگ روزانہ، بعض لوگ ہر دو دن بعد اور بعض ہر تین دن بعد بعض ہر جمعے، بعض ہر ماہ، بعض لوگ ہر سال اپنے گھر والوں سے ملاقات کر سکتے ہیں۔[5]

اہم نکات

۱۔ زندگی ہاتھ سے نکل جانے کے بعد دوبارہ نہیں ملے گی۔

---

[1] الکافی ۳: ۲۴۴ [2] بحار الانوار ۶: ۲۷۰ [3] الکافی ۳: ۲۴۶ [4] الکافی ۳: ۲۲۸ [5] بحار الانوار ۶: ۲۵۶۔۲۵۷۔۲۵۸

۲۔ برزخی زندگی کی زیادہ فکر کرنی چاہیے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ وَّ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

۱۰۱۔ پھر جب صور میں پھونک ماری جائے گی تو ان میں اس دن نہ کوئی رشتہ داری رہے گی اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ نُفِخَ: یہ دوسرے صور کا ذکر ہے جس سے تمام زندہ ہو جائیں گے۔

۲۔ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَہُمۡ: نسب کی ضرورت دنیا میں پیش آتی ہے کہ کون کس کی اولاد ہے۔ اس پر خاندان و قبائل اور میراث وغیرہ کے آثار مترتب ہوتے ہیں۔

آخرت میں تمام آثار اعمال پر مترتب ہوں گے۔ لہٰذا یہاں عمل دیکھا جائے گا۔ کسی کا نسب و حسب فائدہ نہیں دے گا۔

حدیث میں آیا ہے:

كُلُّ حَسَبٍ وَ نَسَبٍ مُنْقَطِعٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا حَسَبِي وَ نَسَبِي۔[1]

ہر حسب و نسب منقطع ہو گا سوائے میرے حسب و نسب کے۔

روایت ابن عساکر عبد اللہ بن عمر سے۔ سند صحیح ہے۔

تفسیر مظہری میں یہ حدیث ان لفظوں میں مذکور ہے:

کل نسب و صهر ینقطع یوم القیامة الانسبی و صهری۔

ہر نسب اور رشتہ قیامت کے دن منقطع ہو جائے گا سوائے میرے نسب اور رشتہ کے۔

اس حدیث کے نقل کے بعد لکھتے ہیں:

مومنین کا نسب، نبی کے نسب میں داخل ہے چونکہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مومنین کے باپ اور ان کی ازواج امہات المومنین ہیں۔

پھر لکھا ہے:

بغوی نے کہا ہے کہ رسول کے نسب و سبب سے مراد قرآن اور ایمان ہے۔

اسی طرح یہ حضرات آل کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ آل رسول سے مراد ہر متقی مومن ہے۔ پھر درود بھیجتے ہوئے وَ اٰلِہٖ کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ بزعم خود، خود بھی آل میں شامل ہیں۔ و شهدوا علی انفسهم۔

---

[1] روح المعانی ۹: ۲۶۴، اخرجه الطبرانی والبیهقی والحاکم، تفسیر طبری ۶: ۴۰۳

خود اپنے موقف کے خلاف عملی شہادت دیتے ہیں۔

۳۔ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ: صور پھونکنے کے بعد کی حالت کا ذکر ہے کہ یہاں کوئی کسی کا حال نہیں پوچھے گا۔ ہر ایک کو اپنی فکر لاحق ہوگی:

لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝[1] — ان میں سے ہر شخص کو اس روز ایسا کام درپیش ہوگا جو اسے مشغول کر دے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝١٠٢ — ۱۰۲۔ پس جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی نجات پانے والے ہیں۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝١٠٣ — ۱۰۳۔ اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا ہو اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ۝١٠٤ — ۱۰۴۔ جہنم کی آگ ان کے چہروں کو جھلسا دے گی اور اس میں ان کی شکلیں بگڑی ہوئی ہوں گی۔

تشریح کلمات

تَلْفَحُ: (ل ف ح) اللفح۔ جھلسا دینا۔

كٰلِحُوْنَ: (ك ل ح) ترش روئی کے وقت دانت ظاہر ہونے کو الکلوح کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

آیت ۱۰۲۔۱۰۳ کی تشریح سورۃ الاعراف آیات ۸۔۹ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ: ان کے چہروں کو آتش نے مسخ کیا ہو گا۔ آگ سے چہرے کی کھال جھلس جانے کی وجہ سے بھنی ہوئی سری کی طرح ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ بدعمل لوگوں کے لیے نسب فائدہ نہیں دے گا۔

۲۔ اعمال کا وزن عند اللہ ہوتا ہے۔ اسی وزن کے مطابق اعمال کا اجر ملے گا۔

---

[1] ۸۰ عبس: ۳۷

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾	۱۰۵۔ کیا تم وہی نہیں ہو کہ جب میری آیات تمہیں سنائی جاتیں تو تم انہیں جھٹلاتے تھے؟
قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾	۱۰۶۔ وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار! ہماری بدبختی ہم پر غالب آ گئی تھی اور ہم گمراہ لوگ تھے۔
رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾	۱۰۷۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس جگہ سے نکال دے اگر ہم نے پھر وہی (جرائم) کیے تو ہم لوگ ظالم ہوں گے۔
قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾	۱۰۸۔ اللہ فرمائے گا: خوار ہو کر اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

تشریح کلمات

اخْسَـُٔوْا: (خ س ء) کسی کو دھتکارنے کے لیے اِخسأ کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ: ایک ایسا سوال جس میں ان کے جرائم کا پورا خاکہ موجود ہے اور آنے والے عذاب کا پورا نقشہ۔ وہ آیات الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں۔

۲۔ اعترافی جواب ہے: ہماری شقاوت اور بدبختی ہم پر غالب آ گئی تھی۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم تجاوز کار ظالم تھے۔

بعض حضرات نے اسے اعتذاری جواب قرار دیا ہے کہ یہ تکذیبی عناصر (گویا اشعری مذہب کے مطابق) یہ عذر پیش کر رہے ہوں گے: اے اللہ! ہم نے تیری آیات کی تکذیب اس لیے کی کہ تو نے ازل میں یہی لکھ دیا تھا۔ تیرا فیصلہ غالب آ گیا اور تکذیب ہو گئی۔ ہم نے اپنی خود مختاری سے تو نہیں کی۔[1]

صاحب محاسن التاویل کا جواب اشعری مذہب کے مطابق نہیں ہے اگرچہ اپنی جگہ درست ہے۔ جواب میں لکھتے ہیں:

انه باطل فی نفسه لما انه لا یکتب علیهم من السعادة و الشقاوة الا ما اعلم اللّٰه تعالیٰ انهم یفعلونه باختیارهم....۔	اول تو یہ نظریہ بذات خود باطل ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے ان کے حق میں وہ سعادت اور شقاوت ثبت فرمائی ہے جو یہ لوگ اپنے اختیار سے بجا لانے والے ہیں....۔

---

[1] محاسن التاویل ۷: ۳۰۴

۳۔ رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡهَا: آتش جہنم سے نکلنے کی خواہش کا اظہار ایک ناممکن امر کی درخواست ہے اور یہ وعدہ غلط اور جھوٹ ہے کہ ہم دوبارہ دنیا میں جا کر آیات الٰہی کی تکذیب کریں تو ہم سے بڑا ظالم کوئی نہ ہو گا۔

۴۔ قَالَ اخۡسَـُٔوۡا فِیۡهَا: جواب ملے گا: ذلت و خواری کے ساتھ اسی آتش میں پڑے رہو۔

۵۔ وَلَا تُکَلِّمُوۡنِ: مجھ سے بات نہ کرو۔ ان ظالموں نے اللہ سے اس وقت بات نہیں کی جب اللہ ان سے فرما رہا تھا: ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ دار امتحان میں جن لوگوں نے اللہ سے بات نہیں کی اور نہ اللہ کی بات سنی انہیں دار جزا میں بات کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔

اِنَّهٗ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡ عِبَادِیۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَ ارۡحَمۡنَا وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذۡتُمُوۡهُمۡ سِخۡرِیًّا حَتّٰۤی اَنۡسَوۡکُمۡ ذِکۡرِیۡ وَ کُنۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ تَضۡحَکُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

۱۰۹۔ میرے بندوں میں سے کچھ لوگ یقیناً یہ دعا کرتے تھے: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے ہیں پس ہمیں معاف فرما اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

۱۱۰۔ تو تم نے ان کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ انہوں نے تمہیں ہماری یاد سے غافل کر دیا اور تم ان پر ہنستے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّهٗ کَانَ فَرِیۡقٌ: تم نہ صرف میری آیات کی تکذیب بلکہ ان آیات پر ایمان لانے والوں کی توہین بھی کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ میرے بندے میری بارگاہ میں دعا کرتے تھے۔ اپنے ایمان کے حوالے سے مغفرت اور میرے رحم کے مقام کو سمجھ کر مجھ سے رحمت طلب کرتے تھے تم ان کا تمسخر اڑاتے تھے۔

۲۔ ان کے تمسخر میں تم اس حد تک مگن تھے کہ اس تمسخر میں مشغول رہنے کی وجہ سے تم نے مجھے اپنے ذہن سے نکال کر فراموش کر دیا تھا۔

۳۔ اَنۡسَوۡکُمۡ: ”مؤمنین نے تمہیں ذکر خدا سے غافل کر دیا“ سے مراد ہے کہ مؤمنین کا ایمانی وجود سبب بن گیا کہ تم نے ان مؤمنین کا تمسخر اڑایا۔ ان کا تمسخر سبب بن گیا کہ اللہ کا ذکر ان کے دلوں سے نکل جائے۔ اس لیے بطور ذکر سبب، اس کی نسبت مؤمنین کی طرف دی گئی ہے۔

اِنِّیۡ جَزَیۡتُهُمُ الۡیَوۡمَ بِمَا صَبَرُوۡۤا ۙ

۱۱۱۔ آج میں نے ان کے صبر کا انہیں یہ بدلہ دیا

اَنَّهُمۡ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾	کہ وہی لوگ کامیاب ہیں۔

تفسیر آیات

تمہارے تمسخر پر ان لوگوں نے جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا اس کا آج انہیں صلہ مل رہا ہے اور وہ حقیقی کامیابی پر فائز ہوگئے ہیں۔ الۡیَوۡمَ سے مراد یوم آخرت ہے اور اَنَّهُمۡ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ صرف یہی لوگ کامیاب ہیں۔ یعنی آخرت کے دن صرف مؤمن ہی کامیاب ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ آیات الٰہی کی تکذیب تمام جرائم کی جڑ ہے۔

۲۔ جو دنیا میں کلام خدا کی تکذیب کرتے رہے ہیں انہیں کل اللہ سے کلام کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

قٰلَ کَمۡ لَبِثۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ عَدَدَ سِنِیۡنَ ﴿۱۱۲﴾	۱۱۲۔ اللہ پوچھے گا: تم زمین میں کتنے سال رہے ہو؟

قَالُوۡا لَبِثۡنَا یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ فَسۡـَٔلِ الۡعَآدِّیۡنَ ﴿۱۱۳﴾	۱۱۳۔ وہ کہیں گے: ایک روز یا روز کا ایک حصہ (ہم وہاں) ٹھہرے ہیں، پس شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجیے۔

قٰلَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا لَّوۡ اَنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱۴﴾	۱۱۴۔ فرمایا: تم وہاں تھوڑا ہی (عرصہ) ٹھہرے ہو، کاش کہ تم (اس وقت) جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ قٰلَ کَمۡ لَبِثۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ: یہ سوال قیامت کے دن ان مشرکین سے ہوگا کہ تم نے اس زمین میں کتنی مدت زندگی گزاری؟ فِی الۡاَرۡضِ قرینہ بنتا ہے کہ سوال دنیا کی زندگی سے متعلق ہے۔ اگرچہ مجمع البیان اور المیزان کا موقف یہ ہے کہ سوال قبر میں رہنے کی مدت کے بارے میں ہے لیکن دیگر آیات کے شواہد کی بنا پر یہ سوال دنیا کی زندگی کے بارے میں ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ سورہ طٰہ آیت ۱۰۴ میں آیا ہے:

اِذۡ یَقُوۡلُ اَمۡثَلُهُمۡ طَرِیۡقَةً اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا یَوۡمًا ۝	جب ان میں سے زیادہ صائب الرائے کا یہ کہنا ہو گا کہ تم تو صرف ایک دن رہے ہو۔

پھر یہاں آخرت کی جزا کی زندگی کا دنیا کی امتحان کی زندگی کے ساتھ موازنہ ہوتا ہے۔ قبر کی مدت کو تو مَا لَبِثُوۡا غَیۡرَ سَاعَةٍ[۱] ایک گھڑی سے تعبیر کیا ہے۔

---

[۱] ۳۰ روم: ۵۵

۲۔ فَسۡـَٔلِ الۡعَآدِّیۡنَ : اعمال عباد پر نظر رکھنے والے فرشتے ہی مراد ہو سکتے ہیں۔
۳۔ قٰلَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا : یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ آخرت کی اس ابدی زندگی کے مقابلے میں تمہاری دنیاوی زندگی قلیل ہی ہے۔

اہم نکات

۱۔ آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی کے مقابلے میں دنیوی زندگی ایک دن ہی شمار ہوگی۔

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔ کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تمہیں عبث خلق کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے نہیں جاؤ گے؟

تفسیر آیات

۱۔ عَبَثًا : کھیل کے طور پر۔ کھیل کے لیے دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں:
i۔ تم نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ تمہاری خلقت کے سامنے کوئی معقولیت، کوئی غرض نہیں ہے۔ اس زندگی کا کوئی حساب، کوئی جوابدہی نہیں ہے۔
ii۔ کیا تمہارا یہ عقیدہ تھا: اَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ تمہیں ہمارے سامنے حاضر ہونا نہیں ہے؟ ظالم مظلوم یکساں ہیں، مجرم اور نیک برابر ہیں؟

اہم نکات

۱۔ اگر قیامت کا روز حساب نہ ہوتا تو خلقت عبث ہو جاتی ہے۔

فَتَعٰلَی اللّٰہُ الۡمَلِکُ الۡحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡکَرِیۡمِ ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ پس بلند و برتر ہے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عرش کریم کا مالک ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَتَعٰلَی اللّٰہُ : اللہ کی ذات اس تصور سے بالاتر ہے کہ کوئی کام بے مقصد اور عبث کرے۔ وہ ذات جن اوصاف کی مالک ہے اس سے عبث کا صادر ہونا ممکن نہیں ہے۔
۲۔ الۡمَلِکُ : وہ حقیقی بادشاہ ہے جیسے چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ موت و حیات اسی کے ہاتھ میں ہے۔
۳۔ الۡحَقُّ : ایسا بادشاہ جو حق و حقیقت کا مالک ہے۔ غیر معقول اور عبث کا تصرف نہیں کر سکتا۔
۴۔ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡکَرِیۡمِ : عرش کا مالک ہے۔ کائنات کے تدبیری امور اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

۵۔ الْكَرِيْمِ: عرش کو کریم کے ساتھ متصف کرنے کا یہ مقصد ہو سکتا ہے کہ چونکہ عرش اللہ تعالیٰ کے مقام تدبیری کا نام ہے لہٰذا کل کائنات پر اللہ کا کرم اس کے مقام تدبیری سے ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

۱۱۷۔ اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں ہے تو اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے اور کافر یقیناً فلاح نہیں پا سکتے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَعَ اللّٰهِ: اللہ کے ساتھ۔ یعنی اللہ کے وجود یا اللہ کی عبادت کے ساتھ۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوں گے: اللہ کے ہوتے ہوئے کسی اور معبود کو پکارتے ہیں۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے: اللہ کی عبادت کے ساتھ کسی اور معبود کی بھی عبادت کرتے ہیں۔

۲۔ لَا بُرْهَانَ لَهٗ: اس قسم کے شخص کے پاس اس موقف پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس سے یہ بات ملتی ہے کہ ہر موقف کے اختیار کرنے سے پہلے اس کے حق میں دلیل قائم ہونی چاہیے۔ یہاں تو اس موقف کے خلاف دلیل ہے۔

۳۔ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ: اس کا حساب اللہ کے پاس ہے۔ اسی کے حضور اس کو جواب دینا ہے۔ اگرچہ ان کے حساب کا نتیجہ یہی ہوگا: لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۔

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸۔ اور کہد یجیے: اے میرے پروردگار! معاف فرما اور رحم فرما اور تو سب سے بہترین رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

اسی دعا کی تلقین ہے جو اللہ کے خاص بندے مانگا کرتے اور مشرکین ان کا تمسخر کرتے تھے۔

خالی

سُورَۃُ النُّورِ

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ سورۃ مبارکہ مدینہ میں ہجرت کے پانچویں سال نازل ہوئی چونکہ واقعۂ افک ۵ ہجری کو غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر پیش آیا تھا۔ چنانچہ واقدی نے کتاب مغازی میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کے پانچوں سال دوم شعبان کو بنی مصطلق کے ساتھ جنگ کے لیے نکلے اور اول رمضان کو واپس مدینہ پہنچ گئے۔

کوفی قرائت کے مطابق اس سورۃ مبارکہ کی آیات کی تعداد ۶۴ ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں واقعہ افک کے علاوہ اسلام کے حیات آفرین نظام کے بعض اہم قوانین کا ذکر ہے۔

بہتان تراشی کو عظیم گناہ قرار دے کر احترام آدمیت کا زرین اصول وضع کیا گیا ہے۔ زنا کی سزا کا حکم بھی اس میں بیان ہوا ہے اور ساتھ زنا کے بہتان کی سزا کا بھی ذکر ہے۔

ایک اہم مسئلہ لعان بھی بیان ہوا ہے کہ غیرت کے نام پر قتل کی جگہ ایک حل پیش کیا گیا ہے جس میں غیرت کا تقاضا بھی پورا ہوتا ہے اور ناحق قتل کا عدم جواز بھی ثابت ہوتا ہے۔ گھر کی چار دیواری کے تقدس کا قانون بیان فرما کر اسلامی تہذیب کا ایک زرین اصول بیان فرمایا ہے۔ ایک اہم نکتہ جو اس سورۃ مبارکہ میں نازل ہوا ہے وہ نور الٰہی کو ایک محسوس چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر اس حقیقت کو دل نشین کرنا ہے۔

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ　بنام خدائے رحمٰن رحیم

سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَ فَرَضۡنٰہَا وَ اَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ①

۱۔ یہ ایک سورہ ہے جسے ہم نے نازل کیا اور اسے فرض کیا اور اس میں صریح آیات کو نازل کیا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

تشریح کلمات

سُوۡرَۃٌ: (س و ر) السورۃ کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں۔ سورۃ القرآن یا تو سور المدینۃ سے ہے چونکہ سورۃ بھی شہر پناہ کی طرح قرآن کا احاطہ کیے ہوئے ہے یا سورۃ بمعنی مرتبہ سے مشتق ہے۔

فَرَضۡنٰہَا (ف ر ض) فرض کے اصل معنی سخت چیز کاٹنے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ لازم اور مقرر کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سُوۡرَۃٌ: یہ مجموعہ کلام چند بنیادی احکام پر مشتمل ہے۔

۲۔ فَرَضۡنٰہَا: اسے ہم نے قطعی حکم کے طور پر نازل کیا ہے۔ دراصل اس جگہ فرض کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قطع الشیء الصلب کسی سخت چیز کو کاٹنے کے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی اس کا حکم اٹل ہے۔ سفارش نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنا لازم ہے۔

۳۔ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ: اس میں احکام پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں جن میں کسی قسم کا ابہام

نہیں ہے۔ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ تاکہ تم ان احکام سے سبق حاصل کرو۔

یہ سورہ ایسی تاکیدی تمہید کے ساتھ نازل ہو رہا ہے جو کسی دوسرے سورہ کے لیے دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ میں بیان ہونے والے احکام، اسلامی شریعت کے قطعی اور تغیر ناپذیر احکام ہیں۔

اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّ لَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَ لۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾

۲۔ زناکار عورت اور زناکار مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور دین خدا کے معاملے میں تمہیں ان پر ترس نہیں آنا چاہیے اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت موجود رہے۔

تشریح کلمات

جَلۡدَۃٍ: (ج ل د) کوڑے مارنا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا: زنا کی یہ تعریف کی گئی ہے: انسان کسی ایسی عورت کے ساتھ ہمبستری کرے جو اس پر حرام ہو۔ نہ اس کے ساتھ عقد کیا ہو، نہ اس کی مملوکہ ہو اور نہ از روئے شبہ ہو۔[1] اس میں قبل اور دبر میں فرق نہیں۔[2] مبانی میں محرمۃ کے بعد بالاصالۃ کی قید کا اضافہ کیا ہے کہ اصالۃً حرام ہو۔ عارضی طور پر حرام نہ ہو۔ جیسے حیض، روزہ اور احرام کی حالت میں اگر ہم بستری کرے تو حرام ہے، زنا نہیں ہے۔

فقہ حنفیہ زنا کی تعریف میں وطی فی الدبر (عمل قوم لوط) کو زنا میں شامل نہیں کرتے جب کہ مالکی، شافعی شامل کرتے ہیں۔ از روئے شبہ سے معلوم ہوا کہ اگر کسی عورت کے ساتھ اس گمان میں مباشرت کرے کہ وہ اس کی زوجہ ہے تو یہ زنا نہیں ہے۔ اسی طرح اس شبہ میں مباشرت کی کہ یہ عورت حلال ہے، بعد میں پتہ چلے حرام تھی، زنا نہیں ہے۔

---

[1] شہید ثانی المسالک۔ ۱۴: ۳۲۸ [2] الخوئی مبانی ۱: ۱۶۷

عقد کی قید سے ظاہر ہے اس عورت کے ساتھ ہم بستری زنا نہیں ہے جس کے ساتھ عقد کیا ہو۔ اگر ایسی عورت کے ساتھ عقد کیا جائے جو اس پر عقد سے حلال نہیں ہوتی جیسے ماں، بہن، بیٹی وغیرہ تو اس عقد کا کوئی اثر نہیں۔ ایسے عقد سے ہمبستری کی جائے تو وہ زنا ہے۔ یعنی زنا بامحرم ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت کو ہمبستری کے لیے کرایہ پر لیا جائے تو بھی زنا ہے۔ امام ابوحنیفہ ان دونوں جگہوں پر زنا نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں عقد کی وجہ سے زنا نہیں ہے۔ یعنی اگر کسی نے اپنی ماں، بیٹی کے ساتھ عقد کر کے ہمبستری کی تو یہ زنا نہیں ہے، عقد کی وجہ سے اور کرایہ پر لینے کی وجہ سے بھی زنا نہیں ہے۔[1] یعنی حد جاری نہ ہو گی۔

زنا پر اگر مجبور کیا گیا ہو تو حد نہیں ہے۔ جبر عورت پر تو ہو سکتا ہے لیکن کیا مرد پر بھی جبر ہو سکتا ہے؟ کہتے ہیں ایک امر کے شرعاً ممنوع ہونے کے باوجود فطرۃً خواہشات پیدا ہو سکتی ہیں لہٰذا مرد کو بھی مجبور کیا جا سکتا ہے۔

غیر اسلامی قوانین میں زنا کی تعریف میں ''زن غیر'' کی قید لگائی جاتی ہے۔ کسی کی زوجہ سے مباشرت کرے تو زنا ہے۔ اگر وہ کسی کی زوجیت میں نہیں ہے مثلاً کنواری ہے تو یہ زنا نہیں خواہ مرد شادی شدہ ہو یا نہ ہو۔ البتہ یہ ایک جرم ہے لیکن اس کی سزا نہیں ہے۔

مغربی دنیا میں زنا کا تصور صرف اور صرف جبر پر مبنی ہے۔ اگر طرفین مرضی سے مباشرت کریں تو یہ زنا اور جرم نہیں ہے۔

غیر کی عورت سے زنا کی سزا ہندوں میں یہ ہے کہ عورت کو کتوں کے سامنے ڈال دیا جائے تاکہ اسے چیر پھاڑ دیں۔ مرد کو لوہے پر لٹا کر آگ لگا دی جائے۔

یہودی قانون میں ہے:

> جو شخص دوسرے کی بیوی یعنی ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرے، زانی اور زانیہ دونوں ضرور جان سے مار دیے جائیں۔[2]
>
> اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو، دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال کر لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا۔[3]

اسلامی تعلیمات اس جرم پر سزا دینے پر انحصار نہیں کرتیں۔ سزا تو جرم سرزد ہونے کے بعد آخری حل ہے بلکہ اسلام اس جرم کا اپنی انسان ساز تعلیمات کے ذریعہ سدباب کرتا ہے۔

ا۔ اسلام، مسیحیوں کے برخلاف شادی کو ایک مقدس فریضہ سمجھتا ہے اور اس کی تشویق فرماتا ہے۔ سورہ نور میں فرمایا:

---

۱ الرخسی: المبسوط۔ ۹: ۵۸۔ ۸۵ ۲ احبار۔ ۲۰۔ ۱۰ ۳ استثناء ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۶

وَاَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَالصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَاِمَآئِكُمۡ‌ؕ اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۝[1]	اور تمہارے غلاموں اور کنیزوں میں سے جو صالح ہوں ان کا نکاح کر دو، اگر وہ نادار ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا، علم والا ہے۔
وَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ...[2]	اور اگر تم میں سے کوئی مالی رکاوٹ کی وجہ سے آزاد مسلم عورتوں سے نکاح کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو (اسے چاہیے کہ) وہ تمہاری مملوکہ مسلمان لونڈی سے نکاح کرے۔

۲۔ احادیث میں شادی کی اہمیت:

النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَنْ رَغِبَ عَنْهُ فَقَدْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي۔[3]	نکاح میری سنت ہے۔ جو اس سے منہ موڑتا ہے وہ میری سنت سے منہ موڑتا ہے۔
رَكْعَتَانِ يُصَلِّيهِمَا الْمُتَزَوِّجُ أَفْضَلُ مِنْ سَبْعِينَ رَكْعَةً يُصَلِّيهَا أَعْزَبُ۔[4]	شادی شدہ کی دو رکعت کنوارے (جس کی بیوی نہ ہو) کی ستر رکعتوں سے افضل ہے۔
مَا بُنِيَ فِي الْإِسْلَامِ بِنَاءٌ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ أَعَزُّ مِنَ التَّزْوِيجِ۔[5]	اسلام میں کوئی بنیاد ایسی نہیں ڈالی گئی جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک شادی سے زیادہ پسندیدہ اور محترم ہو۔
مَنْ تَزَوَّجَ أَحْرَزَ نِصْفَ دِينِهِ۔[6]	جو شادی کرتا ہے اس نے اپنا نصف دین بچا لیا۔

شادی نہ کرنے کی مذمت:

إِنَّ أَرَاذِلَ مَوْتَاكُمُ الْعُزَّابُ۔[7]	تمہارے مُردوں میں سب سے کم درجہ کنوارے مُردوں کا ہے۔
خِيَارُ أُمَّتِي الْمُتَأَهِّلُونَ وَ شِرَارُ أُمَّتِي الْعُزَّابُ۔[8]	میری امت کے نیک لوگ وہ ہیں جو شادی شدہ ہیں اور میری امت کے بدترین لوگ کنوارے لوگ ہیں۔
الْمُتَزَوِّجُ النَّائِمُ أَفْضَلُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الْعَزَبِ۔[9]	شادی شدہ کا نیند میں رہنا افضل ہے مجرد کے روزہ اور قیام (درعبادت) سے۔

۴۔ محرم نامحرم کی تمیز: اسلامی تعلیمات کا ایک اہم پہلو محرم، نامحرم کا تصور ہے۔ نامحرم کا مطلب یہ ہے کہ جس کے ساتھ شادی ہو سکتی ہے وہ مرد یا عورت نامحرم ہے۔ خواہ وہ سالی، سالہ یا شوہر کے بھائی یا بھائی

۱؎ ۲۴ نور: ۳۲ ۲؎ ۴ نساء: ۲۵ ۳؎ مستدرک ۱۴: ۱۵۲ ۴؎ الکافی ۵: ۳۲۸ ۵؎ مستدرک ۱۴: ۱۵۲
۶؎ الکافی ۵: ۳۲۸ ۷؎ الفقیہ ۳: ۳۸۴ ۸؎ مستدرک ۱۴: ۱۵۶ ۹؎ مستدرک ۱۴: ۱۵۵

کی زوجہ ہی کیوں نہ ہو۔

انسان پر واجب ہے کہ وہ نامحرم عورت کی طرف بقصد تلذذ نہ دیکھے:

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِہِمۡ ...[1] آپ مومن مردوں سے کہدیجیے: وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں....

وَ قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ یَغۡضُضۡنَ مِنۡ اَبۡصَارِہِنَّ ...[2] اور مومنہ عورتوں سے بھی کہدیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

حدیث میں آیا ہے:

لَكَ اَوَّلُ نَظْرَةٍ وِ الثَانِيَّةُ عَلَيْكَ وَلَا لَكَ۔[3] پہلی نگاہ تیرے حق میں ہے دوسری نگاہ تیرے حق میں نہیں ہے۔

یعنی پہلی نگاہ جائز ہے۔ دوسری نگاہ جائز نہیں ہے۔

مصری ایک شاعر نے خوب کہا ہے۔

نظرة فابتسامة فسلام
فكلام فموعد فلقاء
ایک نگاہ پھر ایک تبسم پھر سلام
پھر گفتگو، پھر طے، پھر ملاقات

۵۔ عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جائے۔

۶۔ زنا کو اسلام نے بدترین گناہ قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ سبع موبقات (سات ایسے گناہ جن کے ارتکاب پر جہنم ہے) میں شامل ہے۔

وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا ﴿﴾[4] اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یقیناً یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

فِي الزِّنَا خَمْسُ خِصَالٍ يَذْهَبُ بِمَاءِ الْوَجْهِ وَ يُورِثُ الْفَقْرَ وَ يَنْقُصُ الْعُمُرَ وَ يُسْخِطُ الرَّحْمَنَ وَ يُخَلِّدُ فِي النَّارِ، نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ.[5] زنا میں پانچ خصلتیں ہیں: بے آبرو ہوتا ہے. فقر کا باعث ہوتا ہے۔ عمر کوتاہ ہو جاتی ہے، خدائے رحمٰن ناخوش ہوتا ہے۔ جہنم میں ہمیشہ رہنا پڑتا ہے۔ ہم پناہ مانگتے ہیں اللہ کی جہنم کی آگ سے۔

اِذَا ظَهَرَ الزِّنَا مِنْ بَعْدِي كَثُرَ مَوْتُ الْفَجَأةِ۔[6] میرے بعد جب زنا عام ہو جائے تو مرگ مفاجات زیادہ ہو گی۔

---

[1] ۲۴ نور: ۳۰ [2] ۲۴ نور: ۳۱ [3] الفقیہ ۴: ۱۹ [4] ۱۷ بنی اسرائیل: ۳۲ [5] الکافی ۵: ۵۴۲ [6] الکافی ۲: ۳۷۴

اِذَا فَشَا الزِّنَا ظَهَرَتِ الزَّلْزَلَۃُ۔[1] جب زنا عام ہو جائے تو زلزلہ زیادہ آئے گا۔

۷۔ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے یہ فطری خواہش پوری کرنے کے لیے اسلامی قوانین نے اس مسئلے میں انسانی کمزوری کو سامنے رکھا ہے:

الف: چار شادیوں تک اجازت دی گئی تاکہ مرد ہر وقت اپنی خواہشات پوری کر سکے اور معاشرے میں کوئی عورت بے شوہر نہ رہے۔

ب: اگر سفر و دیگر حالات میں اس سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو موقت نکاح (متعہ) ایک بہترین حل ہے۔

ایک شخص ایک سے زیادہ شادی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور کبھی ایک شادی کرنے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ دوسری طرف حوادث اور جنگوں میں لوگ مارے جاتے ہیں۔ بہت سی جوان عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ بچے ساتھ ہونے کی وجہ سے ان سے کوئی شادی نہیں کرتا۔ اس صورت میں متعہ بہترین حل ہے۔ متعہ کے ہوتے ہوئے مسلمان زنا کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

اسی لیے عبد اللہ بن عباس کہا کرتے تھے:

> متعہ اس امت کے لیے ایک رحمت تھا۔ اگر اس سے روکا نہ گیا ہوتا تو سوائے شقی کے کوئی زنا کا مرتکب نہ ہوتا۔

زنا ان تمام قدروں کو پامال کرتا ہے جن پر خاندان کی تشکیل کا دار و مدار ہے اور نسلوں میں جرائم کے جرثومے خلط ملط ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے ایک بدخصلت معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

زنا اخلاقی قیود و حدود سے آزاد ہو کر ہوس رانی کی ایک درندگی ہے۔

زنا ناموس کی ہتک حرمت کے ساتھ ہوس پرستی کا غیر انسانی عمل ہے۔

احادیث کے مطابق زنا کے اثرات خود اس کا ارتکاب کرنے والے کی ناموس پر مترتب ہوتے ہیں۔

حدیث میں زنا کے مسئلے میں آیا ہے:

لَا تَزْنُوا فَتَزْنِیَ نِسَاؤُكُمْ ... كَمَا تَدِینُ تُدَانُ۔[2] لوگو! زنا نہ کرو ورنہ تمہاری عورتوں سے زنا ہو گا۔ جیسے تو کرے گا تیرے ساتھ وہی کچھ ہو گا۔

زنا کا ثبوت: ۱۔ اقرار: اقرار کے مؤثر ہونے کی چند شرائط ہیں:

i۔ بالغ ii۔ عاقل iii۔ اپنے اختیار سے ہو iv۔ غلام نہ ہو۔ v۔ اقرار کو چار مرتبہ دہرائے۔

حنفی اور حنبلی کا بھی یہی موقف ہے۔[3] مالکی اور شافعی کے نزدیک صرف ایک اقرار کافی ہے۔[4]

واضح رہے اسلامی تعلیمات اقرار بزنا کی تشویق نہیں کرتیں بلکہ اس بات کو ترجیح دی جاتی ہے کہ وہ

---

[1] الخصال ۱: ۲۸۷ [2] الکافی ۵: ۵۵۴ [3] سرخسی۔ المبسوط ۹: ۹۱ [4] بدایۃ المجتہد۔ ۲: ۴۳۸

اقرار نہ کرے۔ اپنے آپ کو معاشرے میں رسوا نہ کرے بلکہ اس عمل بد پر توبہ کرے۔ چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں ایک شخص نے زنا کا چار مرتبہ اقرار کیا۔ آپؑ ہر مرتبہ اسے ترغیب دیتے تھے کہ اقرار کو آگے مت بڑھائے۔ جب اس نے چار مرتبہ اقرار کیا تو فرمایا:

فَوَ اللّٰہِ لِتَوْبَتُہٗ فِیمَا بَیْنَہٗ وَ بَیْنَ اللّٰہِ اَفْضَلُ مِنْ اِقَامَتِی عَلَیْہِ الْحَدَّ ...[1]

قسم بخدا اس کا اپنے اور اللہ کے درمیان توبہ کرنا اس پر میری طرف سے حد جاری کرنے سے بہتر تھا۔

اگر کوئی زنا کا اقرار کرنے کے بعد انکار کرے تو سنگساری کی حد ساقط ہو گی۔ کوڑوں کی حد ساقط نہیں ہو گی۔ اگر بغیر شوہر کے حمل ٹھہر جائے، حد جاری نہ ہو گی کیونکہ ممکن ہے از روئے شبہ یا از روئے جبر یا از روئے مساحقہ ہو۔

۲۔ گواہ: گواہ سے زنا ثابت ہونے کے لیے درج ذیل شرائط ہیں:

i۔ چار عادل مرد گواہی دیں یا تین مرد، دو عورتیں۔ اگر گواہی دینے والے دو عادل مرد اور چار عورتیں ہوں تو اس سے حد ثابت ہوتی ہے، رجم نہیں۔

ii۔ گواہی مشاہدے کی دیں۔ اگر مشاہدہ کی گواہی نہ دیں تو گواہوں پر قذف کی حد جاری ہو گی۔

iii۔ گواہی ایک زمان اور ایک مکان کی ہو۔ اگر زمان و مکان میں اختلاف آ جائے تو زنا نہیں ہے۔ گواہوں پر قذف کی حد جاری ہو گی۔

iv۔ اگر چار مرد گواہوں نے ایک کنواری لڑکی کے قبل میں زنا کی گواہی دے دی مگر چار عورتوں نے گواہی دی کہ اس لڑکی کی بکارت باقی ہے تو اس لڑکی پر حد جاری نہ ہو گی۔

یہاں ایک مسئلہ پیش آتا ہے کہ ہمارے زمانے میں جو فیزیکل شواہد ہیں، مثلاً D.N.A کے ذریعہ زنا ثابت ہو گا یا نہ؟ ایک نظریہ یہ ہے کہ فیزیکل شواہد کی موجودگی میں گواہ کی نوبت نہیں آتی۔ فیزیکل شواہد اور گواہ میں اگر ٹکراؤ ہو جائے تو فیزیکل شواہد مقدم ہیں۔ جیسا کہ بکارت کے مسئلے میں گواہ پر فیزیکل شاہد مقدم ہے۔ ۴۲۷

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ حد ثابت ہونے کے دو طریقے ہیں: اقرار اور گواہ۔ کسی تیسرے طریقے سے حد ثابت نہ ہو گی۔

v۔ اگر گواہ چار سے کم ہوں تو گواہوں پر قذف کی حد جاری ہو گی۔ زنا کی حد جاری نہ ہو گی۔

vi۔ اگر گواہی پوری ہونے سے پہلے توبہ کر لے تو حد ساقط ہو گی۔

vii۔ ہر اس مقام پر جہاں شبہ لاحق ہو جائے، حد جاری نہ ہو گی۔ مثلاً اس نے اس عورت کے ساتھ اپنی زوجہ سمجھ کر یا حلال سمجھ کر یا حرام ہونے کا علم نہ ہونے کی وجہ سے مباشرت کی ہو تو حد جاری نہ ہو

---

[1] الکافی ۷: ۱۸۸

گی۔ اس کے لیے یہ حدیث بنیاد ہے:

ادْرَءُ وا الْحُدُودَ بِالشُّبْهَاتِ.... [1] شبہ لاحق ہونے کی صورت میں حد جاری نہ کرو۔

viii۔ اگر محارم عورتوں ماں، بیٹی، بہن کے ساتھ عقد کر کے (معاذ اللہ) ہمبستری کرے تو زنا بامحرم کی حد ہوگی۔ عقد کی وجہ سے حد ساقط نہ ہوگی۔ فقہ حنفی میں عقد کی وجہ سے یہ زنا نہیں ہے حد جاری نہ ہوگی۔ خواہ حرمت کا علم ہو تو بھی۔ [2]

ix۔ جبر کی صورت میں حد جاری نہ ہوگی۔ عورت پر جبر تو ہو سکتا ہے لیکن مرد پر جبر کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ بعض کہتے ہیں جبر کی صورت میں خواہش کیسے بیدار ہوگی؟ لیکن اکثر کا یہ نظریہ ہے کہ شرعاً حرام ہونے اور فطرۃً خواہش بیدار ہونے میں منافات نہیں ہے۔ لہٰذا مرد پر بھی جبر چل سکتا ہے۔

حدود و تعزیرات

۱۔ قتل:

الف: اپنی محرم عورتوں سے زنا کرنے کی سزا قتل ہے۔

ب: کافر ذمی، مسلم عورت سے زنا کرے۔

ج: کسی عورت پر جبر کر کے زنا کرے تو ان سب میں سزا قتل ہے۔

۲۔ رجم (سنگسار): اگر شادی شدہ شخص جس کی عورت اس کی دست رسی میں ہو اور اس سے مباشرت کرنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو، زنا کرے تو اس کی سزا سنگسار کرنا ہے۔

سنگسار کیے جانے کی سزا کے لیے درج ذیل شرائط موجود ہونی چاہئیں:

الف۔ بالغ و عاقل ہو۔ نابالغ اور مجنون ہو تو رجم نہیں ہے۔

ب۔ غلام نہ ہو۔ اگر غلام ہو تو رجم نہیں ہے۔

ج۔ حلال عورت اس کی دست رسی میں ہو۔ جب چاہے اس کے ساتھ مباشرت کر سکتا ہو۔ اگر اس سے دور ہونے کی وجہ سے اس کی دست رسی میں نہ ہو تو یہ سزا نہ ہوگی۔ اسے فقہی اصطلاح میں زناء المحصن، احصان یعنی حفاظتی حصار میں ہونے والے کا زنا کہتے ہیں۔ احصان حفاظتی قلعہ میں آنے کو کہتے ہیں۔ یعنی شادی کرنے کے بعد جنسی خواہشات کی طغیانی سے بچانے والے حصار میں آنے کے بعد بھی زنا کرتا ہے تو اس کی سزا رجم، سنگسار کرنا ہے۔

مندرجہ بالا شرائط کے ساتھ اگر عمر رسیدہ بھی ہو تو پہلے کوڑے مارے جائیں گے بعد میں سنگسار ہوگا اور اگر جوان ہو تو بعض کے نزدیک صرف رجم ہے اور بعض کے نزدیک اس کے لیے بھی تازیانہ اور رجم دونوں

---

[1] الفقیہ ۴: ۷۴

دونوں سزائیں ہیں۔ حنبلی کا بھی یہی نظریہ ہے۔

۳۔ تازیانہ: یہ ایسے لوگوں کی سزا ہے جو رجم کی سزا کی شرائط نہیں رکھتے۔ ساتھ یہ بھی ہے کہ مرد ہو۔ ایسے لوگوں کی سزا ایک سو تازیانے، ایک سال علاقہ بدری اور سر منڈوانا ہے۔ عورت ہو تو صرف تازیانے ہے۔ اس میں اصل وہ حدیث ہے جو رسول کریمؐ سے روایت ہے:

البکر بالبکر جلد مأة وتغریب عام والثیب بالثیب جلد مأة و رجم[1]

غیر شادی شدہ مرد کا غیر شادی شدہ عورت کے ساتھ ہو تو ایک سو کوڑے ایک سال علاقہ بدری، شادی شدہ کے ساتھ ہو تو سو کوڑے اور سنگساری ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت میں آیا ہے:

الشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ جُلِدَ مِائَۃُ وَالرَّجْمَ وَ الْبِکْرُ وَالْبِکْرَۃُ جُلِدَ مِائَۃُ وَ نَفْیَ سَنَۃٍ ...۔[2]

عمر رسیدہ مرد اور عمر رسیدہ عورت اگر زنا کریں سو کوڑے اور سنگسار ہے اور کنوارا اور کنواری اگر زنا کریں تو سو کوڑے اور سال کے لیے علاقہ بدری ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت کردہ حدیث سے صحیح مسلم کی روایت کردہ حدیث کی تشریح ہوتی ہے چونکہ غیر شادی شدہ خواہ شادی شدہ عورت سے زنا کرے یا غیر شادی شدہ عورت سے، سزا ایک ہے۔ یہی صورت عورت کی بھی ہے کہ اس سے زنا کرنے والا خود شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اس کی ایک ہی سزا ہے۔

امام صادق علیہ السلام کی روایت میں یہ بات واضح ہے کہ عمر رسیدہ مرد اگر زنا کرے دوسری طرف جو بھی ہو، اسی طرح عمر رسیدہ عورت زنا کرے دوسری طرف جو بھی ہو تو اس کی سزا سو تازیانہ اور رجم ہے۔

اسی طرح اگر غیر شادی شدہ مرد زنا کرے دوسری طرف جو بھی ہو اور شادی شدہ عورت زنا کرے ۴۲۹
دوسری طرف جو بھی ہو، اس کی سزا سو کوڑے اور جلا وطنی ہے۔ اگر عورت ہو تو علاقہ بدری نہ ہو گی۔ مالکی کا بھی یہی موقف ہے۔

سخت سردی اور گرمی میں حد جاری نہ ہو گی۔ سردیوں میں دن کے وسط میں اور گرمیوں میں دن کی ابتدا یا آخر میں جاری کی جائے گی۔ مریض پر صحت یاب ہونے تک حد جاری نہ ہو گی۔ اگر حد جاری کرنا ضروری ہو تو ایک سو تیلیوں پر مشتمل ایک گچھ ایک بار مارنا چاہیے۔

واضح رہے کہ حقوق اللہ میں حد جاری کرنا شرعی حاکم کی ذمے داری ہے۔ دوسرے لوگ کوئی سزا جاری نہیں کر سکتے۔ اگر حقوق العباد میں سے ہو، جیسے قذف تو متاثرہ شخص کے مطالبے پر حد جاری کی جائے گی۔

تازیانہ اور رجم کے بھی احکام و آداب ہیں جو ایک مہذب اور دستوری نظام کے آئینہ دار ہیں۔ ان

---

[1] سنن دارمی ۲: ۱۸۱۔ صحیح مسلم ۳: ۱۳۱۶
[2] الفقیہ: ۲۶

کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں درج ہے۔

۲۔ وَّلَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ: اسلامی سزاؤں کے اجراء کے سلسلے میں جذبات و احساسات کا غالب آنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے ذہن پر اللہ تعالیٰ کی حکمت و حاکمیت حاکم نہیں ہے۔

۳۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ: اللہ اور آخرت پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ دین خدا کے سلسلے میں جذبات غالب نہ آئیں۔

اس سلسلے میں ایک حدیث قابل ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

يُؤْتَى بِوَالٍ نَقَصَ مِنَ الْحَدِّ سَوْطاً فَيَقُولُ رَبِّ رَحْمَةً لِعِبَادِكَ فَيُقَالُ لَهُ أَنْتَ أَرْحَمُ بِهِمْ مِنِّي فَيُؤْمَرُ بِهِ إِلَى النَّارِ وَ يُؤْتَى بِمَنْ زَادَ سَوْطاً فَيَقُولُ لِيَنْتَهُوا عَنْ مَعَاصِيكَ فَيُؤْمَرُ بِهِ إِلَى النَّارِ۔[1]

قیامت کے دن ایک حاکم کو لایا جائے گا جس نے ایک تازیانہ کم مارا تھا۔ اس سے پوچھا جائے گا کیوں کم کیا؟ وہ کہے گا: تیرے بندے پر رحم کھا کر۔ اللہ فرمائے گا تو مجھ سے زیادہ رحم کرنے والا بن گیا ہے؟ اسے آتش کی طرف روانہ کرے گا۔ پھر ایک اور شخص لایا جائے گا جس نے ایک تازیانہ زیادہ مارا تھا۔ اس سے پوچھا جائے گا: تو نے زیادہ کیوں مارا؟ وہ کہے گا: تاکہ تیری نافرمانی سے باز آ جائے۔ فرمائے گا: تو مجھ سے زیادہ حکمت والا تھا۔ اسے بھی آتش کی طرف روانہ کیا جائے گا۔

۴۔ وَلۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: مومنین کی ایک جماعت وہاں حاضر رہے تاکہ معاشرے میں اس جرم کے انجام بد کا شعور پھیلے اور لوگ باز آ جائیں۔ جس زانی نے چار گواہوں کی طرف سے گواہی دینے کی حالت میں زنا کا ارتکاب کر کے اپنا پردہ چاک کیا ہے اس کے لیے کسی قسم کی ستر پوشی نہیں ہے۔

اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّ الزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳﴾

۳۔ زانی صرف زانیہ یا مشرکہ سے نکاح کرے گا اور زانیہ صرف زانی یا مشرک سے نکاح کرے گی اور مومنوں پر یہ حرام کیا گیا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ زانی زنا کاری میں مشہور ہو۔ اس پر حد بھی جاری ہو چکی ہو، پھر بھی

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۸: ۳۷

اس نے توبہ نہ کی ہو، اس پر پاکدامن عورتیں حرام ہیں۔ وہ صرف اپنی طرح کی کسی زانی عورت یا مشرکہ سے شادی کر سکتا ہے۔

اسی طرح اگر ایک عورت زنا کاری میں شہرت رکھتی ہے، اس پر حد جاری ہو چکی ہے اور توبہ کے آثار نہیں ہیں۔ ایسی عورت پاکباز مردوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔ اس کا کوئی زانی مرد یا مشرک ہی جفت ہو سکتا ہے۔ (المیزان)

چنانچہ احادیث بھی اس تفسیر کی تائید میں ہیں۔ حضرت امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

هُمْ رِجَالٌ وَ نِسَاءٌ كَانُوا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ مَشْهُورِينَ بِالزِّنَا فَنَهَى اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَنْ أُولَئِكَ الرِّجَالِ وَ النِّسَاءِ وَ النَّاسُ الْيَوْمَ عَلَى تِلْكَ الْمَنْزِلَةِ مَنْ شَهَرَ شَيْئاً مِنْ ذَلِكَ أَوْ أُقِيمَ عَلَيْهِ الْحَدُّ فَلَا تُزَوِّجُوهُ حَتَّى تُعْرَفَ تَوْبَتُهُ۔[1]

یہ ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں ہے جو عہد رسالت میں زنا کاری میں مشہور تھے۔ ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں اللہ نے منع کیا ہے۔ آج بھی لوگوں کے لیے یہی صورت ہے کہ جو بھی ایسے امور کے ارتکاب میں شہرت رکھتا ہو یا اس پر حد جاری کی گئی ہو تو ایسے فرد کے ساتھ شادی نہ کرو جب تک توبہ نہ کرے۔

ہم اسی تفسیر پر اکتفا کرتے ہیں دیگر تفاسیر کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

وَ الَّذِيۡنَ يَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡهُمۡ ثَمٰنِيۡنَ جَلۡدَةً وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۴

۴۔ اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں پھر اس پر چار گواہ نہ لائیں پس انہیں اسّی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی گواہی ہرگز قبول نہ کرو اور یہی فاسق لوگ ہیں۔

تشریح کلمات

الۡمُحۡصَنٰتِ: (ح ص ن) الاحصان کے اصل معنی المنع لتحصنکم من بأسکم یعنی تحفظ اور حفاظتی حصار میں آنے کی صورت پر گزند کا چھونا منع ہو جاتا ہے۔ اسی سے قلعہ کو الحصن کہتے ہیں۔ اسی معنی کے لحاظ کے ساتھ قرآن میں یہ لفظ درج ذیل معانی میں استعمال ہوا ہے:

---

[1] الکافی ۵: ۳۵۵

i۔ آزاد غیر مملوک: فَعَلَیۡہِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَی الۡمُحۡصَنٰتِ ... [1]۔ اس آیت میں الۡمُحۡصَنٰتِ سے مراد آزاد عورتیں ہیں جو کنیز نہیں ہیں۔ مملوکیت جن کے لیے منع ہے۔

ii۔ شادی شدہ: وَّ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ ... [2]۔ الۡمُحۡصَنٰتُ سے یہاں منکوحہ عورتیں مراد ہیں جو مرد کے حفاظتی حصار میں آ گئی ہوں۔

iii۔ پاکدامنی: وَ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ۔ یہاں الۡمُحۡصَنٰتِ پاکدامن عورتیں ہیں جو اپنی عفت کو حفاظت میں رکھتی ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ: الرمی کسی نشانی پر کوئی چیز پھینکنے کو کہتے ہیں۔ یہاں پاکدامن عورتوں پر بے عفتی کا بہتان لگا کر ان کی عزت و وقار کو مجروح کرنے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

۲۔ الۡمُحۡصَنٰتِ: اس جگہ الۡمُحۡصَنٰتِ سے مراد پاکدامن عورتیں ہیں۔ وہ عورتیں جن کی بے عفتی پر چار گواہ مکمل نہ ہوئے ہوں پاکدامن شمار ہوتی ہیں۔ یعنی شرعاً پاکدامن ہیں۔ واقع کے اعتبار سے ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔

۳۔ ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ: زنا کا الزام لگانے کے بعد چار گواہ پیش نہ کر سکے تو یہ قابل سرزنش جرم ہے۔

آیت میں اگرچہ عورتوں کا ذکر ہے لیکن یہ حکم مردوں پر بہتان لگانے والوں کے لیے بھی ہے۔ اس طرح کہ آیت میں یَرۡمُوۡنَ جمع مذکر استعمال ہوا ہے کہ بہتان لگانے والے مردوں کا ذکر ہے لیکن اگر عورتیں کسی پر زنا کا الزام لگاتی ہیں تو ان کا بھی یہی حکم ہے۔ اس الزام کو فقہی زبان میں قذف کہتے ہیں۔

قذف کے الفاظ: کوئی کسی سے کہہ دے: تو زانی ہے، تو نے زنا کیا ہے، تو نے بدفعلی کی ہے، تیرے ساتھ بدفعلی ہوئی ہے اور ان تعبیروں سے زنا اور بدفعلی (عمل قوم لوط) سمجھی جاتی ہے تو یہ قذف ہے۔ ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ ان الفاظ کا کہنے والا بھی اس کے مفہوم سے باخبر ہو۔

یہ تعبیرات بھی قذف ہیں: تو اپنے باپ کا نہیں ہے۔ اے زانیہ کے بیٹے، کہنے کی صورت میں اس کی ماں پر قذف ہے۔ اسی طرح ہر وہ تعبیر جس سے زنا کا الزام سمجھا جاتا ہے قذف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تکویناً و تشریعاً عزت بخشی ہے:

وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ ... [3]	ہم نے اولاد آدم کو عزت و تکریم سے نوازا ہے۔
لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ [4]	تحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔
وَ صَوَّرَکُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَکُمۡ ... [5]	اور اس نے تمہاری صورت بنائی تو بہترین صورت بنائی۔

---

[1] ۴ نساء: ۲۵ [2] ۴ نساء: ۲۴ [3] ۱۷ بنی اسرائیل: ۷۰ [4] ۹۵ تین: ۴ [5] ۶۴ تغابن: ۳

تشریع یعنی قانون کے ذریعے مومن کی عزت و تکریم کی صورت یہ ہے کہ اس کے وقار کو مجروح کرنا حرام ہے۔ خواہ اس خامی کو فاش کر کے ہی کیوں نہ ہو جو اس میں حقیقتاً موجود ہے جسے غیبت کہتے ہیں۔

مؤمن کی عزت و وقار کے تحفظ کے سلسلے میں اہم ترین قانون قذف کا قانون ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مؤمن پر زنا کا الزام لگاتا اور چار گواہوں سے ثابت نہیں کر سکتا ہے تو:

i۔ اس پر اسی (۸۰) کوڑے برساؤ: فَاجۡلِدُوۡهُمۡ ثَمٰنِیۡنَ جَلۡدَۃً...۔

ii۔ ایسے الزام لگانے والوں کی گواہی قبول نہ کرو: وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَۃً اَبَدًا۔

iii۔ ایسے لوگ فاسق ہیں: وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤمن کا وقار مجروح کرنا کس قدر سنگین جرم ہے۔

اس قسم کی الزام تراشیاں عام ہونے سے زنا کے عام ہونے کا راستہ بھی ہموار ہو جاتا ہے کہ محلے شہر، علاقے میں کہاں کہاں یہ جرم ہو رہا ہے اور کون کون سے لوگ اس جرم میں ملوث ہیں۔ قذف کے مرتکب میں یہ شرائط ہونی چاہئیں:

i۔ بالغ ہو۔ بچہ قذف کرے تو حد نہیں ہے، البتہ تعزیری سزا ہے۔

ii۔ عاقل ہو۔ مجنون کا قذف مؤثر نہیں ہے۔

مقذوف، جس پر بہتان لگایا گیا ہے اس میں درج ذیل شرائط ہونی چاہئیں:

i۔ بالغ ہو۔ اگر کسی بچے پر الزام لگایا ہے تو تعزیر ہے، حد نہیں ہے۔

ii۔ عاقل ہو۔

iii۔ مسلمان ہو۔ اگر کافر پر الزام لگایا جائے تو حد نہیں تعزیر ہے۔

iv۔ عفت کا مالک ہو۔ اگر زانی مشہور ہو تو حد نہیں ہے۔

v۔ اپنا بیٹا نہ ہو۔ اگر باپ اپنے بیٹے پر الزام لگاتا ہے تو حد نہیں، تعزیر ہے۔

حد قذف: قذف کے مرتکب پر حد جاری ہو گی جو اسی (۸۰) کوڑے ہے جو کپڑوں کے اوپر درمیانی طریقہ سے مارے جائیں گے۔ یعنی زنا کی حد میں مارے جانے والے کوڑوں سے کچھ نرم۔ قذف کی حد مقذوف کے مطالبے پر جاری ہو سکتی ہے۔ اگر مقذوف مطالبہ نہ کرے، کسی اور کو حد جاری کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر مقذوف نے ایک مرتبہ معاف کیا ہو تو دوبارہ حد جاری کرنے کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

حد کے مطالبے کا حق جیسے خود مقذوف کو ہے، اس کے وارث کو بھی حق ہے کہ اپنے مرحومین پر قذف کی حد جاری کی جائے۔

۴۔ وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَۃً اَبَدًا: قذف کرنے والے اب کسی معاملے میں شہادت دینے کے قابل نہ رہے اور نہ ان کی بات قابل وثوق رہی۔ اب لوگوں میں ان کا کوئی اعتبار نہیں رہا۔

۵۔ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ: اب یہ لوگ فاسق اور منحرف شمار ہوں گے۔

واضح رہے قذف کی ایک سزا تو جسمانی ہے، اسی (۸۰) تازیانے۔ دوسری سزا نفسیاتی ہے کہ معاشرے میں بے اعتبار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا ۚ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵﴾

۵۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں، اس صورت میں اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

قذف کا مرتکب ہونے کے بعد جو لوگ توبہ کرتے ہیں وہ فاسق نہیں رہتے۔ ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں:

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ۔[1] گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہو جاتا ہے جس سے گناہ سرزد ہوا ہی نہیں۔

کیا یہ استثنا سابقہ جملے (عدم قبول شہادت) کی طرف بھی سرایت کرے گا؟ یہاں ایک اصول فقہ کی بحث ہے جو ہماری تفسیری دائرہ بحث سے خارج ہے تاہم ایک مختصر اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ بحث یہ ہے:

اگر متعدد جملوں کے بعد ایک استثنا آجائے تو یہ استثناء صرف آخری جملہ کی طرف جائے گا یا سب جملوں کی طرف۔ مثلاً یہ حکم مل جائے: علماء کا احترام کرو، فقراء کی کمک کرو، سوائے ان لوگوں کے جو سیاسی ہیں تو یہ استثناء آخری جملے فقراء کے ساتھ مخصوص ہے یا دونوں جملوں کے ساتھ۔

زیر بحث آیت میں توبہ کرنے والوں کا استثناء آخری جملہ فاسقون کے ساتھ مختص ہے یا دونوں جملوں سے استثناء ہے۔ اگر صرف آخری جملہ کے ساتھ مختص ہے تو ان قذف کرنے والوں کی شہادت ناقابل قبول ہو گی اور اگر دونوں جملوں کے ساتھ ہے تو توبہ کے بعد ان کی شہادت قبول ہو جائے گی۔

زیادہ مورد قبول موقف یہاں یہ ہے کہ آخری جملے سے تو یقیناً استثناء ہو جائے گا اس کے بعد دوسرے جملوں سے استثنا و عدم استثنا قرائن پر موقوف ہے۔ اگر کوئی قرینہ نہیں ہے تو صرف آخری جملہ سے استثنا سمجھا جائے گا۔

چنانچہ اس آیت میں یہ قرینہ سمجھا جاتا ہے کہ جب توبہ کے بعد فاسق نہ رہے تو غیر فاسق کی شہادت قبول ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ استثناء دونوں جملوں کی طرف جائے گا۔

---

[1] الکافی ۲: ۴۳۵

واضح رہے اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا کا استثناء پہلے حکم یعنی قذف کی سزا سے متعلق نہیں ہو سکتا چونکہ اس کا تعلق مقذوف سے ہے جس میں توبہ مؤثر نہیں ہے۔ توبہ ان باتوں سے متعلق ہوتی ہے جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

چنانچہ مقذوف اگر معاف کر دے تو حد ساقط ہے۔ معاف کرنے کے بعد مقذوف دوبارہ حد کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

وَ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ اَزۡوَاجَہُمۡ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہُمۡ شُہَدَآءُ اِلَّاۤ اَنۡفُسُہُمۡ فَشَہَادَۃُ اَحَدِہِمۡ اَرۡبَعُ شَہٰدٰتٍۭ بِاللّٰہِ ۙ اِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۶﴾

۶۔ اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت یہ ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ سچا ہے۔

وَ الۡخَامِسَۃُ اَنَّ لَعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَیۡہِ اِنۡ کَانَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۷﴾

۷۔ اور پانچویں بار کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ اَزۡوَاجَہُمۡ: سابقہ آیت میں غیروں پر الزام کا حکم بیان ہوا۔ اس آیت میں انسان اگر اپنی زوجہ پر زنا کا الزام لگاتا ہے تو اس کا حکم بیان ہوا ہے۔

حضرت سعد بن عبادہ انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے دریافت کیا: اگر میں اپنے گھر میں یہ معاملہ خود دیکھ لوں تو میں کیا چار گواہوں کو لے کر آؤں؟ تب تک یہ فارغ ہو کر چلا جائے گا۔ اگر میں اس واقعہ کو بیان کروں تو کیا میں اپنی پیٹھ پر اسی تازیانے کھاؤں؟... اسی اثنا میں ہلال بن امیۃ حاضر ہوا اور کہا: میں نے ایک شخص کو اپنی عورت کے ساتھ دیکھا۔ حضورؐ کے چہرے پر کراہت کے آثار نمودار ہوئے تو ہلال نے کہا: اللہ جانتا ہے میں سچا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کوئی حل نازل فرمائے گا.... اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر اپنی زوجہ پر زنا کا الزام لگائے اور چار گواہ پیش نہ کر سکے تو وہ چار گواہ پیش کرنے کی جگہ چار مرتبہ یہ کہے گا کہ میں اللہ کے ساتھ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچا ہے۔

چار مرتبہ اس عبارت کو دہرانے سے اپنی زوجہ پر زنا کے الزام میں قذف کی سزا سے بری ہو جائے گا۔

پانچویں مرتبہ وہ یہ کہے: اگر وہ اس الزام میں جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

وَ يَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ﴿۸﴾

۸۔ اور عورت سے سزا اس صورت میں ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔

وَ الْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۹﴾

۹۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر وہ سچا ہے۔

تفسیر آیات

عورت سے زنا کی سزا اس وقت ٹل جائے گی اگر عورت چار مرتبہ یہ کہے: میں اللہ کے ساتھ گواہی دیتی ہوں کہ شوہر اپنے الزام میں جھوٹا ہے۔

پانچویں مرتبہ یہ کہے: اگر شوہر سچا ہے تو اللہ کا غضب ہو اس پر۔

اس عمل کو فقہی اصطلاح میں لعان کہتے ہیں۔ اگر زن و شوہر درج بالا طریقے سے لعان کریں تو یہ عورت اس مرد پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔

لعان کی شرائط:

i۔ لعان کے طرفین کا مکلّف ہونا شرط ہے۔ یعنی بالغ، عاقل ہوں۔

ii۔ عورت گونگی بہری نہ ہو۔

iii۔ عورت کے ساتھ ہمبستری ہو چکی ہو۔

iv۔ صیغہ لعان میں اشھد (شہادت دیتا ہوں/ دیتی ہوں) کا تلفظ ہو۔

v۔ صیغہ تلفظ کے وقت دونوں کھڑے ہوں۔

vi۔ ابتدا شوہر کی طرف سے ہو اور اس عورت کا تعین کرے جس کا لعان کرنا مقصود ہے۔

vii۔ صیغہ لعان عربی میں جاری کریں۔ اگر ممکن نہیں ہے تو غیر عربی میں بیان ہو سکتا ہے۔

viii۔ حاکم شرع کے سامنے لعان ہو۔ یعنی شرعی عدالت میں لعان کریں۔

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو تمہیں اس سے خلاصی نہ ملتی) اور یہ کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

اگر قانون لعان کے ذریعے اللہ نے تمہیں تحفظ نہ دیا ہوتا تو یہ بات شوہر کے لیے ناقابل حل ہوتی

کہ ایک طرف اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی زوجہ کی بے عفتی کا مشاہدہ کیا ہے، دوسری طرف اگر اس بات کا اظہار کرے تو الٹا تازیانے پڑ جاتے ہیں اور اگر مرد کی گواہی کو ثبوت زنا کے لیے کافی سمجھا جاتا تو مردوں کے لیے اپنی عورت کو مورد الزام ٹھہرانے کا ایک بہت بڑا بہانہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اس لیے ایسا قانون وضع فرمایا کہ غیرت و حمیت کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں اور دنیوی اعتبار سے عار و ننگ سے بچ جائیں۔ واقع میں اگرچہ ایک سچا اور دوسرا جھوٹا ہے تاہم کون سچا اور کون جھوٹا ہے؟ پردہ رہ جائے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡكِ عُصۡبَةٌ مِّنۡكُمۡ‌ؕ لَا تَحۡسَبُوۡهُ شَرًّا لَّـكُمۡ‌ؕ بَلۡ هُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ؕ لِكُلِّ امۡرِىٴٍ مِّنۡهُمۡ مَّا اكۡتَسَبَ مِنَ الۡاِثۡمِ‌ۚ وَالَّذِىۡ تَوَلّٰى كِبۡرَهٗ مِنۡهُمۡ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۝۱۱

۱۱۔ جو لوگ بہتان باندھ لائے وہ یقیناً تمہارا ہی ایک دھڑا ہے، اسے اپنے لیے برا نہ سمجھنا بلکہ وہ تمہارے لیے اچھا ہے، ان میں سے جس نے جتنا گناہ کمایا اس کے لیے اتنا ہی حصہ ہے اور ان میں سے جس نے بڑا حصہ لیا ہے اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔

تشریح کلمات

الافك: (ا ف ك) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔ جھوٹ بھی چونکہ اصلیت اور حقیقت سے پھرا ہوتا ہے اس لیے اس پر بھی افك کا لفظ بولا جاتا ہے۔

عُصۡبَةٌ: (ع ص ب) وہ جماعت جس کے افراد ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہوں۔

تفسیر آیات

یہ واقعہ کسی زوجہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے متعلق ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ زوجہ ماریہ قبطیہ ہے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عائشہ سے متعلق ہے۔ واقعہ کی راوی خود حضرت عائشہ ہیں۔ فرماتی ہیں:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب سفر پر نکلتے تو اپنی زوجات میں سے قرعے کے ذریعے ایک کا انتخاب کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ ایک غزوہ کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا۔ یہ واقعہ حکم حجاب نازل ہونے کے بعد کا تھا۔ مجھے اپنے ہودے میں اٹھایا اور بٹھایا جاتا تھا۔ واپسی پر جب مدینہ کے نزدیک پہنچے تو رات کو چلنے کا اعلان ہوا تو میں اٹھ کر رفع حاجت کے لیے لشکر سے دور نکل

گئی۔ جب میں واپس آئی تو پتہ چلا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر گر گیا ہے۔ میں اس ہار کو تلاش کرنے میں لگ گئی۔ ادھر قافلہ والوں نے میرے ہودے کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا۔ ان کا خیال تھا میں ہودے کے اندر موجود ہوں۔ اس زمانے میں عورتیں غذا کی کمی وجہ سے ہلکی ہوتی تھیں اس لیے انہیں محسوس نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ جب میں واپس پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں اپنی چادر اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی اور سوچ لیا کہ وہ جب انہیں ہودے میں نہیں پائیں گے تو خود ہی تلاش کرنے آ جائیں گے۔ اتنے میں مجھے نیند آ گئی۔

صبح کے وقت صفوان بن معطل سلمی کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا چونکہ حجاب کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے کئی بار دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ انہوں نے اپنا اونٹ میرے پاس بٹھا دیا۔ دوپہر کے قریب ہم نے لشکر کو جا لیا۔

اس پر کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ پر بہتان تراشنا شروع کیا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد شہر میں اس بہتان کی خبریں ہر طرف پھیل گئیں۔

ا۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡکِ عُصۡبَۃٌ مِّنۡکُمۡ: جن لوگوں نے یہ بہتان گھڑا ہے وہ خود تمہارے اندر کا ایک ٹولہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا افك (بہتان) کے مرتکب ایک نہیں کئی افراد تھے۔ مِّنۡکُمۡ سے معلوم ہوا وہ مسلمانوں کی جماعت کے اندر موجود لوگ ہیں۔

اصحاب افک (بہتان کا چرچا کرنے والے) کون تھے۔

حضرت عائشہ کے خلاف تہمت لگانے والے درج ذیل افراد کا ذکر ملتا ہے:

i۔ عبد اللہ بن أبی جو منافقوں کا سردار تھا۔

ii۔ زید بن رفاعہ جو قابل قدر شخصیت کا مالک نہ تھا۔

iii۔ مسطح بن اثاثہ سابقین اولین اور بدری ہیں۔ حضرت ابوبکر کی خالہ کا بیٹا اور یتیم ہونے کی وجہ سے نہایت محتاج تھا۔ حضرت ابوبکر اس کی ہمیشہ کمک کرتے تھے۔ واقعہ افك میں ملوث ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکر نے اس کی کمک بند کر دی جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا یَاۡتَلِ اُولُوا الۡفَضۡلِ مِنۡکُمۡ وَ السَّعَۃِ ...[1]	تم میں سے جو لوگ احسان کرنے والے اور (مال و دولت میں) وسعت والے ہیں....

iv۔ حسان بن ثابت شاعر رسول، یہ بھی بدری ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو الدار المنثور ذیل آیت۔ ۲۴ نور: ۲۲

v۔ حمنہ بنت جحش۔ حضرت زینب بنت جحش زوجہ رسول کی بہن۔

کشاف نے ان افراد کے ذکر کے بعد کہا ہے: و من ساعدھم اور وہ لوگ جنہوں نے ان افراد کی مدد کی یعنی اس تہمت میں مدد کی لیکن کسی اور کا نام نہیں ملتا۔

مصادر میں آیا ہے کہ ان میں سے صرف آخری تین افراد پر رسول اللہ ﷺ نے قذف کی حد جاری فرمائی۔ پہلے دو پر حد جاری نہیں فرمائی۔

۲۔ لَا تَحۡسَبُوۡہُ شَرًّا لَّکُمۡ: اس واقعہ میں شر کا پہلو صرف چند افراد تک محدود تھا۔ باقی کل امت کے لیے اس قسم کے واقعات میں خیر کا پہلو زیادہ ہے۔ اسی لیے مؤمنین سے خطاب فرمایا۔ خیر کا پہلو یہ ہے: اس قسم کے واقعات میں اور وہ بھی خود رسول اللہ ﷺ کی زوجہ سے مربوط ہو، ایک طریقہ سامنے آتا ہے کہ اس کا کس طرح سامنا کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس تہمت پر ایک ماہ تک کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا، نہ کوئی جذباتی ردعمل دیکھنے میں آیا، نہ کسی قسم کا انتقامی قدم اٹھایا جاتا ہے۔

دوسری طرف اس واقعہ کی وجہ سے ایک قانون اور اخلاقی ضابطہ حیات وجود میں آیا اور ان دس آیات میں وہ اخلاقی وشرعی نکات بیان فرمائے جن کا اظہار ایسے واقعات میں اسلامی معاشرہ کو چاہیے۔

۳۔ لِکُلِّ امۡرِیًٔ مِّنۡہُمۡ مَّا اکۡتَسَبَ مِنَ الۡاِثۡمِ: جس نے جتنا حصہ لیا اتنا گناہ اس کے ذمے ہے۔ اس واقعہ میں موجود شر کے پہلو کا ذکر ہے جو چند افراد تک محدود ہے۔

۴۔ وَ الَّذِیۡ تَوَلّٰی کِبۡرَہٗ مِنۡہُمۡ لَہٗ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ: جس نے اس بہتان تراشی میں بڑا حصہ اپنے ذمے لیا یعنی اس بہتان کو اٹھانے میں سب سے زیادہ جس نے کردار ادا کیا۔ اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔ بہت سے اہل سنت کے مصادر میں آیا ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن ابی ہے۔ بعض نے حسان بن ثابت کو اس کا مصداق قرار دیا ہے لیکن اکثر نے اسے رد کیا ہے۔

لَوۡ لَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ ظَنَّ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتُ بِاَنۡفُسِہِمۡ خَیۡرًا ۙ وَّ قَالُوۡا ہٰذَاۤ اِفۡکٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۲﴾	۱۲۔ جب تم نے یہ بات سنی تھی تو مومن مردوں اور مومنہ عورتوں نے اپنے دلوں میں نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہیں کہا کہ یہ صریح بہتان ہے؟

تفسیر آیات

ان آیات میں اس قسم کی بہتان بازی کی صورت میں سننے اور بہتان لگانے والے، دونوں کے لیے ہدایات ہیں:

۱۔ لَوۡلَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡہُ: اس قسم کا بہتان سننے کی صورت میں مؤمنین اور مؤمنات کو چاہیے تھا کہ نیک گمان کریں اور اسے کھلا بہتان قرار دیں۔

بِاَنۡفُسِہِمۡ کی تین تفسیریں ہو سکتی ہیں:

i۔ بِاَنۡفُسِہِمۡ سے مراد فی بِاَنۡفُسِہِمۡ ہو سکتا ہے۔تم نے اپنے دلوں میں نیک گمان کیوں نہ کیا؟

ii۔تم نے اپنی ملت، اپنے معاشرے کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا؟ جیسا کہ سورۃ الحجرات میں فرمایا:

وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ...[۱]	اور آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگایا کرو۔

اسی طرح

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ...[۲]	اور تم اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔

فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُیُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ ...[۳]	اور جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو اپنے آپ پر سلام کیا کرو۔

iii۔تم نے خود اپنے بارے میں نیک گمان کیوں نہ کیا کہ اگر خود تمہارے ساتھ ایسا واقعہ پیش آتا تو تم ام المؤمنین کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ یہ کیوں نہیں سوچا کہ کیا انسان اپنی ماں کے بارے میں اس قسم کی بات سوچ سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی پر بہتان کی بات سن کر نیک گمان کرنا چاہیے، نہ بدگمانی: بِاَنۡفُسِہِمۡ خَیۡرًا ...۔

لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَیۡہِ بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ ۚ فَاِذۡ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِالشُّہَدَآءِ فَاُولٰٓئِکَ عِنۡدَ اللّٰہِ ہُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔وہ لوگ اس بات پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب چونکہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں لہٰذا وہ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔

تفسیر آیات

وہ اپنے اس الزام پر چار گواہ پیش نہ کر سکے تو اللہ کی شریعت اور قانون میں وہ جھوٹے ہیں۔ اس صورت میں بھی چار گواہ پیش کرنا پڑتے ہیں جہاں الزام لگانے والا مدعی ہو کہ اس نے خود اس عمل زشت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب کہ اس واقعے میں ایسا بھی نہ تھا کہ کسی نے مشاہدے کا دعویٰ کیا ہو۔

---

[۱] ۴۹ حجرات: ۱۱	[۲] ۴ نساء: ۲۹	[۳] ۲۴ نور: ۶۱

اس آیت میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس قسم کے بہتان کی صورت میں اسے رد نہ کرنا اور اسی کی تکذیب نہ کرنا خود ایک قابل سرزنش عمل ہے۔

وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ رَحۡمَتُہٗ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ لَمَسَّکُمۡ فِیۡ مَاۤ اَفَضۡتُمۡ فِیۡہِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور اگر دنیا اور آخرت میں تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو جن باتوں کا تم نے چرچا کیا تھا ان کے سبب تم پر بڑا عذاب آ جاتا۔

تشریح کلمات

اَفَضۡتُمۡ: (ف ی ض) باتوں میں لگے رہنے اور چرچا کرنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو نہ تمہیں دنیا میں مہلت ملتی، نہ آخرت میں مغفرت۔ یہ اللہ ہے جس نے تمہیں مہلت دی کہ توبہ کر سکو اور اپنے گناہ کو مٹا سکو ورنہ اس جرم پر دنیا ہی میں عذاب نازل ہونا تھا۔

اہم نکات

۱۔ الزام کو ثابت نہ کر سکے وہ قانون الٰہی میں جھوٹا ہے: عِنۡدَ اللّٰہِ ہُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ۔

اِذۡ تَلَقَّوۡنَہٗ بِاَلۡسِنَتِکُمۡ وَ تَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاہِکُمۡ مَّا لَیۡسَ لَکُمۡ بِہٖ عِلۡمٌ وَّ تَحۡسَبُوۡنَہٗ ہَیِّنًا ٭ۖ وَّ ہُوَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَظِیۡمٌ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ جب تم اس جھوٹی خبر کو اپنی زبانوں پر لیتے جا رہے تھے اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہہ رہے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہ تھا اور تم اسے ایک معمولی بات خیال کر رہے تھے جب کہ اللہ کے نزدیک وہ بڑی بات ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ تَلَقَّوۡنَہٗ بِاَلۡسِنَتِکُمۡ: اس وقت تم عذاب عظیم سے دوچار ہو جاتے جب تم اس تہمت کو زبان زد عام کر رہے تھے اور کسی علمی سند کے بغیر صرف وہم و گمان پر اس بہتان کو رواج دے رہے تھے۔

۲۔ وَّ تَحۡسَبُوۡنَہٗ ہَیِّنًا: اور ساتھ اس عظیم گناہ کے بارے میں تمہیں احساس گناہ بھی نہ تھا اور اسے معمولی سمجھ رہے تھے۔ اول تو کسی بھی مؤمن کے خلاف بہتان لگانا گناہ ہے۔ گناہ کو گناہ نہ سمجھنا، خود اپنی جگہ

قابل سرزنش گناہ ہے اور اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

۳۔ وَّ هُوَ عِنۡدَ اللّٰهِ: جب کہ یہاں ناروا نسبت کا تعلق ام المؤمنین سے ہے اور اس سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دل اندوہ ناک ہوتا ہے اور رسالت بھی متاثر ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی پر بہتان لگا کر اس کا وقار مجروح کرنا عظیم گناہ ہے: وَّ هُوَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِيۡمٌ۔

وَ لَوۡ لَاۤ اِذۡ سَمِعۡتُمُوۡهُ قُلۡتُمۡ مَّا يَكُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ٭ سُبۡحٰنَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ جب تم نے یہ بات سنی تھی تو کیوں نہ کہا: ہمیں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی؟ خدایا تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔

تفسیر آیات

یہ اخلاق و سیرت کی ایک تعلیم ہے کہ ایسے بہتان اور ناروا نسبتوں کے موقع پر کیا ردعمل اختیار کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ ایسی باتیں جب سنی جاتی ہیں تو ان باتوں کو اپنی زبان پر نہیں دہرانا چاہیے۔

مَّا يَكُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا: بہتان عظیم ہے۔ اسے دہرانے کی جگہ اس کی تکذیب کرنا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ کسی پر الزام کی باتیں سن لی جائیں تو اسے زباں سے دہرانا نہیں چاہیے: مَّا يَكُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّتَكَلَّمَ ....

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنۡ تَعُوۡدُوۡا لِمِثۡلِهٖۤ اَبَدًا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو آیندہ کبھی بھی ایسے کام کا اعادہ نہ کرنا۔

وَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور اللہ آیات تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ نصیحت فرماتا ہے کہ آیندہ تم ہرگز اس قسم کی حرکتوں کا ارتکاب نہ کرنا۔ لِمِثۡلِهٖۤ اس جیسے

بہتان کا اعادہ نہ کرنا سے مراد بظاہر یہ ہے کہ اس قسم کا بہتان جس کا تعلق ازواج رسول سے ہو اور ممکن ہے مطلق زنا کا بہتان لِمِثْلِهٖٓ میں شامل ہو۔

۲۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اس نصیحت کے بعد حکم خدا کی نافرمانی نہ کی جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان کے درمیان بے حیائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے، اللہ یقیناً جانتا ہے مگر تم نہیں جانتے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو تم پر فوری عذاب آ جاتا) اور یہ کہ اللہ بڑا شفیق، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ: جنہیں یہ بات پسند ہو اور چاہتے ہوں کہ اہل ایمان کے درمیان فحش عام ہو اور پھیلے۔ اس میں اگرچہ سیاق آیت میں قذف کا ذکر ہے تاہم اطلاق میں فحش پھیلانے کی تمام صورتیں شامل ہیں۔ خود بہتان پھیلانا، بدکاری کے مراکز قائم کرنا اور فحش فلموں کے ذریعے اس کی سوچ کو پھیلانا، خود عمل بد کے پھیلنے کا محرک بن جاتے ہیں۔

الْفَاحِشَةُ: ہر اس عمل یا اس قول کو کہتے ہیں جس کی قباحت معمول سے زیادہ ہو۔ ماعظم قبحه من الاقوال والافعال۔ (راغب)

۲۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ: اللہ ان پھیلانے والوں کو جانتا ہے تم نہیں جانتے یا یہ معنی ہو کہ اللہ ان لوگوں کی عاقبت کو جانتا ہے، تم نہیں۔

۳۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ: اللہ اپنے اس فضل و احسان کا مکرر ذکر فرماتا ہے جس کے تحت ان فحش پھیلانے والوں کو بھی مہلت ملتی ہے اور توبہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے:

مَنْ اَذَاعَ فَاحِشَةً كَانَ كَمُبْتَدِئِهَا۔[1]

جو کسی فحش کو پھیلائے وہ اس پر عمل کرنے والے کی طرح ہے۔

---

[1] الکافی ۲: ۳۵۶

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنْ قَالَ فِی مُؤْمِنٍ مَا رَأَتْہُ عَیْنَاہُ وَ سَمِعَتْہُ أُذُنَاہُ فَھُوَ مِنَ الَّذِینَ قَالَ اللّٰہُ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ ....[1]

جو کوئی کسی مؤمن کے بارے میں وہ بات جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی ہے (دوسروں کو) بتا دیا کرے وہ اس آیت میں شامل ہے...۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ وَ مَنْ یَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ فَاِنَّہٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَتُہٗ مَا زَکٰی مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّ لٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اے ایمان والو! شیطان کے نقش قدم پر نہ چلنا اور جو شخص شیطان کے نقش قدم پر چلے گا تو وہ بے حیائی اور برائی کا حکم دے گا اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے ایک شخص بھی کبھی پاک نہ ہوتا مگر اللہ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ خوب سننے، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ: اس جملے کی تشریح سورۃ البقرہ آیت ۲۰۸ میں ہو چکی ہے۔

۲۔ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَتُہٗ مَا زَکٰی مِنْکُمْ: اللہ کا فضل و کرم تمہارے شامل حال نہ ہوتا تو تمہیں مہلت نہ ملتی۔ جرم سرزد ہوتے ہی عذاب تمہیں آ لیتا۔ پھر تمہیں توبہ کرنے اور اپنے آپ کو اس آلودگی سے پاک کرنے کا بھی موقع نہ ملتا۔

۳۔ وَّ لٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ: پاکیزہ کرنے والا اللہ ہی ہے لیکن اللہ کا یہ فضل و کرم اندھی بانٹ نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس کو نصیب ہو جائے بلکہ یہ فضل اس شخص کے لیے ہے جو مَنْ یَّشَآءُ کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس میں وہ داخل ہو سکتا ہے جو اس کا اہل ہے۔

۴۔ وَ اللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ: اللہ دلوں کی آواز کو سنتا اور اس بات کا علم رکھتا ہے کہ کون اہل ہے۔

وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَ

۲۲۔ تم میں سے جو لوگ احسان کرنے والے اور

---

[1] الکافی ۲: ۳۵۷

السَّعَةِ اَنۡ یُّؤۡتُوۡۤا اُولِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنَ وَ الۡمُہٰجِرِیۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۪ۖ وَ لۡیَعۡفُوۡا وَ لۡیَصۡفَحُوۡا ؕ اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۲﴾

(مال و دولت میں) وسعت والے ہیں وہ قریبی رشتہ داروں، مسکینوں اور فی سبیل اللہ ہجرت کرنے والوں کو کچھ دینے سے دریغ نہ کریں اور انہیں عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے کیا تم خود یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے اور اللہ غفور رحیم ہے۔

تشریح کلمات

یَاۡتَلِ: (ا ل و) اِلُو سے، دریغ کرنے کے معنی میں ہے۔ لا یألو نکم الیۃ سے ہے تو قسم کھانے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا یَاۡتَلِ اُولُوا الۡفَضۡلِ مِنۡکُمۡ: اہل سنت کے مصادر میں آیا ہے کہ یہ آیت مسطح بن اثاثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کی حضرت ابوبکر نے واقعہ افک کے بعد کمک بند کر دی تھی۔ ابن عباس کی روایت کے مطابق یہ آیت اصحاب کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جس نے واقعہ افک کے بعد اس میں ملوث ایک شخص کی کمک بند کر دی تھی۔ (مجمع البیان)

۲۔ اُولُوا الۡفَضۡلِ سے مراد مال و دولت والے اور السَّعَۃِ سے مراد رزق میں وسعت والے ہیں۔ مالداروں اور وسعت رکھنے والوں کو قرابت داروں، مساکین اور مہاجرین کی کمک کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ان سے رنجش ہے تو معاف کرنا چاہیے۔ اگرچہ سبب نزول آیت ایک واقعہ ہے لیکن اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس میں تمام اہل دولت، قرابت دار، مساکین اور راہ خدا میں اپنے وطن سے دور ہونے والے سب شامل ہیں۔

اہم نکات

۱۔ بعض واقعات اگرچہ تلخی اور رنجش پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن ان سے قانون سازی کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ قانون اور نظام حیات خیر ہے۔

۲۔ فحش، خواہ اس کا تعلق قول سے ہو یا عمل سے، پھیلانا عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ ... لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ...۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡغٰفِلٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ لُعِنُوۡا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۖ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ جو لوگ بے خبر پاک دامن مومنہ عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

تفسیر آیات

سبب نزول خواہ خاص ہو، تعبیر عام ہے۔ ہر اس عورت پر بہتان لگانے کی صورت میں جس میں تین اوصاف موجود ہیں: پاکدامنی، بے خبری اور ایمان۔ ایسی عورت پر بہتان عائد کرنا موجب لعنت ہے۔

پاکدامن عورت پر زنا کا الزام عائد کرنا سبع موبقات (سات تباہ کن) گناہوں میں شامل ہے۔

حدیث میں آیا ہے:

الْكَبَائِرُ سَبْعٌ: قَتْلُ الْمُؤْمِنِ مُتَعَمِّداً وَ قَذْفُ الْمُحْصَنَةِ وَ الْفِرَارُ مِنَ الزَّحْفِ وَ التَّعَرُّبُ بَعْدَ الْهِجْرَةِ وَ اَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ ظُلْماً وَ اَكْلُ الرِّبَا بَعْدَ الْبَيِّنَةِ...[1]

بڑے (تباہ کن) گناہ سات ہیں: جان بوجھ کر مؤمن کو قتل کرنا، پاکدامن عورت پر زنا کا الزام لگانا، جنگ سے فرار کرنا، اسلامی تہذیب کے بعد دوبارہ غیر مہذب ہو جانا، یتیم کا مال ظلم کے ساتھ کھانا، ثبوت کے بعد سود کھانا۔

غافلات: اس خاتون کو کہتے ہیں جو بے عفتی کے امور سے نا آشنا ہے۔ بدچلنی کا اسے پتہ نہیں کیا ہوتی ہے۔

۴۴۶

يَّوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان سب اعمال کی گواہی دیں گے جو یہ کرتے رہے ہیں۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن انسانی جسم کے وہ اعضاء جو کسی جرم میں استعمال ہوئے ہوں گے پیش کیے جائیں گے۔ انسان کا مادی وجود دنیا میں ہر چھ سال میں بدل جاتا ہے تو قیامت کے دن ان بدلنے والی موجودات کو

---

[1] الکافی ۲: ۲۷۷

حاضر کیا جائے گا کہ وہ اس جرم کی گواہی دیں جن کے انجام دینے میں ان اعضاء کو استعمال کیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے ان اعضاء سے جرم سرزد ہوتے ہوئے دکھایا جائے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ ....[1]	اس دن ہر شخص اپنا نیک عمل حاضر پائے گا، اسی طرح ہر برا عمل بھی....

اور

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝[2]	اس روز تمام راز فاش ہو جائیں گے۔

سے بھی ظاہر ہوتا ہے خود عمل دکھایا جائے گا۔ اسی طرح وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ....[3] بھی شاہد ہے کہ خود عمل دیکھا جائے گا۔

لہٰذا اس آیت میں زبان، ہاتھ اور پاؤں کی شہادت سے مراد عملی شہادت ہو سکتی ہے۔ اس پر شاہد یہ آیت بھی ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝[4]	آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیتے ہیں اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے اس کے بارے میں جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ۝	۲۵۔ اس دن اللہ ان کا حقیقی بدلہ پورا کرے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق ہے (اور حق کا) ظاہر کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

يُوَفِّيْهِمُ : (و ف ی) وفا، پورا کرنا۔ يُوَفِّيْهِمُ ان کو پورا کر دے گا۔

دِيْنَهُمُ : دین، جزا اور بدلہ کے معنوں میں ہے جیسا کہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں ذکر ہو چکا۔

تفسیر آیات

۱۔ قیامت کے دن اللہ ہر ایک کو اس کا حقیقی اور واقعی بدلہ دے گا۔ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ یعنی جزائھم الواقعی۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ جزاء، سزا قراردادی نہیں ہے کہ کسی کی طرف سے مقرر کرنے پر تقرر ہوتی ہے بلکہ جزا و سزا ایک امر واقعی ہے جو انسانی عمل پر مترتب ہوتا ہے۔ جس طرح دنیا میں بہت سے فیزیکل

---

[1] ۳ آل عمران: ۳۰　[2] ۸۶ طارق: ۹　[3] ۹۹ زلزال: ۸　[4] یٰس: ۶۵

مسائل ایسے ہیں کہ انسانی عمل پر خود بخود مترتب ہوتے ہیں۔ مثلاً صحت کے مسائل ایسے نہیں ہیں کہ کسی کی طرف سے تجویز ہونے پر مقرر ہوئے ہوں بلکہ انسانی عمل پر خود بخود مترتب ہوتے ہیں۔

۲۔ وَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡحَقُّ الۡمُبِیۡنُ: قیامت کے دن جب انسان واقع بینی کے عالم میں داخل ہوگا تو اسے جہاں اپنے اعمال کا حقیقی بدلہ نظر آئے گا وہاں تمام حقائق کھل کر سامنے آجائیں گے:

لَقَدۡ کُنۡتَ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ ہٰذَا فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ ﴿۲۲﴾ [1]

بے شک تو اس چیز سے غافل تھا چنانچہ ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے لہٰذا آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

ان حقائق میں سب سے اہم، معرفت الٰہی ہوگی جو انتہائی ظہور کی وجہ سے پوشیدہ تھی۔ دنیا میں ہر چیز اس کی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ روشنی تاریکی سے، ظلم عدل سے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی ضد نہیں ہے لہٰذا اللہ کا ظہور سب سے زیادہ ہے۔ انتہائی ظہور کی وجہ سے پردۂ خفا میں تھا۔ آخرت کے دن اللہ کی معرفت کامل ہو جائے گی: ہُوَ الۡحَقُّ الۡمُبِیۡنُ۔

اہم نکات

۱۔ بدلہ عمل پر خود مترتب ہوتا ہے۔

اَلۡخَبِیۡثٰتُ لِلۡخَبِیۡثِیۡنَ وَ الۡخَبِیۡثُوۡنَ لِلۡخَبِیۡثٰتِ ۚ وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیۡنَ وَ الطَّیِّبُوۡنَ لِلطَّیِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوۡنَ مِمَّا یَقُوۡلُوۡنَ ؕ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ رِزۡقٌ کَرِیۡمٌ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے ہیں، یہ ان باتوں سے پاک ہیں جو لوگ بناتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡخَبِیۡثٰتُ: خبث، کفر و شرک کی خباثت مراد ہو سکتی ہے۔ اسی طرح طیب سے مراد ایمان و عفت کی پاکیزگی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

لِیَمِیۡزَ اللّٰہُ الۡخَبِیۡثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَ یَجۡعَلَ الۡخَبِیۡثَ بَعۡضَہٗ عَلٰی بَعۡضٍ فَیَرۡکُمَہٗ جَمِیۡعًا فَیَجۡعَلَہٗ فِیۡ جَہَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ [2]

تاکہ اللہ ناپاک کو پاکیزہ سے الگ کر دے اور ناپاکوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باہم ملا کر یکجا کر دے پھر اس ڈھیر کو جہنم میں جھونک دے، (دراصل) یہی لوگ خسارے میں ہیں۔

---

[1] ۵۰ ق ۲۲ [2] ۸ انفال: ۳۷

اس آیت فَیَجۡعَلَہٗ فِیۡ جَہَنَّمَ دلیل ہے کہ خبیث سے مراد کافر ہے۔

لہٰذا آیت کا مطلب یہ بنتا ہے: خبیث عورتوں کا جوڑ خبیث مردوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی کافر عورتوں کا جوڑ کافر مردوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح پاکیزہ عورتوں کا جوڑ پاکیزہ مردوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی مومن عورتوں کا جوڑ مؤمن مردوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے:

بری باتیں برے لوگوں کو بجتی ہیں اور اچھی باتیں اچھے لوگوں کو۔

بعض دیگر نے کہا ہے:

برے اعمال برے لوگوں کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اور نیک اعمال نیک لوگوں کے لیے مناسب ہیں۔

پہلا معنی زیادہ سیاق آیت سے مربوط ہے چونکہ آخر میں فرمایا ہے: اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوۡنَ۔ یہ لوگ ان باتوں سے پاک ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ طیب سے مراد افراد و اشخاص ہیں، اقوال و افعال نہیں۔

یہ آیت بھی اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً ... کی طرح ہے۔

آیت کا سبب نزول مسئلہ افک سے مربوط لگتا ہے تاہم لفظ کی عمومیت کی وجہ سے ہر مؤمن مرد و عورت اور غیر مؤمن مرد و عورت سب شامل ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حقیقی کفو وہ ہے جو نظریات و عقیدے پر مبنی ہو۔

۴۴۹

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتًا غَیۡرَ بُیُوۡتِکُمۡ حَتّٰی تَسۡتَاۡنِسُوۡا وَ تُسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَہۡلِہَا ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہونا جب تک اجازت نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ کر لو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فِیۡہَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدۡخُلُوۡہَا حَتّٰی یُؤۡذَنَ لَکُمۡ ۚ وَ اِنۡ قِیۡلَ لَکُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا

۲۸۔ اور اگر تم اس گھر میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو بغیر اجازت کے اس میں داخل نہ ہونا اور اگر تم سے لوٹ جانے کے لیے کہا جائے تو لوٹ

هُوَ اَزۡکٰی لَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِیۡمٌ ﴿۲۸﴾ جاؤ، اسی میں تمہاری پاکیزگی ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب آگاہی رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتًا: گھر انسان کے لیے امن وسکون اور رازداری کی جگہ ہے۔ گھر انسان کے وقار، ناموس اور عزت و آبرو کے تحفظ کی جگہ ہے۔ پھر گھر کی چار دیواری کے اندر انسان تمام تکلفات سے آزاد زندگی گزارتا ہے۔ افراد خاندان میں بعض بے تکلفیوں اور کبھی بعض خامیوں کے لیے گھر ایک پردہ ہے۔ اس پردے کا احترام انسانی عزت و وقار کا احترام ہے۔ بلا اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونا احترام آدمیت کے خلاف ہے۔

۲۔ غَیۡرَ بُیُوۡتِکُمۡ: اپنے گھروں کے علاوہ۔ اس میں اپنے گھر کے علاوہ سب کے گھر شامل ہیں، خواہ اس کے قریبی ترین رشتہ دار کیوں نہ ہوں۔ جیسے ماں باپ، بیٹا، بیٹی اور بھائی۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیٹی فاطمہ علیہا السلام کے گھر میں اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوتے تھے۔[1]

اس طرح ایک شخص نے رسول اللہؐ سے سوال کیا: کیا میں اپنی ماں کے گھر بلا اجازت داخل ہو سکتا ہوں جب کہ ان کی خدمت کے لیے صرف میں ہوں؟ فرمایا:

اَ یَسُرُّکَ اَنۡ تَرَاھَا عُرۡیَانَۃ۔ کیا تو اپنی ماں کو عریاں دیکھنا پسند کرے گا؟

کہا: نہیں۔

فرمایا:

فَاسۡتَاذِنۡ عَلَیۡھَا۔[2] اجازت لیا کرو۔

۳۔ حَتّٰی تَسۡتَاۡنِسُوۡا: جب تک اُنس پیدا نہ کرو۔ یعنی گھر والے باہر سے آنے والے سے غیر مانوس نہ ہوں۔ گھر میں دفعتاً داخل نہ ہوں جب تک اجازت کے ساتھ گھر والوں میں آنے والے کو قبول کرنے کے لیے آمادگی نہ ہو۔ آیت میں حتی تستاء ذنوا جب تک اجازت نہ لو، نہیں فرمایا۔ اذن لینے اور اُنس لینے میں فرق یہ ہے: اذن تو انسان ناگواری کی حالت میں دیتا ہے کہ کوئی بے وقت آیا ہے تو دروازے سے واپس کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا لیکن اُنس تو اس حالت کو کہتے ہیں جس میں گھر والوں میں پوری آمادگی پائی جاتی ہے کہ آنے والے کا استقبال کریں۔

۴۔ وَ تُسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَہۡلِہَا: جب تک گھر والوں پر سلام نہ کرو۔ پہلے مانوس، پھر سلام، پھر داخل ہونا۔ یہ ہیں آداب اور تہذیب اسلامی کہ کسی کے گھر میں داخل ہوں تو سلام کر کے داخل ہونا چاہیے۔ دوسری

---

[1] الکافی ۵: ۵۲۸ [2] مستدرک الوسائل ۱۴: ۲۸۲

جگہ فرمایا:

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ [1] جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو اپنے آپ پر سلام کیا کرو۔

۵۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ: یہ آداب، یہ تہذیب خود تمہارے لیے بہتر ہے جس سے تمہارا پردہ اور تمہارے راز محفوظ رہتے ہیں اور تمہاری گھر کی چاردیواری کی آزادی بھی متاثر نہیں ہوتی۔

۶۔ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا: گھر میں کسی ایسے فرد کو نہ پاؤ جو تمہیں اجازت دے سکے تو گھر میں داخل نہ ہوں۔ جیسے اگر کوئی بچہ ہو یا کوئی اور فرد جو اجازت دینے کا مجاز نہیں ہے۔

۷۔ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا: اگر اجازت دینے سے معذرت کریں تو گھر والوں کا عذر قبول کرو۔ صریح لفظوں میں معذرت کریں یا قرائن سے سمجھ جائیں کہ اجازت دینا نہیں چاہتے ایسی صورت میں واپس جانا چاہیے کیونکہ انسان کبھی کسی مجبوری میں ہوتے ہیں یا ایسی حالت میں ہوتے ہیں جو گھر کا راز ہے۔ عذر قبول کرنا خود اپنی جگہ بزرگواری کی علامت ہے:

شر الناس من لا يقبل العذر... [2] لوگوں میں بدتر شخص وہ ہے جو عذر کو قبول نہیں کرتا۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ البتہ ایسے گھروں میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں جن میں کوئی رہائش پذیر نہ ہو اور ان میں تمہارا کوئی سامان ہو اور اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

تفسیر آیات

ایسی عمارتوں میں داخل ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جو برائے رہائش نہیں ہیں، جو کہ محل راز نہیں ہیں۔ جیسے ہوٹل، مارکیٹ، دوکانیں، مسافر خانے وغیرہ۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

قال: هِيَ الْحَمَّامَاتُ وَالْخَانَاتُ. [3] اس سے مراد عمومی حمام اور مسافر خانے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ گھر کی چاردیواری کا تحفظ و احترام آدمیت کا تحفظ ہے۔

۲۔ گھر والوں کا عذر قبول کرنا چاہیے۔

---

[1] نور: ۶۱ [2] غرر الحکم الفصل السادس حول الاعتذار ص ۴۴۷ [3] الوسائل الشیعة ۲۰: ۲۱۹

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِہِمۡ وَ یَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَہُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَزۡکٰی لَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ آپ مومن مردوں سے کہد یجیے: وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اوراپنی شرمگاہوں کو بچا کر رکھیں، یہ ان کے لیے پاکیزگی کا باعث ہے، اللہ کو ان کے اعمال کا یقیناً خوب علم ہے۔

تشریح کلمات

یَغُضُّوۡا: (غ ض ض) غض کے معنی کمی کرنے کے ہیں خواہ نظر کی صورت میں ہو یا کسی برتن میں سے کچھ کم کرنے کی صورت میں ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِہِمۡ: نگاہوں کو نیچے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نامحرم عورت کا سامنا ہوتا ہے تو اس کے محاسن پر نگاہ جمانے کے لیے نگاہ اوپر کی طرف اٹھانا پڑتی ہے۔ نگاہ نیچے رکھنے کی صورت میں نگاہ زمین کی طرف ہوگی۔عورت کے محاسن پر نظر نہیں جمے گی۔

۲۔ مِنۡ اَبۡصَارِہِمۡ: میں من تبعیضی ہونے کی صورت میں معنی یہ بنیں گے: اپنی نگاہوں کو (قدرے) نیچے رکھو جس سے نامحرم پر نظر نہ پڑے۔

مرد اور عورت کے درمیان فطرتاً ایک کشش ہوتی ہے جو نوع انسانی کی بقا کے لیے ضروری ہے اور خطرناک بھی۔ اسلام نے فطری اور قانون کے پرامن دائرے میں رہتے ہوئے اس خواہش کو پورا کرنے کی تاکید کی ہے اور نصف دین اسی میں قرار دیا ہے جب کہ اس سے پھیلنے والی خرابیوں کی راہ روکنے کی بھی چارہ جوئی کی ہے۔ چنانچہ جہاں قدرتاً یہ خواہش انسان میں رکھی ہے وہاں قانوناً اسے لگام دی ہے۔ فطرت اور شریعت دونوں کے امتزاج سے نسل انسانی کو جہاں بقا مل جاتی ہے وہاں نسلی اختلاط اور بے عفتی سے تحفظ مل جاتا ہے۔ یہ لگام نگاہ سے شروع ہوتی ہے کیونکہ فساد کی ابتدا بھی نگاہ سے ہوتی ہے۔ ایک نگاہ، ایک تبسم، پھر باہمی گفتگو، پھر بے تکلفی پھر....

۳۔ وَ یَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَہُمۡ: اس جگہ روایات کے مطابق شرم گاہوں کی حفاظت سے مراد نظروں کی حفاظت ہے۔

کل ایة فی القران فی حفظ الفروج فھی من الزنا الا ھذہ الآیة فھی من النظر۔[1]

قرآن کی ہر آیت میں حفظ الفروج سے مراد زنا ہے صرف اس آیت میں نگاہ مراد ہے۔

---

[1] المیزان

اَلنَّظْرَۃُ سَھْمٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیسَ مَسْمُومٌ مَنْ تَرَکَھَا لِلّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ لَا لِغَیْرِہِ اَعْقَبَہُ اللّٰہُ اِیمَانًا یَجِدُ طَعْمَہُ۔[1]

نگاہ، ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ جو اسے برائے خدا ترک کر دے تو اس کے بعد اللہ اسے ایسے ایمان سے نوازے گا جس کا ذائقہ وہ محسوس کرے گا۔

دوسری روایت میں آیا ہے:

وَ کَمْ مَنْ نَظْرَۃٍ اَوْرَثَتْ حَسْرَۃً طَوِیلَۃً۔[2]

کتنی نگاہیں ایسی ہیں جو طویل حسرت کا باعث بنی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ خواہشات کو پہلے قدم پر روکنا مؤثر اور آسان ہے۔

وَ قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنٰتِ یَغۡضُضۡنَ مِنۡ اَبۡصَارِہِنَّ وَ یَحۡفَظۡنَ فُرُوۡجَہُنَّ وَ لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَ لۡیَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِہِنَّ عَلٰی جُیُوۡبِہِنَّ ۪ وَ لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ اِلَّا لِبُعُوۡلَتِہِنَّ اَوۡ اٰبَآئِہِنَّ اَوۡ اٰبَآءِ بُعُوۡلَتِہِنَّ اَوۡ اَبۡنَآئِہِنَّ اَوۡ اَبۡنَآءِ بُعُوۡلَتِہِنَّ اَوۡ اِخۡوَانِہِنَّ اَوۡ بَنِیۡۤ اِخۡوَانِہِنَّ اَوۡ بَنِیۡۤ اَخَوٰتِہِنَّ اَوۡ نِسَآئِہِنَّ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُنَّ اَوِ التّٰبِعِیۡنَ غَیۡرِ اُولِی الۡاِرۡبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَظۡہَرُوۡا عَلٰی عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا یَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِہِنَّ لِیُعۡلَمَ مَا

۳۱۔ اور مومنہ عورتوں سے بھی کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کو بچائے رکھیں اور اپنی زیبائش (کی جگہوں) کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو اس میں سے خود ظاہر ہو اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رکھیں اور اپنی زیبائش کو ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اپنے شوہروں، آباء، شوہر کے آباء، اپنے بیٹوں، شوہروں کے بیٹوں، اپنے بھائیوں، بھائیوں کے بیٹوں، بہنوں کے بیٹوں، اپنی (ہم صنف) عورتوں، اپنی کنیزوں، ایسے خادموں جو عورت کی خواہش نہ رکھتے ہوں اور ان بچوں کے جو عورتوں کے پردوں کی باتوں سے واقف نہ ہوں، اور مومن عورتوں کو چاہیے کہ (چلتے ہوئے) اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ جس سے ان کی پوشیدہ

---

[1] الفقیہ ۴: ۱۸ [2] الوسائل ۲۰: ۱۹۰

يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۱

پوشیدہ زینت ظاہر ہو جائے اور اے مومنو! سب مل کر اللہ کے حضور توبہ کرو، امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

تشریح کلمات

خمر: (خ م ر) اصل میں خمرٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ عرف میں خُمار کا لفظ صرف عورت کی اوڑھنی پر بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع خُمُرٌ آتی ہے۔

جیوب: (ج ی ب) جیب کے معنی گریبان کے ہیں۔

اَلْاِرْبَۃِ: (ا ر ب) الارب کے معنی سخت احتیاج کے ہیں جسے دور کرنے کے لیے تدبیر کرنی پڑے۔ آیت میں نکاح کی احتیاج مراد ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ: مردوں کی طرح عورتوں پر بھی نامحرم مرد پر شہوانی نگاہ کرنا حرام ہے۔ شرم گاہوں کی حفاظت سے مراد نگاہ سے بچنا ہے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ و حضرت میمونہ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب ابن مکتوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں داخل ہوئے تو آپؐ نے دونوں سے فرمایا:

پردہ کرو۔

بیبیوں نے عرض کیا:

یا رسول کیا وہ اندھے نہیں ہیں؟ وہ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ پہچانیں گے۔

فرمایا:

کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم دونوں انہیں نہیں دیکھ سکتیں؟

۲۔ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ: اپنی زیبائش کو ظاہر نہ کریں۔ یعنی زیبائش والے مقامات کو ظاہر نہ کریں خواہ ان پر فعلاً زیورات موجود ہوں یا نہ ہوں۔ لہٰذا زِيْنَتَهُنَّ سے مراد مواضع زینتھن ہیں اور خود زیورات کو دیکھنا بھی حرام نہیں ہے اگر وہ پہنے ہوئے نہ ہوں۔

۳۔ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا: مگر وہ جو خود سے ظاہر ہو۔ وہ زیبائش جو از خود ظاہر ہو۔ جس میں اظہار نہ ہو۔ ظاہر کرنا نہ ہو، خود ظاہر ہو۔

عورتوں کی زیبائش میں سے بعض وہ ہیں جو ظاہر نہ کرنے کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی۔ جیسے سینہ، سر کے بال، داخلی لباس۔ بعض زیبائش ایسی ہیں جو اظہار کے بغیر ظاہر ہو جاتی ہیں جیسے ہاتھ، پاؤں۔

احادیث کے مطابق اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنۡہَا میں ان جگہوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جو دوسری قسم سے متعلق ہیں۔

مروی ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا عورت اگر محرم نہیں ہے تو کہاں تک اسے دیکھ سکتے ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

الوَجْهُ وَ الْكَفَّانِ وَ الْقَدَمَانِ۔[1] چہرہ دونوں ہاتھ اور دونوں قدم دیکھ سکتے ہیں۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی روایت میں فرمایا:

الوجہ والکف و موضع السوار۔[2] چہرہ، ہاتھ اور کنگن کی جگہ۔

ایک روایت میں آیا ہے:

الزِّینَۃُ الظَّاھِرَۃُ الْکُحْلُ وَ الْخَاتَمُ۔[3] ظاہری زینت سرمہ اور انگوٹھی ہے۔

فضیل بن یسار کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال ہوا کہ کیا عورت کے بازو زینت میں شمار ہوتے ہیں؟ فرمایا:

نَعَمْ وَ مَا دُونَ الْخِمَارِ مِنَ الزِّیْنَۃِ وَ مَا دُونَ السِّوارَیْنِ۔[4] ہاں اوڑھنی کے اندر زینت شمار ہوتے ہیں اور کنگن کے اندر بھی۔

البتہ صاحب الجواھر فرماتے ہیں:

بعید نہیں اس آیت سے خود زیبائش کو بھی چھپانا واجب ہو جائے اگر یہ زیورات اپنی جگہوں پر ہوں۔

جسم کی نمائش کے بغیر صرف زیورات کا چھپانا واجب ہو سکتا ہے اگر یہ زیورات اپنے مقامات پر پہنے ہوئے ہوں۔

اس موقف پر اس آیت کا آخری جملہ وَ لَا یَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِہِنَّ لِیُعۡلَمَ مَا یُخۡفِیۡنَ مِنۡ زِیۡنَتِہِنَّ دلیل بن سکتا ہے۔ جب زیور کی آواز بھی پوشیدہ رکھنا واجب ہے تو خود زیورات کو جب پہنے ہوئے ہوں، چھپانا واجب ہو جائے گا خواہ ان زیورات کے ساتھ جسم کا کوئی حصہ نظر آتا ہو یا نہ۔ اس موقف کے مطابق وَ لَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ میں موضع الزینۃ مراد لینے کی ضرورت نہیں چونکہ خود زیورات کا اظہار بھی جائز نہیں ہے۔

ان روایات میں زیبائش کے مقامات کا ذکر ہے جیسے دونوں ہاتھ، چہرہ۔ دیگر روایات میں خود زیبائش کا ذکر ہے جیسے سرمہ اور انگوٹھی۔ البتہ سرمے کا چہرے سے اور انگوٹھی کا تعلق ہاتھوں سے ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورتوں پر واجب کیا ہے؟ ان جگہوں کو چھپانا ہے جو زیبائش کے مقامات ہیں جیسے گردن سینہ خواہ ان پر زیورات ہوں یا نہ ہوں یا صرف ان پر زیورات ہونے کی صورت میں چھپانا

---

[1] الکافی ۵: ۵۲۱ [2] مسائل علی بن جعفر (ع) ص ۲۱۹ [3] الکافی ۵: ۵۲۱ [4] الکافی ۵: ۵۲۰

ہے جیسے آنکھیں سرمگین اور ہاتھوں میں انگوٹھی ہونے کی صورت میں چھپانا واجب نہیں ہے؟

جواب یہ ہے کہ زیبائش کی جگہوں کا چھپانا واجب ہے خواہ ان پر زیورات ہوں یا نہ ہوں۔ دوسری روایات کو ہم پہلی روایت پر حمل کر سکتے ہیں کہ آنکھوں اور ہاتھوں کا چھپانا ہر صورت میں واجب نہیں ہے خواہ ان میں سرمہ اور انگوٹھی کی زیبائش موجود ہو۔

۴۔ وَلۡیَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِہِنَّ عَلٰی جُیُوۡبِہِنَّ: اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رکھیں۔ جس سے گردن اور سینہ چھپ جائیں۔ آیہ حجاب کے نزول سے پہلے عورتیں اپنی چادروں کو کندھوں پر پیچھے کی طرف ڈال دیتی تھیں جس سے گردن اور سینہ نمایاں ہوتا تھا۔ اس آیت میں حکم آیا جس چادر (خمر) سے عورتیں اپنے سروں کو چھپاتی ہیں ان سے سینوں کو بھی چھپائیں۔ چہرے کا مسئلہ روایات اور علماء کے فتاویٰ سے معلوم ہے۔ ہم اس پر سورۃ الاحزاب آیت ۵۹ میں روشنی ڈالیں گے۔

۵۔ وَلَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ: وہ زیبائش جو نامحرم مردوں کے سامنے ظاہر کرنا جائز نہیں ہے ان کے بارے میں استثناءات کا ذکر ہے:

الف۔ اِلَّا لِبُعُوۡلَتِہِنَّ: اپنے شوہروں کے لیے وہ اپنے آپ کو زیبائش سے آراستہ کر سکتی ہیں بلکہ شوہر کے لیے آرائش نہ کرنے والی عورتوں کی مذمت ہے۔ ملاحظہ ہو مستدرك الوسائل ا: ۳۹۴۔ باب كراهة ترك المرءة للحلى۔

ب۔ اَوۡ اٰبَآئِہِنَّ: میں باپ، دادا، پردادا، نانا، پرنانا سب شامل ہیں۔

ج۔ اَوۡ اٰبَآءِ بُعُوۡلَتِہِنَّ: شوہر کا باپ۔

د۔ اَوۡ اَبۡنَآئِہِنَّ: اپنے بیٹے، پوتے، نواسے سب شامل ہیں۔

ھ۔ اَوۡ اَبۡنَآءِ بُعُوۡلَتِہِنَّ: اپنے شوہر کے بیٹے۔

و۔ اَوۡ اِخۡوَانِہِنَّ: اپنے سگے بھائی، سوتیلے بھائی۔

ز۔ اَوۡ بَنِیۡۤ اِخۡوَانِہِنَّ: بھائیوں کے بیٹے۔ اس میں پوتے، پرپوتے شامل ہیں۔

ح۔ اَوۡ بَنِیۡۤ اَخَوٰتِہِنَّ: بہنوں کے بیٹے۔

ان کے علاوہ سگے ماموں اور سگے چچا بھی محرم ہیں۔ اگرچہ آیت میں ذکر نہیں تاہم مسئلہ ایک مسلمہ ہے۔

ط۔ اَوۡ نِسَآئِہِنَّ: اپنی عورتوں سے مراد مسلمان عورتیں ہیں۔ غیر مسلم، یہودی، مسیحی اور مجوسی عورتوں کے سامنے پوری زیب و زینت کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔ حدیث میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ اپنے مردوں کو تمہاری زیبائش بیان کریں گی۔

ی۔ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُنَّ: مملوکہ کنیز، خواہ غیر مسلم کیوں نہ ہو۔ کیا اس میں غلام بھی شامل ہیں؟ ایک روایت میں فرمایا: غلام بھی شامل ہیں۔ (مجمع البیان)

ک۔ اَوِ التّٰبِعِیۡنَ غَیۡرِ اُولِی الۡاِرۡبَۃِ: ایسے تابع خادم جو عورت کی خواہش نہ رکھتے ہوں۔ جو گھر میں خادم کی حیثیت سے کام کاج کرتے ہیں۔ ایسے ہوش و حواس کے مالک نہیں ہیں کہ جن سے جنسی خواہشات بیدار ہوں۔ اس کی تطبیق میں چند اقوال ہیں۔ جنسی خواہشات نہ رکھنے والوں میں زیادہ سن رسیدہ لوگ، نامرد، مقطوع الذکر یا کسی بیماری کی وجہ سے جنسی خواہش نہ رکھنے والے سب شامل ہیں لیکن روایت میں یہ سب آیت کے مصداق نہیں ہیں۔

حضرت امام محمد باقر و حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کی روایت میں مصداق کا ذکر ہے:

هُوَ الۡاَحۡمَقُ الَّذِی لَا یَاۡتِی النِّسَآءَ.[1]	غَیۡرِ اُولِی الۡاِرۡبَۃِ سے مراد وہ کم عقل ہے جو عورتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

ل۔ اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِیۡنَ: وہ بچے جن میں ابھی جنسی خواہشات بیدار نہ ہوئی ہوں۔ مثلاً دس سال سے کم عمر کے بچے۔

۶۔ وَلَا یَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ: وہ اپنے پاؤں زمین پر ایسے مارتی ہوئی نہ چلا کریں جس سے ان کے پاؤں کے زیورات کی جھنکار نامحرم مرد محسوس کریں اور ان کی توجہ مبذول ہو جائے۔

اس حکم سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ صرف نگاہ نہیں بلکہ باقی حواس سے بھی بچنا چاہیے جو خواہشات کو مشتعل کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

ایما امرأة استعطرت و خرجت لیوجد ریحها فهی زانیة ....[2]	کوئی عورت عطر لگا کر نکلے تا کہ دوسروں کو خوشبو محسوس ہو تو یہ بھی ایک قسم کا زنا ہے۔

۷۔ وَتُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ: اس سلسلے میں تم سے نگاہ و دیگر حواس کے ذریعے لغزشیں ہوتی رہی ہیں۔ ان کے لیے توبہ کرو۔ اللہ کے تازہ وضع کردہ احکام کی طرف رجوع کرو اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے باز آجاؤ۔

اہم نکات

۱۔ فساد کو اس کے پہلے قدم پر روکنا آسان اور مؤثر ہے۔

وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ ؕ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ	۳۲۔ اور تم میں سے جو لوگ بے نکاح ہوں اور تمہارے غلاموں اور کنیزوں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو، اگر وہ نادار ہوں تو

---

[1] التہذیب ۷: ۴۶۸	[2] مجموعہ ورام ۱: ۲۸

يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۳۲﴾

اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا، علم والا ہے۔

تشریح کلمات

ایامی: (ا ی م) ایم۔ بے شوہر عورت اور بے ہمسر مرد کو کہتے ہیں۔ جسے مجرد کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ: تم اپنے میں سے جو مجرد (بے نکاح) ہیں۔ ان کا نکاح کر دو یہ حکم ہے اولیائے نکاح کو کہ وہ اپنے زیر ولایت افراد کا نکاح کریں۔ باپ، دادا کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے بیٹے، بیٹیوں کا نکاح کریں۔ اس امر استحبابی میں اولیائے نکاح کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں کہ وہ بے نکاح لڑکیوں کے نکاح میں مدد دیں۔ حدیث میں ہے:

فَمَنْ اَحَبَّ فِطْرَتِی فَلْیَسْتَنَّ بِسُنَّتِی وَ مِنْ سُنَّتِی النِّکَاحُ۔ [۱]

جو میری فطرت کو پسند کرتا ہے اسے میری سنت پر عمل کرنا چاہیے۔ میری سنت ہے نکاح۔

مَا بُنِیَ بِنَاءٌ فِی الْاِسْلَامِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ مِنَ التَّزْوِیجِ [۲]

اسلام میں اللہ کے نزدیک تزویج سے زیادہ پسند کی کوئی بنیاد نہیں ڈالی گئی۔

رُذَالُ مَوتَاکُمُ الْعُزَّابُ۔ [۳]

مُردوں میں سب سے بُرے مجرد لوگ ہیں۔

دوسری روایت میں ہے۔

شِرَارُ اُمَّتِی الْعُزَّابُ۔ [۴]

میری امت میں سب سے بُرے مجرد لوگ ہیں۔

دوسروں کو نکاح میں مدد دینے کے بارے میں حدیث میں آیا ہے:

کَانَ لَہٗ بِکُلِّ خُطْوَۃٍ خَطَاھَا اَوْ بِکُلِّ کَلِمَۃٍ تَکَلَّمَ بِھَا فِی ذَلِکَ عَمَلُ سَنَۃٍ قِیَامٌ لَیْلُھَا وَ صِیَامٌ نَھَارُھَا.... [۵]

جو اپنے مؤمن بھائی کی شادی میں سعی کرتا ہے۔ اس کے لیے اٹھنے والے ہر قدم اور ہر بات پر ایک سال کی عبادت کا ثواب ملے گا جس کی راتیں قیام اور دن صیام کی حالت میں گزارے ہوں۔

۲۔ وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ: تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں جو ازدواجی زندگی نبھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کا بھی نکاح کر دو۔

۳۔ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِهِمُ اللّٰهُ: یہ اگر نادار ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا۔

---

[۱] الکافی ۵: ۴۹۴ [۲] الوسائل الشیعۃ ۲۰: ۱۴ [۳] الکافی ۵: ۳۲۹ [۴] مستدرک الوسائل ۱۴: ۱۵۶ [۵] الوسائل الشیعۃ ۲۰: ۴۶

یہ اللہ پر توکل اور غیبی امداد پر ایمان سے متعلق ہے کہ جیسے خرچ بڑھتا ہے، آمدنی بڑھ جاتی ہے۔ گھر میں مہمان زیادہ آتے ہیں، گھر زیادہ آباد ہوتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

مَنْ تَرَكَ التَّزْوِيجَ مَخَافَةَ الْعَيْلَةِ فَقَدْ اَسَاءَ بِاللّٰهِ ظَنَّ۔[1]

جو تنگدستی کے خوف سے شادی نہ کرے اس نے اللہ کے ساتھ بدگمانی کی ہے۔

اہم نکات

۱۔ شادی ایک مقدس فریضہ ہے۔

۲۔ خرچ بڑھنے سے رزق بڑھتا ہے۔

وَلۡیَسۡتَعۡفِفِ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ نِکَاحًا حَتّٰی یُغۡنِیَہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَالَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ فَکَاتِبُوۡہُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا ٭ۖ وَّاٰتُوۡہُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ وَلَا تُکۡرِہُوۡا فَتَیٰتِکُمۡ عَلَی الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا لِّتَبۡتَغُوۡا عَرَضَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَمَنۡ یُّکۡرِہۡہُّنَّ فَاِنَّ اللّٰہَ مِنۡۢ بَعۡدِ اِکۡرَاہِہِنَّ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ جو لوگ نکاح کا امکان نہ پائیں انہیں عفت اختیار کرنی چاہیے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انہیں خوشحال کر دے اور تمہارے غلاموں میں سے جو مکاتبت کی خواہش رکھتے ہوں ان سے مکاتبت کرلو اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان میں کوئی خیر ہے اور انہیں اس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشا ہے دے دو اور تمہاری جوان لونڈیاں اگر پاکدامن رہنا چاہتی ہوں تو انہیں دنیاوی زندگی کے متاع کے لیے بدکاری پر مجبور نہ کرو اور اگر کوئی انہیں مجبور کر دے تو ان کی اس مجبوری کے بعد یقیناً اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

اَلۡبِغَآءِ: (ب غ ی) البغی کسی چیز کی طلب میں میانہ روی کی حد سے تجاوز کی خواہش کرنا۔

---

[1] الکافی ۵: ۳۳۰

تفسیر آیات

۱۔ وَلۡیَسۡتَعۡفِفِ: جو لوگ نکاح کرنے پر قادر نہیں ہیں وہ عفت شعاری اختیار کریں۔

۲۔ حَتّٰی یُغۡنِیَہُمُ اللّٰہُ: عفت شعاری کے پیچھے یہ شعور و عقیدہ کارفرما ہو کہ اللہ اسے غنی اور بے نیاز کرے گا۔ اس طرح فضل خدا کے انتظار میں عفت اور پاکدامنی اختیار کرنا آسان ہو جائے گا۔

۳۔ وَالَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ: کوئی غلام یا کنیز اپنے آقا کے ساتھ معاہدہ (مکاتبت) کرے جس کے تحت وہ اپنی آزادی کے لیے معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے۔ آقا کی طرف سے اس معاہدے کو قبول کرنے کی صورت میں آقا اسے مال کمانے کی اجازت اور موقع فراہم کرے گا۔

واضح رہے کہ صدر اسلام میں غلامی کا قانون جاری رکھنے کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں تھی چونکہ دشمنان اسلام مسلمان اسیروں کو غلام بناتے تھے تو اسلام نے بھی میدان جنگ میں جو کافر اسیر بن جاتے تھے انہیں غلام بنانے کا قانون برقرار رکھا۔

واضح رہے اسلام نے انسان کو غلام بنانے کی تمام صورتیں ختم کر کے صرف ایک صورت برقرار رکھی۔ چنانچہ کسی انسان کو غلام بنانے کی واحد صورت یہی ہے کہ کفر و اسلام کی جنگ میں میدان جنگ میں جو کافر اسیر بن جائے گا، وہی غلام ہو گا یا جو عورت اسیر بن جائے گی وہی کنیز ہو گی۔ غلامی کی کسی اور صورت کو اسلام قبول نہیں کرتا ہے۔ غلام نہ بنانے کی صورت میں دو صورتیں اور رہتی ہیں: یا اسیروں کو قتل کیا جائے یا آزاد کیا جائے۔ یہ دونوں صورتیں قابل عمل نہیں تھیں۔ اس لیے کافروں کے مقابلے میں ان کو بھی غلام بنانے کا عمل جاری رکھا۔ پھر ان غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے بہت سے قوانین بنائے گئے۔ ان میں سے ایک یہی عمل ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔

۴۔ وَّاٰتُوۡہُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰہِ: اس مد کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف میں متعین فرمائی ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ میں '' وَفِی الرِّقَابِ، گردنیں غلامی سے آزاد کرانے '' کے عنوان سے ذکر ہو چکا ہے کہ اگر اس معاہدے کے بعد کوئی غلام مال کا کوئی ایک حصہ ادا نہ کر سکے تو زکوٰۃ کی مد سے یہ مال ادا کیا جائے گا اور اس غلام کو آزادی دلائی جائے گی۔

۵۔ وَلَا تُکۡرِہُوۡا فَتَیٰتِکُمۡ عَلَی الۡبِغَآءِ: جاہلیت کے زمانے میں قحبہ گری کا رواج لونڈیوں کے ذریعے چلا ہوا تھا۔ لوگ اپنی لونڈیوں کو قحبہ گری کے لیے بٹھا دیتے اور ان کے ذریعہ مال و دولت کماتے تھے۔ کبھی تو اپنے گھروں میں بٹھا دیتے تھے جن کے دروازوں پر قحبہ خانے کی علامت کے طور پر جھنڈے لگا دیتے تھے۔ اس آیت میں حکم آیا کہ اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔

۶۔ وَمَنۡ یُّکۡرِہۡہُّنَّ: اگر ان لونڈیوں کو مجبور کیا گیا ہو تو اللہ انہیں معاف فرمائے گا کیونکہ

مجبور گناہ گار نہیں ہوتا۔

وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ مَوۡعِظَۃً لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔اور بتحقیق ہم نے تمہاری طرف واضح کرنے والی آیات نازل کی ہیں اور تم سے پہلے گزرنے والوں کی مثالیں بھی اور تقویٰ رکھنے والوں کے لیے موعظہ بھی (نازل کیا ہے)۔

تفسیر آیات

۱۔وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ: ہم نے اس قرآن کے ذریعے تم پر عبادات، معاملات، حلال و حرام و آداب پر مشتمل ایسے احکام و قوانین نازل کیے جو تمہارے لیے نظام حیات اور دستور زندگی بن جائیں۔

۲۔ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا: گزشتہ اقوام کی سرگزشت بیان کر کے تمہارے لیے دروس عبرت فراہم کیے۔ البتہ ان دروس سے صرف وہ لوگ استفادہ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانا چاہتے ہیں: لِّلۡمُتَّقِیۡنَ۔

اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیۡتُوۡنَۃٍ لَّا شَرۡقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرۡبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَ لَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ؕ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے، اس میں ایک چراغ رکھا ہوا ہے، چراغ شیشے کے فانوس میں ہے، فانوس گویا موتی کا چمکتا ہوا تارا ہے جو زیتون کے مبارک درخت سے روشن کیا جاتا ہے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی، اس کا تیل روشنی دیتا ہے خواہ آگ اسے نہ چھوئے، یہ نور بالائے نور ہے، اللہ جسے چاہے اپنے نور کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بھی بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

مشکوۃ: (ش ك و) طاق جو آر پار نہ ہو۔

زیت: (ز ی ت) الزیت زیتون کے تیل کو بھی کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: نور کی یہ تعریف کی جاتی ہے: الظاهر لنفسه و المظهر لغيره۔ بذات خود ظاہر ہو اور دوسروں کو بھی ظہور بخشے۔ اللہ تعالیٰ کو نور اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ بذات خود ظاہر ہے اور کائنات کا ظہور اسی سے ہے۔ ہم اس عالم ناسوت میں اشیاء کو ان کی ضدوں سے پہچانتے ہیں۔ اگر تاریکی نہ ہوتی تو ہم نور سے واقف نہ ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کی کوئی ضد نہیں ہے۔ وہ ظہور محض اور نور ہے جس کے مقابلے میں کوئی تاریکی نہیں ہے۔ وہ اگر ہم سے پوشیدہ ہے تو شدت ظہور اور فرط نور اور ادراکات کی کوتاہی کی وجہ سے ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کا فرمان نقل ہوا ہے:

وَ اَبۡیَنُ مِمَّا تَرَی الۡعُیُوۡنُ...[1] تیری ذات ان چیزوں سے زیادہ آشکار ہے جن کو آنکھیں دیکھتی ہیں۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی دعاؤں میں آیا ہے:

یا باطنا فی ظهوره [2] اے وہ ذات جو اپنے ظہور میں پوشیدہ ہے۔

وہ کسی پردہ خفا میں نہیں ہے۔ چونکہ جب ہر چیز کا ظہور اللہ کی طرف سے ہے تو خود اللہ کا ظہور سب سے زیادہ عیاں ہوگا۔ اگر کسی کے لیے عیاں نہیں ہے تو یہ اس کی اپنی نا اہلی ہے۔

اس سلسلے میں شاعر نے خوب کہا ہے:

خفی لا فراط الظهور تعرضت

لا دراکه ابصار قوم اخافش

وہ فرط ظہور سے پردۂ خفا میں ہے اسے دیکھنے کی

کوشش چمگادڑوں کی آنکھوں نے کی ہے۔

اللہ کو نور اس معنی کے لحاظ سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کوئی شعاع ہے جس کی کرنیں کسی جسم پر پڑتی ہیں تو اس سے روشنی منعکس ہو جاتی ہے اور ہمارے پردہ چشم پر پڑتی ہے تو دماغ کے بینائی کے حصے کو متاثر کرتی ہے۔ یہ حسی نور اور روشنی، مادی اور مخلوق خدا ہے۔ اللہ کو اس حسی اور مادی نور سے تشبیہ دینا ممکن نہیں

[1] نہج البلاغۃ خ ۱۵۵ [2] بحار ۹۵: ۱۶۵

ہے۔ جس طرح اللہ کا سمیع و بصیر ہونا ہماری سماعت و بصارت کی طرح نہیں ہے، اسی طرح اللہ کا نور ہونا ہمارے درمیان موجود شمسی و غیر شمسی نور کی طرح نہیں ہے۔ لہٰذا

i۔ اللہ اس کائنات کا آشکارترین وجود ہے: الظاھر لنفسہ۔

ii۔ کل کائنات اس وجود کے آثار ہیں: المظھر لیغرہ۔

لہٰذا نور کہنے میں ذات اور افعال کا ظہور، دونوں ہیں۔

واضح رہے نور کی سماوات و ارض کی طرف اضافت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نور اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے ہے۔ لہٰذا کائنات سے مربوط تمام چیزیں اس اطلاق میں شامل ہیں۔ کائنات کی تخلیق، تدبیر، تقدیر اور ہدایت، سب کے سب فیض باری تعالیٰ ہیں۔ لہٰذا کیا اللہ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ہے سے مراد خالق السموات والارض ہے؟ یا منوّر السموات والارض ہے؟ یا ھادی السموات والارض ہے؟ تین اقوال نہیں بنتے بلکہ یہ سب ایک قول کے ذیل میں آتے ہیں کہ کل کائنات اللہ تعالیٰ کی تجلی ہے۔

یہ سب اپنی جگہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ بذات خود نور وظہور ہے لیکن آیت میں جس نور کا ذکر ہے اس سے مراد افعال خدا میں سے ایک فعل ہے۔ یعنی ہدایت۔ وہ بھی ہدایت تشریعی۔ اس پر دلیل آیت کے ذیل میں موجود یہ جملہ ہے: یَهۡدِی اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ۔

اس سے معلوم ہوا کہ نور سے مراد نور ہدایت ہے۔ یہ نور ہدایت اگرچہ کل کائنات کے لیے ہے تاہم اس سے فیض حاصل کرنے والے صرف مَنۡ یَّشَآءُ ہیں۔

۲۔ مَثَلُ نُوۡرِهٖ: وہ نور جس کی طرف اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ نور خدا، جو قلب مؤمن کو منور کرتا ہے۔ اس ہدایت کو قرآن نے متعدد مقامات پر نور کہا ہے:

یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ ...[1] یہ لوگ اپنی پھونکوں سے نور خدا کو بجھانا چاہتے ہیں۔

اَوَ مَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰهُ وَ جَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِهٖ فِی النَّاسِ کَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ ...[2] کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا اور ہم نے اسے روشنی بخشی جس کی بدولت وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پھنسا ہوا ہو۔

۳۔ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡهَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَۃٍ: اس نور کو تشبیہ دی گئی ہے ایک ایسے طاق سے جس میں چراغ رکھا ہوا ہے اور چراغ شیشے میں ہے۔ طاق، چراغ اور شیشہ تینوں کے مجموعے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ چراغ شیشے میں اور شیشہ طاق میں ہونے سے دو خصوصیات وجود میں آتی ہیں: ایک یہ کہ اس کا نور ہر طرف پھیلتا ہے۔ دوسری یہ کہ نور بیرونی گزند سے محفوظ رہتا ہے اور تیز آندھی بھی اس کی

---

[1] ۹ توبۃ: ۳۲ [2] ۶ انعام: ۱۲۲

روشنی کی تمازت کو متاثر نہیں کر سکتی۔

۴۔ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ: خود شیشہ اور قندیل موتی کا چمکتا ستارہ ہے۔ اس میں چراغ ہو تو اس چراغ کی روشنی ہر سو پھیل جائے گی۔

۵۔ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیۡتُوۡنَۃٍ: یہ چراغ زیتون جیسے بابرکت درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو تو اس چراغ کی روشنی میں جو شفافیت آئے گی وہ تصور سے زیادہ ہو گی چونکہ اس درخت کے کئی ایک اوصاف ہوں گے:

i۔ یہ نہ شرقی ہو گا، نہ غربی۔ مفسرین فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس درخت پر سورج کی شعاع محدود نہیں کہ مشرقی ہو تو مغربی دھوپ نہ پڑے اور مغربی ہو تو مشرقی دھوپ نہ پڑے بلکہ یہ درخت ایسی جگہ پر ہے جہاں ہر وقت اور ہر سو دھوپ ہے۔ جس سے اس درخت کا پھل عمدہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس پھل سے عمدہ تیل نکلتا ہے اور اس تیل سے روشنی بھی عمدہ ہوتی ہے۔

ii۔ دوسرا وصف یہ ہے کہ یہ درخت مبارک، بابرکت اور کثیر المنافع ہے۔ اس برکت کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے تیل سے عمدہ روشنی میسر آتی ہے۔

۶۔ یَّکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ: یہ تیل اپنی صفائی اور شفافیت سے از خود روشنی دیتا ہے، کسی آتش سے سوزش کی وجہ سے نہیں۔ یعنی اس کی روشنی اپنی ذاتی ہے کسی آتش سے حاصل کردہ نہیں ہے۔

۷۔ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ: بعض فرماتے ہیں: اس سے مراد مضاعف ہے، متعدد نہیں ہے۔ مگر آیت میں نور متعدد کا ذکر ہے۔ چراغ کا نور، قندیل کا نور جسے چمکتے ستارے سے تشبیہ دی ہے، تیل کا نور، جس کے بارے میں فرمایا: یُضِیۡٓءُ وہ بذات خود روشنی دیتا ہے۔ لہٰذا ان متعدد انوار کو نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ کہا گیا ہے۔ ۴۶۴

۸۔ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ: اللہ کائنات میں سے جو اہل ہیں ان کو اپنے نور کی ہدایت دیتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا آیت کا یہ جملہ دلیل بنتا ہے کہ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ سے مراد نور ہدایت ہے۔

تشبیہ اس طرح ممکن ہے کہ اللہ نے کائنات کو خلق فرما کر اس کے لیے ہدایت کا جو سامان فراہم فرمایا ہے وہ ہدایت، نور مضاعف اور نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ کی طرح متعدد انوار ہیں: نور رسالت و نبوت، نور ولایت و امامت، نور عقل و فطرت۔ اللہ نے ہدایت کے اسباب فراہم کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ نہ یہ کہ اللہ کی طرف سے فراہم شدہ ہدایت میں کسی قسم کی کمی ہے۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے سامان ہدایت نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ہیں:

اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ ...۔[1]	کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو اور جسے اپنے رب کی طرف سے روشنی ملی ہو

---

[1] ۳۹ زمر: ۲۲

چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے۔ آپؑ نے اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ کی تفسیر میں فرمایا:

هَادٍ لِأَهْلِ السَّمَاءِ وَ هَادٍ لِأَهْلِ الْأَرْضِ۔[1]	اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں کے لیے ہدایت دینے والا ہے۔

۹۔ وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ: ہر قسم کے حقائق، خصوصاً غیر محسوس حقائق بیان کرنے کے لیے مثال کا کردار بہت اہم ہے۔ خصوصاً ایک غیر محسوس چیز، جیسے ہدایت ہے۔ ہدایت ایک معنوی چیز ہے اسے روشنی، جو ایک محسوس اور بصری چیز ہے، کے ساتھ تشبیہ دینے سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن نے ایمان کو نور اور کفر کو ظلمت کے ساتھ متعدد آیات میں تشبیہ دی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ نے اپنی ہدایت کو واضح سے واضح تر انداز میں پیش فرمایا ہے: مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ....

فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَ یُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیۡہَا بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ ﴿۳۶﴾	۳۶۔ (ہدایت پانے والے) ایسے گھروں میں ہیں جن کی تعظیم کا اللہ نے اذن دیا ہے اور ان میں اس کا نام لینے کا بھی، وہ ان گھروں میں صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فِیۡ بُیُوۡتٍ: جب اللہ تعالیٰ نے کائنات کے لیے فراہم کردہ ہدایت کو روشن طاق کے ساتھ تشبیہ دی تو اس آیت میں ہدایت کے اس روشن چراغ کے مقامات کا ذکر فرمایا کہ اس روشن چراغ نے کہاں سے اپنی ضوفشانی کرنا ہے۔ فرمایا: فِیۡ بُیُوۡتٍ یہ مشکوۃ ایسے گھروں میں ہوں گے جن کے احترام کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ اللہ کی ہدایت کی روشنیاں پھیلنے کے گھروں میں سرفہرست انبیاء علیہم السلام کے گھر ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے۔

هي بيوت الانبياء و بيت علي ع منها۔[2]	بُیُوۡتٍ سے مراد انبیاء کے بیوت ہیں اور علی ع کا گھر بھی انہیں میں سے ہے۔

حضرت انس اور بریدة سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ

---

[1] الکافی ۱: ۱۱۵ [2] تفسیر القمی ۲: ۱۰۳

کی تلاوت فرمائی تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر سوال کیا: یا رسول اللہ! یہ کون سے گھر ہیں؟ قال بیوت الانبیاء۔ فرمایا: انبیاء کے گھر ہیں۔ حضرت ابوبکر نے کھڑے ہو کر سوال کیا: یا رسول اللہ! کیا علی اور فاطمہ کا گھر بھی انہیں گھروں میں سے ہے؟

قال نعم من افاضلھا۔[1] فرمایا: ہاں! ان میں افضل گھروں میں سے ہے۔

صاحب مجمع البیان فرماتے ہیں: اس حدیث کی تائید آیۂ تطہیر سے ہو جاتی ہے جو بیت رسول کے رہنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی:

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ۞[2] اللہ کا ارادہ بس یہی ہے ہر طرح کی ناپاکی کو اہل بیت ! آپ سے دور رکھے اور آپ کو ایسے پاکیزہ رکھے جیسے پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

۲۔ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ: اللہ تعالیٰ نے اذن دیا ہے کہ ان گھروں کو رفعت دی جائے۔ ان گھروں کی تعظیم کی جائے۔ اذن دیا ہے یعنی اجازت دی ہے۔ اجازت دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اس عمل کا انجام دینا جائز ہے، کوئی مانع نہیں۔ اعلانِ عدم مانع کو اذن کہتے ہیں۔

اس سے تو یہ مفہوم ہو سکتا تھا کہ ان گھروں کی تعظیم جائز اور بلا مانع ہے لیکن بعد کا جملہ وَ یُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ ان گھروں میں ذکر خدا کا اذن ہے، سے معلوم ہوا کہ اس اذن کا مطلب صرف جواز نہیں بلکہ یہ تعظیم اللہ کو مطلوب ہے۔

۳۔ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیۡہَا: ان گھروں کی تعظیم اس وجہ سے مطلوب ہے کہ یہاں ذکر خدا اور اس کی تسبیح و تقدیس ہوتی ہے۔ کوئی جگہ بذات خود قابل تعظیم نہیں ہوتی جب تک اس کی اللہ کے ساتھ کوئی نسبت نہ ہو۔ اگرچہ ہر وہ گھر جس میں ذکر خدا ہوتا ہے قابل احترام ہے تاہم احادیث کے مطابق مساجد اور انبیاء و اوصیاء کے گھر مرکز ذکر خدا ہونے کے اعتبار سے قابل تعظیم ہیں۔

اہم نکات

۱۔ جن گھروں کو اللہ نے رفعت و بلندی عطا کی ہے ان کی اہانت کرنے والے قیامت سے پہلے ہی پشیمان ہوں گے۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡہِیۡہِمۡ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیۡعٌ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ

۳۷۔ ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت ذکر خدا اور قیام نماز اور ادائیگی زکوٰۃ سے

---

[1] الدر المنثور ۵: ۵۰ نیز ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ۱: ۵۳۳، تفسیر ثعلبی الکشف والبیان ۷: ۱۰۷ روح المعانی ۹: ۳۶۷۔
[2] ۳۳ احزاب: ۳۳

اِیۡتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۪ۙ یَخَافُوۡنَ یَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِیۡہِ الۡقُلُوۡبُ وَ الۡاَبۡصَارُ ﴿۳۷﴾	غافل نہیں کرتیں وہ اس دن سے خوف کھاتے ہیں جس میں قلب و نظر منقلب ہو جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ رِجَالٌ: یسبح فیھا رجال جن گھروں کی تعظیم کا حکم ہے ان میں ایسے مردان حق مشغول تسبیح ہوتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت ذکر خدا سے غافل نہیں کرتی۔

۲۔ تِجَارَۃٌ: ایک پیشہ ہے۔ جب کہ بیع ایک وقتی عمل ہے۔ مثلاً عین نماز کے وقت تجارتی قافلہ پہنچ جاتا ہے اور ایک شخص کو اس سے کچھ خریدنا ہے تو وہ نماز میں تاخیر کر کے خرید میں مشغول نہیں ہوتا۔

یہ رجال ذکر خدا، اقامہ نماز، ادائے زکوۃ کے مقابلے میں دنیوی مفادات کو ترجیح نہیں دیتے۔ ذکر خدا کے بعد اقامۂ نماز کے ذکر سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ذکر خدا، نماز کے علاوہ ہے۔ مثلاً تجارت اور بیع کے موقع پر اگرچہ نماز کا وقت نہیں ہے لیکن تجارت اور بیع میں حلال و حرام کا خیال رکھنا ذکر خدا و خوف قیامت کی وجہ سے ہوگا۔ یہاں ذکر خدا اور اقامۂ نماز میں فرق سامنے آتا ہے۔

۳۔ یَخَافُوۡنَ یَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِیۡہِ الۡقُلُوۡبُ وَ الۡاَبۡصَارُ: قیامت کے دن قلب و بصر میں انقلاب آئے گا۔ اب انسان وہ چیزیں دیکھنے لگے گا جو یہاں نہیں دیکھ سکتا تھا:

اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ ؕ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا ﴿ؕ﴾ [1]	پڑھ اپنا نامۂ اعمال! آج اپنے حساب کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔
وَ بَدَا لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مَا لَمۡ یَکُوۡنُوۡا یَحۡتَسِبُوۡنَ ﴿﴾ [2]	اور اللہ کی طرف سے وہ امر ان پر ظاہر ہو کر رہے گا جس کا انہوں نے خیال بھی نہیں کیا تھا۔
فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ ﴿﴾ [3]	بے شک تو اس چیز سے غافل تھا چنانچہ ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے لہٰذا آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

ممکن ہے تَتَقَلَّبُ کا مطلب یہ ہو کہ خوف و ہراس کی شدت کی وجہ سے قلب و بصر اپنے ٹھکانے پر نہ ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ قابل تعظیم گھروں میں رہنے والے کبھی دنیوی مفاد کو اللہ کی بندگی پر مقدم نہیں کرتے۔

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۱۴ [2] ۳۹ زمر: ۴۷ [3] ۵۰ ق: ۲۲

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ تاکہ اللہ انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دے اور اپنے فضل سے انہیں مزید بھی عطا کرے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دے دیتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ: یہ مردان حق تجارت و بیع کو چھوڑ کر ذکر خدا، نماز، زکوٰۃ اس لیے بجا لاتے ہیں تاکہ اللہ ان کے ان نیک اعمال کی جزا دے۔ عبادت بجا لانے کا محرک ثواب ہو تو یہ کوئی نقص نہیں ہے۔

۲۔ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ: اللہ ان کے اعمال صالحہ کے مطابق میں ثواب عنایت کرنے کے بعد اپنے فضل و کرم سے مزید عنایت فرمائے گا۔ یہ نہایت قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو ثواب عنایت فرماتے ہوئے صرف ان کے اعمال کو سامنے نہیں رکھے گا بلکہ اپنی طرف سے مزید تفضّل فرمائے گا یعنی مومنین کو دو قسم کے ثواب ملیں گے:

i۔ اپنے اعمال کے مقابلے میں ایک نیکی کے مقابلے میں دس نیکیوں کا ثواب، کبھی ایک نیکی کے مقابلے میں سات سو نیکیوں کا ثواب، جیسے راہ خدا میں انفاق کا ثواب ہے۔ یہ ثواب ایک حساب اور استحقاق کے مطابق ہو گا۔

ii۔ دوسرا وہ ثواب ہے جو کسی عمل اور استحقاق کی بنیاد پر نہیں بلکہ اللہ اپنی طرف سے از راہ تفضّل عنایت فرمائے گا۔ یہ ثواب بغیر حساب، بغیر استحقاق ہو گا۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ انسان کا کچھ عمل صالح ہو تو اللہ مزید تفضّل فرمائے گا۔ اگر سرے سے کوئی عمل نہ ہو تو تفضّل کی نوبت نہیں آتی۔

۳۔ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ: جس کے ساتھ اللہ کی مشیت ہو جائے اسے بغیر استحقاق، بغیر محاسبہ عنایت فرمائے گا۔ واضح رہے اللہ کی مشیت اندھی بانٹ نہیں ہوتی۔ وہ صرف اہل کو عنایت فرمائے گا۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کو اپنے اعمال سے زیادہ فضل خدا سے امید رکھنی چاہیے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ

۳۹۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں سراب، جسے پیاسا پانی خیال کرتا ہے مگر جب وہاں پہنچتا ہے

يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ	تو اسے کچھ نہیں پاتا بلکہ اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے
فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ	تو اللہ اس کا حساب پورا کر دیتا ہے اور اللہ
الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾	بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

سراب: (س ر ب) گرمی میں جو ریت پانی کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہے اسے سراب کہا جاتا ہے۔ اسی سے ہر بے حقیقت چیز کو سراب کہا جاتا ہے۔

بِقِيْعَةٍ: (ق ی ع) ہموار میدان۔

الظَّمْاٰنُ: (ظ م ء) پیاس کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ: کافر اپنے اعمال کا ثواب دنیا میں ملنے کی توقع رکھتے ہیں۔ وہ بتوں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے دنیوی مسائل حل ہو جائیں۔ وہ اپنے معبودوں کو خوش کر کے جو جزا لینا چاہتے ہیں وہ ایک سراب کی طرح ہے کہ اس کے واہمہ کی نگاہ میں بہت دلفریب ہے مگر حقیقت و واقعیت سے عاری۔ قیامت کے دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک ہیچ کے پیچھے گئے ہوئے تھے۔

۲۔ وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ: البتہ اللہ کے پاس اپنے بُرے اعمال کی سزا موجود پائیں گے۔

۳۔ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ: اب اللہ اس کا پورا پورا حساب چکا دے گا۔

اگر کافروں میں اہل کتاب کو بھی شامل سمجھا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ یہ لوگ جو نیک اعمال بجا لائیں گے وہ کفر کی وجہ سے حبط ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن ان کے تمام اعمال سراب کی مانند ہوں گے جن سے وہ قیامت کی پیاس بجھانے کی توقع رکھتے ہوں گے لیکن نامہ اعمال دیکھنے پر پتہ چلے گا: لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا۔

اہم نکات

۱۔ کافر اپنی تمام تر توقعات ایک سراب سے وابستہ کر رکھتا ہے۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ	۴۰۔ یا ان کی مثال اس تاریکی کی طرح ہے جو
يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ	گہرے سمندر میں ہو جس پر ایک موج چھائی ہوئی

فَوۡقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُہَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ یَدَہٗ لَمۡ یَکَدۡ یَرٰىہَا ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوۡرًا فَمَا لَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾	ہو اس پر ایک اور موج ہو اور اس کے اوپر بادل، تہ بہ تہ اندھیرے ہی اندھیرے ہوں، جب انسان اپنا ہاتھ نکالے تو وہ اسے نظر نہ آئے اور جسے اللہ نور نہ دے تو اس کے لیے کوئی نور نہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوۡ کَظُلُمٰتٍ فِیۡ بَحۡرٍ لُّجِّیٍّ: یا کافروں کے اعمال کی بے مائیگی کی یہ مثال پیش کی جا سکتی ہے: ان کے اعمال گہرے سمندر میں تاریکی کی طرح ہیں۔ یَّغۡشٰہُ مَوۡجٌ اس تاریکی پر ایک موج چھائی ہوئی ہے جس سے تاریکی دوگنی ہو جاتی ہے۔ مِّنۡ فَوۡقِہٖ مَوۡجٌ اس پر ایک اور موج ہے جس سے تاریکی تین گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ مِّنۡ فَوۡقِہٖ سَحَابٌ اس کے اوپر بادل چھایا ہوا ہے جس کی وجہ سے تاریکی تہ بہ تہ ہو جاتی ہے۔ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُہَا فَوۡقَ بَعۡضٍ۔ اس تہ بہ تہ ظلمات کی وجہ سے یہ ظلمات روشنی سے کافی دور ہو جاتی ہیں۔ جس طرح نورانی ہستیاں نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ، نور بالائے نور میں تھیں، یہ کافر ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُہَا فَوۡقَ تاریکی بالائے تاریکی میں ہیں۔

۲۔ وَ مَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوۡرًا فَمَا لَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ: روشنی کا واحد منبع جسے نور نہ دے، اس کے لیے نور حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ لہٰذا کافر کے لیے ان ظلمات سے نکل کر روشنی کی طرف آنے اور ساحل تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ کافر کے لیے ظلمات سے نکل کر روشنی اور نجات کے ساحل تک آنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسۡبِیۡحَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۱﴾	۴۱۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی؟ ان میں سے ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے اور اللہ کو ان کے اعمال کا بخوبی علم ہے۔
وَ لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ	۴۲۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے

وَ اِلَی اللّٰہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۴۲﴾ لیے ہے اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَمۡ تَرَ: کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ہے۔ اللہ نے اپنے رسولؐ کو کائنات کے اسرار و رموز سے واقف کر رکھا ہے۔ رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاتھ میں کنکروں کی تسبیح سے یہ بات واضح ہے کہ رسولؐ کے لیے یہ بات واضح تھی۔ کائنات کی ہر شیء تسبیح کرتی ہے۔ جیسا کہ سورہ حج آیت ۱۸ میں بھی اسی طرح خطاب فرمایا:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَ الۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ....

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے نیز سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے انسان اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔

اس آیت میں غیر صاحبان عقل کے سجدے کا ذکر ہے اور اَلَمۡ تَرَ کیا آپ نے نہیں دیکھا کا خطاب ہے۔ اس سے معلوم ہوا ان چیزوں کا سجدہ اور تسبیح رسولؐ کے لیے ایک مسلمہ امر ہے۔

۲۔ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ: اگرچہ لفظ مَنۡ صاحبان عقل کے لیے استعمال ہوتا ہے تاہم از باب تغلیب غیر صاحبان عقل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اسی سورہ کی آیت ۴۵ میں پیٹ کے بل اور چار ٹانگوں پر چلنے والے جانوروں کے لیے لفظ مَنۡ استعمال ہوا:

مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی بَطۡنِہٖ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی رِجۡلَیۡنِ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰۤی اَرۡبَعٍ ....

ان میں سے کوئی اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے اور کوئی دو ٹانگوں پر چلتا ہے اور کوئی چار ٹانگوں پر....

۴۷۱

لیکن مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ میں سب شامل ہیں۔ اس پر شاہد وَ الطَّیۡرُ پرندوں کے ذکر کے بعد کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسۡبِیۡحَہٗ ''ان سب کو اپنے نماز و تسبیح کا علم ہے'' کا جملہ ہے نیز اس موقف پر آیہ:

تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡہِنَّ ؕ وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ ....[1]

ساتوں آسمان اور زمین اور ان میں جو موجودات ہیں سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو....

شاہد ہے۔

---

[1] ۱۷ اسراء: ۴۴

۳۔ كُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسۡبِيۡحَهٗ: ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی نماز اور تسبیح ہوتی ہے۔ پرندوں کی اپنی نماز و تسبیح ہوتی ہے۔ انسان کی اپنی۔
دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان میں سے ہر ایک کو علم ہے۔ البتہ ہر ایک کا علم اس کے حساب سے ہے۔ انسان کو اپنی نماز کا علم اور پرندوں کو بھی اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے۔ وہ علم کے مطابق ارادہ و اختیار سے نماز قائم کرتے اور تسبیح پڑھتے ہیں۔ اس کی یہ تاویل درست نہیں ہے کہ ہر ایک نماز و تسبیح زبان حال سے کرتے ہیں یا ان کا اللہ کی طرف احتیاج ان کی نماز ہے چونکہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ ... تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے۔

اللہ فرمائے کہ تم نہیں سمجھ سکتے اور ہم کہیں کہ ہم سمجھ سکتے ہیں، وہ زبان حال اور احتیاج ہے۔
کل کائنات، انسان، حیوان، جمادات سب اپنے خالق کی تسبیح و عبادت میں مشغول ہیں۔ قرآن نے پہاڑ درخت، چوپاؤں، پرندوں، سورج، چاند، ستاروں کی تسبیح کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے اور وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ سے عمومی اشیاء کی تسبیح کا ذکر فرمایا ہے۔
۴۔ وَ لِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: کائنات کی ہر شیء اپنے وجود، انجام کار اور اپنی بقا میں اللہ کی محتاج ہے۔ کائنات میں کوئی شیء ایسی نہیں ہے جس کی شہ رگ اللہ کے ہاتھ میں نہ ہو۔ لہٰذا کائنات پر اللہ کی ملکیت کا وہ تصور ہے جو کسی غیر اللہ کے لیے قابل تصور نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ کل کائنات اللہ کی تسبیح خواں ہے۔
۲۔ تسبیح ایک کائناتی فریضہ ہے جس سے صرف یہ انسان انحراف کرتا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزۡجِىۡ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيۡنَهٗ ثُمَّ يَجۡعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الۡوَدۡقَ يَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ جِبَالٍ فِيۡهَا مِنۡۢ بَرَدٍ فَيُصِيۡبُ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَصۡرِفُهٗ عَنۡ مَّنۡ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرۡقِهٖ يَذۡهَبُ بِالۡاَبۡصَارِ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی بادلوں کو چلاتا ہے پھر اسے باہم جوڑ دیتا ہے پھر اسے تہ بہ تہ کر دیتا ہے؟ پھر آپ بارش کے قطروں کو دیکھتے ہیں کہ بادل کے درمیان سے نکل رہے ہیں اور آسمان سے پہاڑوں (جیسے بادلوں) سے اولے نازل کرتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے اسے برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اسے ہٹا دیتا ہے، قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو ختم کر دے۔

تشریح کلمات

يُزْجِيْ: (ز ج و) الزجية کے معنی کسی چیز کو دفع کرنے کے ہیں تا کہ چل پڑے۔

رُكَامًا: (ر ك م) رکم کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا۔ تہ بہ تہ بادل۔

الْوَدْقَ: (و د ق) بارش کے معنوں میں ہے۔

بَرَدٍ: (ب ر د) البرد کے معنی اولے کے ہیں۔

تفسیر آیات

ا۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا: بخارات جب بادل کی شکل اختیار کرتے ہیں تو اگر اسی جگہ رہتے تو سمندر کے بخارات بارش کی شکل میں دوبارہ سمندر میں گرتے خشکی کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ مگر:

وَاللّٰهُ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا — اور اللہ ہی ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو اٹھاتی ہیں

فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ .... [1] — پھر ہم اسے ایک اجاڑ شہر کی طرف لے جاتے ہیں۔

ہوا کے ذریعے اللہ ان بادلوں کو خشکی کی طرف چلاتا ہے۔ انسان پانی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہروں، پائپوں اور ٹینکروں کے ذریعے منتقل کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فضائی راستے سے ہوا اور بادل کے ذریعے اربوں ٹن پانی چند گھنٹوں میں دور دراز خشک علاقوں تک پہنچا دیتا ہے۔

۲۔ ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ: ان پتلے بادلوں کو جو بارش دینے کے قابل نہیں ہیں آپس میں جوڑ دیتا ہے کہ گھنے ہو جائیں۔

۳۔ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا: اس جوڑنے کے نتیجے میں یہ بادل گھنے، تہ بہ تہ اور بارش دینے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان بادلوں کے مختلف ٹکڑے باہم جڑتے ہیں۔ کڑک کی آواز ہم سنتے ہیں، چمک بھی دیکھتے ہیں۔

۴۔ فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ: پھر بادلوں کے بیچ میں سے بارش کے قطرے ایسے نکلتے ہیں جیسے تھن سے دودھ۔

۵۔ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ: آسمان سے، پہاڑوں سے اولے نازل فرماتا ہے۔ یہاں آسمان سے مراد بلندی ہے اور پہاڑ سے مراد وہ ابر ہے جو آسمان کی طرف پہاڑ کی طرح اٹھتے ہیں۔ انسان نے یہ منظر جہاز پر سوار ہونے کے بعد دیکھا ہے۔ ہزاروں میٹر بادل کے یہ پہاڑ اوپر کی طرف اٹھتے ہیں تو درجہ حرارت منفی 60 سے 70 سینٹی گریڈ تک ہو جاتا ہے جس سے ان کی چوٹیوں پر برف کی ایک تہہ جم جاتی ہے۔ یہ برف جب نیچے کی طرف گرنا شروع ہوتی ہے تو ہزاروں میٹر بادل سے گزرنا پڑتا ہے۔

---

[1] ۳۵ فاطر: ۹

جس سے یہ برف پگھل کر بارش کے قطروں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بادل چھلنی کا کام دیتے ہیں۔

حدیث رسول ﷺ میں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ جَعَلَ السَّحَابَ غَرَابِیلَ لِلْمَطَرِ ھِیَ تُذِیبُ الْبَرَدَ حَتّٰی یَصِیرَ مَاءً لِکَیْ لَا یُضِرَّ بِہِ شَیْئاً یُصِیبُہُ۔[1]

اللہ تعالیٰ نے بادل کو باران کے لیے چھلنی بنایا ہے جو برف پگھلا دیتا ہے کہ پانی ہو جائے کہ کسی چیز پر لگ جائے تو اسے ضرر نہ پہنچے۔

۶۔ فَیُصِیۡبُ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَصۡرِفُہٗ عَنۡ مَّنۡ یَّشَآءُ: ان گرنے والے اولوں سے بعض اوقات فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ نقصان پہنچنا مشیت الٰہی میں ہے اور جسے بچانا اس کی مشیت میں ہے، اسے یہ برف پھیلا کر بچا لیتا ہے۔

یُقَلِّبُ اللّٰہُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ اللہ شب و روز کو بدلتا رہتا ہے جس میں صاحبان بصیرت کے لیے یقیناً عبرت ہے۔

تفسیر آیات

رات اور دن کے آنے جانے سے اس کرۂ ارض پر زندگی آباد ہے۔ اگر ہمیشہ رات ہوتی تو زندگی ممکن نہ تھی اور اگر ہمیشہ دن ہوتا تو اگرچہ دھوپ سرچشمہ زندگی ہے تاہم اس کی مسلسل تپش سے زندگی ختم ہو جاتی۔

نیز شب و روز کی آمد و رفت نباتات کی نشو و نما اور بارشوں کے نزول کے لیے مؤثر ہے و دیگر بہت سے دروس عبرت اس مظاہر قدرت میں موجود ہیں۔

اہم نکات

۱۔ بادلوں کی ترکیب و ترسیل، شب و روز کی تبدیلی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تدبیر کائنات کے مظاہر ہیں۔

وَ اللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ ۚ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی بَطۡنِہٖ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی رِجۡلَیۡنِ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰۤی اَرۡبَعٍ ؕ

۴۵۔ اور اللہ نے زمین پر چلنے والے ہر جاندار کو پانی سے خلق فرمایا پس ان میں سے کوئی اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے اور کوئی دو ٹانگوں پر چلتا ہے اور کوئی چار ٹانگوں پر، اللہ جو کچھ

---

[1] الکافی ۸: ۲۳۹

يَخۡلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۴۵﴾	چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنۡ مَّآءٍ دابۃ زمین پر چلنے والے کو کہتے ہیں۔ اللہ نے زمین پر ہر چلنے والے کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ یہ بات مسلمات میں سے ہوگئی ہے کہ جاندار کی تخلیق میں بنیادی چیز پانی ہے۔ خواہ ہم نطفہ مراد لیں یا پروٹوپلازم مراد لیں جس کا اکثر حصہ پانی ہوتا ہے یا یہ کہیں کہ حیات کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے پھر مختلف شکلوں میں پھیل گئی ہے۔ ہم سائنس کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر کے قائل نہیں ہیں چونکہ سائنسی نظریات قابل تغییر ہیں، قرآنی حقائق ناقابل تغییر۔ سائنس کے مطابق حیات کا مصدر، حیات ہی ہو سکتی ہے۔ زمین پر حیات نہ تھی، پیدا ہوگئی ہے۔ حیات کی ایک تاریخ ہے۔

قرآن کہتا ہے حیات کا مصدر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس نے حیات کو پانی سے پیدا کیا ہے۔

حدیث میں آیا ہے:

فَجَعَلَ نَسَبَ كُلِّ شَيْءٍ اِلَى الْمَاءِ وَ لَمْ يَجْعَلْ لِلْمَاءِ نَسَباً... [۱]	ہر چیز کا نسب پانی تک ہے۔ پانی کا کوئی نسب قرار نہیں دیا۔

مسئلہ حیات پر تشریح کے لیے سورہ بقرہ آیت ۲۸ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّمۡشِىۡ: زمین پر رینگنے والوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں، جیسے سانپ اور کچھ کیڑے ایسے ہیں جو دو ٹانگوں پر چلتے ہیں، کچھ چار ٹانگوں پر۔

۴۷۵ ۳۔ يَخۡلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ: جو جانور چار سے زیادہ ٹانگوں پر چلتے ہیں وہ اس جملے میں داخل ہو جاتے ہیں: اللہ جو چاہتا ہے خلق فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ پانی سے حیات پیدا ہوئی اور پانی سے حیات برقرار رہ سکتی ہے۔

لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۴۶﴾	۴۶۔ بتحقیق ہم نے حقیقت بیان کرنے والی آیات نازل کیں اور اللہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی رہنمائی فرماتا ہے۔

---

[۱] الکافی ۸: ۹۴

تفسیر آیات

۱۔ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ : زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تمام احکام بیان کیے۔ ایک جامع نظام حیات اور دستور زندگی بیان فرمایا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں: آیات بینات سے مراد آیہ نور اور بعد کی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نور کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ وَ اللّٰہُ یَھۡدِیۡ :ہدایت کا سرچشمہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس سے صرف اہل لوگ ہی ہدایت حاصل کر سکتے ہیں۔

وَ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالرَّسُوۡلِ وَ اَطَعۡنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِکَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں: ہم اللہ پر اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت بھی کی پھر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ پھر جاتا ہے، یہ لوگ مومن ہی نہیں ہیں۔

وَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں سے ایک فریق منہ پھیر لیتا ہے۔

وَ اِنۡ یَّکُنۡ لَّہُمُ الۡحَقُّ یَاۡتُوۡۤا اِلَیۡہِ مُذۡعِنِیۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور اگر حق ان کے موافق ہو تو فرمانبردار بن کر رسول کی طرف آ جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ: اس آیت سے ایک سلسلہ کلام ان لوگوں کے بارے میں شروع ہو رہا ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر جب اس ایمان پر عمل کرنے کی نوبت آتی ہے تو ان کی بے ایمانی فاش ہو جاتی ہے۔

۲۔ وَ اَطَعۡنَا: ان منافقین کو بھی علم تھا کہ اطاعت کے بغیر ایمان کا دعویٰ نہیں سنایا جائے گا۔ اس لیے ایمان کے دعویٰ کے ساتھ اطاعت کا بھی وعدہ اور عہد دیا لیکن جب عمل کی نوبت آئی تو ان کے ایمان کے دعوے اور اطاعت کے عہد کی حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔

۳۔ وَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ : روایات کے مطابق یہ آیت اس وقت

نازل ہوئی جب کچھ منافقین کو اپنے اختلافات و نزاع کے فیصلے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا گیا تو رجوع کرنے سے انکار کیا۔

ایک روایت کے مطابق ایک منافق اور ایک یہودی کے درمیان نزاع تھا۔ یہودی نے رسول اللہؐ کو حَکَمۡ بنایا لیکن منافق کعب بن الاشرف نے یہودی کو حَکَمۡ بنایا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

واضح رہے کہ قرآنی تصریحات کے مطابق اس ایمان کی کوئی قیمت نہیں جس کے نتیجے میں ایک کردار سامنے نہیں آتا۔ دوسری لفظوں میں اگر کسی کا ایمان اس کے کردار میں مؤثر نہیں ہے تو ایسا ایمان اس شخص کی نجات کے لیے مؤثر نہیں ہے۔

۴۔ وَ اِنۡ یَّکُنۡ لَّہُمُ الۡحَقُّ یَاۡتُوۡۤا اِلَیۡہِ مُذۡعِنِیۡنَ: اگر فیصلہ اس کے حق میں ہونے والا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر نہیں اپنے مفاد پر ایمان رکھتے ہیں۔

اَفِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّحِیۡفَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ وَ رَسُوۡلُہٗ ؕ بَلۡ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا انہیں کوئی شبہ یا ڈر ہے کہ کہیں اللہ اور اس کا رسول ان کے ساتھ ظلم نہ کریں؟ (نہیں) بلکہ یہ لوگ خود ظالم ہیں۔

تشریح کلمات

یَّحِیۡفَ: (ح ی ف) حیف فیصلہ کرنے میں ایک جانب کو جھک جانا۔ انصاف نہ کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ: اللہ اور رسولؐ کے فیصلے کو مسترد کرنے کی چند وجوہات ہو سکتی ہیں: ان میں سے ایک قلب کی بیماری ہے جس کی وجہ سے وہ حق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

۲۔ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا: دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں اس بات میں شک ہے کہ رسول برحق ہیں یا جو فیصلہ رسول صادر فرماتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

۳۔ اَمۡ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّحِیۡفَ: تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں یہ خوف لاحق ہے کہ اللہ اور اس کے رسول درست فیصلہ نہ کریں اور اپنے فیصلے میں ناانصافی کریں۔

۴۔ بَلۡ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ: مذکورہ اسباب میں سے کوئی ایک بات بھی رسول ﷺ کو حَکَمۡ

(قاضی) بنانے کے لیے رکاوٹ نہیں بنی:

پہلی بات: دلوں میں بیماری کی وجہ سے وہ رسول کے فیصلے کے منکر نہیں ہیں۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے دلوں میں بیماری نہیں ہے بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیماری انکار کا سبب نہیں ہے چونکہ قلبی بیماری اگر سبب ہوتی تو وہ کسی صورت میں بھی رسول کے فیصلے کو تسلیم نہ کرتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اپنے مفاد یا نقصان نہ ہونے کی صورت میں یہ تسلیم کرتے ہیں۔

دوسری بات: انہیں رسولؐ کی رسالت پر شک وشبہ ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ رسولؐ کی حقانیت جانتے ہیں۔

تیسری بات: وہ یہ خوف رکھتے ہوں کہ رسولؐ اپنے فیصلے میں ناانصافی کریں گے۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ رسولؐ کی سیرت اور عدل و انصاف ان کے سامنے ہے۔ یہ ساری باتیں رسولؐ کے فیصلے کو مسترد کرنے کا سبب نہیں ہیں: بَلۡ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ۔

واحد سبب یہ ہے کہ وہ دوسروں کا حق مارنا چاہتے ہیں۔ دوسروں کا مال ظلم وستم سے کھانا چاہتے ہیں۔ یہ خود ناانصافی کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں علم ہے رسولؐ ناانصافی نہیں کریں گے اس لیے وہ رسول کے فیصلے کی طرف رجوع کرنا نہیں چاہتے۔

بعض مفسرین اس آیت کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں:

> کیا یہ لوگ قلب کی بیماری یا رسالت محمدی میں شک وشبہ یا فیصلے میں اللہ اور رسول کی طرف سے ناانصافی کے خوف کی وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے رسولؐ کے فیصلے کا انکار کر رہے ہیں؟ استفہام انکاری ہے۔ ان میں سے کسی ایک وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ ظالم لوگ ہیں۔ ان میں یہ تمام وجوہ موجود ہیں۔ قلب کی بیماری بھی ہے۔ رسالت محمدیؐ میں شبہ بھی رکھتے ہیں۔ رسولؐ کے فیصلے کو جانبداری اور ناانصافی پر محمول کرتے ہیں۔

اِنَّمَا کَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ جب مومنوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو مومنوں کا قول تو بس یہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں: ہم نے سن لیا اور اطاعت کی اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذَا دُعُوۡۤا: مؤمن وہ ہے جب اللہ اور رسولؐ کی طرف بلایا جائے تو وہ سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا کہیں۔

قابل توجہ اِذَا دُعُوۡۤا کا لفظ ہے۔ خدا و رسولؐ کی طرف بلایا جائے۔ بلانے والا کون ہو؟ آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے ہر بلانے والا شامل ہے۔ خواہ بلانے والا نزاع کا دوسرا فریق ہو کہ وہ پہلے فریق کو اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دے یا بلانے والا حاکم شرع ہو یا دیگر مؤمنین نزاع کے فریقین کو شریعت کی طرف دعوت دیں تو لبیک کہنا ایمان کی علامت ہے۔ بلانے والا کوئی ہو، اصل دعوت تو اللہ و رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کی ہے۔

۲۔ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ: فلاح ونجات اس میں ہے کہ اپنے مقدمات کا فیصلہ اللہ اور رسولؐ سے لیں، خواہ رسولؐ کی زندگی میں ہو یا رسولؐ کے بعد چونکہ اللہ و رسول کا حکم کسی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ یہ آیت حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی شان میں ہے۔[1]

اہم نکات

۱۔ مفادات سے تصادم کی صورت میں ایمان کی حقیقت فاش ہو جاتی ہے۔

۲۔ مقدمات کا فیصلہ اللہ اور رسولؐ سے نہ لینا عدم ایمان کی علامت ہے۔

وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ یَخۡشَ اللّٰهَ وَ یَتَّقۡهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا اور اس (کی نافرمانی) سے بچتا ہے تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

تشریح کلمات

الفوز: (ف و ز) بھلائی کا وافر حصہ حاصل ہو جائے اسے فوز کامیاب کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ: اللہ اور رسولؐ کی طرف سے جو نظام حیات عطا ہوا ہے اس نظام کی شقوں پر عمل کیا جائے۔

۲۔ وَ یَخۡشَ اللّٰهَ: جو بھی قدم اٹھایا جائے اس کے پیچھے خوف خدا اس کے ذہن وضمیر پر حاکم ہو۔

۳۔ وَ یَتَّقۡهِ: اللہ کے غضب اور اس کی رحمت سے دور ہونے سے اپنے آپ کو بچائیں تو ایسے لوگ کامیاب ہیں۔ یعنی ابدی زندگی میں کامیاب ہیں۔

---

[1] التبیان ۷: ۴۵۲

اہم نکات

۱۔ اطاعت و خوف خدا اور تقویٰ کامیابی کے عناصر ہیں۔

وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰہِ جَہۡدَ اَیۡمَانِہِمۡ لَئِنۡ اَمَرۡتَہُمۡ لَیَخۡرُجُنَّ ؕ قُلۡ لَّا تُقۡسِمُوۡا ۚ طَاعَۃٌ مَّعۡرُوۡفَۃٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔اور یہ لوگ اللہ کی کڑی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ ضرور نکل کھڑے ہوں گے، ان سے کہد یجیے: تم قسمیں نہ کھاؤ، اچھی اطاعت (قسم سے بہتر) ہے، بتحقیق اللہ کو تمہارے اعمال کا۔خوب علم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَقۡسَمُوۡا: یہ ایمان سے عاری لوگ کڑی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے آمادہ ہیں خواہ اپنے گھر بار کو چھوڑ کر یا جہاد کے لیے نکلنا پڑے۔

۲۔ قُلۡ لَّا تُقۡسِمُوۡا: ان سے کہد یجیے قسم نہ کھائیں۔قسموں کے ذریعے باتوں کے شیر نہ بنو۔ قسمیں زیادہ کھانا، کلام کے حقیقت سے عاری ہونے کی علامت ہوتی ہے۔اس کے بے حقیقت ہونے کی خلا کو قسموں سے پر کرنا چاہتے ہیں۔

۳۔ طَاعَۃٌ مَّعۡرُوۡفَۃٌ: اگر اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرنی ہے تو اس کا طریق کار سب کے سامنے ہے۔کسی قسم کی ضرورت نہیں ہے۔جس اطاعت کا تمہیں حکم ہوا ہے وہ اطاعت معروف و معلوم ہے۔بعض نے اس کے یہ معنی کیے ہیں: تمہاری اطاعت کا حال سب کو معلوم ہے۔صرف زبان کی حد تک ہے۔

۴۔ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ: تم اپنی قسموں سے اس خلا کو پُر نہیں کر سکو گے۔اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

اہم نکات

۱۔ جھوٹ بولنے والا نفسیاتی طور اپنے جھوٹ کا احساس کرتا ہے۔اس احساس کو دور کرنے کے لیے قسموں کا سہارا لیتا ہے۔

قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡہِ مَا حُمِّلَ

۵۴۔کہد یجیے: اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم نے منہ موڑ لیا تو

وَعَلَيۡكُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِيۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۵۴﴾

سمجھ لو کہ جو بار رسول پر رکھا گیا ہے اس کے وہ ذمے دار ہیں اور جو بار تم پر رکھا گیا ہے اس کے تم ذمے دار ہو اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول کی ذمے داری تو صرف یہ ہے کہ واضح انداز میں تبلیغ کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ: ان منافقین سے کہہ دیجیے: اللہ کی اطاعت کریں۔ اللہ کی طرف سے نازل شدہ دستور پر عمل کریں۔

۲۔ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ: رسولؐ نے جو دستور حیات پیش کیا ہے اس پر عمل کریں۔ اطاعت رسولؐ، اللہ کی اطاعت کی مزید تاکید کے لیے ہے۔ چونکہ رسولؐ کی اطاعت انہیں رسول بنانے والے کی اطاعت ہے۔ مرسَل کی اطاعت مُرسِل کی اطاعت ہے۔

۳۔ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡهِ: اگر وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے منحرف ہو جاتے ہیں تو اس سے رسول کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا کیونکہ فَاِنَّمَا عَلَيۡهِ مَا حُمِّلَ رسول تو صرف اس چیز کے ذمے دار ہیں جس چیز کا فرض ان پر ڈالا گیا ہے۔ وہ تبلیغ رسالت ہے۔ سو اس کی تعمیل ہو گئی۔ پیغام تم تک پہنچا دیا۔ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ وَعَلَيۡكُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ اور تم پر جس فرض کا بوجھ ڈالا گیا ہے جس کے تم ذمہ دار ہو، وہ ہے اطاعت اور فرمان برداری۔

۴۔ وَاِنۡ تُطِيۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا: اگر تم نے اپنی ذمہ داری پر عمل کیا اور رسولؐ کی اطاعت کی تو تم ہدایت پاؤ گے اور حقیقی منزل تک پہنچ جاؤ گے۔

۵۔ وَمَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ: رسولؐ پر صاف صاف حکم پہنچانے سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ رسولؐ تمہارے ایمان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اپنے ایمان کے تم خود مسئول ہو کہ تم بلا جبر و اکراہ ایمان لے آؤ۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس پر کیا بوجھ ڈالا گیا ہے۔ اس آیت سے واضح ہوا انسان پر اطاعت رسولؐ کا بوجھ ڈالا گیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَ

۵۵۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾	نیک اعمال بجالائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں زمین میں اس طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو جانشین بنایا اور جس دین کو اللہ نے ان کے لیے پسندیدہ بنایا ہے اسے پائدار ضرور بنائے گا اور انہیں خوف کے بعد امن ضرور فراہم کرے گا، وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اس کے بعد بھی جو لوگ کفر اختیار کریں گے پس وہی فاسق ہیں۔

تفسیر آیات

قرآن مجید میں خلافت اور استخلاف کو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے:

۱۔ ایک قوم کی نابودی کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ آباد کرنا۔ چنانچہ قوم عاد کے بارے میں فرمایا:

وَ اذۡکُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ ...[1]	اور یاد کرو جب قوم نوح کے بعد اس نے تمہیں جانشین بنایا۔
قَالَ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّہۡلِکَ عَدُوَّکُمۡ وَ یَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿﴾ [2]	موسیٰ نے کہا: تمہارا رب عنقریب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور زمین میں تمہیں خلیفہ بنا کر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

اس کے علاوہ ملاحظہ ہو الانعام: ۱۳۳، ہود: ۵۷، الاعراف: ۷۴۔

۲۔ نسل انسانی کو زمین پر آباد کرنا۔

اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ...[3]	میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں۔
وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَکُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ ..[4]	اور وہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں نائب بنایا

۳۔ ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر اقتدار دینا جیسے:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰکَ خَلِیۡفَۃً فِی الۡاَرۡضِ ..[5]	اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے...

---

[1] ۷ اعراف: ۶۹ [2] ۷ اعراف: ۱۲۹ [3] ۲ بقرہ: ۳۰ [4] ۶ انعام: ۱۶۵ [5] ۳۸ ص: ۲۶

قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ۝۱

ارشاد ہوا: میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں، انہوں نے کہا: اور میری اولاد سے بھی؟ ارشاد ہوا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

وَ لَقَدۡ کَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّکۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُہَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ ۝۲

اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔

زیر بحث آیت بھی اسی خلافت کے بارے میں ہے جس میں ایمان وعمل صالح کا مالک، ظالم نہ ہونا اور صالح بندوں میں سے ہونا شرط ہے۔ اسی لیے اس استخلاف کے یہ ثمرات ہوں گے:

i۔ تمکن در دین۔ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ۔ اس سے واضح ہوا کہ اس استخلاف سے مراد مطلق اقتدار نہیں بلکہ دینی اقتدار ہے جس میں دینی تعلیمات کو بالا دستی حاصل ہوگی۔ دینی قوانین اور دستور حیات کا نفاذ ہوگا۔

ii۔خوف کے بعد امن ہوگا۔ یہ ذکر نہیں کہ یہ خوف کن سے ہوگا۔ داخلی، خارجی، ہر صورت میں خوف امن میں بدل جائے گا۔ نہ بیرونی دشمن سے خوف ہوگا، نہ داخلی حکمرانوں کے ظلم و زیادتی کا خوف ہوگا۔

iii۔یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا: کہ وہ اس امن کی فضا میں اللہ کی بندگی کریں گے۔ اس سے اس خوف کی نوعیت کا علم ہوتا ہے کہ یہ خوف مذہبی تعلیمات پر عمل اور اللہ کی بندگی کرنے سے متعلق ہے۔ شرک و بدعت سے پاک ایک خالص دینی تعلیمات کا رواج ہوگا۔

ان اوصاف کی حامل خلافت کے مصداق کی تلاش میں مفسرین کو مشکل پیش آگئی ہے:

i۔بعض لوگ خلافت کو غلبہ اور اقتدار کے معنی میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اقتدار اور طاقت پر آنا ہی صلاح و ایمان کا معیار ہے۔ مولانا مودودی اس جگہ لکھتے ہیں:

> بعض لوگ خلافت کو محض حکومت اور فرمانروائی اور غلبہ و تمکن کے معنی میں لیتے ہیں۔ پھر اس آیت سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس کو بھی دنیا میں یہ چیز حاصل ہے وہ مؤمن اور صالح اور اللہ کے پسندیدہ دین کا پیرو اور بندگی حق پر عامل اور شرک سے مجتنب ہے اور اس پر مزید یہ ستم ڈھاتے ہیں کہ اپنے اس غلط نتیجے کو بٹھانے کے لیے ایمان، صلاح، دین حق، عبادت الٰہی اور شرک ہر چیز کا مفہوم بدل کر وہ کچھ بنا ڈالتے ہیں جو ان کے اس نظریے کے مطابق ہو۔ یہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف ہے جو یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے بھی بازی لے گئی۔[۳]

تقریباً اسی نظریے کے مطابق بنتا ہے وہ نظریہ جو اس استخلاف سے مراد پوری امت محمدی لیتے ہیں

۱۔ ۲ بقرہ: ۱۲۴   ۲۔ ۲۱ انبیاء: ۱۰۵   ۳۔ تفہیم القرآن

چونکہ اس میں بنی امیہ، بنی عباس اور آج تک کے تمام مسلمان حکمراں شامل ہوتے ہیں خواہ ان کا کردار اور ان کا خود اسلام کے بارے میں نظریہ کچھ بھی ہو۔ کہتے ہیں:

واستخلافهم هو ان يملكهم البلاد.. ويجعلهم اهلها كالذى جرى فى الشام والعراق و خراسان والمغرب۔[1]	استخلاف کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر ان کی حکومت قائم ہوئی اور ان کو اس کا اہل بنا دیا۔ جیسے شام، عراق، خراسان اور مغرب میں ان کی حکمرانی قائم ہوئی۔

ii۔ دوسرا موقف یہ ہے:

وعدہ استخلاف عہد حضرت ابوبکر و حضرت عمر و حضرت عثمان میں پورا ہوا۔ وہ اس وعدہ الٰہی کا مصداق صرف خلفائے ثلاثہ کے پچیس سالہ دور کو لیتے ہیں۔ اس میں وہ حضرت علی علیہ السلام کے دور خلافت کو شامل نہیں کرتے چونکہ ان کے دور میں فتوحات نہیں ہوئیں۔ کہتے ہیں:

> اگر آیہ استخلاف سے خلفائے راشدین مراد نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ خلافی لازم آتی ہے۔ یہ وعدہ اور جن کے ساتھ یہ وعدہ ہے وہ صرف خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں پورا ہوا۔[2]

تعجب کا مقام یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے موقف پر لفظ مِنۡکُمۡ سے استدلال کرتے ہیں کہ یہ وعدہ صرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاصرین سے مربوط ہے لہٰذا بعد میں آنے والے مثلاً حضرت مہدی عجل اللہ اس میں شامل نہیں ہو سکتے۔

گویا یہ لوگ قرآن کریم کے اجتماعی خطابات (جیسے الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے عنوان سے ہے) کو صرف زمانِ نزولِ قرآن کے مخاطبین تک محدود کرتے ہیں۔ ما اجهلهم۔

iii۔ تیسرا موقف یہ ہے: وعدہ استخلاف خلفائے اربعہ سے پورا ہوا تاہم ان میں منحصر نہیں بلکہ بارہ خلفاء بھی اس کے مصداق میں شامل ہیں۔

ابن کثیر اپنی تفسیر ۶: ۷۲ میں صحیح بخاری و صحیح مسلم کی اس حدیث کا یہاں ذکر کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا يزال امر الناس ماضياً ما وليهم اثنا عشر رجالاً۔	لوگوں کے معاملات اس وقت تک درست رہیں گے جب تک ان پر بارہ افراد حاکم (سرپرست) ہوں گے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

> اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ بارہ خلفاء کا وجود ضروری ہے۔ یہ شیعوں

---

[1] تفسیر قرطبی ۱۳: ۲۹۸ [2] تفسیر مظہری ۶: ۵۵۲

کے بارہ امام نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں سے اکثر کو حکومت نہیں ملی۔ البتہ یہ بارہ قریش سے ہوں گے اور حکومت کریں گے۔ عدل و انصاف قائم کریں گے جن کی بشارت قدیم کتابوں میں بھی ہے۔ پھر یہ ضروری نہیں کہ یہ بارہ امام بلا فاصلہ آئیں۔ بلا فاصلہ بھی ہو سکتے ہیں اور وقفے سے بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان بارہ میں سے چار بلا فاصلہ آئے ہیں۔ وہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی ہیں۔ پھر ایک وقفہ آیا۔ پھر ان میں سے کچھ وجود میں آگئے، باقی کس وقت وجود میں آئیں گے؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ان میں المہدی بھی ہیں جس کا نام رسول اللہ کے نام سے اور کنیت رسول اللہ کی کنیت سے ملتی ہوگی۔ جو زمین کو عدل و انصاف سے پُر کرے گا جیسے ظلم و جور سے پُر تھی۔[1]

iv۔ چوتھا موقف شیعہ امامیہ کا ہے کہ چونکہ اس استخلاف میں دین کا اقتدار اور دینی تعلیمات کا نفاذ ہوگا تو ظلم و جور کی جگہ زمین عدل و انصاف سے پُر ہوگی۔ ایسا رسول اللہ ﷺ کے بعد کب ہوگا؟ خود رسول ﷺ فرماتے ہیں ایسا ظہور مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے بعد تا قیام قیامت کے لیے ہوگا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا:

اھل البیت ھاھنا واشار بیدہ الی القبلہ۔[2]	قبلہ کی طرف اپنے دست مبارک سے اشارہ کر کے فرمایا اہل البیت علیہم السلام یہاں ہیں۔

دوسری حدیث بارہ خلفاء کے بارے میں ہے۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں جابر بن سمرۃ راوی ہیں کہ میں اپنے والد کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو رسول ﷺ کو فرماتے سنا:

ان ھذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیھم اثنا عشر خلیفۃ۔	یہ دنیا اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک بارہ خلیفہ نہ گزریں۔

جابر کہتے ہیں:

پھر رسول اللہؐ نے کچھ فرمایا میں نہیں سن سکا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا: کیا فرمایا؟

کہا: فرمایا: کلھم من قریش۔ یہ سب قریش سے ہوں گے۔

صحیح ابی داود میں وہ وجہ بھی مذکور ہے کہ رسولؐ کی آواز کیوں سنائی نہیں دی۔

جابر کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے:

لا یزال ھذا الدین عزیزاً الی اثنا عشر خلیفۃ۔	یہ دین اس وقت تک غالب رہے گا جب تک بارہ خلیفہ آئیں گے۔

---

[1] ملاحظہ ہو جلد ششم صفحہ ۷۲ [2] روح المعانی ۹: ۳۹۶

راوی کہتا ہے:

فکبر الناس وضجوا　　　　لوگوں نے تکبیر کہی اور شور مچایا۔

پھر حضورؐ نے کچھ فرمایا جو میں نہیں سن سکا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ کیا فرمایا؟ کہا:

کلھم من قریش　　　　یہ سب قریش سے ہوں گے۔

جب کہ عبدالملک بن عمیر خود جابر بن سمرۃ سے روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ نے کلھم من بنی ھاشم فرمایا۔

ملاحظہ ہو: امامۃ بقیۃ الائمۃ از السید علی المیلانی۔

سماک بن حرب نے بھی جابر بن سمرۃ سے اپنی روایت میں کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے کلھم من بنی ھاشم فرمایا ہے۔ (امامۃ بقیۃ الائمۃ)

واضح رہے عبدالملک بن عمیر صحیح بخاری کے رجال میں سے ہیں اور سماک بن حرب صحیح مسلم کے رجال ہیں۔

کلھم من بنی ھاشم بہت سے لوگوں کے لیے سنگین جملہ تھا۔ بعض اصحاب کا یہ نعرہ بھی تاریخ میں ثبت ہے کہ نبوت اور خلافت دونوں ایک ہی خاندان میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ عبد اللّٰہ بن زبیر کی جب مکہ میں حکومت قائم ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے سے یہ کہہ کر احتراز کرتے تھے کہ اس سے بنی ہاشم کی ناک اونچی ہو جاتی ہے۔

غیر شیعہ کے لیے بارہ خلفاء ایک ناقابل حل، ناقابل فہم معمہ بنا ہوا ہے اور بنا رہے گا۔

حافظ ابن العربی کہتے ہیں:

لم اعلم للحدیث معنی[1]　　　　مجھے اس حدیث کے معنی کا علم نہ ہو سکا۔

المھلب نے کہا:

میں نے کسی شخص کو اس حدیث کے کسی معنی پر یقین کرتے نہیں دیکھا۔

ابن الجوزی فرماتے ہیں:

میں نے اس حدیث پر طویل بحث کی۔ ان سب مقامات کو چھان مارا جہاں سے کچھ ملنے کی امید تھی اور سوال اٹھایا مگر کوئی مقصد حاصل نہ کر سکا۔

وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ: دین کو کامل اقتدار و تمکن حاصل ہونے کا یہ مطلب نہیں لیا جاتا ہے کہ منحرف کا وجود ختم ہو جائے گا بلکہ منحرف ہمیشہ کی طرح اپنا کردار ادا کرتا رہے گا۔

صاحب سر رسول حضرت حذیفہؓ اس جگہ فرماتے ہیں:

---

[1] روح المعانی ۹: ۳۹۶

ذھب النفاق و انما کان النفاق علی عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم وانما ھو الکفر بعد الایمان قال فضحک عبد اللّٰہ فقال لم تقول ذلک؟ قال علمت ذلک وقال: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ... وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ۔	نفاق ختم ہو گیا، نفاق تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا۔ یہاں ایمان کے بعد کفر کی بات ہے۔ کہتے ہیں یہ سن کر عبد اللہ بن مسعود ہنس پڑے اور کہا ایسا کیوں کہتے ہو؟ کہا: یہ بات مجھے اس آیت سے معلوم ہوتی ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ .... آخر میں فرمایا: جو اس کے بعد کفر اختیار کریں تو یہ لوگ فاسق ہیں۔

ملاحظہ ہو روح المعانی ذیل آیت۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾	۵۶۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

تفسیر آیات

وعدہ استخلاف کے بعد اطاعت خدا کا ذکر نماز و زکوٰۃ کی بجا آوری کے ضمن میں فرمایا اور اطاعت رسول کا صریح لفظوں میں ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وعدۂ استخلاف کے مصداق اور قرآن کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بیان فرمائیں گے۔ ان کی اتباع کرو۔ چنانچہ "حدیث بارہ خلفاء" میں یہ بات واضح ہوگئی کہ اطاعت رسولؐ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک رسولؐ کے فرامین کے مصادیق پر ایمان نہ لائیں۔

اہم نکات

۱۔ رحمت الٰہی ان لوگوں کے شامل حال ہوگی جو رسولؐ کی اطاعت کریں گے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾	۵۷۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ کافر لوگ زمین میں (ہمیں) عاجز بنا دیں گے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا جو بدترین ٹھکانا ہے۔

تفسیر آیات

خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے: اس وعدۂ استخلاف کے نفاذ کی راہ میں کافر کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ اس میں وعدۂ استخلاف کی تکمیل ہے کہ اس وقت دین کا تمکن جب ہو گا تو کفر کے پاس کوئی طاقت نہ ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ عالم کفر اسلام کے خلاف کوئی کردار ادا نہ کر سکے گا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِیَسۡتَاۡذِنۡکُمُ الَّذِیۡنَ مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَبۡلُغُوا الۡحُلُمَ مِنۡکُمۡ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوۃِ الۡفَجۡرِ وَ حِیۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِیَابَکُمۡ مِّنَ الظَّهِیۡرَۃِ وَ مِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ ۟ؕ ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّکُمۡ ؕ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ وَ لَا عَلَیۡهِمۡ جُنَاحٌۢ بَعۡدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوۡنَ عَلَیۡکُمۡ بَعۡضُکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ اے ایمان والو! ضروری ہے کہ تمہارے مملوک اور وہ بچے جو ابھی بلوغ کی حد کو نہیں پہنچے ہیں تین اوقات میں تم سے اجازت لے کر آیا کریں: فجر کی نماز سے پہلے اور دوپہر کو جب تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد، یہ تین اوقات تمہارے پردے کے ہیں، ان کے بعد ایک دوسرے کے پاس بار بار آنے میں نہ تم پر کوئی حرج ہے اور نہ ان پر، اللہ اس طرح تمہارے لیے نشانیاں کھول کر بیان فرماتا ہے اور اللہ بڑا دانا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

الظَّهِیۡرَۃِ: (ظ ھ ر) کے معنی ہیں ظہر کے وقت۔

عَوۡرٰتٍ: (ع و ر) یہاں عورات سے مراد پردے کے تین اوقات ہیں۔ دراصل مقام ستر کو عورت کہتے ہیں، یہ معنی بھی از روئے کنایہ ہے اور عار سے مشتق ہے۔

تفسیر آیات

جب یہ حکم آیا کہ لوگوں کے گھروں میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں تو اس میں کچھ حالات استثنائی ہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے۔ وہ حالات یہ ہیں:

i۔ گھر کے غلام

ii۔ نابالغ بچے

یہ دونوں طَوّٰفُوۡنَ عَلَیۡکُمۡ ہیں جو بار بار تمہارے پاس آتے رہتے ہیں۔ انہیں ہر بار اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تین اوقات تمہاری خلوت کے ہوتے ہیں ان میں یہ دونوں بھی اجازت کے بغیر تمہارے پاس داخل نہ ہوں۔

۱۔ مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ: مملوک میں مرد غلام کے بارے میں یہ حکم ہے۔ کنیز (عورت) اس میں شامل نہیں ہے جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے۔ (الکافی ۵: ۵۲۹)

۲۔ وَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَبۡلُغُوا الۡحُلُمَ: اس سے مراد وہ بچے ہیں جو اچھے برے کی تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر بالغ نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ تمیز نہ ہو تو ان سے ستر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۳۔ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ: روزانہ تین بار۔

۴۔ مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوۃِ الۡفَجۡرِ: فجر کی نماز سے پہلے انسان خواب کے لباس میں ہوتے ہیں۔

۵۔ مِّنَ الظَّہِیۡرَۃِ: ظہر کے وقت، جب قیلولہ کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت بھی انسان تخلیے کی حالت میں سو رہے ہوتے ہیں۔

۶۔ وَ مِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ: عشاء کی نماز کے بعد بھی انسان خواب کے لیے حالت تخلیہ میں ہوتے ہیں۔ ۴۸۹

۷۔ ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّکُمۡ: یہ تین اوقات تمہارے پردے کے ہیں۔ ان حالات میں تم پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنی چاہیے خواہ اپنی زوجہ کے ساتھ ہو یا تنہا۔ العورۃ اصل میں عار سے ہے۔ مقام ستر کے کھلنے سے عار محسوس ہوتا ہے اور بے ستر ہونا عار و ننگ ہے اس لیے عورت کو عورت کہتے ہیں۔

واضح رہے ایام طفولیت میں جن چیزوں پر بچوں کی نگاہ پڑتی ہے اس کے اثرات ان کی نفسیات پر نقش ہو جاتے ہیں۔ کبھی نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہماری معاصر دنیا میں رونما ہونے والی اکثر بے راہ روی بچپنے میں سامنے آنے والے بے حیائی پر مشتمل مناظر کی وجہ سے ہے۔ والدین اپنے گھروں میں اولاد کی اس حالت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ انہیں یہ خیال ہوتا ہے ابھی بچہ ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتا حالانکہ وہ نہ صرف یہ کہ سمجھ سکتے ہیں بلکہ طفولیت کی وجہ سے اس کے اثرات ان پر نقش بھی

ہوتے ہیں۔

۸۔ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ وَ لَا عَلَیۡہِمۡ جُنَاحٌۢ بَعۡدَہُنَّ: مذکورہ تین اوقات کے علاوہ باقی اوقات میں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۹۔ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ: اللہ لوگوں کی نفسیات پر علم رکھتا ہے۔ حکیم ہے، اس کا علاج بیان فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دوسروں کی خلوت کے اوقات میں خلل نہیں ڈالنا چاہیے۔

۲۔ بچوں کی تربیت میں نامناسب مناظر سے احتراز اہمیت کا حامل ہے۔

وَ اِذَا بَلَغَ الۡاَطۡفَالُ مِنۡکُمُ الۡحُلُمَ فَلۡیَسۡتَاۡذِنُوۡا کَمَا اسۡتَاۡذَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اٰیٰتِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ اور جب تمہارے بچے بلوغ کو پہنچ جائیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اجازت لیا کریں جس طرح پہلے (ان کے بڑے) لوگ اجازت لیا کرتے تھے، اس طرح اللہ اپنی آیات تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور اللہ بڑا دانا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا بَلَغَ الۡاَطۡفَالُ مِنۡکُمُ الۡحُلُمَ: بچے جو غلام نہیں ہیں، بلوغ کو پہنچ جائیں اور رشد عقلی مکمل ہو جائے تو ان کو ہر وقت اجازت لینی چاہیے۔ یعنی نابالغ بچے صرف مذکورہ تین اوقات میں اجازت لیں اور بالغ بچے ہمیشہ اجازت لیں۔

۲۔ کَمَا اسۡتَاۡذَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ: جس طرح ان کے بڑے لوگ اجازت لیا کرتے ہیں۔

۳۔ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اٰیٰتِہٖ: اسرار و رموز مخلوق کے تقاضوں کے مطابق احکام بیان فرمانا ایک واضح نشانی ہے۔

۴۔ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ: اس سے اللہ کے بے پایان علم اور حکمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وَ الۡقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیۡ لَا یَرۡجُوۡنَ نِکَاحًا فَلَیۡسَ عَلَیۡہِنَّ جُنَاحٌ اَنۡ یَّضَعۡنَ ثِیَابَہُنَّ غَیۡرَ

۶۰۔ اور جو عورتیں (ضعیف العمری کی وجہ سے) خانہ نشین ہوگئی ہوں اور نکاح کی توقع نہ رکھتی ہوں ان کے لیے اپنے (حجاب کے) کپڑے

مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیۡنَۃٍ ؕ وَ اَنۡ یَّسۡتَعۡفِفۡنَ خَیۡرٌ لَّہُنَّ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۶۰﴾

اتار دینے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والیاں نہ ہوں تاہم عفت کا پاس رکھنا ان کے حق میں بہتر ہے اور اللہ بڑا سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

مُتَبَرِّجٰتٍ: (ب ر ج) التبرج عورت کا اپنے اس حسن کا اظہار، جو چھپانا لازم ہے۔ اصل میں تبرج ظہور کو کہتے ہیں۔ اسی سے بلند عمارت کو برج کہتے ہیں چونکہ وہ نمایاں ہوتی ہے۔ (مجمع البیان)

تفسیر آیات

۱۔ الۡقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ: القواعد، قاعد کی جمع ہے۔ عورتوں سے مخصوص ہونے کی وجہ سے مؤنث صیغہ قاعدۃ نہیں بنایا جاتا جیسے حائض۔ سن رسیدہ عورتوں کو قواعد اس لیے کہا ہے کہ لانھن یکثرن العقود لکبر سنھن۔ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے اکثر بیٹھا کرتی ہیں۔ بعض نے کہا ہے: قاعدۃ فی بیتھا۔ جو خانہ نشین ہوگئی ہوں۔

۲۔ الّٰتِیۡ لَا یَرۡجُوۡنَ نِکَاحًا: ضعیف العمری کی وجہ سے نکاح اور ازدواج کی توقع ختم ہوگئی ہے۔ یعنی وہ اس قدر عمر رسیدہ ہوگئی ہیں کہ ان میں جنسی کشش ختم ہوگئی ہے۔

۳۔ فَلَیۡسَ عَلَیۡہِنَّ جُنَاحٌ: ایسی سن رسیدہ عورتیں اگر حجاب نہ کریں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

۴۔ اَنۡ یَّضَعۡنَ ثِیَابَہُنَّ: وہ کپڑے جو نامحرموں سے پردے کے لیے ہوتے ہیں، جن سے سینہ اور گردن چھپائے جاتے ہیں۔ قرآن میں پردے کے بارے میں جس لباس کا ذکر آیا ہے اسے اتار کر رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ لباس جلباب اور خمار ہیں۔[1] چنانچہ حدیث میں انہی دو لباسوں کا ذکر ہے۔[2]

۵۔ غَیۡرَ مُتَبَرِّجٰتٍ: البتہ یہ اجازت اس حد تک ہے کہ عورت کے وہ محاسن اور زیب و زینت ظاہر نہ ہوں جن کا چھپانا وَلَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ اِلَّا لِبُعُوۡلَتِہِنَّ[3] کے تحت واجب ہے۔

۶۔ وَ اَنۡ یَّسۡتَعۡفِفۡنَ خَیۡرٌ لَّہُنَّ: عفت شعاری ہر حالت میں خواتین کی عزت، وقار کے لیے بہتر ہے۔ ابتذال اور لاپرواہی سے شخصیت مجروح ہوتی ہے۔

۷۔ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ: ان پردوں کے پیچھے ہر حرکت سے اللہ واقف ہے۔

اہم نکات

۱۔ سن رسیدہ خواتین کے لیے ایک سہولت کے ذکر کے ساتھ حفظ وقار کی نصیحت ہے۔

---

[1] جلباب کی تشریح کے لیے سورہ احزاب آیت ۵۹، خمار کے لیے سورہ نور آیت ۳۱ ملاحظہ فرمائیں۔ [2] الوسائل کتاب نکاح
[3] ۲۴ نور: ۳۱

لَیۡسَ عَلَی الۡاَعۡمٰی حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الۡمَرِیۡضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا مِنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اٰبَآئِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اُمَّہٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اِخۡوَانِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَخَوٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَعۡمَامِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ عَمّٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَخۡوَالِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ خٰلٰتِکُمۡ اَوۡ مَا مَلَکۡتُمۡ مَّفَاتِحَہٗۤ اَوۡ صَدِیۡقِکُمۡ ؕ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا جَمِیۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُیُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ تَحِیَّۃً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ مُبٰرَکَۃً طَیِّبَۃً ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿٦١﴾

۶۱۔ اندھے پر کوئی حرج نہیں ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ مریض پر کوئی حرج ہے اور نہ خود تم پر اس بات میں کوئی حرج ہے کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ کے گھروں سے یا اپنی بڑی ماؤں (نانی دادی) کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا ان کے گھروں سے جن گھروں کی چابیاں تمہارے اختیار میں ہوں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم مل کر کھاؤ یا جدا جدا اور جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو اپنے آپ پر سلام کیا کرو اللہ کی طرف سے بابرکت اور پاکیزہ تحیت کے طور پر، اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے لیے کھول کر بیان فرماتا ہے، شاید تم عقل سے کام لو۔

تفسیر آیات

۱۔ لَیۡسَ عَلَی الۡاَعۡمٰی حَرَجٌ: اندھے، لنگڑے، مریض اور خود تم پر کوئی حرج نہیں مذکورہ گھروں سے بلا اجازت کھانے میں۔

اگر یہ فرمایا ہوتا: تم پر کوئی حرج نہیں مذکورہ گھروں سے کھانے میں تو اس میں اندھے، لنگڑے اور مریض بھی شامل ہو جاتے۔ ان کا الگ ذکر کرنے میں کیا راز ہے۔؟

ابن عباس کی ایک روایت میں اس کا جواب ہے۔ کہتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ...[1] اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھایا کرو۔

تو مسلمانوں نے مریض، اندھوں اور معذور لوگوں کے ساتھ کھانے سے احتراز کرنا شروع کر دیا اور خیال ظاہر کیا کہ طعام، اموال میں بہتر مال ہے اور اللہ نے ناجائز طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے سے منع کیا ہے۔ نابینا بہتر کھانے کو نہیں دیکھ سکتے، معذور کھانے میں دوسروں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے، مریض کھانا پورا نہیں کھا سکتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

اس کے علاوہ دیگر روایات میں بھی یہی بات مذکور ہے جو اس آیت کا شان نزول بیان کرتی ہیں۔

جن گھروں سے بلا اجازت کھا سکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

i۔ مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ: اپنے گھروں سے۔ اپنے گھروں سے بلا اجازت کھا سکتے ہیں کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھروں سے مراد اپنی اولاد اور اپنے شوہر، اپنی ازواج کے گھر ہیں۔ چنانچہ اولاد کا گھر باپ کا ہی گھر ہوتا ہے۔ اسی لیے آباء کا ذکر ہے، اولاد کا نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

ان اطیب مایأ کل المؤمن کسبه وان ولده من کسبه۔[3] مؤمن کے لیے پاکیزہ ترین کھانا اپنی کمائی اور اپنا فرزند اپنی کمائی ہے۔

ii۔ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ: اس میں باپ، دادا، پردادا سب شامل ہیں۔

iii۔ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ: ماں دادی سب شامل ہیں۔

iv۔ اور دیگر رشتہ داروں کا ذکر ہے۔ ان سب گھروں سے ان کے مالکوں کی اجازت کے بغیر حسب ضرورت کھا سکتے ہیں۔[4]

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایت ہے: ان مذکورہ گھروں سے بقدر ضرورت ان کی اجازت کے بغیر کھا سکتے ہیں۔

v۔ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ: جس کی چابی تمہارے اختیار میں ہو سے مراد بعض نے مملوکہ غلام لیا ہے اور بعض نے وہ شخص مراد لیا ہے کہ جسے انسان اپنا مال و متاع کا امین، چوکیدار، محافظ بناتا ہے۔

vi۔ اَوْ صَدِيْقِكُمْ: دوست اگر جگری ہے اور اس کے راضی ہونے پر اطمینان بھی ہے تو جائز ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

دوست کی حرمت کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مانوسیت، اعتماد اور بے تکلفی میں اپنی ذات، باپ اور بھائی کی جگہ رکھا ہے۔[5]

---

[1] ۲ بقرۃ: ۱۸۸ [2] اسباب نزول۔ واحدی [3] مجمع البیان۔ [4] فقہ القرآن ۲: ۳۳ [5] روح المعانی ۹: ۴۱۰

vii۔ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَاۡكُلُوۡا جَمِيۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا: اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم مل کر کھاؤ یا جدا جدا۔

روایت ہے:

جاہلیت میں ایک قوم ایسی تھی جو اکیلے کھانا کھانے کو باعث شرم سمجھتی تھی۔ اس رسم کی نفی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

۲۔ فَاِذَا دَخَلۡتُمۡ بُيُوۡتًا فَسَلِّمُوۡا عَلٰۤى اَنۡفُسِكُمۡ: جب کسی گھر میں داخل ہو تو اپنے آپ پر سلام کرو۔ یعنی اپنے ہم نوع اور برادران دینی پر سلام کرو جو فی الحقیقت خود تمہارا حصہ ہیں۔ روایت کے مطابق عَلٰۤى اَنۡفُسِكُمۡ کا مطلب یہ ہے کہ جب تم گھر والوں کو سلام کرو گے تو وہ جواب میں تمہیں سلام کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تم خود اپنے لیے سلام کر رہے ہو۔ چنانچہ اسی مضمون کی روایت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔[2]

۳۔ تَحِيَّةً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً: تَحِيَّةً یہ سلام ایک ایسی تحیت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقرر کیا اور حکم دیا ہے کہ تم ایک دوسرے کی حیات کی دعا کرو کہ اللہ تجھے زندگی دے۔

۴۔ مُبٰرَكَةً اس سلام سے برکتوں میں اضافہ ہوگا۔ انس راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

فاذا دخلت بیتك فسلم علیهم یکثر خیرك...[3]	جب تم اپنے گھر میں داخل ہو جاؤ تو گھر والوں پر سلام کرو تمہاری بھلائی میں اضافہ ہوگا۔

۵۔ طَيِّبَةً: جس سے نفس میں طمانیت اور طہارت آجاتی ہے۔ نفس کدورتوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

۶۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ: اس جملے سے ان احکام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو بیان فرمائے ہیں۔ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ عقل کا تقاضا ہے کہ خود انسان کی دارین کی سعادت پر مشتمل احکام پر عمل کیا جائے۔

اہم نکات

۱۔ اسلام خاندانی ارتباط و اعتماد کو فروغ دینا چاہتا ہے۔

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاِذَا كَانُوۡا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمۡرٍ جَامِعٍ لَّمۡ يَذۡهَبُوۡا حَتّٰى	۶۲۔ مومن تو بس وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جب وہ کسی اجتماعی معاملے میں رسول اللہ کے ساتھ ہوں تو ان کی

---

[1] المیزان		[2] الوسائل ۱۲: ۸۱		[3] عوالی اللآلی ۲: ۱۳۵

يَسْتَأْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾

اجازت کے بغیر نہیں ہلتے، جو لوگ آپ سے اجازت مانگ رہے ہیں یہ یقیناً وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں لہٰذا جب یہ لوگ اپنے کسی کام کے لیے آپ سے اجازت مانگیں تو ان میں سے جسے آپ چاہیں اجازت دے دیں اور ایسے لوگوں کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ: بظاہر مؤمن دکھائی دینے والے حقیقی طور پر اس وقت مؤمن ہو سکتے ہیں جب اللہ اور رسولؐ پر ان کا ایمان ہو۔ پھر اللہ اور رسولؐ پر ایمان راسخ ہونے کی ایک مثال پیش فرمائی۔

۲۔ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ: ایمان راسخ ہونے کی ایک مثال یہ ہے کہ یہ مومنین جب ایک امر جامع میں رسولؐ کے ساتھ ہوں تو رسولؐ کی اجازت کے بغیر رسولؐ کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ اجتماعی مسائل (اگر ہم جہاد کے علاوہ دیگر اجتماعی امور بھی امر جامع میں شامل سمجھتے ہیں) باہمی مشورے کے ساتھ طے فرماتے تھے اور وحی کا ذریعہ ہونے کے باوجود لوگوں کو اعتماد میں لیتے تھے۔ جو لوگ رسولؐ پر قلبی ایمان رکھتے تھے وہ ان آداب کا احترام کرتے تھے اور رسولؐ کی اجازت کے بغیر اس مجلس کو نہیں چھوڑتے تھے جب کہ منافق دوسروں کی آڑ میں کھسک جاتے تھے۔

اَمْرٍ جَامِعٍ کیا ہے؟ بعض کے نزدیک اس سے مراد جہاد ہے۔ سیاق آیت کے مطابق امر جامع ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں پوری امت کی شرکت ضروری ہے اور وہ جہاد کا مسئلہ ہی ہوسکتا ہے۔ مَعَهٗ وہ اس امر جامع میں رسول کی معیت میں ہو۔

۳۔ لَمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ: وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوں گے جو اجازت کے بغیر رسولؐ کا ساتھ چھوڑ دیں۔

تفسیر قمی میں اس آیت کے ذیل میں یہ روایت نقل کی ہے:

> یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہیں رسول اللہ ﷺ نے کسی امر جامع کے لیے بلایا اور انہیں کسی مہم یا کسی جنگی مہم پر بھیجنا چاہتے تھے مگر وہ بغیر اجازت کے وہاں سے کھسک گئے تھے۔ اللہ نے اس آیت کے ذریعے

انہیں اس حرکت سے روک دیا۔

۴۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَاۡذِنُوۡنَکَ: جو لوگ آپؐ سے اجازت طلب کرتے ہیں وہی اللہ اور رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ آیت حضرت حنظلہ بن ابی عیاش کے بارے میں نازل ہوئی۔ روایت میں آیا ہے: اس صحابی کی اس رات شادی ہوئی جس کی صبح احد کی جنگ شروع ہو گئی۔ اس نے رسول اللہؐ سے اجازت لی کہ رات اپنی دلہن کے ساتھ گزارے۔ وہ صبح جنابت کی حالت میں میدان جنگ میں پہنچ گئے اور شہید ہو گئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں نے خود دیکھا فرشتے حنظلہ کو چاندی کے تختے پر آسمان اور زمین کے درمیان کے پانی سے غسل دے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اس صحابی کو غسیل الملائکۃ کہتے ہیں۔

۵۔ فَاِذَا اسۡتَاۡذَنُوۡکَ: اگر یہ راسخ ایمان والے بہانہ جوئی کے لیے نہیں بلکہ اپنے معقول کام کے لیے لِبَعۡضِ شَاۡنِہِمۡ اجازت مانگیں تو آپؐ چاہیں تو اجازت دے سکتے ہیں۔ اس اجازت کو رسولؐ کی مشیت پر چھوڑ دیا چونکہ رسولؐ کی مشیت اللہ کی مشیت کے تابع ہے۔

۶۔ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لَہُمۡ: تاہم اجازت کے ساتھ ہو تو بھی آپؐ کی معیت سے دور ہونا ایک قسم کی کم سعادتی ہے۔ جس کا تلافی آپؐ کی طرف سے طلب مغفرت سے ہو سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسول اللہؐ کی معیت کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اجازت کے بغیر کسی حالت میں بھی رسول اللہؐ کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔

لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَیۡنَکُمۡ کَدُعَآءِ بَعۡضِکُمۡ بَعۡضًا ؕ قَدۡ یَعۡلَمُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ یَتَسَلَّلُوۡنَ مِنۡکُمۡ لِوَاذًا ۚ فَلۡیَحۡذَرِ الَّذِیۡنَ یُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِہٖۤ اَنۡ تُصِیۡبَہُمۡ فِتۡنَۃٌ اَوۡ یُصِیۡبَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ تمہارے درمیان رسول کے پکارنے کو اس طرح نہ سمجھو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو، تم میں سے جو دوسروں کی آڑ میں کھسک جاتے ہیں اللہ انہیں جانتا ہے، جو لوگ حکم رسول کی مخالفت کرتے ہیں انہیں اس بات کا خوف لاحق رہنا چاہیے کہ مبادا وہ کسی فتنے میں مبتلا ہو جائیں یا ان پر کوئی دردناک عذاب آ جائے۔

تشریح کلمات

التسلل: (س ل ل) سل الشیء من الشیء کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے کھینچ لینے کے ہیں۔ اسی سے آنکھ بچا کر کھسک جانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

لِوَاذًا: (ل و ذ) کے معنی ہیں کسی چیز کی آڑ لینا اور اس کے پیچھے چھپ جانا۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَیۡنَکُمۡ کَدُعَآءِ بَعۡضِکُمۡ بَعۡضًا: دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ کا مطلب رسول کو پکارنا ہوسکتا ہے اور رسول کا پکارنا بھی۔ رسول کا پکارنا بلانا بھی ہوسکتا ہے اور بددعا بھی ہوسکتی ہے۔ اس طرح دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

i۔ پہلی صورت میں آیت کے معنی یہ بنتے ہیں: جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو نام لے کر پکارتے ہو، رسولؐ کو اس طرح یا محمد کہہ کر مت پکارو۔ جیسا کہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ...[1] جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں بلاشبہ ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔

وَلَا تَجۡہَرُوۡا لَہٗ بِالۡقَوۡلِ کَجَہۡرِ بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝[2] جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

رسول کے احترام کے منافی عمل سے انسان کی تمام نیکیاں حبط ہو جاتی ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کبھی رسول کو نام سے نہیں پکارا۔

ii۔ دوسری صورت میں یہ معنی بنتے ہیں: رسولؐ کے بلانے کو عام لوگوں کے بلانے کی طرح نہ سمجھو، رسولؐ کا بلانا اللہ کا بلانا ہے۔ اسی لیے رسولؐ کے بلانے پر فوری لبیک کہنا ایمان کا تقاضا ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ ...[3] اے ایمان والو! اللہ اور رسول کو لبیک کہو جب وہ تمہیں حیات آفرین باتوں کی طرف بلائیں۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَا تَوَلَّوۡا عَنۡہُ وَ اَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ ۝[4] اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور حکم سننے کے بعد تم اس سے روگردانی نہ کرو۔

اگر کوئی رسولؐ کے بلانے پر لبیک نہ کہے تو اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ وہ رسولؐ کو دل سے نہیں مانتا۔ اسی وجہ سے اگر نماز کی حالت میں بھی ہو تو رسولؐ کے بلانے پر فوری لبیک کہنا فرض ہے۔

---

[1] ۴۹ حجرات: ۴ [2] ۴۹ حجرات: ۲ [3] ۸ انفال: ۲۴ [4] ۸ انفال: ۲۰

رسول اللہؐ ابی بن کعب کے نزدیک سے گزر رہے تھے اور ابی نماز پڑھ رہے تھے۔ رسول اللہؐ نے ابی کو بلایا تو ابی نے نماز جلدی ختم کر کے حاضری دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما منعك ان تجيبني اذ دعوتك۔ جب میں نے تجھے بلایا تھا تو تو نے لبیک کیوں نہیں کہی؟

کہا: میں نماز میں تھا۔ فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ... اے ایمان والو! اللہ اور رسول کو لبیک کہو جب وہ تمہیں حیات آفرین باتوں کی طرف بلائیں۔

عرض کیا یا رسول اللہؐ! جب آپؐ مجھے بلائیں تو فوری لبیک کہنا ضروری ہوا، خواہ میں نماز میں ہی کیوں نہ ہوں۔

بغوی معالم التنزیل ۲: ۲۸۲، تفسیر کبیر رازی ۱۵: ۴۷۱، الکشاف ۲: ۲۱۰، بخاری تفسیر میں حدیث نمبر ۱۹۶۱ میں ابو سعید بن المعلی سے یہی روایت کی کچھ فرق کے ساتھ کی ہے۔

لیکن بعض حضرات نے رسولؐ کے بلانے پر کھانے کو ترک نہیں کیا تھا اور کھاتے رہے۔ رسولؐ کی آواز پر لبیک نہ کہی تو رسول اللہؐ نے بد دعا دی:

لا اشبع اللّٰہ بطنه۔ اللہ اس کے شکم کو سیر نہ کرے۔

صحیح مسلم باب من لعنه النبی حدیث ۲۵۸۰۔ ناصر الدین الالبانی کو رسول اللہؐ کی نیتوں کا علم ہے!! سلسلہ الاحادیث الصحیحۃ حدیث نمبر ۸۲ میں لکھتے ہیں:

"یہ بد دعا کی نیت سے نہیں تھی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیت کا اس بات سے علم ہو جاتا ہے: البداية والنهاية جلد ۸ صفحہ ۱۱۹ میں سنہ ۶۰ کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے:

ان معاوية لما صار اميرا الى الشام كان يأكل فى اليوم سبع مرات۔ جب معاویہ شام کے امیر بنے تو دن میں سات مرتبہ کھاتے تھے۔

اس کے ساتھ صحیح بخاری میں یہ حدیث دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

المؤمن يأكل فى معى واحد و الكافر يأكل فى سبعة امعاء۔

ملاحظہ ہو صحیح بخاری۔ کتاب الاطعمة باب المؤمن يأكل فى معى واحد۔ ہم اس حدیث کی تطبیق کسی پر کرنا نہیں چاہتے چونکہ تطبیق کسی کے کرنے سے نہیں ہوتی۔ یہاں البداية والنهاية کی روایت پر تبصرہ ہو سکتا ہے۔

iii۔ تیسری صورت میں آیت کے یہ معنی بنتے ہیں: رسولؐ کی بد دعا کو عام آدمی کی دعا کی طرح نہ سمجھو۔ اس لیے کہ آپؐ کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق ابن عباس نے آیت

سے یہی معنی مراد لیا ہے۔ انہوں نے کہا:

احذروا اذا اسخطتموہ دعاءہ علیکم فان دعائه مجاب لیس کدعاء غیرہ۔[1]	تم جب رسولؐ کو ناراض کرو تو ان کی بددعا سے ڈرو چونکہ ان کی دعا قبول ہے، دوسروں کی دعا کی طرح نہیں ہے۔

اس تفسیر کے مطابق وہ توجیہ قرآن کے خلاف ہو جائے گی جس میں کہا جاتا ہے:

رسولؐ کسی پر لعنت یا سب یا بددعا کریں، وہ اس کے لیے رحمت بن جائے گی۔[2]

یعنی رسولؐ کی لعنت رحمت میں تبدیل ہو جائے گی۔

جب کہ رسول اللہ ﷺ ناحق کسی پر لعنت اور نفرین نہیں کرتے تھے، نہ معاذ اللہ گالی دیتے تھے۔ چنانچہ صاحب خلق عظیم کے بارے میں یہ روایت ہے:

ما رأیت رسول اللّٰہ یسبت احداً۔[3]	رسول اللہؐ کو کبھی کسی کو گالی دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔

تعجب کا مقام یہ ہے کہ صحیح مسلم میں ایک مستقل باب ہے، اس کا یہ عنوان ہے:

باب من لعنه النبی او سبّه او دعا علیه و لیس هو اهلاً لذلك۔	یعنی یہ باب نبیؐ کے کسی پر ناحق لعنت کرنے، گالی دینے اور بددعا دینے کے بارے میں ہے۔

چنانچہ اس عنوان میں رسول ﷺ کی اہانت ہے۔

بعض مفسرین کے مطابق یہی تفسیر سیاق آیت کے مطابق ہے چونکہ اس آیت سے پہلے فرمایا ہے:

رسول ﷺ کسی امر جامع کے لیے بلائیں تو اجازت کے بغیر وہاں سے کھسک نہ جائیں۔ اگر ایسا کرتے ہیں تو رسول ﷺ ناراض ہو جائیں گے اور تمہیں بددعا دیں گے۔ رسول ﷺ کی بددعا کو اپنی دعاؤں کی طرح نہ سمجھو۔[4]

۴۹۹ بہرحال آیت سے یہ تیسرے معنی ثابت ہوں یا نہ ہوں، مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسولؐ کی بددعا سے بچنا چاہیے۔ چونکہ رسولؐ کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اس جگہ کسی نے نہیں کہا کہ رسول ﷺ کی بددعا کا طالب ہونا چاہیے چونکہ رسول ﷺ کی بددعا رحمت میں بدل جاتی ہے۔

ہمارے نزدیک ان تین معانی میں سے دوسری صورت سیاق آیت کے مطابق ہے کہ دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ سے مراد حکم رسولؐ اور دعوت رسول ﷺ ہے۔ اس پر سابقہ آیت میں عَلٰۤی اَمۡرٍ جَامِعٍ اور اس آیت میں الَّذِیۡنَ یَتَسَلَّلُوۡنَ اور یُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِہٖۤ قرائن ہیں۔

۴۔ قَدۡ یَعۡلَمُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ یَتَسَلَّلُوۡنَ: اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو دوسروں کے آڑ میں کھسک جاتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جن کو رسولؐ بلاتے ہیں تو وہ مجلس رسولؐ میں بیٹھ کر رسولؐ کا حکم سننے کو اہمیت نہیں دیتے۔

---

۱ الجصاص: احکام القرآن ۵:۲۰۱، تفسیر طبری۔ ۱۸:۱۳۴　۲ ملاحظہ ہو صحیح مسلم باب من لعنه النبی

۳ سنن بیہقی حدیث ۳۵۵۴　۴ البحر المدید ۴:۷۳

۵۔ فَلۡیَحۡذَرِ الَّذِیۡنَ یُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِہٖۤ: جو لوگ حکم رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں انہیں آیندہ دو چیزوں میں سے ایک چیز سے دوچار ہونے کا خطرہ لاحق رہے گا: فتنہ یا دردناک عذاب۔ ایسے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے جس سے ان کا نفاق ظاہر اور ضمیر فاش ہو جائے گا یا آخرت میں عذاب الیم سے دوچار ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ رسولؐ کی دعوت پر لبیک نہ کہنا نفاق کی علامت ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ قَدۡ یَعۡلَمُ مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡہِ ؕ وَ یَوۡمَ یُرۡجَعُوۡنَ اِلَیۡہِ فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ متوجہ رہو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اللہ جانتا ہے تم جس حال میں ہو اور جس دن انہیں اس کی طرف پلٹا دیا جائے گا تو وہ انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں اور اللہ کو ہر چیز کا خوب علم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ کل کائنات اللہ کے قبضہ ملکیت اور گرفت میں ہے۔ ایسا مالک ہے جو اپنی مملوک کی شہ رگ سے زیادہ نزدیک ہے۔

۲۔ قَدۡ یَعۡلَمُ مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡہِ: تم جس روش پر ہو اس کو اللہ جانتا ہے۔ تمہارے ایمان، تمہاری نیت اور ارادے کیا ہیں؟ سب پر اللہ کو علمی احاطہ ہے۔

۳۔ فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا: آج اگر وہ ستار العیوب ہے تو یہ دار الامتحان کی بات ہے مگر کل دار الجزاء میں تو یہ باتیں فاش ہو جائیں گی۔

یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو بغیر اذن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مجلس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چلے جاتے اور حکم رسول پر لبیک نہیں کہتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ جانتا ہے تم کس روش پر ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ ایمان کی روش پر نہ تھے: یَعۡلَمُ مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَیۡہِ...

۲۔ دنیا میں ان کے عدم ایمان پر سے پردہ نہیں اٹھایا ہے: وَ یَوۡمَ یُرۡجَعُوۡنَ...

فہرست مطالب

سورہ کہف

تعارف سورۃ ________ ۹

ہر قسم کی خامی سے پاک کتاب تنبیہ

اور بشارت دینے کے لیے نازل کی ________ ۱۱

اللہ کے اولاد قرار دینا

بہت بڑی گستاخی ہے ________ ۱۲

لوگوں کے ایمان نہ لانے پر

رسولؐ کا سنگین رنج وغم ________ ۱۳

علی علیہ السلام زینت زمین ________ ۱۴

قصۂ اصحاب کہف ________ ۱۶

اصحاب کہف غار میں ________ ۲۲

اصحاب کہف بیدار ہوئے ہیں ________

اصحاب کہف کی کئی سو سال کے بعد

بیداری سے قیامت کا ثبوت ________ ۲۶

اصحاب کہف کی قبر کے پاس مسجد کی تعمیر ________ ۲۸

اصحاب کہف کی تعداد میں اختلاف ________ ۲۹

کسی کام کی انجام دہی کو اللہ کی

مشیت پر موقوف قرار دینا چاہیے ________ ۳۰

اصحاب کہف غار میں کتنی مدت سوئے؟ ________ ۳۲

اصحاب کہف کا واقعہ کس بادشاہ

کے دور میں واقع ہوا؟ ________ ۳۳

اللہ کے فیصلے کو کوئی نہیں بدل سکتا ________ ۳۴

اے رسول! عبادت گزار مؤمنوں کو

غربت کی وجہ سے اپنے سے دور نہ کر ________ ۳۵

مراعات یافتہ طبقہ پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے ________ ۳۷

حق کا پیغام ملنے کے بعد کفر و ایمان کا

اختیار بندے کے ہاتھ میں ہے ________ ۳۸

ایمان اور عمل والوں کے لیے اجر کا ذکر ________ ۳۹

ایک جاگیردار اور ایک مؤمن کا مکالمہ ________ ۴۰

جاگیردار کا برا انجام ________ ۴۴

کل کائنات کا اقتدار اعلا اللہ کے پاس ہے ________ ۴۵

مال اور اولاد کے بارے میں اسلام کا موقف ________ ۴۷

وقوع قیامت کا ذکر ________ ۵۰

نامۂ اعمال پیش ہونے کا ذکر ________ ۵۲

سجدہ برائے آدم کا ذکر ________ ۵۳

باطل حق کا ذریعہ نہیں بن سکتا ________ ۵۵

قیامت کے دن مشرکین کی مدد

کرنے والا کوئی نہ ہوگا ________ ۵۶

عذاب آنے تک ایمان نہ لانا
امتوں کی روش رہی ہے ____ ۵۷
کافروں نے انبیاءؑ کی
دعوت حق کا تمسخر کیا ____ ۵۸
ناقابل ہدایت لوگوں کا ذکر ____ ۵۹
اللہ کی مہربانی ہے کہ جرم پر فوری
عذاب نازل نہیں کرتا ____ ۶۰
حضرت موسیٰؑ کا تعلیمی سفر ____ ۶۱
حضرت موسیٰؑ کی معلّم سے ملاقات ____ ۶۵
معلّم: میری تعلیم کو تحمل نہیں کرسکو گے ____ ۶۵
بے خبر شخص صبر نہیں کرسکتا ____ ۶۵
اگر صبر کر سکتے ہو تو میرے
بتانے تک سوال نہ کرو ____ ۶۶
کشتی توڑنے پر صبر نہیں کیا ____ ۶۷
ایک لڑکے کو قتل کرنے پر صبر نہیں کیا ____ ۶۸
ایک گرنے والی دیوار بنانے پر بھی
صبر نہیں کیا ____ ۶۹
تینوں واقعات کا راز بیان ہوتا ہے ____ ۷۰
ایک اہم سوال کا جواب ____ ۷۲
سیر ملکوتی ____ ۷۳
ذوالقرنین کون تھے؟ ____ ۷۴
ذوالقرنین کی سلطنت کی وسعت ____ ۷۶
یأجوج و ماجوج کا ذکر ____ ۷۹
سدّ ذوالقرنین کا ذکر ____ ۸۰
کافروں کے سامنے جہنم پیش کرنے کا ذکر ____ ۸۲
جنت فردوس کا ذکر ____ ۸۵
اللہ تعالیٰ کے کلمات کا شمار ممکن نہیں ____ ۸۶
رسولؐ وہ انسان ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے ____ ۸۷

سورۃ مریم

تعارف سورۃ ____ ۹۵
کھیعص حروف مقطعات کی خصوصیت ____ ۹۵
حضرت زکریاؑ کی مناجات ____ ۹۷
حضرت زکریاؑ کی وارث کے لیے دعا ____ ۹۸
انبیاءؑ کے مالی وارث ہوتے ہیں ____ ۹۹
حضرت زکریاؑ کو یحییٰؑ کی بشارت ____ ۱۰۱
حضرت یحییٰؑ کو بچپن میں حکمت عطا ہوئی ____ ۱۰۴
ولادت کا دن، موت کا دن اور
حشر کا دن نہایت اہم ہیں ____ ۱۰۵
حضرت یحییٰ اور حضرت امام حسین علیہا السلام
میں شباہت ____ ۱۰۶
حضرت مریمؑ کا ذکر ____ ۱۰۶
جبرئیل کا مریمؑ کے سامنے آنے کا
اور عیسیٰؑ کی ولادت کا ذکر ____ ۱۰۷
حضرت عیسیٰؑ کو قوم کے سامنے لانے کا ذکر ____ ۱۱۲
حضرت عیسیٰؑ کا گہوارے میں
کلام کرنے کا ذکر ____ ۱۱۴
اللہ کی اولاد نہیں، مخلوق ہوتی ہے ____ ۱۱۶
حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ____ ۱۱۹
حضرت ابراہیمؑ کا اپنے چچا کو
ہدایت کرنے کا ذکر ____ ۱۲۰
حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت ____ ۱۲۳
حضرت ابراہیمؑ کے لیے ذکر جمیل ____ ۱۲۴
حضرت موسیٰؑ کا ذکر ____ ۱۲۵

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر ۱۲۷
حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر ۱۲۸
آدم، نوح اور ابراہیم علیہم السلام کی نسل میں
انبیاء علیہم السلام کا ذکر ۱۲۹
انبیاء علیہم السلام کے بعد کے ناخلف لوگوں کا ذکر ۱۳۰
توبہ کے بعد جنت میں داخل ہونے کا ذکر ۱۳۲
جبرئیل حکم خدا کے تابع ہیں ۱۳۲
جس نے ابتدائے حیات کی وہی
اعادۂ حیات کرے گا ۱۳۴
اللہ سب منکرین کو جہنم کے گرد جمع کرے گا ۱۳۴
اللہ ہر جماعت سے سرکش
لوگوں کو جدا کرے گا ۱۳۵
ہر مکلف کو جہنم کا مشاہدہ کرانا
اللہ کا حتمی فیصلہ ہے ۱۳۶
دنیا کی رعنائیوں پر کفار کے فخر کا جواب ۱۳۸
ہدایت کے اہل لوگوں کو اللہ
مزید ہدایت دیتا ہے ۱۴۰
کافر آخرت میں نامراد ہو کر
اللہ کے پاس آئے گا ۱۴۱
ناقابل ہدایت لوگوں پر
شیطان مسلط ہوتا ہے ۱۴۳
جن لوگوں نے اللہ سے عہد لیا ہے
وہی شفاعت کا اختیار رکھیں گے ۱۴۴
اللہ کے لیے اولاد قرار دینا ایسی گستاخی ہے جو
آسمانوں اور زمین کے لیے بھی قابل
برداشت نہیں ہے ۱۴۵
کائنات کی تمام موجودات
اللہ کی بندگی میں ہیں ۱۴۶
اللہ تعالیٰ مؤمنین کے دلوں میں
علی علیہ السلام کی محبت پیدا کرے گا ۱۴۷

سورہ طٰہ

تعارف سورۃ ۱۵۱
قرآن کے نزول کا مقصد رسولؐ کو
مشقت میں ڈالنا نہیں ۱۵۳
قرآن خوف خدا رکھنے والوں
کے لیے تذکرہ ہے ۱۵۴
کل کائنات کا مالک اللہ ہے ۱۵۵
اللہ کے لیے اسمائے حسنیٰ ہیں ۱۵۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ۱۵۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور میں ۱۵۷
عصائے موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ۱۶۰
ید بیضاء کا ذکر ۱۶۱
فرعون کو دعوت دینے کا حکم ۱۶۲
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعائیں ۱۶۳
رسول اللہؐ کی علیؑ کے بارے میں دعائیں ۱۶۵
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا ڈالنے کے
واقعے کا ذکر ۱۶۶
لتصنع (ص ن ع) کے معنی کی تشریح ۱۶۸
فرعون سے نرم لہجے میں بات کرنے کا حکم ۱۶۹
بنی اسرائیل کی آزادی کا
مطالبہ کرنے کا حکم ۱۶۹
فرعون کے جواب میں رب کی ایک
جامع ترین تعریف ۱۷۲

صاحبان عقل رب کی نشانیوں
سے آگاہ ہوتے ہیں ______ ۱۷۴
فرعون کی طرف سے معجزات
موسیٰ کی تکذیب ______ ۱۷۵
قرآن میں کوئی لفظی غلطی نہیں ہے ______ ۱۷۹
فرعون کی طرف سے جادو کا مظاہرہ ______ ۱۸۰
عصائے موسیٰ کے غالب آنے
پر ساحروں کا ایمان ______ ۱۸۱
فرعون کی طرف سے جادوگروں کی سزا ______ ۱۸۲
جادوگروں کی طرف سے ایمان پر استقامت ______ ۱۸۳
بنی اسرائیل کو مصر چھوڑنے کا حکم ______ ۱۸۴
فرعون کے غرق اور بنی اسرائیل
کی نجات کا ذکر ______ ۱۸۵
ثم اھتدی۔ ولایت اہل بیت سے
مغفرت ملتی ہے ______ ۱۸۷
موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر ______ ۱۸۸
سامری نے قوم موسیٰ کو گوسالہ پرست بنا دیا ______ ۱۸۹
سامری کون ہے؟ ______ ۱۸۹
حضرت موسیٰ علیہ السلام گوسالہ پرستی پر
اپنی قوم پر برہم ہوتے ہیں ______ ۱۹۱
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے مقابلے میں
گوسالہ کا "خوار" غالب آیا ______ ۱۹۳
قوم موسیٰ نے حجت خدا ہارون کا
حکم مسترد کیا ______ ۱۹۳
حضرت ہارون علیہ السلام سے باز پرسی ______ ۱۹۵
سامری سے باز پرسی اور اس کا جواب ______ ۱۹۶
سامری کو سزا، گوسالہ کو جلا دیا گیا ______ ۱۹۷
قیامت کے دن معلوم ہوگی
دنیا کی بے وقعتی ______ ۱۹۹
قیامت کے دن کس کو شفاعت
کا اختیار ملے گا؟ ______ ۲۰۱
اللہ تعالیٰ کسی کے احاطۂ علم و نظر
میں نہیں آ سکتا ______ ۲۰۲
وحی کی تکمیل تک قرآن سننے کا حکم ______ ۲۰۴
حضرت آدم علیہ السلام کے عزم کا ذکر ______ ۲۰۵
شیطان کا وسوسہ کامیاب،
آدم علیہ السلام نے شجر ممنوعہ کھا لیا ______ ۲۰۷
آدم علیہ السلام کو زمین پر اترنے کا حکم ______ ۲۰۸
وہ دل بے چین ہوتا ہے
جس میں ذکر خدا نہ ہو ______ ۲۰۹
کافر کو مہلت دنیا اللہ کا اٹل فیصلہ ہے ______ ۲۱۰
دنیا داروں کی رعنائیوں پر نظر نہ رکھو ______ ۲۱۲
رسولؐ و اہل بیت رسولؐ نے
نماز کی ابتداء کی ______ ۲۱۳
حجت پوری کرنے سے پہلے
ہلاکت میں نہیں ڈالتے ______ ۲۱۴
کافر اپنی ہلاکت کا اور مؤمن
اپنی فتح و نصرت کا انتظار کریں گے ______ ۲۱۵
سورۃ الانبیاء
تعارف سورہ ______ ۲۱۹
یوم حساب نزدیک ہے ______ ۲۲۱
احکام الٰہی کے آنے پر
بے اعتنائی کرتے ہیں ______ ۲۲۲
قرآن کے خلاف مختلف الزامات کا ذکر ______ ۲۲۳

اہل الذکر سے پوچھنے کا حکم ____ ۲۲۵
انبیاء علیہم السلام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں ____ ۲۲۶
قرآن سے امت مسلمہ
کا ذکر بلند ہوا ہے ____ ۲۲۷
گذشتہ قوموں کی تباہی کا ذکر ____ ۲۲۷
کائنات بے مقصد خلق نہیں ہوئی ____ ۲۲۹
حق کی چوٹ سے باطل کچل جاتا ہے ____ ۲۳۰
اللہ کا قرب رکھنے والے
عبادت میں کیف محسوس کرتے ہیں ____ ۲۳۱
کائنات میں دو معبود ہوتے تو فساد آجاتا ____ ۲۳۲
اللہ پر سوال نہیں آتا،
اللہ بے حکمت کام نہیں کرتا ____ ۲۳۴
اللہ کے علاہ کسی اور معبود کے موجود
ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے ____ ۲۳۵
اللہ کی کوئی اولاد نہیں ہوسکتی ____ ۲۳۶
فرشتے اللہ کے تابع فرمان بندے ہیں،
اولاد نہیں ____ ۲۳۷
آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے
اللہ نے ان کو جدا کیا ____ ۲۳۸
پہاڑوں کی خلقت کا ذکر ____ ۲۴۰
آسمان محفوظ چھت ہے ____ ۲۴۱
لیل ونہار، شمس وقمر کی تخلیق کا ذکر ____ ۲۴۱
ہر متنفس نے مرنا ہے ____ ۲۴۳
شر اور خیر دونوں ذرائع سے آزمائش ہوگی ____ ۲۴۲
رسولؐ کے استہزاء کا ذکر ____ ۲۴۴
لوگ جلد باز ہوتے ہیں، جلدی نہ کرو
وہ عذاب آنے والا ہے ____ ۲۴۵
تمام رسولوں کے ساتھ استہزاء ہوا ہے ____ ۲۴۶
اللہ کے علاہ کوئی
حفاظت کرنے والا نہیں ہے ____ ۲۴۷
گذشتہ قوموں کی طرح مشرکین
کے لیے زمین تنگ ہو رہی ہے ____ ۲۴۹
قیامت کے دن عدالت کا ترازو قائم ہوگا
تو کسی پر ظلم نہ ہوگا ____ ۲۵۱
موسیٰ و ہارون علیہما السلام
کو فرقان عنایت ہونے کا ذکر ____ ۲۵۲
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رشد عقلی کا ذکر ____ ۲۵۳
تاریخ کی پہلی بت شکنی ____ ۲۵۶
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی منطق کے
سامنے مشرک لاجواب ____ ۲۵۹
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آتش گلزار ____ ۲۶۱
ارض فلسطین کی طرف ہجرت ____ ۲۶۲
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق و یعقوب
عنایت ہوتے ہیں ____ ۲۶۲
نسل ابراہیمی میں امامت کا سلسلہ جاری ____ ۲۶۳
حضرت لوط علیہ السلام کی نجات کا ذکر ____ ۲۶۴
حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام
کی قضاوت کا ذکر ____ ۲۶۵
زرہ سازی کی صنعت کی تعلیم ____ ۲۶۷
حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا
اور شیاطین کی تسخیر ____ ۲۶۸
حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا اور قبولیت ____ ۲۷۰
حضرت اسماعیل، ادریس
اور ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر ____ ۲۷۱

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر ______ ۲۷۲
حضرت زکریا و یحیٰ علیہا السلام کا ذکر ______ ۲۷۴
حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر ______ ۲۷۵
انسانوں کا امت واحدہ ہونے کا ذکر ______ ۲۷۶
عمل صالح کی ناقدری نہ ہوگی ______ ۲۷۷
تباہ شدہ بستیوں والے
دوبارہ واپس نہیں آسکیں گے ______ ۲۷۸
یأجوج ومأجوج کی شکل میں
ایک جنگ عظیم ہوگی ______ ۲۷۸
مشرکین اور ان کے بت
جہنم کا ایندھن ہوں گے ______ ۲۸۰
جن کو پہلے خوش خبری دی گئی ہوگی
وہ جہنم کی آہٹ تک نہیں سنیں گے ______ ۲۸۱
فرشتے ان کا استقبال کریں گے ______ ۲۸۲
کائنات کو لپیٹ لیا جائے گا ______ ۲۸۳
اللہ کے صالح بندے
زمین کے وارث ہوں گے ______ ۲۸۴
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالمین کے لیے
رحمت بنا کر بھیجا ہے ______ ۲۸۶
ایک ہی معبود کی طرف دعوت کا حکم ______ ۲۸۹

سورة الحج

تعارف سورة ______ ۲۹۳
قیام قیامت کی ایک تصویر ______ ۲۹۵
نشأۃ ثانیہ پر نشأۃ اولی سے استدلال ______ ۲۹۷
بغیر سند اور دلیل کے اللہ کے بارے
میں بحث نہیں کرنی چاہیے ______ ۳۰۱
جو یکطرفہ (صرف مفاد کے تحت)
اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ دارین کے
خسارے میں جاتا ہے ______ ۳۰۳
مشرکین ایسوں کی پرستش کرتے ہیں
جن کا فائدہ کی نسبت ضرر زیادہ ہے ______ ۳۰۴
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی سے کسی کو پریشانی
ہے تو وہ خودکشی کرلے ______ ۳۰۵
کل کائنات اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے ______ ۳۰۷
اللہ کے بارے میں اختلاف رکھنے والے
فریقین کا ذکر ______ ۳۰۹
جنگ بدر کے بارے میں آیت کا نزول ______ ۳۰۹
حضرت علی علیہ السلام قیامت کے دن سب سے
پہلے اپنا مقدمہ پیش کریں گے ______ ۳۱۰
ایمان و عمل صالح والوں کے داخل
جنت ہونے کا ذکر ______ ۳۱۱
بیت اللہ کو ابراہیم علیہ السلام کا مستقر بنانے کا ذکر ______ ۳۱۳
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اعلان حج کرنے کا حکم ______ ۳۱۳
حج کے دنیا و آخرت کے مفادات کا ذکر ______ ۳۱۵
قربانی اور طواف نسآء کا حکم ______ ۳۱۶
اللہ پر جھوٹ کی نسبت دینا
شرک کے برابر ہے ______ ۳۱۷
شرک کرنے والا آسمان سے گر کر پاش پاش
ہونے کی طرح ہے ______ ۳۱۹
شعائر اللہ کی تعظیم تقویٰ ہے ______ ۳۱۹
قربانی کے جانور سے قربانی سے پہلے فائدہ
اٹھانا درست ہے ______ ۳۲۰
ہر امت کی قربانی کا مقام متعین ہے ______ ۳۲۱
قربانی کے اونٹ کا ذکر ______ ۳۲۳

پہلی بار اذن جہاد کا ذکر ____ ۳۲۵
عبادت گاہوں کے تحفظ کا ذکر ____ ۳۲۶
صرف نظریہ کے جرم میں قتل نہیں کیا جاتا ____ ۳۲۷
اقتدار کا لازمہ اقامہ نماز ہونا چاہیے ____ ۳۲۸
تمام قوموں نے اپنے انبیاء علیہم السلام
کی تکذیب کی ہے ____ ۳۲۹
عبرت کے لیے قوموں کی
سرگزشت دیکھنے کا حکم ____ ۳۳۰
عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ
اللہ کا وعدہ پورا ہوگا ____ ۳۳۱
اللہ اپنے نبیوں کو شیطان
کے ہر حربے سے بچاتا ہے ____ ۳۳۳
داستان غرانیق ____ ۳۳۵
مہاجر اور شہید کا درجہ ____ ۳۳۹
بدلہ کے بارے میں حکم ____ ۳۴۰
انسان کے لیے مسخر کردہ چیزوں کا ذکر ____ ۳۴۳
موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے ____ ۳۴۴
اسلام کے طریقہ عبادت پر
اعتراض کا حق نہیں ____ ۳۴۵
آیات الٰہی سن کر اذیت ہوتی ہے۔ ان
کے لیے آتش کا عذاب زیادہ سنگین ہے ____ ۳۴۷
مشرکین کے معبود مکھی کا بھی
مقابلہ نہیں کر سکتے ____ ۳۴۸
اللہ کے فرشتوں اور انسانوں
میں رسول ہوتے ہیں ____ ۳۴۹
فلاح پانے کے لیے لازم چیزوں کا ذکر ____ ۳۵۰
اللہ کی برگزیدگی کا ذکر، دین پر عمل آسان ہے،
گواہ کا ذکر ____ ۳۵۱

سورة المؤمنون

تعارف سورۃ ____ ۳۵۷
ان اعمال کی نشاندہی جن سے مؤمن
کامیابی حاصل کر سکتا ہے ____ ۳۵۹
انسانی تخلیقی مراحل کا ذکر ____ ۳۶۶
سات آسمانوں کا ذکر ____ ۳۶۹
پانی کو زیر زمین زخیرہ کرنے کا ذکر ____ ۳۷۰
جانوروں کی تسخیر میں موجود
درس کی طرف اشارہ ____ ۳۷۱
حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی سازی کا ذکر ____ ۳۷۳
نوح علیہ السلام کے بعد کی قوموں کا ذکر ____ ۳۷۶
امت واحدہ کا فرقوں میں
بٹ جانے کا ذکر ____ ۳۸۴
دنیا دار یہ نہ سمجھیں ان پر
اللہ کا خاص کرم ہے ____ ۳۸۵
جن پر اللہ کا خاص کرم ہے ان کا ذکر ____ ۳۸۶
اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے
زیادہ ذمے داری نہیں ڈالتا ____ ۳۸۸
آج کے عیش پرست کل کے
عذاب سے زیادہ چلائیں گے ____ ۳۹۰
اس قرآن کو مسترد کرنے کا
کافروں کے پاس کوئی جواز نہیں ہے ____ ۳۹۱
حق اگر لوگوں کی خواہشات کی پیروی
کرے تو عالم بے مقصد ہو جائے ____ ۳۹۳
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق کی دعوت کے مقابلے لوگوں

سے خراج نہیں مانگتے ______ ۳۹۴

انسان کے حواس پر مشتمل نعمتوں کا ذکر ______ ۳۹۶

منکرین قیامت سے چند سوال
اور ان کا ممکنہ جواب ______ ۳۹۸

خالق ہی معبود ہوتا ہے اگر معبود متعدد ہوتے
تو خالق بھی متعدد ہوتے ______ ۴۰۲

برائی کو احسن برتاؤ کے ذریعے
دور کرنے کا حکم ______ ۴۰۴

موت کے وقت تمنائے
رجوع بے سود ہوگی ______ ۴۰۵

عالم برزخ ______ ۴۰۶

صور پھونکنے کے بعد رشتہ ونسب باقی نہیں رہتا
سوائے رسول اللہ ﷺ
کے رشتہ ونسب کے ______ ۴۰۹

نجات کا دار ومدار اعمال کے وزن پر ہے ______ ۴۱۰

کافروں کی تمنائے نجات بے سود ہوگی ______ ۴۱۱

اہل ایمان کی دعاؤں کا مذاق اڑانے والوں
کے لیے نجات نہیں ہوگی ______ ۴۱۲

قیامت کے دن دنیا کی زندگی
بہت تھوڑی لگے گی ______ ۴۱۳

کافروں نے قیامت کا انکار کر کے
خلقت کو عبث قرار دیا تھا ______ ۴۱۴

مشرکوں کے پاس اپنے شرک پر
کوئی سند نہیں ہے ______ ۴۱۵

سورۃ نور

تعارف سورۃ ______ ۴۱۹

چندین آیات احکام پر مشتمل سورۃ ______ ۴۲۱

زانی مرد اور عورت کی تعزیرائی حد ______ ۴۲۲

حدود وتعزیرات ______ ۴۲۸

زانی کا جفت زانیہ یا مشرکہ سے ہوگا ______ ۴۳۰

پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت کی سزا ______ ۴۳۱

اپنی زوجہ پر زنا کے الزام
اور لعان کی صورت ______ ۴۳۵

واقعۂ افک (بہتان) کا ذکر ______ ۴۳۷

اصحاب افک کون تھے؟ ______ ۴۳۸

بہتان عنداللہ عظیم جرم ہے ______ ۴۴۱

بہتان تراشی سننے کا اتفاق ہو
تو کیا کرنا چاہیے؟ ______ ۴۴۲

اہل ایمان کے درمیان فحش عام کرنے
والوں کے لیے عذاب الیم ہے ______ ۴۴۳

شیطان کے نقش قدم نہ چلنے کا حکم ______ ۴۴۴

مالدار غریبوں کی مدد کرنے
سے دریغ نہ کریں ______ ۴۴۵

بے خبر پاکدامن عورتوں پر بہتان لگانے
والوں کے لیے عذاب عظیم ہے ______ ۴۴۶

قیامت کے دن انسان کی زبان،
ہاتھ اور پاؤں گواہی دیں گے ______ ۴۴۷

ناپاک عورتوں کا ناپاک
مردوں سے جوڑ ہوتا ہے ______ ۴۴۸

دوسرے کے گھروں میں داخل
ہونے کے آداب ______ ۴۴۹

مؤمنہ عورتوں کے لیے پردے کا حکم ______ ۴۵۳

عورتوں کے لیے محرم مردوں کا ذکر ______ ۴۵۳

غیر شادی شدہ لوگوں کے لیے شادی کے
اہتمام کا حکم ____________ ۴۵۷
سابقہ غلام آزاد کرنے کے لیے بیت المال
سے رقم دینے کا حکم ____________ ۴۵۸
غلام بنانے کی واحد اسلامی صورت ________ ۴۶۰
اللہ کائنات کا نور ہے ____________ ۴۶۱
قابل تعظیم گھروں کا ذکر ____________ ۴۶۵
علی علیہ السلام اور فاطمہ سلام اللہ علیہا کا گھر
اس میں شامل ہے ____________ ۴۶۶
قابل تعظیم گھروں میں موجود ے
خاصان خدا کا ذکر ____________ ۴۶۷
کافروں کے اعمال سراب کی
مانند بے حقیقت ہیں ____________ ۴۶۹
کائنات کی تمام موجودات کو اپنی
تسبیح وصلوۃ کا علم ہے ____________ ۴۷۰
بادل کی تشکیل اور برف و باران کا ذکر _____ ۴۷۲
گردش لیل و نہار میں اللہ کی
تدبیری آیات ہیں ____________ ۴۷۴
اللہ نے ہر رینگنے والے کو
پانی سے خلق فرمایا ہے ____________ ۴۷۵
دعوائے ایمان کے بعد عمل سے گریز
کرنے والے منافقین کا ذکر ____________ ۴۷۶
اللہ اور رسولؐ کے فیصلے کو مسترد کرنے
کا ان کے پاس کوئی جواز نہیں ____________ ۴۷۷
اطاعت ہی سے ایمان ثابت ہوتا ہے _____ ۴۷۸
قسمیں کھانے سے نہیں اطاعت سے
ایمان ثابت ہوتا ہے ____________ ۴۸۰
مؤمنین کو اللہ کی طرف سے
زمین کی خلافت کا وعدہ ____________ ۴۸۲
غلاموں اور نابالغ بچوں کے لیے دن
میں تین مرتبہ اجازت سے داخل ہونے کا حکم __ ۴۸۸
ضعیف العمر عورتوں کے پردے کا حکم _____ ۴۹۱
ان گھروں کا ذکر جن سے
بلا اجازت کھا سکتے ہیں ____________ ۴۹۲
مؤمن وہ ہیں جو اجتماعی امور میں
رسولؐ کی اجازت کے بغیر نہیں ملتے _______ ۴۹۵
رسولؐ کا پکارنا معمول پر نہ لیا کرو ________ ۴۹۷
کائنات کا مالک اللہ ہے وہ
ہر چیز سے باخبر ہے ____________ ۵۰۰